# ادب لطیف لاہور

جلد ۲۷ شمارہ ۳

جون ۴۸ء

## ترتیب



مدیران:

چودھری برکت علی

ممتاز مفتی

عبدالمتین عارف



زرِ سالانہ آٹھ روپے

فی پرچہ ایک روپیہ

# ادارہ

# اشارات

سالنامہ آپ مطالعہ فرما چکے اور اس کے متعلق آپ کی حوصلہ افزا آرا ابھی ہم تک پہنچ چکیں۔ ہمیں مسرت ہے کہ آپ نے ہماری پیش کش کو ہماری توقع سے کہیں بڑھ کر سراہا اور اسے اپنی نگاہوں میں بلند مقام عطا کیا۔ اس وسیع پسندیدگی کے پیشِ نظر ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم ادبِ لطیف کی گذشتہ عظیم روایات کو برقرار رکھنے کی نہایت اہم ذمہ داری سے ہم بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برا ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اور احساس ہمارے لئے وجہِ نازش ہے!

لیکن حقیقتاً اس کامیابی کا سہرا بہت زیادہ ہمارے معزز قلمی معاونین کے سر ہے جنہوں نے اپنی بہترین تخلیقات سے ہمیں فائدہ اٹھانے کا موقع دیا۔ یہ بہترین تخلیقات جن میں زندگی کو نئے سانچوں میں ڈھالنے کی امنگ، رجعت پسند قوتوں سے متصادم ہونے کا ولولہ اور صالح اقدار کو کائنات پر مسلط کر دینے کا عزم موجود ہے اور جو افادی معیاروں پر پورا اترنے کے ساتھ ساتھ فن کی بلندیوں اور حسن کی رفعتوں کی حامل ہیں!

افسانہ نمبر ابتدا سے ادبِ لطیف کا امتیازی نمبر رہا ہے۔ گذشتہ دو تین سال سے بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر یہ سلسلہ منقطع رہا۔ امسال ادارہ نے اس سلسلہ کی تجدید کا فیصلہ کیا ہے اور طے پایا ہے کہ اکتوبر کا شمارہ افسانہ نمبر کی حیثیت سے قارئین کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ ہم اسے کامیاب ترین صورت میں مرتب کرنے کی تیاریوں میں ابھی سے منہمک ہو گئے ہیں۔ امید ہے کہ ہمارے فن کار ساتھی ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی اپنے فراخدلانہ تعاون کا ثبوت دیں گے اور جلد از جلد اپنی عالی مرتبت نگارشات ارسال فرما کر پرچہ کو بروقت شائع کرنے میں ہماری مدد کریں گے۔

ہماری ملکی آزادی کا ایک سال ختم ہوا جاتا ہے۔ ہمیں امید تھی کہ یہ ہمارے معیارِ حیات کو بلند سے بلند تر کرنے میں مدد دے گی۔ مگر جب ہم اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں یہ محسوس کر کے بے حد اذیت پہنچتی ہے کہ عسرت و نکبت ہم پر آج بھی اُسی طرح غالب ہے۔ جس طرح ایک سال پہلے تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سوراج کی آمد کے ساتھ ساتھ مصائب و آلام میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ آج بورژوا طبقہ ترقی پسند جمہوری قوتوں کو کچلنے کے لئے پہلے سے کہیں زیادہ حاکمانہ اقتدار کو استعمال میں لا رہا ہے۔ ملک میں جگہ جگہ کسان اور زمیندار ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہیں اور اس ٹکر میں کسانوں کو پولیس اور فوج کی گولیوں کا شکار بننا پڑ رہا ہے۔ بڑی بڑی صنعتوں کو آج بھی قومی ملکیت بنانے کی بجائے پرائیویٹ اجارہ داروں کی تحویل میں دینے پر اصرار کیا جا رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ گذشتہ مہینوں میں اربابِ ادب اسی طرح کے دوسرے رجعت پرست حقائق کے خلاف احتجاج کرتے رہے ہیں مگر ابھی انہیں اپنی آواز کو اور بلند کرنا ہے۔ اپنے پروٹسٹ کو اور شدید کرنا ہے اور اس وقت تک اس عمل کو جاری رکھنا ہے۔ جب تک کہ ہماری سوسائٹی انسانیت کی معراج کو نہیں چھو لیتی!

ہمیں امید ہے کہ ادبِ لطیف کے آئندہ شماروں بالخصوص افسانہ نمبر میں ہمارے قارئین اپنے فن کاروں کے اس احتجاج کی مؤثر ترین بازگشت سن سکیں گے!

## عبادت بریلوی

# تنقیدی جھلکیاں

ہمیشہ ہمیشہ سے دنیا کی تمام قوموں کی یہ امتیازی شان رہی ہے کہ ان سب سے ہر ایک نے ہر حال میں اپنے اپنے ادبیات سے دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ بڑی سے بڑی پریشانی اور مصیبت پڑنے پر بھی۔ اس کو اپنے سینے سے لگائے رہی ہیں۔ گو زمانے بدل بھی اس کے مسرت پذیر تنازلیبسوؤں کو سنوارنے کے خیالات اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتے ہیں۔ ان کا یہ ایک ذرا اپنے اپنے ادبیات کو آسمانوں پر چڑھاتے رہنے جاند تاروں سے ہم آہنگ کر دینے کے خواب دیکھنا بلکہ بڑی سے بڑی چیز بھی اس کے دل میں سرمایۂ کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ کیونکہ وہ اس کو اپنی ایک مقدس جاگیر سمجھتا ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک وہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں اس کا صدیوں کا کلچر اور تہذیب علم و عمل، فکر و تدبر اور جذبات و احساسات کی تصویریں بے نقاب نظر آتی ہیں۔ کیونکہ اس کے اندر اسکو اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تمام روایات کا بسیرا دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک قوم سب کچھ چھوڑ سکتی ہے لیکن اپنے ادب سے علیحدگی یا بے تعلقی اختیار نہیں کر سکتی۔ انگریزوں کے متعلق تو یہ کہا جاتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک اس سلطنت کو خیرباد کہہ سکتا ہے جس میں سورج غروب نہیں ہوتا لیکن اگر ان سے کوئی کہے کہ شیکسپیئر کو چھوڑ دو۔ تو وہ اس کیلئے ہرگز تیار نہیں ہوں گے۔ سلطنت کو خیرباد کہہ دینا انہیں منظور ہوگا۔

لیکن دنیا کی ان قوموں کے دوش بدوش ایک بدقسمت قوم ایسی بھی بستی ہے جس نے اپنے ادب کو نہایت کسمپرسی اور زبوں حالی کے ایسے گڑھے میں ڈالے رکھا جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ اس کے ادب کی چشم حسرت ہمیشہ سے اس کی طرف ٹکٹکی باندھے تکتی رہی لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس کی آرزوئیں اور تمنائیں، ارمان اور خواہشیں اپنی قوم کے ایک ایک فرد کی طرف دستِ طلب دراز کرتی رہیں لیکن انکی بے نیازیوں نے اس کی طرف نگاہِ التفات ڈالنے کی بھی زحمت گوارا کرنے دی۔ میرا مطلب اردو اس قوم سے ہے۔ اور جس میں ہندو، مسلمان اور سکھ سب ہی شامل ہیں۔ ہمارا اور میرا اور آپ کا اور ان سب کا شکوہ بیج ہے۔ ہم سب نے وقتاً فوقتاً اس سے دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ اس سے محبت کی ہے۔ اس کو بنانے اور سنوارنے کے بلند بانگ دعوے کئے ہیں۔ لیکن بالکل اسی طرح جیسے کوئی شخص کسی داشتہ سے۔ کوئی ہوس پرست پیشہ ور عورت سے۔ ہم اس طرح خلوص اور انہماک کے ساتھ اس سے دلچسپی کا اظہار نہیں کرتے ہیں جیسے کوئی انسان اپنی بیوی سے کرتا ہے۔ اور یہ ہماری زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ ایک قوم کی زندگی کا سب سے زیادہ تاریک اور گھناؤنا پہلو ہے۔ چنانچہ اس پر جس قدر بھی آنسو بہائے جائیں کم ہیں۔

ہماری زندگی کے چہرے پر یہ بدنما داغ آج ہی نہیں لگا ہے۔ یہ موجودہ نسل ہی کی بے نیازی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ جس روز سے اردو ادب نے آنکھ کھولی، اسی روز سے یہی حال ہے۔ اردو ادب سے یہ بے نیازی ہمارے آباؤ اجداد کی میراث ہے ہم سے پہلے بھی اس کی طرف خاطرخواہ توجہ نہیں کی گئی۔ اس نے جنم اس وقت لیا جب فضا میں چاروں طرف فارسی کے نغمے

گرسے ہوئے تھے۔ اور ہر شخص ان کا والہ و شیدا تھا۔ حکومت کی ہمدردیاں اور دلچسپیاں فارسی ہی کے ساتھ تھیں۔ بڑے بڑے شاعر اردو میں شعر کہنا اپنے شایانِ شان نہیں سمجھتے تھے۔ اگر کبھی اس زبان میں طبع آزمائی کرتے تھے تو محض "تفنن طبع" کے طور پر! ظاہر ہے ان حالات میں ادب صرف عوام کے سہارے تو آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ غدر سے قبل جو کچھ فارسی ادب کے لئے ہوا یا کیا گیا۔ اس کا عشر عشیر بھی اردو ادب کے لئے نہ ہو سکا۔ البتہ غدر کے بعد دنیا بدل گئی۔ اب خود لوگوں نے اسے اپنے کام کا ذریعہ بنانا چاہا۔ چنانچہ وہ بنا۔ لیکن باوجود اصلاحی، علمی اور تعلیمی تحریکوں کے کوئی ایسی فضا اس وقت بھی پیدا نہ ہو سکی جو سملہ کے افراد کی آتشِ شوق کو بھڑکاتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس زمانے میں خاصے ادبی کارنامے پیش کئے گئے بہت سی تخلیقات کے ستارے آسمان ادب پر طلوع ہوئے لیکن جہاں تک عوام کے ذوق و شوق کا تعلق ہے اس میں اندھیرا ہی رہا۔ یہ اندھیرا آج بھی موجود ہے۔ لیکن پھر بھی موجودہ نسل نے بڑی حد تک اردو ادب کے آنسو پونچھنے کی کوشش کی ہے۔ جس کی وجہ سے کچھ سطحی سی بہتری کیفیت ضرور نظر آتی ہے۔ "در" بیمار" کا حال کسی قدر اچھا ضرور معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ تو کسی نے دیکھنے سے ۔ونق آجانے والی کیفیت ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ بیمار کا حال اچھا نہیں۔

اردو ادب کی صورت حال کیا ہے؟ ـــــ اس پر ہم لوگوں میں سے اکثر نے شاید ہی کبھی غور کرنے کی زحمت گوارا کی ہو۔ ہماری زندگی کا عجیب حال ہے کہ ہم حقیقتوں سے جی چراتے اور خیالی دنیا کی ہواؤں میں بسیرا لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ان پر غور کرنے سے قاصر رہتے ہیں اور جو کچھ ہمیں کرنا چاہئے وہ "نذرِ طاقِ نسیاں" ہو جاتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم آگے نہیں بڑھ پاتے "نطب از جا نمی جنبد" کا مصداق بن جاتے ہیں۔

بہرحال میں آج اردو ادب کی موجودہ صورت حال پر کچھ باتیں کرنی چاہتا ہوں اسکی موجودہ صورتِ حال سے اسکے فکری یا فنی پہلو کا جائزہ مقصود نہیں، بلکہ اردو داں قوم نے اسکے ساتھ کیا کیا ہے؟ ۔ اور اس کی وجہ سے اس کی جو حالت ہو گئی ہے۔ اور آئندہ اس کی وجہ سے جو کچھ ہونے والا ہے، میں اس کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔

آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ اردو ادب کے پڑھنے والے دوسرے ملکوں کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اسکا اندازہ آپ اس سے لگا لیجئے کہ اردو ادب کی معیاری سے معیاری کتاب کا پہلا اڈیشن عام طور پر ایک ہزار سے زیادہ نہیں چھپتا۔ اور بعض کتابیں تو پانسو یا چھسو تک چھاپی جاتی ہیں۔ دوسرے اڈیشن کے شائع ہونے کی نوبت کم ہی آتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اردو کی کتابیں زیادہ سے زیادہ چند ہزار لوگوں کی نظروں سے گزرتی ہیں۔ اور یہ بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا ظاہر ہے جب کتاب ہی ہزار یا پانسو سے زیادہ نہیں شائع ہوگی تو زیادہ لوگوں کے پڑھنے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ یہ بات میں اردو ادب کی نشر و اشاعت کی عام حالت کو سامنے رکھ کر کہہ رہا ہوں۔ ورنہ اردو میں بعض بعض کتابوں کے کئی کئی اڈیشن بھی شائع ہوتے ہیں۔ اور وہ ہزاروں کی تعداد میں بکتی بھی ہیں۔ مثال کے طور پر علامہ اقبالؒ کی کتابیں! یا ایک حد تک جوش ملیح آبادی کے کلام کے مجموعے! لیکن انہیں مستثنیات میں سے سمجھنا چاہئے۔

یہ صورت حال حد درجہ افسوسناک ہے لیکن اس پر افسوس کرنے کی بجائے یہ ضروری ہے کہ ہم آپ سر جوڑ کر اسکے اسباب پر غور کریں۔ کیونکہ اگر یہ صورت باقی رہتی ہے تو کم از کم موجودہ طوفانی فضا میں تو اردو ادب کا زندہ رہنا یا ترقی کرنا مشکل ہے۔

اردو ادب کی کتابوں کی اس قدر کم اشاعت ہونے کی سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ اسکے پڑھنے والے کم ہیں۔ اور پڑھنے والوں کے کم ہونے کی وجہ اردو والوں میں ادبی ذوق کا فقدان ہے۔ ادبی ذوق کا فقدان ہونے کا سبب عام فضا ہے جس میں

ہماری زندگی صدیوں سے گھری ہوئی ہے۔ ہمارے یہاں صحیح قسم کی تعلیم کا نام و نشان نہیں۔ لوگ تعلیم حاصل کرتے ہیں لیکن اس کا مقصد اپنے اندر علمی و ادبی صلاحیتوں کو بیدار کرنا نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ صرف تعلیم حاصل کرنے کی خاطر تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں مجھے اپنے ایک پروفیسر کا یہ جملہ آج تک نہیں بھولا جو ہندوستان کے ناقص نظام تعلیم سے اکتا کر اکثر کہا کرتے تھے کہ ہم صرف بھولنے کیلئے پڑھتے ہیں: WE READ TO FORGET تعلیم حاصل کرنے کا مقصد کوئی علمی و ادبی کام کرنا نہیں ہوتا بلکہ اگر کوئی مقصد اس کا ہوتا ہے تو وہ روزی کمانا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بڑی حد تک اقتصادی اور معاشی اقدار کی ناہمواری کا ہی نتیجہ ہے لیکن اسکی تشکیل میں زندگی کے غلط نظریات بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد کتاب دیکھنا ایک خلاف فطرت عمل سمجھتے ہیں۔ اور اگر انہیں کوئی ایسا کرتا ہوا نظر آتا ہے تو وہ اسکے اس عمل کو اس کے عقل و دماغ پر محمول کرتے ہیں۔ انکے نزدیک پڑھنے لکھنے کیلئے زندگی کو وقف کر دینا سب سے بڑی بدمذاقی ہے۔ بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں ادب کی جو تعلیم ابتدا سے شروع ہوتی ہے۔ اس میں کسی باقاعدگی اور معقولیت کو دخل نہیں ہوتا۔ ادب کی تعلیم دینے والے بھی ایسے لوگ ہوتے ہیں جو خود ادب سے کوئی مس نہیں رکھتے۔ ان کی صحبت میں دو چار سال جو طالب علم بسر کرتا ہے اس کو ادب سے کوئی نسبت پیدا ہونے کے بجائے نفرت ہو جاتی ہے۔ اور یہ نقش اس کے ذہن اور دل و دماغ پر ایسا ثبت ہوتا ہے کہ زندگی بھر نہیں مٹتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے بہت سے تعلیم یافتہ ادبیات کی مختلف اصناف کے مطالعہ کو محض تضیع اوقات سمجھتے ہیں جب تعلیم یافتہ افراد کا یہ حال ہو تو پھر غیر تعلیم یافتہ لوگوں کا تو خیر کہنا ہی کیا۔ اور پھر تعلیم ہمارے یہاں ہے ہی کتنی؟ بہت کم لوگوں کو تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے۔ حد آٹھ یا دس فیصدی ہے۔ اس کے علاوہ جن لوگوں کو تھوڑی بہت دلچسپی ہے انہوں نے اپنی یہ عادت ڈال لی ہے اور شعار بنا لیا ہے کہ اردو کی کتاب خرید کر نہیں پڑھیں گے۔ کسی کتب خانے سے حاصل کر لیں گے کسی دوست سے مستعار لے لیں گے کتاب خرید کر پڑھنا اور اس کو اپنے پاس محفوظ رکھنا ان کے خیال میں ٹھیک نہیں۔ اما میں پنجاب اور دوسرے صوبوں کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ میں نے سنا ہے کہ وہاں کے لوگ کتابیں خریدنے میں کم از کم یو پی کے مقابلے میں بہت آگے ہیں۔ لیکن یو پی میں تو حالت غیر ہے۔ یہاں اول تو لوگ پڑھتے ہی نہیں اور جو پڑھتے ہیں انکے نزدیک خرید کر پڑھنا جائز نہیں۔ آپ جدھر جائیں گے ہر شخص اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائے بیٹھا ہوا نظر آئے گا۔ اس نے ادب کے سیاسی رجحان کے متعلق کچھ نہ پڑھا ہوگا۔ اسے مصنف اور کتابوں کے نام تک نہ معلوم ہونگے۔ اگر وہ شاعر ہوگا تو وہ اپنے آپ اور اپنے شاگردوں کے علاوہ دوسروں کو بہت کم جانتا ہوگا۔ اگر اس سے کوئی پوچھے گا کہ صاحب! آپ جدید ادب کے فلاں رجحان سے بھی واقف ہیں؟ تو ارشاد فرمائیں گے "حضرت! اردو ادب تباہ ہو رہا ہے، زبان کو تو ان نئے لکھنے والوں نے تباہ کر ہی دیا تھا، اب ادب اور فن پر بھی حملے ہو رہے ہیں۔ میں ان خرافات کو دیکھ کر بھلا اپنا وقت کیوں خراب کروں —— ان تمام باتوں کا نتیجہ آپ کو معلوم ہے کیا ہو رہا ہے۔ یو پی میں اردو زبان اور ادب والے خود اپنے ہاتھوں سے گلا گھونٹ کر ہلاک کر رہے ہیں۔ یہاں نہ کتابیں شائع ہوتی ہیں اور نہ رسالے نکلتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسی چیز کو معیار بنا کر ریڈیو میں اردو کو صرف دس فیصدی نمائندگی دی جاتی ہے —— لیکن حیرت تو یہ ہے کہ یہاں کے لوگ ابھی تک سو رہے ہیں۔ اور اب تو یہ امکان سا ہو گیا ہے کہ سوتے ہی رہ جائیں گے۔ پنجاب کی مدد شامل حال نہ ہوتی تو اردو کی ان کتابوں اور رسالوں کا بھی پتہ نہ چلتا جو آج دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ دعوے ہے کہ ہم اہل زبان ہیں۔ اردو ہماری زبان ہے۔ کسی سے کہئے کہ صاحب اردو ادب کی بقا کے لئے کچھ سوچئے!

تو ارشاد ہوگا "ہم اہل زبان اور اہل ادب ہیں، اردو ادب کو ہمارے سامنے کون نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اور پھر زبان اور ادب کی بقا کے لئے بھی کچھ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے صاحب الکھنؤ والے زندہ ہیں۔ گفتگو اور بات چیت میں ادب پیش کرتے ہیں۔" اور اس ذہنیت کے نتائج جو کچھ ہو رہے ہیں، اور جو کچھ آئندہ ہونے والے ہیں اس کا تصور کر کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اسی ذہنیت نے کم از کم یو۔پی میں اردو کا جنازہ نکالنے کی پوری تیاری کر دی ہے۔ کاش اب بھی یہاں کے لوگوں کو خصوصاً اور اردو والوں کو عموماً ہوش آجائے، اور جن خطرناک راستوں سے وہ گزر رہے ہیں اس کا ان کو احساس ہو جائے!

اردو ادب کو اگر زندہ رکھنا، ترقی دینا اور آگے بڑھانا ہے تو اس قسم کی ذہنیتوں کو فنا کرنا ہوگا۔ تعلیم عام کرنی ہوگی۔ اور مروجہ نظام تعلیم کے نقشے میں نئے رنگ بھرنے پڑینگے۔ ایک ایک فرد کے دل میں اہل ذوق کی شمعوں کا روشن کرنا ضروری ہوگا۔ بیشمار انجمنیں بنانی ہونگی جو اس کام کو انجام دے سکیں۔ اگر ایسا ہؤا تو اردو ادب کے پھیلنے اور بڑھنے کے امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔ ورنہ مخالفت، نفرت، اور تنگی بغض کے ان طوفانوں میں اس کے پھیلنے اور بڑھنے کے متعلق سوچنا تو در کنار، زندہ رکھنے کی صورت نکالنی بھی "جوئے شیر" کے "لانے" سے کم مشکل نہ ہوگی۔

موجودہ دور میں وطن عزیز کا پورا جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں، اور ہمارا احساس اس خیال سے گھائل ہو جاتا ہے کہ خواہ مخواہ کی نفرت اور انتقام کے ناگ اسے ڈس لینے کے درپے ہیں۔ اگر ہم اس وقت بھی نہ جاگے "اہل زبان" یا "اہل ادب" کی مصنوعی قبائیں اوڑھ کر خیالوں کی دنیاؤں میں بسیرا لیتے رہے تو اس کا اللہ ہی مالک ہے۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ اپنے اپنے گھروں میں ادبی فضا قائم کی جائے۔ اردو قدیم اور جدید ادب کی معیاری کتابیں ہر اردو داں فرد کے گھر میں موجود ہوں، اور ان کو پڑھا جائے۔ ماؤں اور بہنوں، بچوں اور بچیوں کو اسی طرح پڑھایا جائے کہ وہ اس سے دلچسپی لیں۔ جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے حلقے قائم کئے جائیں جن میں اردو زبان اور ادب کی اہمیت پر تقریریں ہوں۔ مشاعروں کا سلسلہ جاری ہو۔ کتب خانے قائم کئے جائیں۔ تمام افراد کو اردو کی کتابیں خریدنے کی طرف راغب کیا جائے۔ اردو ادب کے مدارس شبینہ کھولے جائیں۔ اپنی اپنی حکومتوں سے درخواست کی جائے کہ وہ اردو ادب کی ترقی کے کاموں میں مدد کریں۔ دھن دولت والوں کو اس طرف راغب کیا جائے کہ وہ اردو ادب کی اشاعت کے کاروبار میں روپیہ لگائیں۔ اگر ایسا ہؤا تو حالات بدل سکتے ہیں۔ ورنہ صورت حال تو کچھ ایسی ہے جو زبان حال سے یہ کہہ رہی ہے کہ ؎

تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

## فراق گورکھپوری

# غزل

قلوبِ نو ہے کے سانچے میں ڈھلتے جاتے ہیں　چراغ تیرے تبسم کے جلتے جاتے ہیں
زمیں کی کوکھ ہے یا لہلہاتی جنت ہے　حیاتِ تازہ کے چشمے اُبلتے جاتے ہیں
کبھی زمانے کو دیں گے وہی نوید بہار　جو اپنے منہ پہ لہو اپنا ملتے جاتے ہیں
کبھی نشاط بھی ہو جائے گی عذاب انہیں　ابھی تو غم سے ترے دل بہلتے جاتے ہیں
انہیں جہان کی تفسیر کی کہاں فرصت　عمل سے اپنے جو دُنیا بدلتے جاتے ہیں
وہ جن کے پاس بجز نام کے کچھ اور نہیں　انہیں کے نام سُنا ہے اچھلتے جاتے ہیں
کہیں نہ اپنی ہی پرچھائیوں سے ڈر جائیں　وہ جن کی رہ سے کہستان ٹلتے جاتے ہیں
گلے پڑی اب اسیرو، بلائے آزادی　پرانے طوق و سلاسل بدلتے جاتے ہیں
وہ کاروانِ جنوں خاک و خوں میں لپٹے ہوئے　جو آسمانوں کے بھی سر کچلتے جاتے ہیں

نوائے نیم شبی سے نکل رہی ہے فراق
وہ آنچ جس سے ستارے پگھلتے جاتے ہیں

## کرشن چندر

# دوسری موت

شیواجی پارک بمبئی کے مضافات میں ہے اور اس کے قابلِ دید مقامات میں ہے۔ مگر شروع میں یہ بات آسانی سے سمجھ میں نہیں آسکتی کہ یہاں کی کونسی شے قابلِ دید ہے۔ عمارتیں؟ عمارتیں تو بمبئی میں چاروں طرف ہیں۔ نفیس فلیٹ؟ تو وہ میرین ڈرائیو پر جا کر دیکھئے۔ جہاں ایک فلیٹ کے لئے پچیس ہزار روپے کی پگڑی دینی پڑتی ہے۔ ناریل کے درخت؟ تو وہ جوہو پر ہزاروں کی تعداد میں نظر آئیں گے۔ شیواجی پارک میں تو خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ سمندر؟ بھئی سمندر تو بمبئی کے چاروں طرف ہے۔ اس میں شیواجی پارک ہی کو کیا خصوصیت ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا اسے اس قدر قابلِ دید مقام کیوں سمجھا گیا ہے۔

دراصل یہ بات اتنی جلدی سمجھ میں آنے والی نہیں۔ اس کے لئے شیواجی پارک میں رہنا بہت ضروری ہے اور کوئی دو چار مہینے رہنے سے کام نہ چلے گا۔ برسوں کی مستقل رہائش چاہیئے۔ جب جا کے اس کی قابلِ دید و شنید خصوصیات کا پتہ چل سکے گا مثال کے طور پر مجھے اقامت کے پہلے چھ ماہ میں یہی پتہ نہ چل سکا کہ میرے فلیٹ کے بالکل اوپر دوسرے فلیٹ میں شراب کی بھٹی ہے۔ مسٹر رومولو جو اوپر کے فلیٹ میں رہتے تھے۔ ایک ماہر بٹن ساز تھے اور ایک سندھی کارخانہ دار کی بٹن فیکٹری میں ملازم تھے جب وہ پکڑے گئے تو اچانک ہی ہمیں پتہ چلا کہ صرف ایک ماہر بٹن ساز ہی نہ تھے، ماہر شراب بھی تھے۔ اُن کی بھٹی کی کشید شدہ شراب۔ ذائقے۔ رنگت اور تاثر میں مشہور فرانسیسی شرابوں کو بھی مات کرتی تھی۔ لیکن یہ سب کچھ ہمیں بعد میں معلوم ہوا۔ پہلے چھ ماہ تک تو ہم انہیں بٹن سازی کا ماہر سمجھتے رہے۔ مسٹر رومولو بڑے ملنسار ہنس مکھ انسان تھے۔ اکثر اترتے چڑھتے بلڈنگ کی سیڑھیوں پر ان سے ملاقات ہوتی تھی اور کبھی کبھی منٹ حیدرآباد کے بٹن اور کانپور کے چمڑے کے بٹنوں پر اُن سے گفتگو رہتی تھی اور پھر نام کتنا اچھا تھا۔ رومولو۔۔۔ رومولو۔۔۔ ۔ زبان پر کس نفاست سے گھومتا ہے۔ رومولو۔ رومولو کتنی گٹھلاٹ ہے اس نام میں۔ کھٹوکی بالائی کا سا مزا آتا ہے۔ اور ایک اسی شیواجی پارک میں میرے دوست رہتے ہیں۔ نام ہے خواجہ مشہد بناض۔ نام سن کے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا کوئی گھوڑا کچے شلغم چبا رہا ہے۔ بھلا آپ ہی بتائیے۔ ایسے نام کا آدمی دنیا میں ترقی کرسکتا ہے۔ خیر تو ذکر مسٹر رومولو کا ہو رہا تھا۔ جب وہ ناجائز شراب سازی کے جرم میں دھر لئے گئے تو مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ میرے ایک اور دوست ہیں جو اسی بلڈنگ میں رہتے تھے۔ دس سال فرانس میں رہ کے آئے تھے۔ بڑے خوش ذوق آدمی تھے۔ موٹر گاڑی بھی رکھتے تھے۔ کبھی کبھار جب میرے رشتہ دار گاؤں سے بمبئی کی سیر کے لئے آتے تو میں اُن سے گاڑی مانگ لیتا تھا۔ وہ امپورٹ اور اکسپورٹ کے تاجر تھے اور فیروز شاہ مہتہ روڈ پر ان کا دفتر تھا۔ مسٹر رومولو کی گرفتاری پر ہنس کے فرمانے لگے "بھئی کچھ بھی ہو رومولو برانڈ کی شراب کا جواب بمبئی میں نہیں ہے۔ اسے چکھ کر پیرس کی گلیاں یاد آجاتی ہیں اور فرانسیسی کنواری کا جسم۔ جو اب خود پیرس میں نایاب ہوتا جا رہا ہے۔ آنکھوں کے آگے گھومنے لگتا ہے۔

"مگر" میں نے اپنے دوست سے کہا "میں تو سمجھا تھا کہ یہ بٹن۔۔۔۔"

انہوں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا: "تم نرے چغد ہو۔ ارے میاں یہ شیوا جی پارک ہے۔ یہاں ہر آدمی دو کام ضرور کرتا ہے۔ ایک سفید مارکیٹ کا ایک بلیک مارکیٹ کا۔ سفید مارکیٹ میں پیسہ نہیں ہے۔ پیسہ تو صرف بلیک مارکیٹ سے ملتا ہے۔ مسٹر ر مولو کی شراب ملبار ہل پر جاتی تھی۔ بڑے بڑے امیر گھرانوں میں۔ خود بمبئی کے پولیس کمشنر نے اکثر دعوتوں میں اس شراب کو چکھا ہے۔ کیا بات کرتے ہو؟"

جب پولیس مسٹر ر مولو کو لے گئی تو مجھے بڑا افسوس ہوا۔ میرے دوست کہنے لگے "ہاں کیوں افسوس کرتے ہو؟ وہ بڑا پرانا اور کائیاں ہے۔ دور تک اس کی پہنچ ہے۔ دیکھنا بہت جلد چھوٹ جائے گا" اور یہی ہوا۔ چند دنوں میں میں نے مسٹر ر مولو کو ہنستے کھیلتے واپس آتے دیکھا۔ مگر اب وہ شیوا جی پارک کا فلیٹ تبدیل کر رہے تھے۔ دس ہزار روپیہ پگڑی پر انہوں نے اپنا فلیٹ ایک سندھی شرنارتھی کو دے دیا جو بیچارہ کراچی سے اپنی جان بچا کے بمبئی بھاگ آیا تھا۔ اسے اپنے والیشین کتے کا بڑا افسوس تھا جو کراچی میں ہی رہ گیا تھا۔ بیوی بچے، زیور، دولت سب کچھ وہ لے آیا تھا مگر اس کے مکانات، اس کا کارخانہ اور اس کا باغ وہیں رہ گیا مگر ان چیزوں کا اسے اتنا افسوس نہ تھا۔ جتنا اس کے والیشین کتے کا جو غلطی سے کراچی میں رہ گیا تھا۔ اس نے اپنے مسلمان دوستوں کو کئی تار دیئے۔ لیکن وہ لوگ اتنے کٹر پاکستانی تھے کہ انہوں نے بے چارے کا کتا وہیں رکھ لیا۔ بڑا خوبصورت کتا تھا وہ، سپید براق جلد پہ چیتلے چیتلے داغ، جیسے نئے فیشن کی ساڑھیاں نہیں ہوتی ہیں۔ بس اس کا پیارا والیشین بھی اسی ڈیزائن کا تھا۔ ظالم پاکستانیوں نے ہتیا لیا اور ہماری سرکار ہے کہ ایسے شرنارتھیوں کے لئے کچھ بھی نہیں کرتی!

یہ بات کہ شیوا جی پارک میں ہر آدمی دو کام کرتا ہے مجھے بھی نہیں۔ او رجچی تھی اس وقت جب میرے دوست خود لڑکیوں کی خرید و فروخت کے سلسلے میں پکڑے گئے۔ بعد میں یہ راز کھلا کہ ان کا امپورٹ اور اکسپورٹ کا دفتر بھی جو فیروز شاہ مہتا روڈ پر تھا۔ دراصل لڑکیوں کی امپورٹ اور اکسپورٹ کا کام کرتا تھا۔ یہ کام غریب پنجابی شرنارتھیوں کی آمد سے اور بھی بڑھ گیا تھا۔ انہی دنوں میرے دوست نے اک نئی ڈیلر خرید کی تھی اور اس میں کثر خوبصورت لڑکیوں کو ڈرائیو کے لئے لے جایا کرتے تھے مگر وہ لڑکیاں تو اتنی فیشن ایبل تھیں کہ مجھے کبھی اندازہ ہی نہیں ہوا کہ ان کی بھی امپورٹ اکسپورٹ ہوتی ہے۔ اس قدر رہائی کو اٹی کا مال ہوتا تھا کہ پولیس کی نگاہ بھی چوک جاتی تھی اور پھر بڑے بڑے دوست تھے میرے دوست کے۔ ان کے فلیٹ میں میری ملاقات نواب آف گھسیارہ کے ساتھ ہوئی۔ مسٹر جی حضوری سے ہوئی۔ مولانا شرف اللہ سے ہوئی بیٹھ دولت چاوڑیا سے ہوئی۔ کیا لوگ تھے وہ۔ ہر ایک کے پاس پندرہ بیس بلڈنگیں، آٹھ دس گاڑیاں۔ پانچ سات داشتائیں اور دو چار سیاسی لیڈر نوکر تھے اور جب میں اپنے دوست سے کہتا: "بھئی تم بڑے با رسوخ ہو، ایک بزنس ہمیں بھی کرا دو" تو اپنے موٹے سگار کی راکھ جھاڑ کر کہتے: "ارے بھئی تم کیا جانو۔ اس بزنس میں کتنی پریشانی ہے" اب پتہ چلا۔ جب پولیس انہیں گرفتار کر کے لے گئی کہ اس میں کتنی پریشانی ہے۔ سنا ہے لڑکی جو اکسپورٹ کی گئی۔ صرف تیرہ سال کی تھی۔ اس کے ماں باپ نے اسے پندرہ سو میں بیچ دیا تھا۔ میرے دوست نے اسے ایک ریاست میں سات ہزار روپے پر اکسپورٹ کر دیا۔ کسی نے بیچ میں کمیشن زیادہ مانگا اور میرے دوست نے نہیں دیا۔ اس نے پولیس میں اطلاع کر دی اور آپ جانئے پولیس تو ایسے معاملوں کی تاک میں رہتی ہے۔ بے چارے شریف آدمی کو گرفتار کر لیا۔

ایسے واقعات شیوا جی پارک میں ہوتے رہتے ہیں۔ میرا ایک دوست تھا بھنڈاری۔ بیچارہ کراچی سے یونس

کے لئے آیا تھا۔ یہاں ایک گجراتی لڑکی سے عشق کر بیٹھا اور بزنس کے بجائے اس نے ایک روز لڑکی کی بے مہری سے تنگ آکر زہر کھالیا۔ آپ اس لڑکی کو دیکھیں تو کہیں اس لڑکی کے لئے زہر تو کیا مٹھائی بھی نہیں کھائی جاسکتی مگر دل ہی تو ہے

شیواجی پارک میں کارخانے دار رہتے ہیں اور کرخندار بھی۔ سیٹھ لوگ بھی اور سیٹھوں کے غلام بھی۔ کہیں کہیں فلم ایکٹرس بھی نظر آجاتے ہیں۔" وہ گھر دیکھا تم نے؟ یہاں شری گھوش رہتے ہیں۔"

"شری گھوش! سچ مچ؟"

"ہاں۔"

"وہی شری گھوش جنہوں نے جھڑی کا پکڑا اور چرکا موڑا اور گرہی کے پھولوں میں کام کیا ہے؟"

"ہاں۔"

"کمال ہے بھئی۔ یہ چھوٹا سا مکان اُن کا ہے۔"

"اور وہ جو مکان ہے جس کے باہر بھنگن جھاڑو دے رہی ہے۔ وہاں مس دمساز لانتی رہتی ہے۔"

"دمساز لعنتی!"

"لعنتی نہیں۔ لانتی ہے۔ یقین فانیہ ہے۔"

"دمساز لانتی، جھوٹ تو نہیں بولتے۔ وہی دمساز لانتی جو بدقسمت، من کی پھوار اور میں کیسے کہوں کی ہیروئن ہے۔"

"وہی وہی!"

"مجھے یقین نہیں آتا۔ اتنی بڑی ہیروئن یہاں رہتی ہے۔"

"یقین نہ آتا ہو تو اس بھنگن سے پوچھ لو۔"

"کمال کردیا بھئی۔"

"کیا سمجھتے ہو۔ یہ شیواجی پارک ہے۔" میرا گائڈ جواب دیتا ہے۔

اب مجھے یہاں رہتے ہوئے چھ سال ہوگئے ہیں۔ اب میں کہہ سکتا ہوں کہ شیواجی پارک واقعی قابلِ دید جگہ ہے۔ یہاں فلم انڈسٹری کے بہترین ہیرو اور ہیروئن موجود ہیں۔ بڑے بڑے سیٹھ اور کارخانے دار۔ اخباروں کے مالک اور بڑے بڑے جرنلسٹ جن کے قلم کا لوہا دنیا مانتی ہے اور پھر معمولی لوگ بھی رہتے ہیں۔ دھوبی۔ نائی۔ کلرک۔ ادیب۔ مٹھائی بیچنے والے کچھڑے ڈرائیور، ہوٹیڑ، پان والے، پھول والے، ناریل والے، دہی بڑے کی چاٹ والے معمولی لوگ۔ جن میں طوائفیں بھی شامل ہیں۔ شیواجی پارک دوسری اتفاقی آبادیوں کی طرح ہی ایک اور آبادی ہے۔ اس آبادی میں ہندو زیادہ ہیں مسلمان کم۔ یوں سمجھئے کہ سو میں سے پچانوے تو ہندو ہوں گے اور پانچ مسلمان۔ ہندوؤں میں ستر مرہٹے ہوں گے اور بیس گجراتی۔ باقی پانچ فلم ایکٹر سمجھئے۔ مرہٹے بالعموم متوسط یا نچلے متوسط طبقے کی اولاد ہیں۔ گجراتی امرا کے طبقے میں قدم رکھتے ہیں اور جو فلم ایکٹر ہیں۔ وہ ان دونوں طبقوں کے بیچ میں گزرتے رہتے ہیں۔ کبھی یہاں کبھی وہاں۔ جنگ کے زمانے میں یہ لوگ لاکھوں کماتے تھے۔ جنگ کے بعد لاکھوں گنوا دیئے انہوں نے۔ آج کل بیکاری کے زمانے میں ہندو سیوک سنگھ میں نام لکھا لیا ہے اور ہندو دھرم سے عشق کرتے رہتے ہیں۔ جنگ کے زمانے میں رنڈیوں سے عشق کرتے تھے۔ کبھی کبھی غور کرتا ہوں تو اپنی ساری زندگی بھی۔ شخصی، قومی زندگی۔ امپورٹ ایکسپورٹ کے اصول پر چلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے!

شیواجی پارک میں سبھی طرح کے لوگ ہیں مگر پھر بھی عرصہ چھ سال سے دیکھ رہا ہوں کہ لوگ اپنے فلیٹوں میں آرام سے رہتے ہوں یا دکھ سے رہتے ہوں، شرافت سے ضرور رہتے ہیں۔ کیونکہ انسانی مجبوری کے ہزاروں افراد خندہ گری کے اصول پر کسی آبادی کو زیادہ دیر تک نہیں چلا سکتے۔ اس لئے بچے آسانی سے گلیوں میں گھومتے ہیں۔ عورتیں آزادی سے پارک میں سیر کرتی ہیں۔ دکانوں پر سودا سلف خریدتی ہیں۔ مرد دفتروں کارخانوں اور دکانوں پر کام کرتے ہیں اور شام کو ایک قمیص اور دھوتی پہنے ہوئے سمندر کے کنارے آجاتے ہیں اور گپ اڑاتے ہیں۔ ننھے ننھے کھلونوں کی ننھی ننھی حرکات اور قریب ہی سمندر کی گھن گرج گرج چاروں پہر سنائی دیتی ہے اور چھوٹی چھوٹی انسانی مسرتوں کے لئے پس منظر موسیقی کا کام دیتی ہے۔ کبھی موسیقی ہے تو کبھی گرج ہے۔ کبھی خطرہ ہے تو کبھی خوشی ہے۔ سمندر کی گونج ہر آن انسانی خوشیوں اور دکھوں کے ساتھ بدلتی رہتی ہے اور شیواجی پارک کی انسانی آبادی اس گونج میں اپنے ڈھنگ کے سُر ڈھونڈتی رہتی ہے۔

(۲)

میری اقامت کے پچھلے سال شیواجی پارک میں ایک طوفان اٹھا۔ یہ طوفان بہت دور سے آیا تھا گو سمندر شیواجی پارک کے قریب ہے۔ لیکن یہ طوفان اس سمندر میں نہیں آیا تھا۔ یہ طوفان بہت دور سے آج سے ایک سو سال دور پیچھے سے آیا تھا۔ یہ طوفان غدر سے شروع ہوا اور پندرہ اگست کو سارے ہندوستان میں پھیل گیا۔ انسانی تاریخ کے اس طوفان نے ہر ہندوستانی گھر کی چولیں ہلا دیں اور کہیں نہ کہیں اس کی روح میں، اس کے جسم میں، اس کے ذہن میں، اس کے آداب میں، اس کی زندگی میں کوئی نہ کوئی انقلاب ضرور پیدا کر دیا۔ یہ بڑا بھاری طوفان تھا جو صدیوں کے بعد ہی انسانی زندگی میں آتا ہے تو اسے شروع ہوئے ایک سو سال سے زیادہ عرصہ ہوا تھا۔ کئی لوگ کہتے ہیں کہ یہ ایک طوفان نہ تھا۔ دو طوفانوں کی ٹکر تھی۔ ایک طوفان جو ایک سو سال پہلے شروع ہوا اور دوسرا طوفان جو اس سے کہیں پہلے منو سمرتی کی جارحانہ برہمنیت سے شروع ہوا۔ سینکڑوں سال پہلے وہ برہمنیت جو بدھ کے عروج کا باعث بنی، جس نے اسلام کو فروغ دیا، جس نے اچھوت پیدا کئے۔ آج پاکستان کو جنم دے رہی تھی۔ بلاشبہ یہ دو طوفانوں کی ٹکر تھی۔ قومیت کا سیلاب اور برہمنیت کا ردعمل۔ قومیت کا سیلاب آزادی لایا۔ برہمنیت کے ردعمل نے پاکستان کی تشکیل کی اور اب دونوں طوفان ٹکرا رہے تھے۔ بجلی کی کڑک، رعد، گونج، گرج، انسانی چیخیں، خون کی لہریں، بجلی جو گھروں کو جلا گئی، عصمتوں کو جلا گئی، کھیتوں کو جلا گئی، انسانوں کو جلا گئی۔ یہ طوفان ادھر سے آیا جدھر سے آریہ لوگ آج سے ہزار سال پہلے ہند میں داخل ہوئے تھے۔

سردار دوہتر سنگھ اسی طوفان کے ریلے میں بہتا بہتا شیواجی پارک آ نکلا تھا۔ دوہتر سنگھ لائل پور کا ہٹا کٹا کسان تھا۔ جسم و جان کا مضبوط۔ اس کے آباؤ اجداد نے لائل پور کی بنجر زمینوں میں اپنی محنت سے بہار کے پھول اگائے تھے۔ وہ لائل پور کا بیٹا تھا جس طرح وہاں کی گندم، وہاں کی روئی اور وہاں کے پیلو لائل پور کے تھے۔ جب ایک بوٹے کو اس کے جغرافی ماحول، اس کی مخصوص آب و ہوا، اس کی زمین سے اکھاڑ دیا جائے تو دوسری جگہ اس کی کاشت مشکل سے ہو سکتی ہے۔ اس معمولی امر کو ہر کسان اچھی طرح سمجھتا ہے۔ ہمارے ملک کے تقسیم کرنے والے تقسیم کے وقت بھول گئے تھے۔ دوہتر سنگھ کے قدم شیواجی پارک میں نہ جمتے تھے۔ اس کی رگیں مرجھانے لگی تھیں۔ وہ تندرست پہلوان تھا۔ بیمار ہوا تھا۔

دوہتر سنگھ کی زمین اس کے پاس نہ تھی۔ اس کی بیوی لائل پور کے ایک جانگلی مسلمان نے اغوا کر لی تھی۔ اس کی

آنکھوں کے سامنے اور وہ کچھ نہ کر سکا تھا۔ اس کے ماں باپ اس کے سامنے موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ پھر فوج کی مدد پہنچ گئی اور وہ بچ گیا۔ لیکن کرپان اس کے پہلو میں ہر وقت بے چین رہتی تھی۔ محنت کش کسان، ماہیا اور ہیر گانے والا کسان جنسی مشغلہ میں غرق رہنے والا کسان خون کا پیاسا بن گیا تھا۔ اس نے آتے ہی جب دیکھا کہ شیواجی پارک میں مسلمان مزے مزے میں رہتے ہیں تو وہ بھونچکا سا رہ گیا۔ وہ گلی میں سے گزر رہا تھا کہ اس کی نظر ایک پٹھان پر پڑی جو مسلم دستار باندھے اور شلوار پہنے گھر کے باہر کھڑا تھا۔ اسے بلوچی سپاہی یاد آ گئے جنہوں نے اس کے گاؤں پر حملہ کیا تھا۔ اس نے ست سری اکال کا نعرہ بلند کیا اور کرپان نکال کر پٹھان کو وہیں تہ تیغ کر دیا

شیواجی پارک میں ہندو مسلم فساد کی یہ پہلی واردات تھی۔ پولیس تحقیقات کے لئے آئی مگر مجرم کا پتہ نہ چلا۔ اسی رات غنڈوں نے ایک کمیٹی بلائی اور دو ہتر سنگھ کی پیٹھ ٹھونکی گئی اور فیصلہ کیا گیا کہ شیواجی پارک سے مسلمانوں کو ختم کر دیا جائے۔ اس کام کے لئے سردار دو ہتر سنگھ کو سب غنڈوں کا سردار مقرر کیا گیا۔

دوسری رات کو سردار دو ہتر سنگھ نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے کئی مسلمانوں کو قتل کر دیا۔ ان میں کئی ایک خود غنڈے تھے اور اس فساد کے شروع ہونے سے پہلے ہندو غنڈوں کے ساتھ رہ کر شہریوں کو بلیک میل کیا کرتے تھے

امجد نے مرتے مرتے کہا: "ارے زندگی بھر تیرا میرا ساتھ رہا ہے۔ یاد ہے جب ہم نے مل کر سیٹھ دلپت کی بے عزتی کی تھی؟ جب سکروان جی پارسی کو سمندر میں ڈبویا تھا؟ جب ایرانی ہوٹل والے کو لوٹا تھا اور آج تو ہم پر ہی تلوار لے کر چڑھ آیا ہے دوست!"

دھار کرنے پریشان ہو کر کہا: "کیا کروں دوست! مجبوری ہے۔ ہندو دھرم کا معاملہ آن پڑا ہے۔ ورنہ کوئی بات نہیں تھی۔"

"ست سری اکال!" کہہ کر دو ہتر سنگھ نے امجد کا سر اڑا دیا۔

اگلے روز بہت سے مسلمان شیواجی پارک اور اس کے نواحی علاقوں کو خالی کرنے لگے۔ وہی فلیٹ جو دس ہزار پگڑی پر بھی نہ مل سکتے تھے۔ اب دو دو ہزار روپے پر جانے لگے۔ بلکہ کئی لوگ تو یوں ہی خالی کرتے گئے۔ موٹریں جو پندرہ سولہ ہزار مالیت کی ہوں گی۔ پندرہ پندرہ سو لہ سولہ سو میں بکنے لگیں۔ بجلی کے پنکھے، ریڈیو گرام، ہر گراں شے کے دام کوڑی ہو گئے اور یہ سب سردار دو ہتر سنگھ کی بروقت رہنمائی کے طفیل تھا۔ اب گجراتی سیٹھ اسے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کرتے تھے گجراتی سیٹھانیوں نے اس کے گلے میں ہار پہنائے۔ امجد کی خوبصورت مرہٹی بیوی اس نے اپنے ہاں رکھ لی اور اسے امرت چکھا دیا۔ ہر روز شراب کی بوتل اس کے پاس پہنچ جاتی اور سو پچاس روپے بھی۔ اب وہ سیٹھوں کی محفل میں رہتا تھا۔ ان کی موٹروں میں گھومتا تھا اور گلی بازار میں یوں اکڑ کر چلتا تھا جیسے شیواجی پارک کا مالک وہی ہے۔ اب اس کے جسم سے لائل پور کی سوندھی مٹی کی بو نہیں آتی تھی۔ اب اس کے جسم کے ذرے ذرے سے لالچ اور خون کی بو آتی تھی۔ اب اس کی زبان پر ماہیا اور ہیر کے گانے نہیں تھے۔ اب وہ فلموں کے بازاری گیت گاتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہل نہیں تھا خنجر تھا۔ دو ہتر سنگھ مر گیا تھا جو لائل پور کا کسان تھا۔ وہ دو ہتر سنگھ زندہ تھا جسے دو طوفانوں نے جنم دیا تھا۔ اب وہ ہندو دھرم کی عزت کا محافظ تھا اور جن لوگوں نے اس کے ذریعہ فلیٹ حاصل کئے تھے اور موٹریں اور پھر انہیں بازاروں میں ہزاروں کے منافع پر بیچا تھا۔ اس کے قدموں میں بچھے جاتے تھے اور اس کی آؤ بھگت دیوتاؤں کی طرح کرتے تھے

اب یہ طوفان بھی گزر چکا ہے۔ مسلمان شیواجی پارک سے نکال دیئے گئے ہیں۔ کہیں کہیں اکا دکا گھر مسلمانوں کا بچا ہو تو رہ گیا ہو مجھے اس کی خبر نہیں۔ ہاں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ زندگی اب پھر پرانے ڈھرے پر آچلی ہے۔ لوگ باگ پھر راتوں کو گھروں سے سیر کے لئے نکلنے لگے ہیں۔ عورتوں اور بچوں کے قہقہے بھی سنائی دے رہے ہیں۔ سمندر کے کنارے وہی بڑے والے، پھول والے اور ناریل بیچنے والے گھوم رہے ہیں۔ ٹھیلوں پر شمعیں روشن ہیں اور گجراتی سیٹھوں کی قیمتی گاڑیاں زناٹے سے گزر جاتی ہیں اور آدمی انہیں تکتا رہ جاتا ہے۔ دو تہتر سنگھ کی اہمیت ختم ہو چکی ہے۔ اس کے گھر اب شراب کی بوتل پہنچائی نہیں جاتی۔ نہ سو پچاس روپے کی آمدنی ہے۔ کوئی اس کے گلے میں پھولوں کا ہار نہیں پہناتا اسے ہندو دھرم کا رکھشک نہیں بناتا۔ بڑے بڑے سیٹھ جو فساد کے دنوں میں اس کے گلے میں باہیں ڈالے پھرتے تھے اب اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔

دو تہتر سنگھ طوفان کا اکھڑا ہوا پودا ہے۔ ڈول رہا ہے۔ زہر اس کی رگ رگ میں سرایت کر چکا ہے۔ اس کے ساتھی ایک ایک کر کے رخصت ہو چکے ہیں مگر ایک معقول تعداد ابھی باقی ہے۔ کم تنخواہوں والے کلرک، دھوبی۔ نائی۔ کنجڑے۔ ڈرائیور۔ کرخندارپے کا راز زندگی سے ستائے ہوئے لوگ۔ اور غنڈے جنہوں نے کبھی ماں کا دودھ پیا تھا اور آج زندگی کا زہر پیتے ہیں۔ یہ لوگ سوچتے ہیں کہ مسلمان چلے گئے۔ لیکن بیکاری ختم نہیں ہوئی۔ کپڑا نہیں ملتا۔ مکان نہیں ملتا۔ تنخواہ نہیں بڑھتی۔ مسلمان چلے گئے۔ لیکن چیزیں سستی نہیں ہوئیں۔ ہاں امیروں کے پاس موٹریں اسی طرح ہیں۔ ان کے گھروں میں وہی شان و شوکت ہے۔ ان کے کارخانے اسی طرح چلتے ہیں۔

مسلمان چلے گئے۔ بھگا دیئے گئے۔ مار ڈالے گئے۔

لیکن دو تہتر سنگھ بدستور بھوکا ہے

دو چار روز تو اس نے صبر کیا۔ پھر پریشان ہو کر اس نے سیٹھ دلپت کی موٹر روک لی اور اس سے کہا۔

"سیٹھ وہ تمہارے وعدے کدھر گئے؟"

سیٹھ نے خشونت سے کہا: "کیسے وعدے؟"

"وہی میں یہ کر دوں گا۔ وہ کر دوں گا!"

"کیا نہیں کیا میں نے، اور کیا مانگتا ہے؟ یہ لے پانچ روپے"

"پانچ روپے نہیں چاہئیں۔ وہ تیرے آدمی کو جو کرنل اشرف کا فلیٹ دلوایا تھا۔ اس کا کمیشن پانچ سو بنتا ہے۔ وہ دیتا تھا دوں گا۔ ابھی تک نہیں دیا"

"تو مجھ سے کیوں مانگتا ہے؟ راستے میں موٹر روک کے کھڑا ہوتا ہے۔ سالا پولیس میں چالان کرا دوں گا"

"پولیس میں چالان کرا دے گا؟" دو تہتر سنگھ گرجا: "تیری بہن دی ....."

گھوم سے موٹر اس کے ہاتھوں سے نکل گئی اور وہ سڑک پر گر کر مرتے مرتے بچا!

رات کو اس نے سیٹھ دلپت کے آدمی کو قتل کر دیا جس نے اسے پگڑی کا کمیشن نہیں دیا تھا۔ اب مرہٹی سیٹھوں نے اسے گرفتار کرا دیا جنہوں نے بیسوں مسلمانوں کے قتل ہو جانے پر بھی اسے پولس کے ہاتھوں سے بچا لیا تھا۔ جھوٹی گواہیاں دے کر۔ اب وہ ہندو دھرم کا رکھشک نہ رہا تھا۔ شیواجی پارک کے امن کا دشمن تھا۔

اس کے خلاف جو الزام لگائے گئے۔ وہ یہ تھے۔

۱۔ وہ پنجابی تھا

۲۔ وہ پنجابی غنڈہ تھا

۳۔ وہ سکھ تھا

۴۔ وہ سکھ قاتل تھا

۵۔ اس نے ایک مسلمان عورت کے خاوند کو قتل کر کے اُسے اپنے ہاں زبردستی رکھ لیا تھا۔

۶۔ اس نے سیٹھ دلیپت مارواڑی کی موٹر روک لی تھی۔

۷۔ موٹر روک کر اُس نے قتل کی دھمکی دی تھی۔

۸۔ اس نے سیٹھ دلیپت کے پارٹنر کو قتل کر دیا تھا اور اُس فلیٹ میں دوسرے لوگوں کو قتل کرنے جا رہا تھا کہ اُسے پولس نے گرفتار کر لیا۔

۹۔ وہ شیواجی پارک میں جہاں صرف شریف لوگ بستے ہیں۔ ان کے لئے خطرہ تھا۔

ان الزامات کی بنا پر اسے نو دفعہ پھانسی کی سزا ہو سکتی تھی۔ لیکن اُسے صرف ایک دفعہ پھانسی کی سزا ہوئی اور وہ پھانسی پر چڑھا دیا گیا اور اس طرح ددھنتر سنگھ۔ سردار۔ قوم سکھ۔ عمر تیس سال۔ ساکن لائل پور مر گیا۔ تاریخ وفات ۲۰ر اکتوبر ۱۹۴۷ء۔

لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اس سے بہت پہلے مر چکا تھا۔ مار ڈالا گیا تھا۔ سردار ددھنتر سنگھ جو لائل پور کا کسان تھا جس کی عمر تیس سال کی تھی اور وہ جو ماہیا اور ہیر گایا کرتا تھا اور ہر روز اپنے کھیتوں پر کام کرتا تھا جس کے دو بوڑھے ماں باپ تھے۔ ایک نوجوان شرمیلی بیوی تھی اور شریر آنکھوں والے معصوم بچے۔ وہ سردار ۱۵ر اگست کو مار ڈالا گیا۔ یہ قتل باہمی سمجھوتے سے ہوا اور اس کے قاتلوں میں کانگریسی بھی تھے اور لیگی بھی اور ہر وہ ہندوستانی جس نے اپنے آرام کی خاطر پنجاب کی روح کے دو ٹکڑے کر دیئے تھے۔

احمد ندیم قاسمی

# غزل

اگر حضور ابھی مائلِ ظہور نہ تھے
تو تشنگانِ محبت بھی ناصبور نہ تھے

افق کی دھند میں لپٹے ہوئے چراغ سے ہیں
وہ دن جب آپ کے انداز پُرغرور نہ تھے

جزا تو خیر، سزا کے لئے ترستے رہے
غلام آپ کے اتنے تو بے قصور نہ تھے

پسِ نقاب مری بے بسی پہ قہقہہ زن
میں جانتا ہوں کہ تقدیر تھی حضور نہ تھے

رسائی اصل میں ہے انتہائے سرشاری
مسافرانِ محبت تھکن سے چُور نہ تھے

مرے نصیب کو کیوں تابعِ نجوم کیا
اگر نجوم مری دسترس سے دُور نہ تھے

میں مصلحین کا منکر نہیں ندیم، مگر
کسی کے مدِ نظر عشق کے امور نہ تھے

مبارک احمد

# اظہار

زمیں پہ بیٹھ کر کوئی اگر کہے کہ چاند ایک ابروئے خمیدہ کی مثال ہے
تو تو کہے گا دوریٔ نگاہ بھی تو اک سوال ہے۔
بایں دلیل تجھ سے کہہ رہا تھا میں کہ چرخِ نیلی فام سے نگاہ کو ہٹا ذرا
سمٹتی پھیلتی فضائے نیلگوں کے دائرے میں چند روز کے لئے پھسلنا چھوڑ کر
مرے قریب — اس قدر قریب آ
کہ تیرے میرے درمیاں جو بھی رنگ ہے مٹے
تو پھر کہیں تجھے پتہ چلے گا یہ کہ میری آنکھ میں
چمکتا قطرہ بھی نہیں — چمکتی جھیل بھی نہیں — یہ بحر ہے
یہ بحر جس کی ہر مچلتی لہر اک سکون کا پیام ہے
مگر میں پھر بھی ڈرتا ہوں
میں جانتا ہوں بحرِ بے کنار میں کئی جگہ بھنور بھی ہیں
ہر ایک لہر گھومتے بھنور کو دیکھنے کے واسطے اچھل اچھل کے موجِ تند و تیز بنتی جائے گی
ہر ایک موج گھومتے بھنور کو بس میں لانے کے لئے بڑھے گی — مٹتی جائے گی —
— بھنور کے دائرے کو اور بھی بڑھائے گی۔
(بھنور جو آج گھومتا ہے سیلِ رنگِ آب پر)
مگر ابھی سکون ہے
مگر میں پھر بھی ڈرتا ہوں کہ یہ سکوں تلاطمِ نہفتہ کی دلیل ہے
تلاطمِ نہفتہ کے خیال سے فرار چاہتا ہوں میں
لو آج میں نے ایک ڈھنگ سوچ ہی لیا — مگر یہ کیسی اندھی سوچ ہے
میں اپنا ہات آنکھ پر رکھے ہوئے ستادہ ہوں
ہر ایک سمت سوچ کی حدوں سے دور، تیرگی میں گھلا گھرا اک سہانا راز ہے
ہر ایک انگ مست مست، نرم نرم راگنی کا ساز ہے
مگر میں پھر بھی ڈرتا ہوں کہ یہ سکون ساعتی فتیلۂ حیات ہے۔

حیات ؟ — میں غلط سمجھ رہا تھا اتنی دیر سے
حیات اس جگہ کہاں حیات تو
افق کی سرخیوں سے دور، اجنبی دیار میں
دفورِ شوق کے طفیل "قزحِ ایں و آں" کو چھوڑ "ایک رنگ" کا لبادہ اوڑھ کر
کھڑی ہے میرے انتظار میں

تو کیوں نہ میں وہاں چلوں،
مگر جب آگے بڑھنے، رستہ دیکھنے کے واسطے میں اپنا ہات آنکھ سے ہٹاتا ہوں
تو ایک سنگِ جادۂ بحرِ بے کراں کو پاتا ہوں
مگر یہ کیا کہ تو تو اب بھی کہہ رہا ہے "تیری آنکھ میں چمکتے قطرے کی مثال ہے"
تجھے خبر نہیں کہ یہ بھی ایک دوریٔ نگاہ کا سوال ہے
ذرا مرے قریب آ کے دیکھ، میری آنکھ میں
چمکتا قطرہ بھی نہیں، — چمکتی جھیل بھی نہیں، — یہ بحر ہے !

●

## عبدالمجید بھٹی

# برہمن

چھَن، چھَن، چھَن،

چھَن !
چھَن چھَن، چھَن چھَن، چھَن چھَن چھَن !
چھَن چھَن
چھَن !
چھَن — چھَن — چھَن — چھَن !

اے حمید

# منزل منزل

راحیلہ نے کہا تھا میرے متعلق افسانہ مت لکھنا۔ میں بدنام ہو جاؤں گی۔

اس بات کو آج تیسرا سال ہے اور میں نے راحیلہ کے بارے میں کچھ نہیں لکھا اور نہ ہی کبھی لکھوں گا۔ اگرچہ وہ زمانہ جو میں نے اُس کی محبت میں بسر کیا۔ میری زندگی کا سُنہری زمانہ تھا۔ اور اُس کا خیال مجھے ایک ایسے باغ کی یاد دلاتا ہے۔ جہاں سدا بہار درختوں کی پُرسکون چھاؤں میں سپید گلاب کے پھولوں کے جھاڑ مُسکرا رہے ہوں اور جس کی کُھلی اور آزاد روشوں پر خوشحال لوگ محوِ خرام ہوں۔ پھر بھی میں اس باغ کے متعلق کچھ نہیں کہونگا۔ خواہ اس میں راحیلہ کی بدنامی ہو یا نیک نامی —— جب سے راحیلہ جُدا ہوئی ہے۔ میں نے اِس گلاب کے پھولوں اور کُھلی روشوں والے باغ کے دروازے بند کر دیئے ہیں اور راحیلہ کو مجھ سے جُدا ہوئے آج تیسرا سال ہے۔

اس عرصے میں راحیلہ کو میں نے ایک پل کے لئے بھی نہیں دیکھا۔ اور شاید اُس نے بھی مجھے نہ دیکھا ہو۔ ہم —— جو ایک دوسرے کی پل بھر کی جدائی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ زندگی کے تین سال ایک دوسرے سے جُدا رہ کر چُپ چاپ بسر کر گئے ہیں۔ ان تین سالوں پر سے گذر کر پیچھے کی طرف جاتے ہوئے مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں جھڑے ہوئے پتوں والی ایک پژمردہ سڑک پر چل رہا ہوں۔ جو قبرستان میں سے ہو کر گذرتی ہے۔

اُن دنوں میں لاہور کے ایک اخبار کے دفتر میں ملازم تھا۔ گھر چونکہ امرتسر میں تھا۔ لہٰذا شام کی گاڑی واپس اپنے گھر چلا جاتا تھا۔ اگرچہ لاہور میں بڑی آپا کا گھر تھا۔ اور وہ لوگ میری اس ہر صبح سفر ہر شام سفر ایسی زندگی پر مجھے اکثر "بالٹو کلرک" کہا کرتے تھے۔ تاہم جو مزا اپنے گھر میں تھا وہ نہ بلخ میں تھا نہ بخارے میں —— علاوہ ازیں میری عادت کہ میں امرتسری ذکر بندوں کی طرح سال میں چھ مہینے کام کرتا ہوں۔ اور باقی چھ مہینے گھر بیٹھ کر ان دنوں کی کمائی کھاتا ہوں —— ان اطوار کے پیش نظر اپنا گھر چھوڑنا عین حماقت تھی۔

لیکن راحیلہ سے ملنے کے بعد میں نے امرتسر تقریباً چھوڑ دیا۔

آج سے تین سال پہلے موسم گرما کی وہ ایک گرم اور چمکیلی شام تھی۔ میں ابھی ابھی گاڑی سے اُترا تھا۔ مجھے حسبِ معمول بھوک لگ رہی تھی۔ تیز تیز قدم اُٹھاتا پُرشور بازاروں اور دُھندلی گلیوں میں سے گذرتا ہیں گھر کی سمت بڑھ رہا تھا۔ ابھی میں گھر کی سیڑھیوں میں ہی تھا۔ کہ مجھے اوپر بھانجی کی آواز سُنائی دی۔ بھانجی اور میں ہم عمر تھے۔ اور ایک ساتھ کھیلے اور پڑھے ہوئے تھے۔ وہ کافی دنوں کے بعد اپنی نانی کے گھر آئی تھی۔ اور میں اُسے بڑے آرام سے ملنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں سیدھا اپنے کمرے میں گھس گیا۔ کپڑے اُتارے۔ ٹھنڈے پانی سے غسل کیا۔ اور کپڑے بدلنے لگا۔ بھانجی چھوٹے بھائی سے کسی نئی فلم کی ہیروئن کے بارے میں گرما گرم بحث کر رہی تھی۔ اُس کے خیال میں ہیروئن ہیرو سے زیادہ خوبصورت تھی۔ مگر چھوٹا بھائی کہتا تھا کہ ہیروئن کی آنکھیں بھینگی ہونے کے علاوہ اُس کی مونچھیں بھی تھیں۔ اس لئے وہ کسی طرح بھی خوبصورت نہیں کہلائی جا سکتی ——

کپڑے بدل کر میں صحن میں آ گیا۔ بھابی مجھے دیکھتے ہی اچھل پڑی۔ میں بھی تقریباً اچھل پڑا۔ سب قہقہے مار کر ہنسنے لگے۔ وہاں شور مچ گیا جس میں میرے اور بھابی کے قہقہوں کی آواز نمایاں تھی۔ یونہی میری نظر چق کے پیچھے، صحن کے دوسرے آدھے حصے پر پڑی ۔۔۔ بھابی کی نند عظمیٰ بیٹھی ہمارے قہقہوں میں دلچسپی لے رہی تھی۔

"تو گویا آپ بھی ہیں!"

اور میں چق اٹھا تیزی سے اس کے پاس پہنچ گیا۔ عظمیٰ کے ساتھ ایک اور لڑکی بیٹھی تھی۔ جسے میں نے بالکل نہ دیکھا اور جس نے مجھے دیکھ کر جلدی سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ میں ذرا ٹھٹھک گیا۔ اتنے میں بھابی بھی آ گئی۔ اور اس لڑکی کو مجھ سے پردہ کرتے دیکھ کر بول اٹھی۔

"حد ہو گئی! بھلا ماموں سے کیا پردہ۔"

ہاں بھئی، بھلا یہ بھی کوئی پردے کا موقع ہے۔ عظمیٰ نے اس لڑکی کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ اس دوران میں وہ لڑکی شرم سے سکڑی جا رہی تھی۔ اور اس کے کانوں کی لوئیں سرخ ہو رہی تھیں۔ میں عظمیٰ اور بھابی سے باتیں کر رہا تھا۔ باتیں کرتے ہوئے میں نے دو تین بار نظریں بچا کر اس لڑکی کو دیکھا۔ باریک ہونٹ، ستواں ناک، جھالر سی پلکیں اور ہلکا گلابی رنگ۔ چپ چاپ بے زبان بچے کی طرح موم سی ۔۔۔ یہ تھی راجدہ۔

اس سے پہلے میں نے راجدہ کو کہیں اور نہیں دیکھا تھا۔ بھابی نے بتایا وہ عظمیٰ کے سسرال سے ہے۔ اور میں نے سوچا اگر وہ عظمیٰ کے سسرال سے نہ ہوتی تو مجھے کہاں ملتی؟ ویسے راجدہ کا مجھ سے ملنا ناگزیر تھا۔ یہ میں اب سوچتا ہوں۔

شام کے کھانے کے بعد سیر کا پروگرام بن گیا۔ اور ہم سب کمپنی باغ کی طرف چل پڑے۔

باغ ابھی فاصلے پر تھا۔ کہ شام کے ٹھنڈے سائے ماند پڑ گئے اور مرطوب ہوا کے نیم جھونکے ہمارے جسموں سے چھوئے۔ باغ میں داخل ہوتے ہی ہم نے چنبیلی اور مولسری کے پھولوں اور ایسی مٹی کی خوشبو سونگھی جیسے نہر کے پانی سے سیراب کیا گیا ہو اور جہاں سے سارا دن تیز دھوپ میں گرم بخارات اٹھتے رہے ہوں۔ شہر کی نسبت یہاں کی فضا آزاد اور مرطوب تھی۔ گرم ہوا بڑی نرمی سے چل رہی تھی گھنے درختوں کی گہری سبز شاخیں بے معلوم انداز میں ہل رہی تھیں۔ سڑک پر چھڑکاؤ کیا ہوا تھا اور بجلی کے پرانے کھمبوں کی زرد روشنی میں وہاں سے نظر نہ آنے والی بھاپ سی خارج ہو رہی تھی۔ لیمپوں پر پتنگے آ رہے تھے۔ اور عورتیں برقعوں سے پریشان ہو رہی تھیں۔ بیڈ منٹن کلب کے دروازے پر پہنچ کر انہوں نے اپنے برقعے اس پھرتی سے اتارے جیسے ان میں خطرناک بیماریوں کے جراثیم پیدا ہو گئے ہوں اور لپک کر کلب میں داخل ہو گئیں۔ اندر چاروں طرف پردہ ہی پردہ تھا۔ اور کلب کا کہیں نشان تک نہیں تھا۔ مگر اس نے معمولی سے خطے کے عین وسط میں آم کا درخت تھا جس کے پاؤں میں ایک دو شکستہ بنچ پڑے تھے اور دوسری طرف دو پینگیں لٹک رہی تھیں۔ عورتوں کو یہاں صرف دو چیزیں کھینچ لاتی تھیں۔ پہلی چیز کلب کی پینگیں اور دوسری برقعے سے نجات۔

میں کلب کے باہر، بوڑھے پہریدار کے مصلے پر بیٹھ گیا اور اس سے وضو کے فوائد اور نماز کی برکتوں پر لیکچر سنتا رہا۔ وہ تسبیح پھیرتے ہوئے باتیں کر رہا تھا۔ اور میں بڑی توجہ سے اسے تک رہا تھا۔ دراصل میں اسے نہیں بلکہ ان دو ٹوٹے ہوئے سپید بٹنوں اور پھڑپھڑاتی شلواروں کو تک رہا تھا۔ جو بوڑھے کی گردن کے پیچھے سے مجھے جھاڑیوں کے عقب میں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔

کافی دیر بعد بھابھی، عظمیٰ، راجدہ، اماں اور چھوٹی بہنیں اور بچے باہر نکلے۔ اُن سب کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ اور اُن کے جسموں سے گرم گرم پسینے کی تیز بُو اٹھ رہی تھی۔ پردہ کلب سے ذرا آگے جا کر سپید گنبد والا ریڈیو اچانک شروع ہو گیا اور نورجہاں کی تیز آواز سارے کمپنی باغ میں پھیل گئی۔

سے۔۔۔۔ آ رات جا رہی ہے۔۔۔۔

ہم لوگ گنبد کے دائیں طرف والے تختے پلاٹ میں داخل ہو گئے۔ جہاں سُرخ اینٹوں والی چمکیلی روشوں پر سُرخ اور زرد گلاب کے پھولوں کی بیلیں سایہ کئے ہوئے تھیں اور نیچے پلاٹ میں پانی دیا ہوا تھا۔ میں عظمیٰ اور اماں ایک سنگین نشست پر بیٹھ گئے۔ اور نورجہاں کا گانا سننے لگے۔ یہ جگہ ایک لمبے اور گنجان درخت کی اوٹ میں تھی۔ اور قریب ہی جھاڑیوں میں جگنو چمک رہے تھے۔ اماں بڑے غور سے گانا سن رہی تھی۔

"یہ بی بی نورجہاں ہے، اماں نے عظمیٰ سے کہا۔ جس نے شاید ہی کوئی بد صورت کا زنانہ شو چھوڑا تھا۔

دوسرے لوگ پلاٹ کی روشوں پر آزادی اور مسرت کے ساتھ دوڑ رہے تھے۔ اُن کی ایک دوسرے کو پکارنے کی آوازیں باغ کی گرم اور کھلی فضا میں گونج رہی تھیں۔

راجدہ دیکھ کر چلنا کہیں کانٹا نہ چبھ جائے، یہ آواز بھابھی کی تھی۔

میں نے پہلو بچا کر دیکھا۔ راجدہ دونوں ہاتھوں سے ساٹن کی سفید شلوار کے پائنچے اُٹھائے پلاٹ کے پانی میں چل رہی تھی۔

"ادی ــــــ پانی بڑا ٹھنڈا ہے۔ تم بھی آ جاؤ، میں بھی آ جاؤں؟ مگر کیسے؟ ــــــ لیکن راجدہ نے بھابھی کو بلایا تھا۔ جو تھوڑی دیر بعد پانی میں اُتر گئی اور بچوں نے بھی بڑوں کا ساتھ دیا۔ پانی گدلا تھا اور اس کی سطح پر جا بجا زرد زرد گھاس اور سوکھی ٹہنیوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ اور جو بچوں کے گھٹنوں تک آتا تھا۔ بچے ہاتھوں سے پانی کے چھینٹے اُڑاتے، شور مچاتے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ ان میں میری چھوٹی بہنیں بھی تھیں اور چھوٹے بھائی بھی ــــــ بھابھی راجدہ کو چھونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور راجدہ ایک تتلی کی مانند پھرتی سے بھاگتی ہوتی کبھی ایک پودے کا چکر لگاتی اور کبھی لپک کر دوسری طرف نکل جاتی میرا دل بھی پانی میں اُترنے کو چاہا۔ مگر امی کو دیکھتے ہوئے ہمت نہ پڑی۔ آخر میں نے عظمیٰ سے کہا۔

بھابھی بھلا تم کیوں بیٹھی ہو۔ چلو پانی میں،

نا بابا میرے پائنچوں کی کلف اُتر جائے گی۔ اور میں ایک ہی شلوار ساتھ لائی ہوں'۔

جب یہ لوگ تھک گئے تو شلواریں قمیضیں جھاڑتے پانی سے باہر نکل آئے۔ بچوں نے تو سارے کپڑے پانی میں بھگو ڈالے تھے راجدہ کے بال کھل گئے تھے جنہیں وہ لاپروائی سے پیچھے ڈالے ہوئے تھی۔ اُس کی پیشانی اور مونچھوں والی جگہ پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے سڑک والے لیمپ کی روشنی میں جھلملا رہے تھے۔ اتفاق سے میں راجدہ کے قریب کھڑا تھا۔ اور راجدہ نے کئی بار مجھے ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے اُسے گلہ ہو کہ میں عظمیٰ کے پاس کیوں بیٹھا رہا اور پانی میں کیوں نہیں اُترا۔ جب وہ سینڈل کے تسمے باندھنے کے لئے جھکی تو ساکت فضا میں نرم ہوا کی لہریں سی پیدا ہوئیں اور میں نے راجدہ کے پسینے میں ملی ہوئی حنا کی گرم اور خوشگوار خوشبو سونگھی۔

جب ہم باغ سے نکلے تو ہوا بڑے پیارے انداز میں چلنے لگی۔

سڑک کے کنارے والے درختوں کی خاموش گپھاؤں میں بے معلوم سرگوشیاں سی ہونے لگیں۔
گرمیوں کی رات کے گہرے نیلے آسمان پر ستاروں کے چمکیلے پھول جابجا کھلے ہوئے تھے۔ اور کمپنی باغ جہاں سے بڑیوں کی آواز ابھی تک آرہی تھی ہمارے پیچھے رہ گیا تھا۔ عظمی اور امّاں ہٹ کے آگے تھیں۔ راجدہ اور بھابی اُن کے پیچھے اور میں ذرا پرے ہٹ کر بچوں کو مٹے چل رہا تھا۔ راجدہ قدرے اونچی آواز میں بھابی سے ہمکلام تھی۔
'سچ میں تو ایسی راتیں باغوں ہی میں گذارنا چاہتی ہوں۔ بس پائنچے اُٹھائے پانی میں گھومتی پھرتی رہوں۔ اور جب تھک جاؤں تو گلاب کی پھولوں بھری بیلوں کے سائے میں ٹھنڈے بنچ پر سو جاؤں ۔۔۔۔۔۔
خدا کی قسم گرمیوں میں گھروں اور گلیوں میں میرا دل بہت گھبراتا ہے ۔۔۔۔ وہ بڑی بے باکی سے اپنی خواہشات کا اظہار کر رہی تھی۔ اور میں اس سوچ میں تھا۔ کہ یہ وہی راجدہ ہے۔ جو عظمی کے ساتھ چق کی اوٹ میں بیٹھی تھی۔ اور جس نے مجھے دیکھ کر پردہ کر لیا تھا

دوسرے دن شام کے وقت پھر سیر کی تیاری ہونے لگی۔ اُس روز میرا پروگرام راجدہ کو کرسٹل میں آئس کریم کھلانے کا تھا چنانچہ صبح ہی کو میں نے اپنی ایک ڈکشنری بیچ ڈالی تھی۔ جس کے عوض مجھے چھ روپے بارہ آنے ملے تھے۔ یہ رقم چھ سات لوگوں کو آئس کریم کھلانے کے لئے کافی تھی۔ سیر کے بعد میں اُن سبھوں کو کرسٹل میں لے آیا۔ کرسٹل کے ایک کیبن میں سوائے میرے اور چھوٹے بھائی کے باقی سب لوگ بیٹھ گئے۔ ہم کرسٹل کے ہال کمرے میں بیٹھ گئے۔ جہاں میں بیٹھا تھا۔ وہاں سے مجھے راجدہ کی شکل اچھی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ وہی باریک ہونٹ۔ خوبصورت ستواں ناک، لمبی پلکوں کے پُرسکون سایوں والی آنکھیں جو بڑی نرمی اور محبت سے ایک منظر سے دوسرے منظر کی طرف گھومنے کی عادی تھیں۔ ماتھے کے اوپر سر کے سیاہ بالوں کی اُبھری ہوئی دو پہاڑیاں اور اُن کے درمیان میں بہتی ہوئی مانگ کی دودھیا نہر ۔۔۔۔ کرسٹل کے لیڈیز کیبن کے شیشوں میں سے راجدہ نے پہلی مرتبہ مجھے ہمدردی اور محبت کی پاک اور بے لوث نظروں سے دیکھا۔ اور میرے دل میں اُس کی عزت اور توقیر اور بڑھ گئی۔ جیسے اُس نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہو۔
راجدہ کی نظریں طلوع ہوتے ہوئے سورج کی اولین نرم اور پاکیزہ کرنیں تھیں۔ جو نیند میں شرابور پھولوں کے لئے پیغامِ بیداری لیکر آتی ہیں۔
کرسٹل سے نکل کر ہم لوگ گھر کی طرف جا رہے تھے۔ ایک جگہ بازار میں اندھیرا سا تھا اور لوگ نسبتاً کم آجا رہے تھے راجدہ نے نقاب اُٹھا کر پیچھے مڑ کر مجھے دیکھا۔ سیاہ نقاب میں اس کا صندلی خوبصورت چہرہ ۔۔۔۔ جیسے رات کی تاریکی میں کسی خانقاہ کا کھلا اور روشن طاق۔ جہاں موم بتیاں جل رہی ہوں۔ (دراصل راجدہ کو پہلی بار دیکھنے پر جو خیال سب سے پہلے میرے ذہن میں آیا تھا۔ وہ محض ایک موم بتی کا خیال تھا۔ موم بتی ۔۔۔ خاموش اور بے زبان) میرے ساتھ چونکہ بچے بھی تھے چنانچہ لازمی طور پر سب سے پیچھے تھا۔ راجدہ بھی ہوتے ہوتے پیچھے آ گئی۔ قریب پہنچکر اُس نے بچوں کو تیز تیز چلنے کو کہا۔ اور مجھے دیکھکر بولی
' آپ بھی پیچھے ہیں کیا؟ اور اتنا کہکر جلدی سے آگے نکل گئی۔ میں اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔
اُس رات خواب میں راجدہ کو میں تمام رات کمپنی باغ کی سیر کراتا رہا۔ اور کرسٹل میں آئس کریم کھلاتا رہا۔
دوسرے دن ۔۔۔۔ دوپہر کے کھانے کے بعد کیرم بورڈ کھیلتے ہوئے سینما کا پروگرام بن گیا۔
فلم تھی 'مرد کی جیت' جو مجھے بیحد پسند تھی۔ اور میں چاہتا تھا کہ راجدہ بھی اسے دیکھے۔ دعوت بھی میں نے ہی دے ڈالی۔

اور پھر اس سوچ میں پڑ گیا کہ ٹکٹوں کے لئے پیسے کہاں سے آئیں گے۔ الف لیلیٰ، قصہ حاتم طائی با تصویر، اور محبت بھرے خطوط، بہشتی زیور، اور جنت کی کنجی، بیچنے گیا مگر کسی دوکاندار نے یہ کتابیں نہ خریدیں—— امی سے کچھ روپے اُدھار مانگے۔ لیکن اُس نے صاف انکار کر دیا۔ کیونکہ اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ تنخواہ ملنے کے بعد میں دو تین دن تک امرتسر نہیں آیا کرتا——
نہ معلوم راجدہ میری اس ذہنی پریشانی کو کس طرح بھانپ گئی۔ چنانچہ اُس نے اعلان کر دیا۔ کہ فلم ہم بھی دیکھیں گے مگر اس شرط پر کہ ٹکٹیں اپنی اپنی لینی پڑیں گی۔ اس پر میں نے بڑی مخالفت کی۔ دل میں ڈرتے ہوئے کہ کہیں میری مخالفت کامیاب ہو گئی تو پھر کیا ہوگا۔ مگر خیریت گذری کہ راجدہ کی سکیم بالاتفاق رائے پاس ہو گئی۔ اور سینما کی تیاریاں ہونے لگیں۔ نہایا گیا کپڑے بدلے گئے۔ جوتے پالش ہوئے۔ امی نے پان کے گلوں سے ڈبیا بھر لی۔ بھابھی نے حنا کی ساری شیشی اپنے کپڑوں پر انڈیل لی۔ اور اُس کی تیز خوشبو سے دماغ چکرانے لگے۔ ایک طرف راجدہ بال بنا رہی تھی۔ عظمیٰ نے استری گرم کر رکھی تھی۔ اور تین چار رومال آگے ڈالے انہیں نم کر رہی تھی۔ میں نے کہا۔
بھابی تم نے اچھا کیا۔ جو تین چار رومال رکھ لئے۔ فلم میں کئی بار آنسو نکل آتے ہیں، عظمیٰ بھابی مسکرانے لگی۔ اور راجدہ نے بھابھی کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔
"ہمیں رونا نہیں آتا" اور میں بے اختیار کہہ اُٹھا۔
"خدا نہ کرے کہ رونا آئے"—— اور عظمیٰ نے زیرِ لب ہنس کر پوچھا۔
"راجدہ کا بڑا خیال ہے، راجدہ شرم سے ڈوب سی گئی۔ میں خود بات کر کے پشیمان ہو رہا تھا۔ بھابھی نے پلٹ کر عظمیٰ کی طرف دیکھا۔ جو رومال استری کر رہی تھی اور جس کے ہونٹوں پر اُس کی ناک سے بھی زیادہ تیکھی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ اور ہنس کر بدستور سوٹ کیس میں سے کچھ نکالنے لگی۔
—— سینما ہال میں انٹرول کے وقت میں نے عظمیٰ سے فلم کے بارے میں اُس کی رائے پوچھی۔ جس پر وہ شرما سی گئی۔ شاید اُسے ستارہ ٹوٹنے والے استعارے کا خیال آ گیا تھا۔ جس کے فوراً ہی بعد انٹرول ہو جاتا ہے۔ راجدہ اور بھابھی، امی کے دائیں بائیں بیٹھی تھیں۔ اور اُس سے پان لے کر کھا رہی تھیں۔ میں اُٹھا اور پان خریدنے کے لئے باہر بازار میں آ گیا۔ پان میں نے علیحدہ علیحدہ بندھوائے۔ اس طرح مجھے یقین تھا۔ کہ راجدہ کو بھی میں خود پان پیش کر سکوں گا۔ پان لئے جب میں ہال میں داخل ہوا تو فلم شروع ہو چکی تھی۔ اندھیرے اور فلم کی ہلکی روشنی میں مجھے ان لوگوں کے صرف سر ہی دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے ایک ایک کر کے سب کو پان پیش کر دئیے اور جب راجدہ کی باری آئی۔ تو میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا——
اُف توبہ!—— اُس کا ہاتھ کس قدر سرد ہو رہا تھا۔ جیسے میں نے برف سے لدے ہوئے گلاب کے پھولوں پر ہاتھ رکھ لیا ہو۔ اس کے ہاتھ میں اُس کے حصے کا پان ویسے ہی پڑا تھا۔ اور میں اُس کے دل کی تیز دھڑکن اچھی طرح محسوس کر رہا تھا میں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ اور باقی وقت ہال میں بیٹھا۔ راجدہ کے ہاتھ کی نرمی اور سردی کو اپنے جسم میں پھیلتے محسوس کرتا رہا۔
فلم ختم ہو گئی اور ہم گھر آ گئے۔
رات بھر راجدہ کے ہاتھ کا سرد لمس مجھ پر دھندلے بادل کے ٹکڑے کی مانند سایہ فگن رہا۔ اور میں نے اُسی کے خیال میں رات گذار دی۔
صبح اتوار تھی—— دوپہر کے وقت بھابھی نے ڈھولک بجانے کا پروگرام پیش کر دیا۔ جیسے بچوں اور چھوٹی بہنوں نے

ہاتھوں ہاتھ لے لیا —— تھوڑے ہی وقفے کے بعد کہیں سے کسی ہولے تیز اور گھمک دار ڈھولک بھی آگئی اور نیچے اُٹھتے بیٹھتے ہاتھ مارنے اور بے سُری الاپنے لگے۔ بالآخر بھابی آگے بڑھی اور ڈھولک ایک اچھی تال پر دھمکنے لگی۔ وہ تھوڑی منٹ لگاتار خالی ڈھولک ہی دھمکتی رہی۔ اور کسی کے گانے کی آواز نہ آئی۔ بھابی تھم گئی اور جھینک کر بولی۔

'بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی — گاتیں کیوں نہیں؟

راجدہ نے شرما کر منہ پھیر لیا اور بھابی علی ہنسنے لگی۔ اور بھابی کو غصہ آگیا۔ اس کا گورا گورا منہ لال ہوگیا۔ اور بھنویں سکڑ سی گئیں۔ اُس نے ایک ہاتھ زور سے ڈھولک پر مارا اور گانا شروع کر دیا۔

ع اساں گڈی تے ڈھولک اے

آ دھی آہیں وہیا آیا — گڈ گاں کھڑکی اے۔

اُس نے ڈھولک کی تھاپ کے درمیان ہی تیز آواز میں کہا۔

"بھئی یہ بڑی بُری بات ہے" گاؤ نا سب، آخر یہ منگوائی کس لئے ہے؟

چنانچہ بھابی علی نے منہ پکا بنا کر گلا صاف کیا اور بول اُٹھا لئے۔ اُس کی آواز نرم اور لوچدار تھی۔

ع چیا جھرمٹ بدلاں دا

رو دواں راتاں دینہہ — اے وچھوڑا سجناں دا۔

اب راجدہ کی باری آئی۔ اُس نے گردن نیچی کرلی۔ علی اور بھابی اور نیچے ہنسنے لگے۔ اتنے میں ایک نرم اور نکھری ہوئی آواز ڈھولک کی تھاپ کے ساتھ اوپر اُٹھی۔ شعلے کی طرح بے چین۔ مضطرب اور زخم خوردہ ——

ع دو پتر اناراں دے

ساڈا دُکھ سُن سُن کے —— رُوندے پتھر پہاڑاں دے

اور میرے ذہن میں ایک تصویر کھنچ گئی۔ جیسے کہ نہ صیا جل کے گھنے اور تاریک جنگلات میں موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ اور تیز رفتار پہاڑی نالے نشیب کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ لیکن یہ تصویر کچھ غلط تھی۔

پھر ایک اور تصویر سامنے آئی۔ سادہ مگر سوگوار سی۔ جیسے شام کا گیت۔

سنسان پہاڑیوں پر رم جھم رم جھم۔ مدھم بارش کی غمگین موسیقی اور اِدھر اُدھر پتھروں کو سیاہ اور چکنی سطح پر سے رُک رُک کر ٹھہر ٹھہر کر پھسلتے ہوئے بارش کے موتی —— پتھروں کے آنسو ——

ع روندے پتھر پہاڑاں دے . . . . .

ڈھولک تھم گئی۔ شعلہ بجھ گیا۔ مگر سنسان اور گمنام پہاڑوں کے آنسو رُک رُک کر ٹھہر ٹھہر کر بدستور گر رہے تھے - - - اور میں اُن سے پوچھنا چاہتا تھا۔ تم کس کی یاد میں آنسو بہا رہے ہو؟

میں راجدہ سے پوچھنا چاہتا تھا۔ راجدہ تمہیں وہ کون دُکھ ہے جسے سُن کر پہاڑ بھی رونے لگے؟

میں راجدہ سے پوچھنے کے لئے آگے بڑھا اور راجدہ امرتسر کے سٹیشن پر پلیٹ فارم نمبر ۲ پر بھابی اور علی کے ہمراہ لاہور جانے والی گاڑی میں سوار ہوگئی۔ اس کی آنکھیں سوگوار سی تھیں۔ گھنی پلکوں کی پُرسکون چھاؤں میں کہیں کہیں مدھم اداس دھوپ کی چمک تھی۔ گاڑی چل پڑی۔ پلیٹ فارم پیچھے اور گاڑی آگے کھسکنے لگی۔ راجدہ نے آخری بار مجھے دیکھا

اُس کی نگاہیں کہہ رہی تھیں۔ ہمارے گھر ضرور آنا۔

گاڑی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی اور میں سٹیشن پہ ادھر اُدھر پھرتا رہا۔ مجھے واپس گھر جاتے ہوئے ایک قسم کی جھجک سی محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے وہ میرا گھر نہ ہو۔

---

سٹیشن سے نکل کر میں سیدھا کرشل چلا آیا اور کافی دیر وہاں بیٹھا رہا۔ جب شام ہوگئی تو میں اُٹھا اور گھر کی طرف چل پڑا۔ گلی اور بازار میں کافی رونق تھی۔ پر مجھے ہر شے اجنبی اور بے محل سی لگ رہی تھی۔ گھر پہنچ کر میں نے کسی سے بات نہ کی اور کھانا کھا کر خاموشی سے لیٹ گیا۔ صبح اُٹھا اور لاری پر لاہور چلا آیا۔

لاہور پہنچتے ہی مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں کئی سال سمندر پار بسر کرنے کے بعد پہلی مرتبہ اپنے وطن میں داخل ہو رہا ہوں۔ سڑکوں پہ لوگوں کے چہرے بڑے مہربان اور مانوس معلوم ہو رہے تھے۔ جیسے اُن کے دل میری دوستی اور ہمدردی سے لبریز ہوں۔ دفتر سے نکل کر میں نے کئی بار راجدہ کے گھر جانے کا ارادہ کیا۔ مگر یہ خیال کہ اتنی جلدی وہاں چلے جانا مناسب نہیں۔ ہر بار مجھے روک دیتا۔

ایک روز بڑی آپا کو لاہور اچانک کوئی کام پڑ گیا۔ وہ میرے ساتھ لاہور آئیں اور میں اُنہیں راجدہ کے گھر لے گیا۔ میں راجدہ کے گھر پہلی مرتبہ داخل ہو رہا تھا۔ وہ گھر — جو بعد ازاں میرے دل پہ اپنا گہرا اثر چھوڑ گیا — عظمیٰ اور راجدہ ہمیں مکان کی ڈیوڑھی میں ہی مل گئیں۔ وہ دونوں ایک بڑھیا سے جانے کیا خرید رہی تھیں۔ مجھے اور آپا کو اچانک اپنے بالمقابل دیکھ کر وہ سب کچھ بھول گئیں اور حیرت اور خوشی سے اُن کے چھوٹے سے لب کھلے کے کھلے رہ گئے۔ راجدہ کے بال کھلے تھے۔ شاید وہ نہانے کی تیاری میں تھی۔ وہ ہم دونوں کو جلدی سے اوپر لے گئیں اور ہم درمیانی منزل میں پہنچ کر بیٹھ گئے۔ بھائی عظمیٰ نے پنکھا چھوڑ دیا۔

یہ کمرہ ہر قسم کے گھریلو سامان سے بھرا ہوا تھا۔ ایک طرف شیشوں کی قد آدم الماریوں میں چینی کے برتن سجے تھے۔ دوسری طرف لمبے چوڑے خوبصورت پلنگ پر ریشمی تکیے اور دسوتی کی سفید چادر پڑی تھی۔ نعمت خانے کے قریب میز پر ریڈیو رکھا ہوا تھا۔ آدھے فرش پر مٹیالے رنگ کا ایرانی قالین بچھا تھا۔ سنگھار میز کے گول آئینے پر جالی دار ریشمی پردہ لٹک رہا تھا۔ ایک طرف کوٹی اور پاؤڈر اور پیرس کی شام کی مختلف سائز کی شیشیاں پڑی تھیں۔ کارنس پر دونوں طرف پتلی اور لمبی گردن والے پھولدانوں میں گلاب کے پھول مسکرا رہے تھے۔ قریب ہی ایک چمکیلا سگریٹ کیس اور ماچس اور کچھ کتابیں پڑی تھیں۔ کارنس کے اوپر خوبصورت فریم میں سجی ہوئی ایک رنگین تصویر لٹک رہی تھی۔ یہ قدیم ایرانی تمدن کا ایک منظر تھا۔ شہر کا محراب دار پرانا دروازہ — اس میں سے نکلتے اور داخل ہوتے لمبے چغوں اور عماموں والے لوگ — دروازے کی بائیں سمت جالی دار جھروکوں والے مکانوں کے پیچھے اوپر کو اُٹھتے ہوئے مسجد کے دودھیا مینار اور اُن کے عقب میں نیلے آسمان پر سفید کبوتروں کی ٹولیاں — مجھے یہ تصویر بے حد اچھی لگی۔ راجدہ اندر داخل ہوئی۔ اُس نے جلدی سے ایک تپائی ہمارے آگے رکھی اور باہر نکل گئی۔

پھر عظمیٰ آئی۔ اُس کے چھوٹے چھوٹے خوبصورت ہاتھوں میں اخروٹ کی لکڑی کا ایک ٹرے تھا۔ جس میں جھاگ دار وشوے لبالب بھرے ہوئے دو گلاس رکھے ہوئے تھے۔ آپا نے کہا۔ آخر اس تکلف کی کیا ضرورت تھی، مگر میں خاموشی

سے دہشو پینے لگا۔ کیونکہ مجھے سخت پیاس لگ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد راجدہ کی ادھیڑ عمر، پتلی دبلی بے زبان سی ماں اور دوسری بھابی اختر بھی آگئی۔ وہ آتے ہی خندہ پیشانی سے ملیں۔ اور آپا کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں۔ اُن کی باتیں لاہور کی گرمی، پیراشوٹ کی کلیوں، ریل کی دقتوں اور نیم عدوی کے نت نئے نمونوں کے متعلق تھیں جن سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ پھر بھی اُن کی آوازیں مجھے بڑی خوشگوار محسوس ہو رہی تھیں۔ راجدہ بھی ایک طرف بیٹھی گفتگو میں شامل تھی۔ اس وقت اُس گھر کی ہر چیز، دیاسلائی کی ڈبیا سے لیکر راجدہ کے کھلے بالوں تک، مجھے اپنی محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے یہ گھر میرا ہو۔ اس گھر میں میں نے پہلی مرتبہ کھلے آسمان اور چمکیلی دھوپ کو دیکھا ہو۔ اور اسی ایرانی قالین پر میں نے گھٹنوں کے بل چلنا سیکھا ہو اور اسی گھر کے باہر نیم روشن ٹھنڈی گلیوں میں جا کر بچوں کی منڈلیوں میں میں نے اپنا بچپن گذارا ہو۔ یہ اجنبی اور مہربان خیال مجھے راجدہ کے اور قریب لے گیا۔

پھر راجدہ کے دونوں بھائی آگئے۔ ہمیں شکور اور دوست نواز —— میں اُن سے پہلے مل چکا تھا اور ہم دیوان خانہ میں چلے آئے۔ یہ لمبا اور کھلا کمرہ اوپر کی نسبت زیادہ سرد اور پرسکون تھا۔ یہاں سوائے ایک بڑی الماری، زمین پر بچھی ہوئی دری اور میز کے علاوہ تین چار آرام کرسیوں اور آتشدان کی کارنس پر رکھی ہوئی قائد اعظم کی رنگین تصویر کے کچھ نہ تھا۔ مجھے اس کمرے کی سادگی اور خنکی بے حد تسکین بخش محسوس ہوئی۔ ہم دوپہر تک وہاں بیٹھے۔ نئی فلموں کے گانوں، تاش کے کھیلوں اور لیگ پارٹی کی خدمات پر باتیں کرتے اور سگریٹ پیتے رہے۔ اس دوران میں مجھے اوپر سے راجدہ کے تیز اور بیباک قہقہوں کی صدائیں متعدد بار سنائی دیں۔ ساڑھے بارہ بجے دوپہر کی مجلس کا گجر بجا۔ تو ہم اوپر چلے گئے۔ راجدہ خود ریڈیو لگا رہی تھی۔ پہلا ریکارڈ شروع ہوا۔

''ساجن کاہے گھیر لئے۔ . . . .

اور راجدہ نے کنکھیوں سے پل بھر کے لئے مجھے دیکھا۔ اور مجھے سونا ہال والی وہ رات یاد آگئی۔ جب پان پیش کرتے وقت میں نے اُس کا نرم اور سرد ہاتھ اپنے ہاتھ سے دبا دیا تھا۔ گانے کا دھیما، درد بھرا سُر اس کمرے کی پرسکون اور خوشبوؤں بھری فضا میں تیر رہی تھیں۔ اور راجدہ سب کی نظریں بچا کر میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اُس کی نگاہوں میں چاندنی کی نرم خنکی اور بہار کی اداس صبح کا اُجلا پن تھا۔ اس کمرے میں بیٹھے بیٹھے مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں اکھڑ اور اُجڈ لوگوں سے بھری ہوئی کسی پرشور ریل گاڑی سے نکل کر نرم دل گارڈ کے ڈبے میں آن بیٹھا ہوں۔ اور میں شام تک گارڈ کے ڈبے میں بیٹھا رہا۔ اور اگر آپا چلنے کو تیار نہ ہوتیں۔ تو شاید میں تمام عمر اس ڈبے میں بیٹھا سفر کرتا رہتا۔۔ سٹیشن پر سٹیشن گذرتے جاتے۔ منزلوں پر منزلیں آتیں اور میرا سٹیشن کبھی نہ آتا۔ میری منزل کبھی نہ آتی . . . . .

آپا برقعہ پہننے لگیں۔ مجھے بھی کوٹ پہننا پڑا۔ جب ہم چلنے لگے۔ تو راجدہ نے پوچھا۔

پھر کب آئیں گے آپ؟ اور آپا نے کہا۔

اب آپ لوگوں کو آنا چاہیئے۔ لیکن اُن لوگوں میں سے کوئی نہ آیا۔ اور تیسرے دن میں خود راجدہ کے گھر چلا گیا

ـــــ وہ شام نہایت خوشگوار تھی۔ بارش ابھی ابھی رکی تھی۔ اور آسمان ابھی تک ابر آلود تھا۔ مکانات اور سڑکیں دھلی ہوئی تھیں۔ اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بازاروں اور گلیوں میں لہرا رہے تھے۔ ٹھیک یاد نہیں غالباً

ستمبر کا آخر تھا۔

راجدہ کا بھائی گلی کے موڑ پر ہی مل گیا۔ گھر پہنچ کر ہم دیوان خانے میں بیٹھ گئے۔ شہزادہ عظمیٰ بھی وہاں آگئیں۔ اور تھوڑی ہی دیر بعد راجدہ بھی نیچے آکر ہمارے قریب بڑی الماری میں سے کچھ ڈھونڈھنے لگی۔ پھر چائے آگئی۔ چائے کی سبز پھولدار پیالیاں ہاتھوں میں تھامے ہم لوگ گرمجوشی سے باتیں کر رہے تھے۔ کہ باہر ڈیوڑھی میں سائیکل کھڑا کرنے کی آواز آئی۔ سب ایک دم چپ ہو گئے۔ راجدہ کا بھائی زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا "چچا آ رہے ہیں"۔

اور پھر دروازہ کھلا اور ایک چچا نمودار ہوا جس نے نیکر پہنی تھی اور جس کے گندمی چہرے کی کھال کرخت اور کھچی ہوئی سی تھی۔ ایک ہاتھ سے مہندی لگا سر جھاڑتا ہوا ہمارے قریب آکر رک گیا۔ میرا تعارف کروایا گیا۔ مگر اس نے میری طرف سرسری انداز میں دیکھا۔ اور بڑی بے نیازی کے ساتھ میری کرسی کے عقب سے ہو کر ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ جیب سے پاسنگ شو کا سگرٹ نکال کر اس نے سلگایا اور منہ سے دھوئیں کا غبار سا چھوڑتے ہوئے بولا۔

آج قیدِ آدم کی تقریر ہو رہی ہے۔

پہلے تو میں لفظ قاعدِ آدم پر بالکل حیران نہ ہوا۔ کیونکہ اس روز واقعی منٹو پارک میں قیدِ آدم کی تقریر ہو رہی تھی۔ لیکن جب بعد میں چچا صاحب کی کارگیری کا احساس ہوا تو میں بمشکل اپنی ہنسی روک سکا۔

ہاں ہو رہی ہے۔ تم بھی چلو گے چچا؟ راجدہ کے بھائی نے کہا۔

پہلے تو چچا آنکھیں ملتا اور جھپکاتا رہا۔ پھر پاسنگ شو کا لمبا کش لگا کر بولا۔

بھئی چلیں گے ضرور مگر شطرنج بھی ہمارے ساتھ جائے گی۔

حد ہو گئی چچا وہاں شطرنج کا کیا کام؟ اور چچا پاسنگ شو کی راکھ جھاڑ کر بولا۔ میاں ــــ جب تقریر سنتے سنتے تھک جائیں گے تو پھر کیا کریں گے۔ اتنے بھرے مجمع میں سے اٹھ کر چل پڑنا بھی تو مناسب نہ ہو گا۔ اور اگر شطرنج بھی پاس ہی ہو گی تو کیا کہنے ہیں پھر ــــ قاعدِ آدم خواہ ساری رات تقریر کرتا رہے۔

اس کے بعد وہ اٹھا اور سر جھاڑتا ہوا باہر نکل گیا۔

راجدہ کے بھائی نے مجھے بتایا کہ چچا کو شطرنج سے حقیقی عشق ہے اور وہ اکثر یاروں کی ٹولی میں گلی کے کونے پر بیٹھا کمیٹی کے لیمپ کی روشنی میں رات رات بھر شطرنج کھیلتا رہتا ہے۔ اور کچھ دیر تک میں راجدہ کے گھر میں بیٹھا، راجدہ کے خیال سے بے خبر اس کے چچا کی دلچسپ شخصیت کے متعلق سوچتا رہا۔ اور جب میں راجدہ کے گھر سے نکل کر گلی میں سے نکل رہا تھا تو مجھے اس کا چچا ایک خالی دوکان میں دکھائی دیا۔ اس کے آگے شطرنج کی بساط پر مہرے بکھرے ہوئے تھے اور وہ ایک ہاتھ سے ٹھوڑی پکڑے اور دوسرا ہاتھ صدری کی جیب میں ٹھونسے مہروں پر جھکا ہوا تھا۔ جیسے وہ خیال ہی خیال میں کسی غیبی آدمی سے بازی لگائے ہوئے ہو۔

دو تین ہفتے گذر گئے اور میں راجدہ کے ہاں نہ جا سکا۔ ایک دن دوپہر کے وقت میں اپنے دیوانخانے میں بیٹھا چند نئی تصاویر کو البم میں لگا رہا تھا کہ ڈاکیے نے راجدہ کا خط چق اٹھا کر اندر پھینکا۔ یہ خط بڑی آپا کو لکھا گیا تھا۔ لیکن اس میں ایک علیحدہ رقعہ میرے نام بھی تھا۔ راجدہ کی طرف سے میرے نام یہ اس کا پہلا خط تھا۔ جیسے

میں نے کئی بار پڑھا اور جس کے مختصر اور پرمحبت الفاظ بہت جلد مجھے ازبر ہو گئے۔ راجدہ نے جواب کے لئے اپنی کسی سہیلی کا پتہ لکھا تھا۔ میں نے اسی وقت قلم اور کاغذات لئے اور ایک لمبا چوڑا خط راجدہ کو لکھ ڈالا۔ تیسرے ہی روز میرے خط کا جواب بھی آ گیا۔ میں نے اسی وقت ایک اور خط لکھ ڈالا۔ جس کا جواب بھی تیسرے روز مجھے مل گیا۔ میرے لئے یہ کام راجدہ کو ملنے سے بھی زیادہ دلچسپ اور رومانوی تھا چنانچہ میں نے قصداً راجدہ کے ہاں جانا بند کر دیا۔ اب اس کے خطوط میں خطرناک حد تک پہنچی ہوئی بیقراری اور بے چینی کا اظہار ہوتا تھا۔ ایک خط میں لکھا آیا "میں بیمار ہوں"۔

اب میرے لئے مزید رکنا محال تھا۔ دوسرے ہی روز میں راجدہ کے ہاں چلا گیا۔ میں بیٹھا اختر اور عطی سے باتیں کر رہا تھا۔ دراصل راجدہ بیمار نہیں تھی۔ یہ محض مجھے بلانے کے لئے ایک چال چلی گئی تھی جس میں اختر بھی شامل تھی۔ البتہ میں راجدہ سے بالکل نہ بولا۔ پہلے پہل تو وہ میری اس ناراضگی کو مذاق سمجھتے ہوئے مجھے بات بات پر چھیڑتی اور مذاق کرتی رہی لیکن جب میری خاموشی لحظہ بہ لحظہ گہری ہوتی گئی تو وہ پریشان سی نظر آنے لگی۔ باہر گلی میں دو لڑکوں کے درمیان کچھ جھگڑا سا کھڑا ہو گیا۔ اور عطی اور اختر جلدی سے کھڑکیوں کی طرف بھاگ اٹھیں۔ کیونکہ ایک لڑکے نے دوسرے کو بڑی پیچھے دھکا دے ڈالی تھی۔ راجدہ موقع پا کر میرے قریب آ گئی۔

کیا ہو گیا ہے؟

میں خاموش رہا۔

"کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معافی مانگتی ہوں"

"کچھ بھی نہیں ہوا"—— میں نے گریگری پیک کے انداز میں کہا۔ وہ فلم نوابستہ میں انگرڈ برگمین کو اسی انداز میں کہتا ہے۔ یہ فلم میں نے اسی روز ریگل میں دیکھی تھی۔ راجدہ اگر انگرڈ برگمین ہوتی تو یقیناً خاص انداز میں لمبی اور گداز بانہیں میرے گلے میں ڈال دیتی اور گریگری پیک کی ساری خفگی رفوچکر ہو جاتی۔ مگر اس بیچاری کو برگمین کے منانے کے انداز کی کیا خبر تھی۔ وہ کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے الٹا زیادہ پریشان ہو گئی۔ گلی والا جھگڑا ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ اور عطی اور اختر اندر آ رہی تھیں۔

"بڑی بدمعاش ہے یہ" اختر نے عطی سے کہا۔ اور اس نے ہاں میں ہاں ملا دی۔ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئیں۔ راجدہ اٹھی اور اوپر چلی گئی۔ میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ وہاں اور بیٹھا رہا۔ لیکن راجدہ بالکل نیچے نہ اتری۔ عطی آرام کرسی پر نیم دراز تقریباً سو رہی تھی۔ اختر کروشیا کاڑھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ راجدہ ناراض کیوں ہے؟ اس نے کہا۔ خود ہی پوچھ لو۔ اوپر ہو گی، اور مسکرانے لگی۔ میں ایک لفظ کہے بغیر اوپر چلا گیا۔

راجدہ دوسری منزل میں پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا منہ دیوار کی طرف تھا۔ میں نے قریب جا کر اسے پکارا! کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"راجدہ میں یہاں نہ آیا کروں؟" میں نے محسوس کیا کہ راجدہ کا جسم ہچکولے ہوئے ہل رہا تھا۔

"اگر تم یہی چاہتی ہو تو خدا کی قسم میں پیا آپ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تم سے چھپا لوں گا" راجدہ خاموش رہی۔ میں نے کندھے سے پکڑ کر اس کا منہ اپنی طرف کر لیا۔ راجدہ رو رہی تھی۔ گھنی پلکوں کی خنک چھاؤں میں بارش کی جھڑی لگ رہی تھی۔ رم جھم رم جھم—— اور سیاہ پتھروں کی چکنی سلوں پر سے پانی کے شفاف قطرے رک رک کر پھسل

رہے تھے۔ ـــ سوہندے ٹھکر مہیاراں دے

چند لمحات کے لئے ہم خاموش نگاہوں سے ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ بے زبان اور مسحور ـــ جیسے ہمیں جادو کی چھڑی چھو گئی ہو۔ راجدہ کے آنسو نہیں تھمتے تھے۔ میں نے آہستہ سے راجدہ کی گرم پیشانی پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑوں گا راجدہ، زندگی کے ہر قدم میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔ وعدہ کرتا ہوں۔

اور جلدی سے اُٹھ کر نیچے چلا آیا۔ پچھلے کمرے میں عقیلہ بدستور چھوٹا سا منہ کھولے سو رہی تھی۔ اور اختر گردونیا کا دھرا ہی تھی۔ اُس نے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھ کر پوچھا۔

’پوچھ آئے کیا؟‘

’بچاری بہت بے حال ہے!‘ میں نے سگریٹ کیس جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

’چلئے؟‘ اختر نے آنکھیں اُٹھا کر پوچھا۔

’ہاں ـــ‘ گلی میں سے گزرتے ہوئے میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ تو راجدہ کھڑکی میں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ لیکن اُس کی آنکھیں بدستور سوجی ہوئی تھیں۔

ـــ راجدہ کے گھر میں داخل ہو کر ایرانی قالین پر نیم دراز ـــ محبت اور تسکین سے پُر لمحات کے درمیان، کارنس کے اوپر ٹنگی ہوئی مشرقی تمدن کی تصویر کو گھورتے ہوئے میں نے کئی بار شیراز کے چمکتے ہوئے نیم روشن بازاروں، در سرسبز شاداب باغوں اور پُراسرار قہوہ خانوں کی سیر کی ـــ قہوہ خانے، جہاں ایران، مصر اور شام کی زہرہ جمال دوشیزائیں سوڈانی دف بجاتے ہوئے محوِ رقص تھیں، اور ہرے بھرے باغات کا پُرسکون سلسلہ جہاں نازک و خوبصورت روشوں کے اِدھر اُدھر بجا دلکش فوارے چاندی ایسا پانی اُگل رہے تھے۔ اور جہاں شیریں میووں لدے پھندے درخت تھے۔ اور جن کے عقب میں نیلے افق پر شیراز کی مسجدوں اور خانقاہوں کے دودھیا گنبد ـــ

تنہائی اور خاموشی کے یہی وہ لمحات ہوا کرتے جب مجھے ہر اندھیرے کی تہہ میں سے روشنی کے ننھے منے تارے چھوٹتے دکھائی دیتے۔ اور مجھے کئی بار یوں دکھائی پڑتا جیسے کوئی غیر مرئی شے روشنی کا دیا لئے تاریکی کے خوفناک سمندر کو چیرتی سربفلک لہروں میں کبھی ڈوبتی، کبھی اُبھرتی آہستہ آہستہ، قدم بقدم میری طرف بڑھ رہی ہو ـــ

تنہائی روشنی ہے ـــ اور راجدہ کے تصور میں ڈوب کر میں اس روشنی سے کئی بار چندھیا کر رہ گیا۔ راجدہ کا خیال مجھے سب سے الگ ہو جانے پر مجبور کر دیتا تھا۔ اور سب سے الگ ہو کر میں کئی بار راجدہ کے خیال سے بھی آگے نکل گیا تھا۔ راجدہ کا تصور تو ایک پُل کے تھا۔ جو خاموشی اور تنہائی کی اتھاہ خلیج پر پھیلا ہوا تھا۔ اور جسے عبور کرنے پر میں اپنے تئیں ایک انوکھی، روشن اور اَن دیکھی دنیا میں پاتا تھا۔ جہاں سوائے چمکیلے افق، دودھیا گنبدوں اور اُبھر اُبھر کر ڈوبتی ہوئی لمبی لمبی سوگوار تانوں کے اور کچھ بھی نہ تھا ـــ سلسلہ در سلسلہ، وجدانی تاثرات میں ڈوبے ہوئے نورانی لمحات کے منتشر ٹکڑے تھے۔ جن کا راجدہ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اور جنہیں میں راجدہ سے الگ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

نومبر ختم ہو رہا تھا۔ رات کو اچھی خنکی ہو گئی تھی۔ اور دن کو لوگ دھوپ اور چھاؤں کے سنگم پر چلتے تھے۔ ایک شام دفتر سے گھر لوٹتے ہوئے دل غیر معمولی طور پر اداس تھا۔ ایک تو راجدہ کو دیکھے ہفتہ ہو چلا تھا۔ اور دوسرے کچھ فضا کا بھی

اتر تھا۔ اپنی گلی میں پہنچتے ہی مجھے یونہی خیال آیا۔ اگر گھر راجدہ بیٹھی ہوئی ہو تو؟ ——— تو پھر! ——— یکایک میں نے تھپک ماری تھی۔ اور میں ہنسنے لگا۔ مگر گھر پہنچ کر جب راجدہ کو دیکھا تو میرا دل اچھل کر میرے منہ کے قریب آگیا کیا یہ چھپک ماری گئی تھی یا زمانے میری دعا قبول کی تھی یا راجدہ کی محبت نے مجھے گلی میں ایسا سوچنے پر مجبور کیا تھا؟

راجدہ باورچی خانے میں امی اور آپا کے درمیان بیٹھی تھی۔ اس کی پیشانی پر سونے کا چھوٹا سا جھومر لیمپ اور جلتی ہوئی آگ کی روشنی میں جھلمل جھلمل کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کا چہرہ کھل سا گیا۔ جیسے دھند سے آسماں کا کوئی چھوٹا سا ٹکڑا اچانک سورج کے سامنے آگیا ہو۔ اس نے شرما کر سر جھکا لیا۔ اور میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ گھر میں راجدہ کے ساتھ آیا ہوا کوئی محافظ دکھائی نہ دیتا تھا۔

"تم اکیلے کیسے آگئیں؟"

"وہ اکیلی تو نہیں آئی، بڑی آپا نے کہا۔ خالہ کے لڑکے کے ساتھ اپنی خالہ سے ملنے آئی تھی اور۔۔۔۔۔"

راجدہ نے آپا کا جملہ کاٹتے ہوئے کہا۔

"۔۔۔۔ اور میں نے سوچا آپا اور امی کو بھی مل آؤں" ——— کس قدر شیریں تھا اس کا لہجہ ——— جیسے میٹھے پھلوں سے لدی ہوئی ڈالیوں پر بارش کے پہلے قطرے گر رہے ہوں۔

گلی میں ایک جگہ اس رات قوالی تھی۔ جس جگہ یہ محفل منعقد ہونی تھی۔ اس کے عین اوپر آپا کی ایک سہیلی کا مکان تھا۔ بچے اور چھوٹی بہن تو سرشام ہی اس مکان میں پہنچ چکی تھیں۔ امی اور آپا وغیرہ میرے کھانے کا انتظار کر رہی تھیں۔ کھانے کے بعد میں نے سیر کی تجویز پیش کر دی۔ آپا اور امی نے کہا بھئی ہم تو نہیں جائیں گے تم دونوں ہو آؤ ——— راجدہ بخوشی تیار ہو گئی۔

جب ہم دونوں نیچے اترنے لگے تو امی بولیں۔

"ذرا جلدی پلٹنا، راجدہ کو قوالی بھی سننا ہے،"

راجدہ اور میں ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس پڑے۔ فکر نہ کرو امی ——— ہم ابھی آئے۔

نیم روشن گلیوں اور بارونق بازاروں کو خاموشی سے عبور کرنے پر جب ہم کمپنی باغ والی سڑک پر آگئے تو میں نے راجدہ سے پوچھا۔

"یہ خالہ زاد بھائی کون ہے؟"

"بڑا پیارا لڑکا ہے جی ——— اسے ہماری محبت کا علم ہے۔ اس کی بھی ایسی ہی شادی ہوئی ہے۔ وہ دونوں ہماری طرح ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ دونوں نے شادی تک بڑے بڑے دکھ اٹھائے ہیں۔ اسی لئے تو وہ مجھے خود یہاں تک چھوڑنے آیا تھا۔ شاید پرسوں مجھے لینے پھر آئے۔ اور ان کی بیوی تو اس سے بھی زیادہ پیاری اور درد مند ہے۔"

"راجدہ! مجھے یقین نہیں آرہا۔ کہ ہم اکیلے سیر کرنے جا رہے ہیں۔ کاش کمپنی باغ کبھی نہ آئے۔"

اور راجدہ ہنس پڑی۔

"کمپنی باغ نہیں آئے گا۔ تو پھر ہم سیر کہاں کریں گے؟"

اور کمپنی باغ آ گیا۔ جب ہم اُس پلاٹ کے قریب سے گذرے جہاں سُرخ روشوں پر گلابی اور سندوری رنگ کے گلاب کے پھولوں کی بیلیں اپنا پُرسکوں سایہ کئے تھیں۔ تو راجدہ بولی۔

"وہ شام یاد ہے نا!"

"ہاں راجدہ، وہ شام مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ وہ ہماری محبت کی اولین شام تھی۔ اور اُس کا نقش بڑا گہرا اور دیرپا ہے۔ اُسی شام ہماری محبت نے اِن رنگ برنگ پھولوں اور پتّوں کے درمیان اپنی آنکھیں کھولی تھیں اِس مرطوب سبزہ زار میں ——— اور اسی جگہ میں نے پہلی مرتبہ تمہارے گرم پسینے کی خوشگوار بُو سونگھی تھی۔ جس میں حنا کی خوشبو بھی شامل تھی۔

"آہ"، راجدہ نے مُنہ سکیڑ کر کہا۔ "کیسی باتیں کرتے ہو۔"

تم نہیں جانتیں راجدہ! یہ میری اپنی باتیں ہیں۔ تم محض سُنتی جاؤ۔ تمہیں کیا خبر میری محبت بیک وقت کہاں کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ اور کہاں جا کر ختم ہوتی ہے۔ یہ بہار کے پھولوں کی مانند مجھے اپنے جسم کے ذرّے ذرّے سے پھوٹتی معلوم ہو رہی ہے۔ اور میں نہیں جانتا ان پھولوں کا انجام کیا ہو گا؟

راجدہ خاموشی سے میری باتیں سُنتی گئی۔ ہم ایک ایسی سڑک پر سے گذر رہے تھے۔ جس کی دونوں طرف جامن کے سایہ دار درخت تھے۔ اور بجلی کے لیمپ کافی جگہ چھوڑ کر لگائے ہوئے تھے۔ چلتے ہوئے کبھی ہم اندھیرے میں گھر جاتے اور کبھی روشنی میں نکل آتے۔ ہوا کے نرم جھونکے ہمارے قریب سے کبھی رات کی رانی اور کبھی چنبیلی اور گلاب کی خوشبوئیں گذر جاتے اب فضا میں خنکی بڑھنے لگی تھی۔

"راجدہ سردی تو نہیں لگ رہی؟"

بالکل نہیں ——— آج تو میرے ہاتھ بھی گرم ہیں۔

یہ محبت کی گرمی ہے راجدہ، میں نے اُس کے نرم اور نیم گرم ہاتھ دبا کر کہا۔ اور راجدہ مُسکرانے لگی۔

ہم پھر اندھیرے کی غاروں سے گذر رہے تھے۔ مگر راجدہ کے سُنہری جھومر کی چمک یہاں اور تیز ہو گئی تھی۔ میں نے سگریٹ سُلگایا اور ایک کلب گھر کے قریب سے گذرتے ہوئے ہمیں مردوں کے قہقہوں اور بلیرڈ کی چھڑی کے گیند سے ٹکرانے کی آوازیں سُنائی دیں۔

کلب والے ریڈیو پر آ دو کے بعد انگریزی میں خبریں سُنائی جا رہی تھیں اور پلاٹ کے بنچوں پر بیٹھے ہوئے لوگ اُٹھنا شروع ہو گئے تھے۔ بہار کی چمکیلی رات کے گہرے نیلے آسمان پر ستاروں کے کافوری فانوس جا بجا روشن تھے۔ ایک طرف سات ستاروں کی ٹولی سفیدے کے چھریرے درختوں پر سے جھانک رہی تھی۔ شبنم آلود گھاس پر سے گذر کر ہم اپنے پسندیدہ پلاٹ کے وسط میں آ کر بیٹھ گئے۔ یہ جگہ پلاٹ کی عام سطح سے نیچی تھی۔ اور حوض کی مانند بنی ہوئی تھی۔ ہمارے دائیں بائیں نصف دائرے کی شکل میں پھولوں بھرے پودوں کی کیاریاں تھیں۔ جن میں قرمزی اشیم گلابی، گہرے زرد اور برف جیسے سفید اور کاسنی رنگوں کے چھوٹے چھوٹے بے شمار پھول اوس میں بھیگے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی نہر کی طرف سے کناروں پر اُگی ہوئی بھنگ کی تیز اور مرطوب بُو بھی آ جاتی تھی۔ سامنے والے باغ میں آڑو اور آلوچے کے درخت۔ قطار اندر قطار، سفید شگوفوں سے لدے ہوئے تھے۔ کلب گھروں کے روشندانوں

میں سے مندمند روشنی جھانک رہی تھی۔ دفعتاً نہر والے درختوں کے عقب میں مدھم روشنی کا غبار سا اٹھا جو لمحہ بہ لمحہ پھیلتا گیا۔ اور تھوڑی ہی دیر بعد درختوں کے اوپر زرد چاند کا پژمردہ چہرہ نمودار ہو گیا ——— اس کی سوگوار چمک میں باغ کی ہر شے افسردہ اور ملول سی نظر آنے لگی۔ ادھر اُدھر پھلدار باغات کے ذخیروں میں پرندوں کی پیاری پیاری آوازیں بلند ہونے لگیں۔ جیسے وہ چاند کے استقبال کا گیت گا رہے ہوں۔ ساجدہ سیاہ برقعہ میں اپنا آپ لپیٹے مرمریں بنچ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اور اس کا سر میرے زانو پر تھا۔ اور میری انگلیاں اس کے سنہری گھونگھر سے کھیل رہی تھیں۔ جو صندلی چاندنی میں، شام کے ستارے کی مانند کبھی نیلی اور کبھی سُرخ چمک دے رہا تھا۔ راجدہ نے میری طرف آنکھیں اٹھا کر کہا۔

"مجھے ڈر لگتا ہے۔" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"مجھ سے؟"

"ہاں ——— کہیں تم مجھ سے محبت کرنا چھوڑ تو نہیں دو گے؟"

"کبھی نہیں راجدہ۔"

"سچ ——— میں اُس وقت مر جاؤں گی۔"

"ہاں ——— کبھی نہیں، کبھی نہیں راجدہ،" اور میں نے شام کے ستارے کو چوم لیا۔ اور پھر راجدہ کے نرم بالوں سے کھیلتے کھیلتے، راجدہ سے بے خبر، میں اپنی تنہائی اور خاموشیوں کے ڈرنگے سمندروں کی نچلی تہوں میں اُتر گیا۔ اور وہاں میں نے سیاہ پتھروں کی درزوں میں ایسے انمول موتیوں کی ڈھیریاں دیکھیں جو دنیا کی کسی کان میں نہ تھے۔ اور چکیلی بیلوں پر جھومتے ہوئے ایسے پھول دیکھے۔ جو دنیا کے کسی باغ میں نہ تھے۔

ہم پلاٹ سے نکل کر سڑک پر آئے تو ہال دروازے والی گھڑی نے رات کے گیارہ کا گجر بجایا۔ اب ٹھنڈی ہوا سارے باغ میں چل رہی تھی۔ اور چاند کافی اوپر آ گیا تھا۔ ہمارے سامنے سڑکوں پر دُور تک درختوں کے جھومتے ہوئے سایوں کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا۔ ہمارے کپڑے اوس میں نم آلود تھے۔ راجدہ کا سیاہ نقاب ہوا میں لہرا رہا تھا اور وہ خود یوں چل رہی تھی جیسے ابھی ابھی ہلکی شراب کا ایک پیگ لگا کر اٹھی ہو۔

جس وقت ہم اپنی گلی میں پہنچے تو قوالی ہو رہی تھی۔

راجدہ کو بڑی آپا اور امی کے پاس پہنچا دینے کے بعد میں نے سگریٹ سلگایا اور اپنے دوستوں کی ٹولی میں جا بیٹھا ابھی میں پہلا ہی کش لگا رہا تھا۔ کہ خوبصورت قوال نے مجھے نیم وا نگاہوں سے دیکھ کر مصرعہ اٹھایا۔

؎ سہانی رات تھی اور پُرسکون زمانہ تھا۔

معاً مجھے محسوس ہوا۔ کہ وہ میری اور راجدہ کی ملاقات کا حال بیان کرنے لگا ہے۔ جیسے وہ ابھی کہے گا سہانی رات تھی۔ اور پُرسکون زمانہ تھا۔ اور راجدہ اپنا سر اپنے محبوب کے زانو پر رکھے کمپنی باغ کے پلاٹ میں لیٹی ہوئی تھی۔ وہ دونوں ابھی ابھی کمپنی باغ سے واپس آئے ہیں۔ راجدہ اوپر چلی گئی ہے اور اس کا محبوب وہ سامنے بیٹھا سگریٹ پی رہا ہے ——— میں گھبرا سا گیا۔ — مگر خیریت گزری دوسرا مصرعہ کچھ اور تھا۔

———

صبح نہایت روشن اور شاندار تھی۔ نیلے اور پُرنور آسمان پر سپید سپید کبوتروں کی ٹولیاں چکر لگا رہی ہیں۔ راجدہ دیر تک سوتی رہی۔ اس دوران میں، میں صبح کی سیر سے واپس آچکا تھا اور میرے ہاتھ میں اصلی گلاب کے شبنم آلود سُرخ پھول تھے جن سے بڑی فرحت بخش شیریں خوشبو اُٹھ رہی تھی۔ میں دبے پاؤں راجدہ کی طرف گیا۔ وہ گرم چادر میں مُنہ سر لپیٹے بے سُدھ پڑی تھی۔ میں نے آہستہ سے چادر کھسکائی اور پھول اُس کے مُنہ پر ڈال دیئے۔ اور تیزی سے باہر آگیا۔۔۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھولوں کا گلدستہ پکڑے۔ نیند میں شرابور نیم وا آنکھیں لئے، رومال سے مُنہ پر پڑی ہوئی شبنم پونچھتی باورچیخانے میں داخل ہوئی۔ جیسے وہ بہار کی دیوی ہو اور اپنے عہدِ محبت کی نشانی لئے خیابانوں سے رخصت ہو رہی ہو۔

"پھولوں کی شہزادی" چھوٹے بھائی نے کہا۔ وہ پچھلے روز اسی نام کی ایک کتاب اسکول سے لایا تھا۔

امی، بڑی آپا اور چھوٹی بہنیں ہنس پڑیں۔ اور چھوٹا بھائی اور راجدہ شرما گئے۔ باورچی خانہ چونکہ کافی کھلا اور روشن تھا۔ اور موسمِ سرما کی بھی آمد آمد تھی۔ چنانچہ صبح کی چائے یہیں اُڑا کرتی تھی۔

سبھی خواہ کچھ کہیں، میں تو راجدہ کو اپنے پاس ہی لے آؤں گی۔ امی نے راجدہ کے پیالے میں ملائی ڈالتے ہوئے کہا۔

راجدہ نے سر جھکا لیا۔ آپا بولیں۔

کیوں نہیں، اور اس سے زیادہ اچھی بھابی ہمیں کہاں ملے گی؟ اور راجدہ نے شرما کر دونوں ہاتھوں سے مُنہ ڈھانپ لیا۔ اس کی خوبصورت مخروطی انگلیوں میں سُنہری انگوٹھیوں کے سفید نگینے آگ کی روشنی میں دمک اُٹھے اور پھر جیسے باورچی خانہ یکدم سرد حریم میں بدل گیا۔ اور ایک نیم روشن خوشبوؤں بھرے کمرے میں سیج پر چنبیلی اور زنبق کے بے شمار پھول بکھر گئے۔ دُلہن کا عروسی جوڑا پہنے، سُنہری جھومر پیشانی پر لگائے، سولہ سنگار سے آراستہ ہو کر سیج پر چھوئی موئی سی بیٹھ گئی۔ اور میں سیج کے قریب آیا۔ اور راجدہ نے جلدی سے اپنا چہرہ ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ اور اس کی حنائی بھگوئی ہوئی مخروطی انگلیوں میں انگوٹھیوں کے نگینے ستاروں کی مانند دمکنے لگے اور امی نے کہا۔

بس یہ کہیں ٹک کر بھی کام کرے۔ امی کا یہ جملہ ساکن جھیل میں پھینکا ہوا پتھر تھا۔ جو میرے سُنہری خواب کی لہروں کو ٹکڑے کر گیا۔ اور میں پھر باورچی خانے میں تھا۔ امی میری پیالی میں چائے ڈال رہی تھی۔

دوپہر کے کھانے کے بعد، میں، راجدہ اور بڑی آپا دیوانخانے میں بیٹھے تھے۔ آپا گلی والی کھڑکی کے چق کے قریب بیٹھی سویٹر بن رہی تھی۔ اور راجدہ میز کے قریب آرام کرسی پر نیم دراز نغمۂ حرم پڑھ رہی تھی۔ میں سگریٹ لگائے کبھی کچھ لکھ رہا تھا۔ اور کبھی راجدہ کے چہرے کو تکنے لگتا تھا۔ جہاں اختر شیرانی کی نظموں کا مطالعہ ایک دلفریب حُسن پیدا کر رہا تھا۔ بڑی آپا بولیں۔

چلو راجدہ ۔۔۔ فہمیدہ سے مل آئیں،

فہمیدہ بڑی آپا کی گہری سہیلی تھی۔ اُن کا مکان گلی ہی میں تھا۔ اور اُس نے راجدہ کو آکر مل جانے کا پیغام بھی بھیجا تھا۔ راجدہ تیار ہو گئی اور میں نے قلم میز پر رکھ دیا۔

جلدی لوٹ آؤں گی، راجدہ نے برقعہ پہنتے ہوئے کہا۔ میں نے دراز میں سے موم بتی نکالی اور اسے روشن کر کے میز پر لگا دیا۔ اسے بجھنے مت دینا، راجدہ ہنس پڑی۔

یہ تو آدھی بھی ختم نہ ہو گی۔ کہ میں آجاؤں گی۔ اور وہ روشن موم بتی کو دیکھ کر جس تیزی سے آپا کے ہمراہ چل اٹھا بیٹھی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا۔ گویا وہ فہمیدہ کے مکان کو ہاتھ لگا کر واپس آجائے گی۔ اور مجھے اپنے بچپن کا زمانہ یاد آگیا جب بڑی آپا مجھے بازار سے کوئی شے خرید کر لانے کے لئے بھیجتی تھیں تو وہ زمین پر تھوک کر کہتی۔

"دیکھتی ہوں یہ پہلے سوکھتی ہے کہ تم پہلے آتے ہو۔"

اور میں لپک کر دکاندار کے پاس پہنچتا۔ جلدی جلدی سودا خریدتا اور گھر میں داخل ہو کر سب سے پہلے تھوک کو دیکھتا وہ ابھی سوکھا تو نہیں مگر حالانکہ بڑی آپا تھوک کو بالکل بھول گئی ہوتی تھی۔

میز کے کنارے پر لگی ہوئی موم بتی لمحہ بلمحہ پگھل رہی تھی۔ گرم موم کے ننھے ننھے شفاف قطرے دلہن کے آنسوؤں کی مانند بہہ رہے تھے۔ سگریٹ سلگائے میں بڑے انہماک سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ میرا سگریٹ بھی موم بتی کے ساتھ ہی سلگ رہا تھا۔ سگریٹ میں سے نیلے دھوئیں کی پتلی دبلی لکیر اُٹھ رہی تھی۔ اور موم بتی سے ننھا سا شعلہ ــــــ ایک کے پاس دھواں اور راکھ تھی اور دوسرے کے پاس روشنی اور آنسو ــ ــ ــ وہ بتی قریب الختم تھی۔ میں بڑا مضطرب اور پریشان تھا۔ جیسے اگر موم بتی بجھ گئی تو پھر ماجدہ کبھی میرے پاس نہ آئے گی۔ اور میں اُس کے رخساروں کے گلابی تم کبھی نہ دیکھ سکوں گا۔

موم بتی کا زرد شعلہ بھڑکا اور ڈوب سا گیا جس طرح میدانِ جنگ میں ڈھلتی دھوپ کی سُرخی میں کسی سپاہی کے بلند ہوتے ہوئے نیزے کی انی ایک دفعہ چمک کر بجھ جانے اور موم بتی بجھ گئی اور ماجدہ نہ آئی۔ میں نے سگریٹ کی گردن راکھدان میں مسل کر پرانی موم بتی کی لاش پر نئی موم بتی روشن کی اور سگریٹ سلگا کر بیٹھا رہا۔ــــ تھوڑی دیر بعد گلی والے دروازے کی چق اٹھی اور ماجدہ جلدی سے اندر داخل ہوئی۔ اُس کا سانس تیز تیز چل رہا تھا۔ جیسے وہ بھاگتی ہوئی آرہی ہو۔

"ابھی نہیں بجھی؟ دیکھا میں کتنی جلدی آگئی"!

میں نے ماجدہ کو ایک لمحہ کے لئے دیکھا اور چپکے سے سر جھکا لیا۔ وہ برقعے کے بٹن کھولتی ہوئی میری طرف بڑھی

چُپ کیوں ہو گئے؟

کچھ نہیں ــــــ یہ دوسری موم بتی ہے، پہلی بجھ گئی تھی،

"تو اپنی موم بتی کے پیسے لے لو،،

یہ اُس نے کچھ ایسے پیارے انداز میں کہا کہ ہم اپنی اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکے۔

"سچ بڑے اچھے لوگ ہیں وہ ــــــ مجھے اٹھنے ہی نہ دیتے تھے۔ بڑی مشکل سے بھاگ کر آئی ہوں۔

آپا کہنے لگی ہیں ذرا دیر بعد آؤں گی۔ میں نے کہا بھئی۔ میں تو چلتی ہوں' ــــــ

اس دوران میں ماجدہ نقاب ایک طرف رکھ کر کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

موم بتی کی نرم روشنی میں اُس کے چہرے کے نقوش بڑی خوبصورتی سے اُجاگر ہو رہے تھے۔ اُس کا چہرہ سنہری جلد والی ایک کتاب تھا۔ جو محبت بھرے روشن اور مقدس اشعار سے لبریز ہو۔

موم بتی کی دھیمی روشنی میں ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ہماری آوازیں ایک دوسری سے ہم آہنگ تھیں۔

اُن لہروں کی مانند جو پُراسرار چاندنی میں بڑی خاموشی سے پُرسکون ساحلوں کی طرف سمٹ رہی ہوں۔
ایک ہی چشمے سے نکلتی ہوئی دو ندیاں، جو پہاڑی کی مرطوب ڈھلان میں بہا کر آپس میں مل کر بہنے لگی ہوں۔ ایک ہی ڈالی کے دو شگوفے، جو ایک ساتھ کھلیں اور جنہیں ایک ساتھ مُرجھا کر جھڑ جانا ہوں۔
ہم الفاظ کی موسیقی سے کھیل رہے تھے۔ جس طرح موسم بہار میں کم سن بچے پھولوں سے کھیلتے ہیں۔ راجدہ کے چہرے کے گرد روشنی کا پُرنور ہالہ سا تھا اور مجھے یوں معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے راجدہ آگ کا ایک زرّیں شعلہ ہے جو شام کے وقت کسی کھلے میدان کے وسط میں روشن ہو۔
جب ہم خاموش ہو جاتے تو ہمیں اپنے کہے سنے الفاظ دیوان خانے کی نیم روشن فضا میں جگنوؤں کی مانند رہ رہ کر چمکتے دکھائی دیتے۔ پھر ہماری گفتگو خاموش اور بے زبان گفتگو میں بدل جاتی۔ ہم ایک دوسرے سے درختوں، پھولوں، ستاروں اور آبشاروں کی زبان میں باتیں کرتے۔
یہ گہرے جنگلات اور تاریک راتوں کی گفتگو تھی۔ جو دن نکلنے پر اپنے پیچھے روشنی اور شبنم کے آنسو چھوڑ جاتی ہے
پھر دن نکل آیا اور راجدہ لاہور چلی گئی۔

لاہور پہنچنے کے بعد راجدہ مجھے برابر خط لکھتی رہی۔
جنوری کا آخیر تھا۔ کہ راجدہ کا ایک خط آیا۔

میرے پردیسی۔ ۔ ۔ ۔ معاف کرنا میں تمہارے خط کا جواب دیر سے لکھ رہی ہوں۔ میرا چچا زاد بھائی سعید برما سے اچانک واپس آ گیا ہے۔ اور گھر میں چونکہ رشتہ داروں کی آمد و رفت ہے۔ اس لئے اتنی فرصت نہ مل سکی کہ تمہیں اطمینان سے بیٹھ کر خط لکھتی۔ سچ مجھے بڑا افسوس ہے پتہ نہیں تم کیا خیال کرتے ہوگے . . . . .
راجدہ کا اندازہ درست تھا۔ سعید کے بارے میں مجھے طرح طرح کے غیر خوشگوار خیالات نے گھیر رکھا تھا اگرچہ اُس کے متعلق میں اتنا ہی جانتا تھا۔ کہ وہ راجدہ کا چچا زاد بھائی ہے اور تین سال سے برما میں ہے۔ پھر بھی میرے کان میں اتنی بھنک ضرور پڑ چکی تھی کہ سعید کی مرحوم ماں راجدہ کو اپنے بیٹے کے لئے مانگ چکی ہے۔ اب مجھے بار بار سعید کا خیال آتا اور ہر بار مجھے یہی محسوس ہوتا جیسے کوئی آن دیکھا ہاتھ بڑی خاموشی سے میرے دل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے خیال ہی خیال میں کئی دفعہ راجدہ کو سعید کے پاس بیٹھے ہنس ہنس کر باتیں کرتے دیکھا۔
اور ایک ہفتہ بعد جب میں راجدہ کے ہاں گیا۔ تو راجدہ تولیہ اور صابن دانی پکڑے سعید کا منہ دھلا رہی تھی مجھے اچانک اپنے بالمقابل دیکھ کر راجدہ کا چہرہ ایک دفعہ زرد ہو کر جیسے ڈوب سا گیا۔ راجدہ کے بھائی وہیں بیٹھے تھے۔ بعد ازاں میرا تعارف کروایا گیا۔ سعید خندہ پیشانی سے مجھے ملا۔ راجدہ اوپر جا چکی تھی۔ سعید ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ راجدہ کے بھائی کیرم بورڈ کھیل رہے تھے۔ اور میں آرام کرسی میں دھنسا خاموشی سے سگریٹ پی رہا تھا جعلی اور اخروغیرہ باورچی خانے میں تھیں کبھی کبھی علی کی دبی دبی ہنسی اور اختر کی گفتگو کی مدھم آواز آ جاتی تھی۔ راجدہ اوپر تھی۔ اور میں کمرے میں خاموش اور اُداس اُداس بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ میں وہاں کتنی دیر بیٹھا رہا۔ مگر راجدہ ایک بار

ھی پھر میرے سامنے نہ آئی۔

اُس گھر میں ہالوں کی گرویدگی اور محبت کے بعد یہ پہلا موقع تھا۔ کہ مجھے وہاں کی ہر شے بیزارگی سے مُنہ پھیرتی محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے میں اجنبی ہوں۔ اور اُن کی منشا کے خلاف وہاں آن بیٹھا ہوں۔

مجھے اپنا جسم خود اپنے آپ پہ ایک ناقابلِ برداشت بوجھ معلوم ہونے لگا۔

میں اُٹھا اور چُپکے سے راجدہ کے گھر سے باہر نکل آیا۔

باہر لوگ آ رہے تھے اور جا رہے تھے۔۔ ۔ کئی ایک نے میری طرف حیرانگی اور دلچسپی سے دیکھا۔ جیسے میں کوئی بہروپیا ہوں۔ اور بھیس بدل کر اُن کے درمیان آگیا ہوں۔ جیسے وہ مجھے پہچان بھی چکے ہیں اور میرے بہروپ پہ حیران بھی ہو رہے ہیں۔ بازار میں چلتے چلتے کئی بار میرے قدم لڑکھڑائے اور میں گرتے گرتے سنبھلا۔ ایک ہوٹل کے قریب پہنچ کر میں اندر گھس گیا۔ لیکن چائے کا آرڈر دے کر بغیر چائے پئے باہر نکل آیا۔

میری حالت کسی ایسے گویّے کی سی تھی جو بھری محفل میں گاتے ہوئے اچانک بے سُرا ہو گیا ہو۔

میں واپس چلا آیا۔ اپنے دولت خانے میں پہنچ کر مجھے یُوں محسوس ہوا۔ جیسے میں بیچ بازار میں ننگا ہو گیا تھا اور میرے اوپر کسی نے چادر ڈال دی ہے ـــــ میز پہ پڑی ہوئی کتابوں کے پاس پھولدان میں گلاب کے پھول مُرجھا رہے تھے۔ کونے میں میرے چھوٹے بھائی کے ہاتھ سے بنی ہوئی آئل پینٹ تصویر پر گرد سی جم رہی تھی۔ اس تصویر میں سُوکھے ہوئے درختوں کی بے برگ ٹہنیوں کے عقب میں بھورے رنگ کے جل محل کرتے وسیع بادل اُٹھتے دکھائے گئے تھے اور نیچے لکھا تھا ؏ ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میں نے اُس تصویر کو لیکر رومال سے اُس پر جمی ہوئی گرد صاف کی اور میرا دل بھر آیا اور میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور میں نے تصویر کو سینے سے لگا لیا۔ کتنی ہی دیر تک راجدہ کا غم آنسو بن کر میری آنکھوں سے بہتا رہا۔ اور جب میں نے تصویر کو دوبارہ میز پر رکھا تو مجھے اپنا آپ اُس بچے کی مانند مسرور اور ہلکا ہلکا سا محسوس ہو رہا تھا۔ جسے سکول کے دروازے پر پہنچ کر خبر ملے کہ آج چھٹی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

دوسرے مہینے کے وسط میں راجدہ کا خط آیا۔ کہ اُس کے والدین اُس کی شادی سعید سے کرنا چاہتے ہیں۔ اور اُس نے زہر منگا کر اپنے پاس رکھ لیا۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

راجدہ کا ایک اور خط آیا۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خدا کے لئے مجھے بتاؤ۔ میں مر جاؤں گی پردیسی،

میں کیا کرتا ـــــ میں نوکری چھوڑ بیٹھا تھا۔ کس بنا پر راجدہ کو بچاتا۔ میں نے امی سے بات کی کہ اگر راجدہ مجھے مل جائے تو میں نوکری پھر کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ وہ مان گئی مگر ابا نے کہا۔ کہ وہ لڑکی والوں کو صاف صاف کہہ دے گا کہ لڑکا نکما ہے ـــــ راجدہ مجھے بار بار لکھتی۔ نوکری کر لو۔ پھر ہم شادی کر لیں گے۔ پھر ہمیں دُنیا کی کوئی طاقت جُدا نہ کر سکے گی ـــــ میں نے سر توڑ کوشش کی لیکن کچھ ہاتھ نہ آیا۔ جب راجدہ کے بچھڑ جانے کے بعد مجھے ایک کالج کی لائبریری میں پچاس روپوں کی جگہ مل گئی۔ اُس رات خوشی سے میں بالکل نہ سو سکا۔ تمام رات بستر میں لیٹا بیداری کے خواب

دیکھتا رہا۔ راجدہ بھاری کامدار ریشمی لباس میں ملبوس پھولوں میں لپٹی۔ دُلہن بنی میرے ساتھ سمٹی ہوئی بیٹھی ہے۔ باریک ریشمی گھونگھٹ میں سے مجھے اُس کے ریشمی رُخسار دمکتے ہوئے معلوم ہو رہے ہیں ہمیں راجدہ کی شریر اور چنچل سہیلیوں نے گھیر رکھا ہے۔ کوئی پان پیش کر رہی ہے۔ اور کوئی دودھ کا گلاس پلانے پر تلی کھڑی ہے۔ مگر میں انکار کر رہا ہوں۔ کیونکہ مجھے پتہ ہے۔ کہ پان میں سپاریوں کی جگہ روڑے اور دودھ میں چینی کی جگہ نمک کا ڈبہ انڈیل دیا گیا ہے ——
پھر میں نیچے جانے کے لئے اُٹھا ہوں اور میرے ساتھ تکیہ بھی اُٹھ آیا ہے۔ کیونکہ اُسے میرے کوٹ کے ساتھ چپکے سے چپٹا دیا گیا ہے۔ میرا مذاق اُڑایا جا رہا ہے۔ اور میں شرمندہ ہو رہا ہوں۔ میں جوتا ڈھونڈھ رہا ہوں۔ اور جوتا نہیں مل رہا۔ ........

پھر جیسے کسی باغ میں پھولوں بھری بیلوں اور گنجان درختوں کی پُرسکون چھاؤں میں راجدہ میرے قریب بیٹھی اون اور سلائیاں لئے کچھ بُن رہی ہے۔ میں گھاس پر نیم دراز ہوں۔ ہمارے پاس ہی ایک بڑی ہی پیاری بچی پھولوں اور گھاس پر گرے پڑے پتوں سے کھیل رہی ہے۔ کبھی کبھی راجدہ اور کبھی بچی کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ اور آسمان پر موسم بہار کی شام کی سنہری چمک پھیل رہی ہے ........

اور پھر دن نکل آیا اور اُسی دن میں اُمیدوں اور ارادوں سے بھرپور دل لئے راجدہ سے ملنے گیا۔ ایک بازار کا موڑ گھومتے ہی مجھے سامنے راجدہ کا بھائی آتا نظر آیا۔ مجھے یوں معلوم ہوا۔ جیسے راجدہ خود چلی آ رہی ہے میرا دل چاہا کہ میں اُسے گلے سے لگاؤں۔ قریب پہنچ کر وہ ٹھہر گیا۔

"بھئی کل شام دفتر سے نکل کر گھر ضرور پہنچ جانا"

"کوئی محفل سرود گرم ہو رہی ہے کیا؟ میں نے اپنے جسم میں مسرتوں کے غبارے سے اُبھرتے محسوس کئے"

"یہی سمجھ لو، اُس نے حسب عادت مسکراتے ہوئے کہا" سعید کا نکاح ہو رہا ہے"

"کہاں؟ میرے منہ سے خود بخود نکل گیا۔ لیکن مجھے اب تک یاد نہیں۔ کہ میں نے ایسا کہا ہو۔

"گھر ہی میں —— ویسے تم ضرور پہنچ جانا"

"ضرور ——" اور وہ چلا گیا۔ اور مسرتوں کے غبارے یکے بعد دیگرے پھٹتے چلے گئے اور میں نہ راجدہ کے گھر کی سمت بڑھ سکا۔ اور نہ وہاں کھڑا ہو سکا —— بازار میں ہر شے سے بے خبر، میں سر جھکائے، ہاتھ لٹکائے یوں چلا جا رہا تھا جیسے اپنے جوان بھائی کو قبرستان میں دفنا کر آ رہا ہوں۔

راجدہ، سعید سے بیاہی جا رہی تھی۔

وحشی اور ظالم لوگوں سے بھری ہوئی ریل گاڑی سے نکل کر میں نے نرم دل گارڈ کے ڈبے میں پناہ لی تھی اور نرم دل گارڈ نے مجھے بڑی محبت سے سگریٹ پیش کرنے کے بعد ڈبے سے باہر نکال دیا تھا۔ اور میں پھر اُنہی لوگوں کے اژدہام میں تھا۔ تنہا اور بے یار و مددگار۔

گھر پہنچ کر میں تمام رات سگریٹ پیتا اور بڑے تحمل سے راجدہ کے بغیر بسر ہونے والی اپنی زندگی کے نشیب و فراز گنتا رہا۔ راجدہ کے بغیر میں اپنی زندگی کا کوئی آخری نقشہ قائم کرنے سے بالکل قاصر تھا۔

کسی وقت مجھے محسوس ہوتا کہ میں کسی اجنبی اور ناواقف شہر کے اَن دیکھے بازاروں میں یونہی آوارہ

اور بے مقصد گھوم رہا ہوں۔ اور لوگ اپنی اپنی دوکانیں اور کاروبار بند کر کے گھروں کو جا رہے ہیں اور نیمی مجھے اپنی دونوں طرف ویران اور اُجاڑ کھنڈرات کا مہیب سلسلہ حدِ نگاہ تک پھیلا معلوم ہوتا اور میں چلا جا رہا ہوں ——— کہاں؟ کدھر؟ کوئی خبر نہیں ———

ماجدہ میرے لئے روشنی کا مینار تھی جسے دیکھ کر بھٹکے جہاز راں منزل کی درست سمت اور خطرے سے آگاہ ہوتے ہیں۔ مگر اب اس مینار کی روشنی دھند کے دبیز غلاف میں لپٹی ہوئی تھی اور مجھے ہر قدم پر خطرے اور گمرہی کا احساس ہو رہا تھا۔ ماجدہ کو اپنے قریب پا کر مجھے اپنے تئیں ایک ایسے پہاڑ کا احساس ہوتا جس کی چوٹی پر سورج طلوع ہو رہا ہو۔ لیکن اب یہ سورج غروب ہو رہا تھا اور میرے دامن کی بستیوں میں شام کے سائے پھیل رہے تھے۔

ماجدہ کا خیال مجھے ہر شے سے الگ تھلگ ہونے پر اُکساتا تھا اور سب سے الگ ہو کر میں کئی بار ماجدہ کے خیال سے بھی آگے نکل گیا تھا۔ مگر آج ناامیدی اور خاموشی کے اس پل پر میں اکیلا کھڑا، اپنے نیچے بہنے والی تنہائی اور درد کی تاریک خلیج کو تک رہا تھا۔ جہاں ماجدہ کی کانپتی ہوئی مدھم سی شبیہہ سُرمئی دھندلکوں میں آہستہ آہستہ تحلیل ہو رہی تھی۔

شام کے وقت میں گھر سے نکلا اور کمپنی باغ کی طرف چل پڑا۔

باغ میں دھوپ ماند پڑ رہی تھی۔ کہیں کہیں ڈھلتے سورج کی سُرخی درختوں کے تنوں پر چمک رہی تھی ہلکی سرد ہوائیں درختوں پر سے سوکھے پتے جھڑ جھڑ کر گر رہے تھے۔ سڑک پر گرتے ہی وہ کچھ دور تک لڑھکتے اور پھر جیسے بے جان سے ہو کر رہ جاتے۔

پریڈ کلب کے پاس سے گزرتے ہوئے مجھے ماجدہ، علی اور بھابھی اور بچوں کی آوازیں سنائی دیں۔ جیسے وہ اندر ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے ہوں۔ میں نے اندر جھانک کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ پلاٹ کے وسط والا آم کا گنجان درخت خاموش محافظ کی مانند کھڑا تھا۔ اور زرد زرد گھاس پر خالی ڈبیاں اور چوسی ہوئی گنڈیریوں کے چھلکے بکھرے ہوئے تھے۔

سڑک پر گرے ہوئے سوکھے پتوں کو روندتا۔ میں اس پلاٹ میں داخل ہوا۔ جہاں ہماری محبت نے پہلی بار رنگ برنگ پھولوں اور پتوں میں اپنی آنکھیں کھولی تھیں۔ یہاں مرجھائے ہوئے بے پھول پودوں کی قطاریں سر جھکائے کھڑی تھیں۔ چھت والے گلاب کی بیلیں سوکھ رہی تھیں۔

" ماجدہ دیکھ کر چلنا کہیں کانٹا نہ چبھ جائے۔ یہ بھابھی کی آواز تھی۔

" اوئی پانی بڑا ٹھنڈا ہے۔ تم بھی آ جاؤ ——— یہ ماجدہ کی آواز تھی ——— وہ دونوں ہاتھوں سے ساٹن کی شلوار کے پائنچے اُٹھائے پلاٹ کے پانی میں چل رہی تھی . . . . . . .

اب وہ میرے قریب کھڑی سینڈل کے تسمے باندھ رہی ہے۔ اور فضا میں اس کے خوشگوار پسینے اور حنا کی خوشبو پھیل رہی ہے۔ اور وہ بھابھی سے کہہ رہی ہے ——— سچ تو یہ کہ ایسی راتیں پانیوں ہی میں گزارنا چاہتی ہوں۔ بس پائنچے اُٹھائے پانی میں گھومتی پھرتی رہوں۔ اور جب تھک جاؤں تو . . . . . . . .

ہم پرستش میں آ گئے ہیں۔ اور راجدہ کیبن کے شیشوں میں سے مجھے پہلی بار محبت کی پاک اور بے لوث نظروں سے تاک رہی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اور راجدہ نے نقاب اُٹھا لیا ہے ——— کالے نقاب میں اُس کا سپید چہرہ ——— جیسے تاریک رات میں کسی خانقاہ کا کھلا ہُوا روشن طاق ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

راجدہ کہہ رہی ہے۔

میں ڈرتی ہوں۔ کہیں تم مجھ سے محبت کرنا چھوڑ تو نہ دوگے؟ سچ میں مر جاؤں گی'۔

'اور ——کبھی نہیں، کبھی نہیں راجدہ'۔

اور میں غم سے نڈھال سا ہو کر سنگین بنچ پر بیٹھ گیا۔ میرے اوپر گلاب کی پژمردہ بیل کے جھاڑ تھے۔ میں نے اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپا لیا۔ اور راجدہ ——— کبھی نہیں، کبھی نہیں، اور پھر رِم جھم رِم جھم ——— مدھم بارش کی غمگین موسیقی اور سیاہ پتھروں پر سے رُک رُک کر ٹھیر ٹھیر کر پھسلتے ہوئے پتھروں کے آنسو ——— روندے پتھر پہاڑاں دے

میں پلاٹ سے باہر نکلا تو سرد اور نیلے آسمان پر تارے ٹمٹما رہے تھے۔ ہوا تھم گئی تھی۔ اور باغ کے گنجان درخت یوں خاموش اور متفکر کھڑے تھے۔ جیسے وہ بے زبان فرشتے ہوں اور راہ میں کھڑے کسی پیغمبر کے جنازے کا انتظار کر رہے ہوں۔

——— ——— ——— ———

وقت کا نہ رُکنے والا چکر گھومتا گیا۔

میں نے راجدہ کے ہاں آنا جانا چھوڑ دیا۔ کچھ عرصہ تک راجدہ کے دُکھ بھرے خط مجھے ملتے رہے لیکن میری طرف سے کوئی جواب نہ ملنے پر اُس نے بھی خط لکھنے بند کر دیئے۔ میرا زیادہ وقت لائبریری میں گذرتا تھا۔ دُنیا کے بہترین مصنفوں کی کتابوں نے میرے دل و دماغ کو روشنی اور سکون عطا کیا۔

قسم قسم کی تصانیف سے بھری ہوئی لمبی لمبی الماریوں کے پاس فاوسٹ، جین ایر، سلامبو اور پیامِ مشرق پڑھتے پڑھتے جب کبھی مجھے راجدہ کا خیال آتا تو میں اپنے آپ سے شرمسار سا ہو جاتا۔ جیسے وہ کوئی لڑائی مار کٹائی والی فلم ہو جسے میں نے کبھی بڑے شوق سے دیکھا ہو ——— پھر بھی کسی وقت جب بارش موسلا دھار ہو رہی ہوتی تو میں لائبریری کی بالکنی میں کھڑا نیچے کالج کے پلاٹ میں، ننگے بنچوں، سرسبز گھاس اور عشق پیچاں کے کاسنی پھولوں کو دیکھتے دیکھتے محسوس کرتا جیسے راجدہ مجھ سے جُدا نہیں ہوئی۔ وہ اب بھی میرے قریب اِس بالکنی میں کھڑی اُگتی بارش میں پلاٹ کا نظارہ کر رہی ہے۔ اور پھر میرا دل راجدہ کی محبت کے غیر فانی جذبات سے مالا مال ہو جاتا۔

انہی لمحات میں مجھے اپنے اردگرد ننھی اور کم سن پریوں کے نازک پروں کی نرم پھڑپھڑاہٹ سُنائی دیتی۔ اور میرے دل کے بھی جیسے پر نکل آتے اور وہ بھی اُن معصوم آسمانی روحوں کے جُھرمٹ میں مل کر مصروفِ پرواز ہو جاتا۔

جنوری کی ایک ابر آلود شام کو ——— جبکہ سردی اپنے جوبن پر تھی۔

میں لائبریری سے باہر نکل رہا تھا۔ کہ راجدہ کا بھائی مل گیا۔ گرم سُوٹ میں ملبوس، سگریٹ سلگاتے، اُس نے

گرمجوشی سے میری طرف محبت کا ہاتھ بڑھایا۔

"کہاں رہتے ہیں آپ؟ کبھی ملتے ہی نہیں۔ مجھ سے کوئی غلطی ہو . . ."

میں نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ اُس کے قہقہے کا انداز راجدہ سے کس قدر ملتا تھا —— ایک پل کے لئے میں کائنات کی ہر شے سے الگ ہو کر راجدہ کے خیال میں کھو گیا۔

ہم ایک قریبی چائے خانے میں داخل ہو گئے۔ یہاں کی فضا ہر قسم کے لوگوں اور سگرٹوں کے دھوئیں سے بھری ہوئی تھی۔ ہم نے چائے منگوائی اور کافی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ جب ہم ہوٹل سے باہر نکلے تو مدھم لیمپوں کی بھیگی ہوئی روشنی میں گیلی سڑک پر جا بجا پانی کے گڑھے چمک رہے تھے۔ اور لوگ لمبے کوٹوں اور گرم چادروں میں منہ سر چھپائے جلدی جلدی گزر رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ بارش ایک دفعہ ہو کر رکی ہے۔ ہم خاموشی سے چلے جا رہے تھے۔ ابھی بمشکل ایک بازار ہی طے کیا ہو گا۔ کہ پھر بوندا باندی شروع ہو گئی۔ اور جب راجدہ کے گھر والی گلی قریب آئی تو بارش یک لخت تیز ہو گئی۔ ہم ایک کر گلی میں گھسے اور ایک مکان کی ڈیوڑھی میں کھڑے ہو گئے۔ بارش چھپڑ پھاڑ کر شروع ہو گئی تھی۔ ہم رومالوں سے اپنے اپنے کوٹوں پر سے بارش کا پانی پونچھ رہے تھے۔ اور اِدھر اُدھر مکانوں کے پرنالوں میں سے بارش کا پانی ایک مسلسل شور کے ساتھ گر رہا تھا۔ ہوا سرد ہو گئی تھی۔ گلی کے لیمپوں کی روشنی گرتی بارش کے دھندلے نقاب میں ماندھی پڑ گئی تھی۔ اور گلی میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک دُھواں سا اُٹھنے لگا تھا۔ راجدہ کا مکان یہاں سے تیسرا یا چوتھا تھا۔ اُس کے بھائی نے کوٹ کے کالر اُٹھا کر کہا۔

"میرا خیال ہے گھر چلتے ہیں۔ یہاں کتنی دیر تک کھڑے رہیں گے؟"

اُس ابر آلود رات کو، بارش کی لگاتار گونج میں کافی مدت کے بعد راجدہ کو پہلی بار دیکھنے کا خیال مجھے بڑا سکین دہ محسوس ہوا۔ چنانچہ تیزی سے بھاگ کر ہم راجدہ کے گھر میں داخل ہو گئے۔ دیوان خانے کی بتی روشن تھی۔ اس نے مجھے نیچے بیٹھنے کو کہا۔ اور خود کپڑے بدلنے اوپر چلا گیا۔ میں نے دیوان خانے کا دروازہ کھولا۔ اور اندر داخل ہو گیا۔

کمرے کی فضا گرم اور بیحد مہربان تھی۔ اور وہاں سگریٹ کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ کرسیاں آتشدان کے قریب کھسکی ہوئی تھیں۔ اور آتشدان میں لکڑیوں کے جل جانے پر دہکتے ہوئے کوئلوں کی سُرخ لو جگمگا رہی تھی۔ تپائی پر ریڈیو خاموش پڑا تھا۔ قریب ہی راکھدان میں تازہ بجھے ہوئے سگریٹ میں سے دھوئیں کی پتلی لکیر اُٹھ رہی تھی معلوم ہوتا تھا۔ ابھی ابھی کوئی وہاں سے اُٹھ کر گیا ہے۔ کمرے کا حلیہ آج سے کچھ عرصہ پہلے کی نسبت بالکل تبدیل ہو چکا تھا۔ فرش پر دری کی بجائے کافی بڑا ایرانی قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف پلنگ کے قریب نئی طرز کا سنگھار میز پڑا تھا۔ جس پر ہر قسم کا سنگھار کا سامان چمک رہا تھا۔ سنگھار میز کے کونے میں سعید کی تصویر چاندی کے فریم میں مسکرا رہی تھی۔ پلنگ کے پاس ہی سرہانے کی طرف ایک چھوٹے سے میز پر کچھ کتابیں، پیڈ اور قلم دوات اور ٹیبل لیمپ رکھا ہوا تھا۔ کارنس کی پٹی ہلکے سبز رنگ کی ریشمی چادر سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اور دونوں کناروں پر گلدانوں میں کاغذی نگین پھول اصلی پھولوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ کارنس کے اوپر وہی شیراز کے پرانے دروازوں لمبے لمبے پُراسرار جالی دار جھروکوں اور مسجد کے دودھیا میناروں والی تصویر لٹک رہی تھی یہ تصویر اور بیڈ پہلے اوپر ہوا کرتے تھے۔ مجھے

یہ سوچنے میں بالکل دیر نہ لگی کہ یہ کمرہ راجدہ بیگم کا تھا۔ میں نے راکھدان میں سگریٹ مسلا اور ریڈیو کی بتی روشن کر دی
لاہور ــــ دلّی ــــ بمبئی ــــ ریڈیو کی سوئی ڈائیل کا نصف سے زیادہ حصہ طے کر چکی تھی
معاً ایک جگہ میرا ہاتھ خود بخود رُک گیا۔ یہ قاہرہ تھا۔ اور وہاں سے عربی موسیقی کا پروگرام شروع تھا۔
دف بج رہی تھی اور لڑکے اور لڑکیاں مل کر گا رہے تھے۔ گیت کے بول میری سمجھ سے باہر تھے۔ مگر ان کی گہری لَے ــــ سوگوار کانپتی ہوئی تانیں دل پر برابر اثر انداز ہو رہی تھیں۔ یہ تانیں نند اُٹھ کر دل کی گہرائیوں سے اُٹھتیں۔ اور شعلے کی مانند لپک کر پھیل جاتی تھیں۔ ان میں سادگی، سچائی اور تڑپ تھی۔
جب لڑکوں یا لڑکیوں کی ٹولی اپنے بول ختم کرتی تو دیر تک دف بجتی رہتی۔ جیسے کوئی بدوی کھجور کے درخت کو ہلا رہا ہو۔ اور پکی ہوئی موٹی موٹی کھجوریں زمین پر گر رہی ہوں۔ پھر لڑکیوں کی باریک آوازیں تنی ہوئی کمانوں سے نکلے ہوئے سنہری تیروں کی مانند اوپر کو اُٹھتیں۔
یہ عرب کی صحرا زادیوں کے گیت تھے۔ جنہیں وہ خاص خاص موقعوں پر گاتی ہیں۔ کبھی چاندنی رات میں کھجوروں تلے ٹھنڈی ریت پر محفلیں جما کر کبھی میدانِ جنگ سے لوٹتے ہوئے اپنے خاوندوں اور بھائیوں کی آمد پر کبھی قاہرہ ریڈیو سٹیشن پر آ کر ــــ
دروازہ کھلا اور راجدہ کا بھائی اور سعید اندر داخل ہوئے۔ میں نے ریڈیو بند کر دیا۔
سعید بھورے اوورکوٹ میں ملبوس تھا۔ اور راجدہ کا بھائی گرم چادر اوڑھے ہوئے تھا۔
'بڑے دنوں بعد نظر آئے۔ کہیں گئے ہوئے تھے'؟ سعید نے میری طرف ہاتھ بڑھا کر پوچھا۔
'جی نہیں۔ یہیں تھا۔ دراصل کام کی زیادتی کے باعث - - - - -
'بہت خوب ــــ آدمی کام کرتا ہی اچھا لگتا ہے، سعید نے بوڑھوں کی مانند مجھے نصیحت کی۔
راجدہ کا بھائی سنگار میز کے دراز دیکھ کر بولا۔
'بھئی سگریٹ ختم ہو گئے میاں'۔
اور میں نے جیب سے 'دو ماریز' کا ڈبہ نکال کر میز پر رکھ دیا۔ اور وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا اور مجھے راجدہ کا خیال آ گیا ــــ راجدہ کہاں ہے؟ شاید اوپر سو رہی ہو گی۔ اس نے تو کہا تھا۔ میں زہر کھا لوں گی۔ کیا اُسے میرے آنے کی خبر نہیں ہوئی؟
دروازہ پھر کھلا اور عظمیٰ اور اختر اندر داخل ہوئیں۔ اختر اپنی بچی اٹھائے تھی اور عظمیٰ کے ہاتھ میں سلائیاں اور تصف بُنے ہوئے موزے تھے۔
'کہیں باہر گئے ہوئے تھے کیا؟ عظمیٰ نے کرسی آتشدان کے قریب لاتے ہوئے پوچھا۔
"جی نہیں ــــ یہیں تھا"
'اچھا'۔
یہ ذرا سی، 'اچھا' کہہ کر وہ بڑے اطمینان سے موزے بننے لگی۔ جس طرح کوئی بچہ قلم چھڑک کر لکھنے میں مشغول ہو جائے۔ یہ 'اچھا' سیاہی کا ایک دھبہ تھا جو میرے کپڑوں پر چھڑکا گیا تھا۔ اختر اور سعید تیز تیز باتیں

راجدہ نے لکھا تھا میں زہر کھالوں گی، اور راجدہ نے زہر کھا لیا تھا۔ چائے کا گرم گھونٹ حلق میں اُتارتے ہوئے میں نے راجدہ کی آواز سنی۔ وہ اپنی امی کو بلا رہی تھی اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ خواب جزیروں سے مجھے آوازیں دے رہی ہے۔ میرے دل میں ایک اجنبی اور مقدس خیال بجلی کی مانند چمکا اور میرا ذہن چکا چوند ہو کر رہ گیا۔

ایک قسم کی زندگی، عظمت اور برتری کا خیال۔

جو بھرتری ہری کو گھنے جنگلوں میں اور موسٰے کو آگ کی طرف کھینچتا ہوا لے گیا۔

اور جس نے کالیداس کو میگھ دوت اور ڈانٹے کو ڈیوائن کامیڈی لکھنے پر اکسایا۔

میں نے سگریٹ آتشدان میں پھینکا اور اس خیال کی تعظیم میں میرا سر خود بخود جھک گیا۔ جب میں گلی سے نکل رہا تھا تو مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں صد بہار در آغوش، اقلیمِ محبت کے سنہری خیابانوں میں داخل ہو رہا ہوں۔ مجھے اپنے آپ پر ایک ایسے بجرے کا گمان ہو رہا تھا جس کے ریشمی بادبان تنے ہوئے ہوں۔ اور جیسے مشرقی ہواؤں کے مہربان جھونکے آہستہ آہستہ دور - - - پُرسکون جھیلوں، روشن پہاڑوں اور پھولوں سے ڈھکے ہوئے گمنام جزیروں کی طرف لئے جا رہے ہوں - - - - - -

آج راجدہ کی شادی کو تیسرا سال ہو رہا ہے۔

مگر میری راجدہ اس وقت بھی میرے پاس ہے۔ وہ ازل سے میرے پاس تھی اور ابد تک رہے گی اور اس کا سعید کی راجدہ سے کوئی تعلق نہیں۔ جس طرح کسی قدآور درخت سے چمٹی ہوئی لچکیلی بیل رات کی خاموشی میں اپنی غذا حاصل کرتی ہے اسی طرح میں راجدہ کی محبت سے اپنی غذا حاصل کر رہا ہوں۔

میں اس کی محبت کو ہضم کر گیا ہوں اور اس کے اجزا میرے روح و بدن میں سرایت کر گئے ہیں۔

سعید کی راجدہ کے تین بچے ہیں اور اب وہ سعید کی راجدہ کم اور اپنے بچوں کی زیادہ ہے لیکن میری راجدہ صرف میری ہے اور میں ہی اس کی بے لوث محبت کی تمام جائداد کا واحد مالک ہوں۔ وہ ایک سدا بہار درخت ہے جو مجھے اپنی ٹھنڈی چھاؤں عطا کرتا ہے ایک چشمہ ہے جس کا شفاف پانی محض میری خاطر زمین سے پھوٹتا ہے اور ایک گمنام وادی جس کے نشیب و فراز صرف میرے قدموں کی چاپ سے آشنا ہیں۔

جب مشرق میں صبح ہوتی ہے تو میں اسے اپنے ساتھ کرنوں کا تاج پہنے زریں تخت پر بیٹھے اوپر کو اٹھتے دیکھتا ہوں۔ شام کے وقت جب وادیوں پر اندھیرا چھانے لگتا ہے تو ہم پہاڑ پر چڑھ کر دن کی رخصتی کا گیت ہم آواز ہو کر گاتے ہیں۔

اور جب رات کا جادو پھیل جاتا ہے تو وہ ستاروں کے دریچے کھول کر نورانی راستوں پر سے گزرتی ہوئی میرے پاس آجاتی ہے اور ہم تمام رات گلاب کے پیالوں میں شبنم کی شراب پیتے ہیں اور ازلی و ابدی محبت کے غیر فانی گیت گاتے رہتے ہیں۔

ہر جگہ، ہر مقام پر ہمارے قدم ایک ساتھ اور ہم آہنگ ہو کر اٹھتے ہیں۔ اس کا خیال مجھے اپنے تئیں اس بادل کا احساس دلاتا ہے جو خشک اور بنجر زمینوں پر بارش کے موتی لٹانے کے لئے پہاڑوں کی چوٹیوں پر سے بلند ہوا ہو ——

وہ بوڑھی ہے نہ جوان، کنواری ہے نہ شادی شدہ —— اُسے وقت کا بوڑھا ہاتھ کبھی نہیں چھو سکتا۔ وہ اس کی دسترس سے باہر، لازوال، اٹل اور غیر فانی ہے۔

وہ ہر لحظہ، ہر گھڑی، ہر پل میرے ساتھ ہے۔ وہ اس وقت بھی میرے دل پر اپنی محبت کے نازک پروں کا سایہ کئے ہوئے ہے۔ جبکہ میں اس کی داستان قلم بند کر رہا ہوں۔

سعید کی راجدہ سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے اور میں اس کے بارے میں کبھی کوئی افسانہ نہیں لکھوں گا . . . "

سیف الدین سیفؔ

# غزل

آپ سے پیشتر نہیں آتی ۔۔۔ موت کیا سوچ کر نہیں آتی

میری رخصت کا وقت آپہنچا ۔۔۔ تیری صورت نظر نہیں آتی

یہ ہنسی غیر کا مقدر ہے ۔۔۔ کیا مرے حال پر نہیں آتی

تیری محفل کو دوڑتا ہے خیال ۔۔۔ بے خودی راہ پر نہیں آتی

آ ہی جاؤ کہ وقت نازک ہے ۔۔۔ زندگی لوٹ کر نہیں آتی

عمر کیسے کٹے گی سیفؔ یہاں
رات کٹتی نظر نہیں آتی

قتیل شفائی

# کہاں سے کہاں تک

چند لمحوں کے لئے میں نے خریدا ہے تجھے — چند لمحوں کے خریدار سے یوں پیار نہ کر
میرے سینے میں کوئی یاد، کوئی داغ نہیں — میرے سینے میں کسی لمحے کو ضو بار نہ کر
پو پھٹے میں نے ترے گھر سے چلے جانا ہے — میرے معصوم ارادوں کو گنہ گار نہ کر

●

جانے کیا بات ہے؟ چھائی تھی اداسی دل پر — اب مجھے تو نے بلایا ہے تو چین آیا ہے
گو مجھے تجھ سے محبت نہیں لیکن پھر بھی — میری آنکھوں نے تری سیج کو مہکایا ہے
یوں چلا آیا ہوں جیسے مجھے آنا ہی تو تھا — یوں چلا جاؤں گا جیسے ترا غم کھایا ہے

●

بے ارادہ ہی ترے گھر کو چلا آتا ہوں — ورنہ اس دل کو لگے رہتے ہیں سو سو دھڑکے
آتے جاتے مرے احباب مجھے دیکھ نہ لیں — میرے اعصاب پہ طعنوں کی نہ بجلی کڑکے
ٹوک بیٹھے نہ کہیں مجھ سا کوئی بڑھ کے مجھے — یوں تصادم سے مبادا کوئی شعلہ بھڑکے

●

جا ذرا کہہ دے کہ وہ کل سے نہیں آئے ہیں — اور تو اس کے سوا کوئی بہانہ ہی نہیں
بیٹھنا چاہیں تو کہہ دینا دبے لفظوں میں — آج شاید مرے گھر پر انہیں آنا ہی نہیں
جو بھی آتا ہے وہ میرا ہی پتہ پوچھتا ہے — شہر میں اور کہیں ان کا ٹھکانہ ہی نہیں؟

●

## تابشؔ دہلوی

# غزل

ل کو ٹھکرا کے ترا حسن پشیماں ہوگا — آئینہ آئینہ اک دیدۂ حیراں ہوگا

سکے گی نہ کبھی تختۂ گل پہ بجلی — آشیانہ جو سرِ صحنِ گلستاں ہوگا

رف ساحل نہیں آسودۂ ہنگامۂ بحر — میری کشتی کو بھی اندازۂ طوفاں ہوگا

ہیں تمنّا ہے کہ ہو سلسلہ جنبانِ جنوں — تیری زلفوں کی طرح کون پریشاں ہوگا

بری حالت میں افاقہ ہو یقینی تو نہیں — یوں تو ہونے کو مرے درد کا درماں ہوگا

یہ جنوں پردہ درِ عقل ہوا ہے ورنہ — چاک ہو جانے سے پہلے ہی گریباں ہوگا

لیتا اہلِ جہاں داغِ تمنا سے کبھی — جنتِ گم شدہ میرا دلِ ویراں ہوگا

ں نوازی ہے پتنگوں کے لئے نورِ حجاب — ہائے وہ شعلہ جو فانوس میں عریاں ہوگا

میری کشتی تہِ گرداب ہے لیکن تابشؔ
ایک اک موج میں خمیازۂ طوفاں ہوگا

عبداللہ ملک

# ادب اور فسطائیت

"ہم تاریخ کے نازک ترین دور میں سے گزر رہے ہیں۔ یہ زمانہ بحران کا زمانہ ہے۔ اور ہر لمحہ یہ بحران شدت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ ہماری زندگی کا کوئی شعبہ بھی تو ایسا نہیں جس پر اس بحران اور نزاکتِ وقت کی پرچھائیاں نہ پڑ رہی ہوں۔ ہماری روحانی اور سماجی زندگی بھی خطرے میں ہے۔ یہ صورت حال صرف سیاسی زندگی ہی میں نہیں ہے بلکہ انسان کی ذاتی اور معاشرتی اقدار بھی خطرے میں گھری ہوئی ہیں۔"

MARX PLANCK نے یہ الفاظ ۱۹۳۲ء کے شروع میں کہے تھے۔ یہ بڑا بحران کنی کا زمانہ تھا۔ اقتصادی بحران کے بادل پوری دنیا پر چھا رہے تھے۔ کارخانوں کی چمنیوں سے دھواں نکلنا بند ہو رہا تھا۔ مشینوں کی گڑگڑاہٹ رک گئی تھی۔ بیکاروں کی تعداد ان گنت ہو رہی تھی۔

اس معاشی بحران کے تین برس میں (۱۹۳۰ء — ۱۹۳۲ء) صنعتی پیداوار بہت گھٹ گئی۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں پیداوار کم ہو کر ۱۹۲۹ء کے مقابلے میں صرف ۶۵ فیصدی رہ گئی۔ برطانیہ میں ۸۶ فیصدی، جرمنی ۶۶ فیصدی اور فرانس میں ۷۷ فیصدی۔ اور اس طرح سے اس عالمگیر معاشی بحران نے ۲ کروڑ ۴۰ لاکھ انسانوں کو بیروزگاری کے اندھے کنوئیں میں دھکیل دیا۔ یہ صرف صنعتی مزدوروں کی تعداد ہے۔ اس کے علاوہ کروڑوں کسانوں کو بھی اس بھیانک بحران نے فاقہ کشی کرنے پر مجبور کیا۔

اس عالمگیر معاشی بحران نے تمام ممالک کے مزدور، کسان اور نچلے طبقے کے پسے ہوئے عوام پر انقلاب اور بغاوت کے دروازے کھول دیئے۔ چنانچہ تمام دنیا کے سرمایہ دار ممالک میں زبردست عوامی تحریکیں اٹھیں۔ خود اس نیم برِاعظم ہندوستان میں اس زمانے میں زبردست ہڑتالیں ہوئیں، مظاہرے ہوئے۔ بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے جنم لیا۔ حتیٰ کہ پوری کانگرس کو اس زبردست جوش کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ اور مکمل آزادی کا ریزولیشن پاس کرنا پڑا۔ یہ حالت صرف ہندوستان میں نہیں تھی۔ بلکہ یورپ میں اور بالخصوص جرمنی میں اگر ایک طرف بحران کی شدت تھی تو دوسری طرف عوام میں اس نظام کو بدلنے کا بھی اسی شدت سے احساس تھا۔ چنانچہ جرمنی میں ۱۹۳۲ء میں ریشتاگ کے انتخابات میں ۶۰ لاکھ انسانوں نے کمیونسٹ پارٹی کو ووٹ دیئے۔

مگر سرمایہ دار اور سامراجی اس معاشی بحران اور عوام کے انقلابی تیوروں سے دو طرح چھٹکارا حاصل کرتا ہے۔ ایک راستہ تو فسطائی آمریت کے قیام کا ہے۔ یعنی سب سے زیادہ رجعت پسند، سب سے زیادہ جنگجو قوم پرست اور سامراجی سرمایہ دار عناصر کی حکومت کا قیام۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ دنیا کو از سرِ نو تقسیم کرنے کے لئے ایک نئی جنگ کا آغاز کیا جائے۔

۱۹۳۰ء کے معاشی بحران سے خوفزدہ ہو کر دنیا کے سرمایہ داروں نے دونوں ہی راستے اختیار کئے۔ ایک طرف جرمنی کا سرمایہ دار تھا جس نے فسطائی آمریت کی راہ اختیار کی تو دوسری طرف جاپانی سامراجیوں نے جنگ کی ابتدا کی۔
ترقی پسند ادیبوں کی پہلی پود انہی حالات سے متاثر ہوئی تھی۔ اگر ایک طرف یہ لکھنے والے سماج کے اس نظام کو بدلنے کے خواہاں تھے تو دوسری طرف ایسے ادیب بھی جنم لے رہے تھے جو اس دنیا سے اکتا گئے تھے۔ جو آفاقی اعیان میں پناہ لیتے تھے۔ دراصل یہ زمانہ تھا بھی ایسا ہی۔ حقیقت کچھ اتنی ٹھوس اور تلخ تھی! اس سے آزمائش کچھ دل گردے ہی کا کام تھا۔ لہذا بڑے بڑے ادیب ان حالات میں کنی کترا گئے۔ چنانچہ جب انگلستان کے نئے لکھنے والوں کا پہلا مجموعہ شائع ہوا تو MICHAEL ROBERTS نے اس کے مقدمہ میں لکھا تھا

"جو شاعر اپنے ارد گرد کے حالات سے نالاں ہے لیکن اسکے باوجود وہ خود کسی مطمح نظر کا مالک نہیں اور طنز کی کوئی بنیاد نہیں تو وہ لازماً زندگی سے گریزاں ہوتا چلا جائیگا۔ اور اس کی تحریروں میں ابہام آتا چلا جائے گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی تحریریں علم و فلسفہ کا پلندہ تو بن جائینگی۔ اور ایک محدود گروہ ان سے مستفید بھی ہو سکے گا لیکن پڑھے لکھے والوں کی اکثریت اُن سے حظ نہ اٹھا سکے گی۔ اور یہ شاعر ایک طرف خیالی قاری سے مخاطب ہوگا تو دوسری طرف یہ عوام سے نفرت کرنا شروع کر دیگا۔
لیکن اس مجموعے کے لکھنے والے خیالی قاری کی تلاش میں نہیں بلکہ جیتے جاگتے انسانوں سے مخاطب ہو رہے ہیں"

جب نئی پود نے قلم سنبھالا تو وہ کسی اعتقاد کے مالک اور مطمح نظر کے حامی نہ تھے لیکن اس حقیقت کا اعتراف ان میں موجود تھا کہ زندگی کا چلن ٹھیک نہیں۔ اس کو بدلنا ہوگا۔ یہ نظام جو بیکاری اور افلاس کو جنم دیتا ہے۔ اور کچھ عرصے کے بعد معصوم انسانوں کو جنگ کے میدانوں میں کٹوا دیتا ہے کوئی صالح نظام نہیں۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء کے بعد نئے لکھنے والوں میں زیادہ تر ایسے تھے جو انہی حقائق سے دست و گریباں ہو رہے تھے اور اسی کشمکش کے دوران میں انہوں نے اپنے عقیدے کو تلاش کیا۔ اپنا مطمح نظر اپنایا اور معاشرے میں اپنا مقام ڈھونڈا اس جستجو اور تلاش میں ایک زبردست حقیقت نے مشعل راہ کا کام کیا یہ تھا سوویٹ نظام حکومت۔ اس لئے کہ جب پوری سرمایہ دار دنیا معاشی بحران میں پھنسی ہوئی تھی اور اس دنیا میں بیکار انسان ہجوم در ہجوم در در کا رواں بنے پھر رہا تھا تو صرف سوویٹ روس ہی تھا جہاں بھوک، افلاس اور بیکاری حرف غلط کی طرح مٹ رہی تھی۔ اس حقیقت نے ان نئے لکھنے والوں کو بہت متاثر کیا چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جب دوسرا مجموعہ شائع ہوا تو اس کا لب و لہجہ مختلف تھا۔ اس کا عزم پختہ اور بات واضح تھی۔ چنانچہ اس کے مقدمے میں اس تبدیلی کا بھی اظہار کیا گیا۔

"اگر ہم انقلاب کے خواہاں ہیں، اور ہماری ہمدردیاں ان انقلابی طاقتوں کے ساتھ ہیں تو اسکی وجہ یہ نہیں کہ ہمیں بیکاروں اور مفلسوں کے ساتھ بہت زیادہ ہمدردی ہے اور ہم میں رحم کا جذبہ ابھر رہا ہے۔ بلکہ ہماری ہمدردیاں اس لئے انکے ساتھ ہیں کہ انکی لڑائی ہماری لڑائی ہے۔ اور جیسے جیسے ادیب کو یہ محسوس ہوگا کہ اس کے اپنے مفاد محنت کش طبقے سے وابستہ ہیں ویسے ہی اس کی سیاست بھی محنت کش طبقے کی سیاست سے وابستہ ہوتی جائے گی۔ اور اس کا نتیجہ ہوگا کہ اس کی تحریریں سے فرار اور

ابہام دور ہوتے چلے جائیں گے۔

یہ انگلستان کی مثالیں اس لئے دے رہا ہوں کہ ہماری نئی پود اور خصوصاً ترقی پسند ادیبوں کی پہلی پود انگلستان کی اسی پود سے متاثر ہوئی تھی انگلستان اور یورپ کے دوسرے ممالک کے ادیبوں کو اس معاشی بحران کے نور جیسی نسنائی رجحانات اور فسطائی قوتوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اور آج پھر پوری دنیا کو اسی قسم کے تجربات سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ اس لئے اس پود کے تجربات ہمارے لئے بہت اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ اس پود کی اچھائیاں مسلمہ ہیں لیکن ساتھ ساتھ اس پود کی کوتاہیوں کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اسی قسم کی کوتاہیاں ہمارے ہاں بھی ابھر رہی ہیں۔

—— ہاں تو میں انگلستان کے نئے لکھنے والوں کی بات کر رہا تھا۔ ۱۹۳۰ء کی پود میں غصے سے زیادہ امید تھی ان میں جھنجھلاہٹ نہ تھی بلکہ تبقن کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ ان سے پہلی پود میں غصہ تھا جھنجھلاہٹ تھی اور بڑھتے بڑھتے ناامیدی اور قنوطیت کی راہ اختیار کرتی جاتی۔ پھر ایسا بھی ہوا کہ پرانی روایات کو تاحد گھٹنے کا رجحان اور جدید ہیئت کی محنت مندی کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا۔

اس کی وجہ نمایاں ہے۔ ۱۹۱۷ء کے سوویٹ انقلاب کے بعد پورے یورپ میں انقلابی تحریکیں ابھریں اور انہوں نے پورے سامراجی نظام کی در و دیوار کو ہلا دیا۔ ان تحریکوں میں جنگ کے مخالف جذبہ بھی بہت حد تک کارفرما تھا۔ چنانچہ پورے یورپ میں جنگ کے خلاف ناول اور نظمیں لکھی گئیں۔ کیونکہ وہ تمام ادیب جو اس جنگ میں شریک ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے ملک کے سرمایہ داروں کے ان نعروں پر یقین کر لیا تھا کہ یہ جنگ آخری جنگ ہے۔ اور اس کے بعد خوشحالی اور فارغ البالی کا ایک نیا دور طلوع ہونے والا ہے۔ لیکن جب ۱۹۱۸ء اور ۱۹۱۹ء میں سوویٹ کے ساتھ دوسرے ممالک میں مزدور اور کسان بندوقیں لیکر اپنے حقوق کے حصول کے لئے میدان میں نکلے تو بھی سرمایہ دار رہنما تھے۔ جنہوں نے اپنے توپ کے دہانوں کو ان معصوم انسانوں کی طرف پھیر دیا۔ اسی حادثے سے یہ پہلی پود تلملائی تھی۔ اور اس میں غصہ اور جھنجھلاہٹ جھلکنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی کچھ ادیبوں میں گریز اور فرار نمایاں ہوا۔

لیکن ۳۰ء کے بعد تو سیاسی طور پر بھی مزدور اور محنت کش عوام زیادہ منظم اور باشعور بنتے جا رہے تھے اسی منظم اور باشعور نے درمیانہ طبقہ کے لکھنے والوں کے سینوں میں امید اور تیقن کی مشعل روشن کی تھی ورنہ بھی حقیقت ہے کہ جیسے جیسے یورپ میں فاشزم بڑھتا گیا ویسے ہی ان نئے لکھنے والوں میں زیادہ ہیجان اور زیادہ پختگی آتی گئی۔ یہ فاشزم نے اپنے لے عزم کا اظہار تھا اسکے ساتھ ساتھ ایک طرف اگر یہ ادیب ابھرتے ہوئے فسطائی رجحانات کی پوری ماہیت کو سمجھ رہے تھے۔ تو دوسری طرف محنت کش عوام کے تیور بھی ان کی ہمتیں بندھا رہے تھے۔

چنانچہ صرف انگلستان نہیں بلکہ پورے یورپ میں ہیرنگ تک نئے لکھنے والوں میں ایک زبردست امید جھلکتی ہے۔ اور نئے نظام میں یہی یقین تھا جو یورپ کے بہترین لکھنے والوں کو کشاں کشاں سپین کی پہاڑیوں میں فرانکو کے خلاف لڑنے کے لئے لے گیا۔ اس وقت یہ ادیب اپنے حکمران طبقوں کے ماتھے کے شکنوں

سے پہلے نیا نہ ہو کر فسطائیت کے خلاف سینہ سپر تھے۔ انکے حکمران طبقے فسطائیت کے پودے کو سینچ رہے تھے۔ مگر یہ لکھنے والے اسکی جڑیں کاٹ رہے تھے۔ طن ہونے کے مقام پر یہ سرمایہ دار، یہ حکمراں طبقے، یہ سامراجی پوری فسطائیت دشمن تحریک کو دبانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کا نتیجہ نا امیدی، پست ہمتی اور مستقبل سے مایوسی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس وقت ان ادیبوں کے ایمان متزلزل ہونے لگے۔ اب ان کا مارکسزم پر سے بھی اعتقاد اٹھتا جا رہا تھا۔ ان کی انقلاب دوستی بھی ہوا ہو رہی تھی۔ ان کی فسطائیت دشمنی بھی اپنی اہمیت کھو رہی تھی۔ اگر ایک طرف بورژوا سیاست کامیاب ہو گئی تھی تو دوسری طرف یہ درمیانے طبقے کے لکھنے والے ادیب امید کا دامن چھوڑ بیٹھے تھے۔

اس تغیر کی وجوہات کو تلاش کرنا آج ہمارے لئے ضروری ہے۔ کیونکہ آج ہمارے ہاں بھی ادیبوں کا ایک حلقہ ایسا ہے جو امید کا دامن چھوڑ بیٹھا ہے جو مستقبل سے مایوس ہو رہا ہے۔ جو انسانوں سے متنفر اور حکومت سے خائف ہے۔

یورپ کے ادیبوں میں فاشزم دشمنی مسلم تھی۔ یہ ادیب فسطائی رجحانات کی مخالفت تو کر رہے تھے لیکن وہ ان منبعوں پر حملہ کرنے سے گریزاں تھے جن سے یہ رجحانات پھوٹ رہے تھے۔ یہ ادیب فسطائی اور فسطائیت نواز ممالک میں ادب اور تہذیب کی بیخ کنی پر کراہ تو رہے تھے، لیکن وہ یہ تیز پوری شدت سے محسوس نہ کر رہے تھے کہ ادب اور تہذیب اس وقت تک اسی طرح مٹتی رہے گی جب تک کہ سرمایہ داری نظام باقی ہے۔ ہٹلر، ٹوجو اور مسولینی اس وقت تک جنم لیتے رہیں گے جب تک کہ دنیا میں منافع خوری اور استحصال کرنے والا نظام باقی ہے۔ مرادیب یہ بھی محسوس نہ کر سکے کہ کونسا طبقہ زوال پذیر نظام کے خلاف لڑ سکتا ہے۔ یہ ادیب یہ بھی محسوس نہ کر سکے کہ کونسا فکر اس جنگ میں سرمایہ دار نظام کو شکست دے سکتا ہے۔ اس لئے اس کا نتیجہ مایوسی اور پست ہمتی میں ظاہر ہوا۔ اور بہت سے ادیبوں میں تو نیم فسطائی رجحانات جڑ پکڑ گئے۔

مگر جب واقعی فسطائی فوجیں اپنے ہتھیار لے کر ول سے لیس یورپ پر چڑھنے لگیں، اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ پورا یورپ ہٹلر کے پاؤں تلے روندا جائے گا تو اس وقت یورپ کے ادیبوں کی آنکھیں کھلیں۔ ان کی انسانیت دوستی نے نہ صرف اس فکر کو پہچانا بلکہ انہوں نے اس طبقے کی راہنمائی کو بھی تسلیم کیا جو فاشزم، رجعت اور تاریکی کو کامیابی سے للکار رہا تھا۔ اور یہ حیرانی کی بات تھی کہ یورپ کے اکثر ممالک میں عوام نے نہ صرف سیاسی طور پر ہی کمیونسٹ پارٹی اور مزدور طبقہ کی راہنمائی تسلیم کی بلکہ ہر با جس ادیب کو بھی ان ہی صفوں میں جگہ ملی۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ گو بہت سے ادیبوں، کالج کے پروفیسروں اور بعض اہل علم کے لئے یہ نہایت تلخ ہے۔

دوسری جنگ ختم ہوئی، فسطائیت کے بہت سے اہم ستون ایک ایک کر کے گر گئے۔ بہت سے ممالک میں نیا نظام وجود میں آیا۔ جمہوریت کی نئی تشریح ہوئی، اور عوامی جمہوریت عمل میں آئی۔ مگر اس کے باوجود شہنشاہیت اور فسطائیت ہنوز زندہ ہیں۔ اور وہ دنیا کو ایک بار پھر جنگ کے شعلوں اور تاریکی کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل دینا چاہتی ہیں۔

اس لئے یہ ضروری ہے کہ آج ہم اپنے اردگرد بھی نگاہ دوڑائیں اور دیکھیں کہ کہیں ہمارے ہاں بھی فسطائی رجحانات تو نہیں ابھر رہے۔ کہیں ہمیں بھی نئے قسم کے ہٹلر، مسولینی اور ان کے کاسہ لیسوں سے پالا تو نہیں پڑنے والا۔ کہیں یہاں پر بھی زبان پر پابندی تو نہیں لگنے والی۔ کہیں یہ دھرتی بھی تو غلامی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بعد سرمایہ دارو

کی حرص و آز کی آماجگاہ تو نہیں بننے والی۔ یہی سوال ہیں جو ہر سوچنے والے اور لکھنے والے کو پریشان کر رہے ہیں۔ اور جو ادیب پریشان نہیں ہو رہے وہ یقینی طور پر ادب اور زندگی کا ناطہ توڑ بیٹھے ہیں۔

وقار عظیم نے ادب لطیف کے سالنامہ ۱۹۵۷ء میں ادب اور پاکستانی ادیب کے عنوان سے ایک مقالہ سپرد قلم کیا ہے۔ اور انہوں نے کچھ اسی قسم کے حالات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

"انتشار کی دنیا میں قدروں کا سارا نظام تہ و بالا ہو گیا ہے۔ انسانیت پر وحشت و درندگی کا غلبہ ہے۔ محبت پر نفرت مستولی ہے۔ نیکی پر بدیوں کا پردہ پڑ رہا ہے۔ اور رجعت کی قوتیں ان حالات سے ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ استحصال مجبوروں اور بے بسوں کی مجبوری اور بے بسی کی بنیادوں پر اپنے ایوانِ کی تعمیر میں مصروف ہے۔ رجعت پسندی اگر اسی طرح بغیر کسی روک ٹوک کے مصروف عمل رہی تو ساری زندگی پر ان کا قبضہ ہو جائے گا۔"

وقار عظیم نے واقعی ایک باحس ادیب ہونے کی حیثیت سے حالات کا صحیح جائزہ لیا ہے۔ اور آگے چل کر وہ ان حالات کو بدلنے کے لئے بھی کہتے ہیں۔ لیکن آج جو حالات ہیں وہ اس وقت تک نہیں بدلے جا سکتے جب تک کہ موجودہ دور انتشار کی وجوہات نہ تلاش کی جائیں۔ اور اس مخرج کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند نہ کر دیا جائے جن سے نفرت، وحشت رجعت، اور استحصال کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ کیونکہ جب تک یہ مخرج باقی رہے گا یہ رجعتی رجحانات ابھرتے رہیں گے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ رجحانات ہمارے ادیبوں کا گلا ہی گھونٹ دیں۔ اپنی حقائق پر نگاہ رکھئے کہ آج اس دور وحشت میں کتنے لکھنے والوں کو ان نئے فرائض کا احساس ہوا۔ بلکہ بہت سے لکھنے والے تو خود اسی دور وحشت اور رجعتی رجحانات کا شکار ہو گئے۔ بہرحال ان کے خیالات میں پراگندگی اور انتشار خود جھلکنے لگ گیا۔

اس وقت پوری دنیا ایک بار پھر تسلطائی طاقتوں اور ان کے نعروں سے لرزاں و ترساں ہے۔ اور اب ان نعروں کی گونج صرف یورپ کے میدانوں میں ہی نہیں سنی جا رہی بلکہ پاکستان اور ہندوستان کے گلی کوچوں میں بھی حکمران طبقے اسی قسم کے نعرے لگا رہے ہیں اور عوام کے ایک طبقے میں بھی یہ نعرے مقبولیت حاصل کر رہے ہیں۔

حقیقت میں آج سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام معیشت اتنے گل سڑ گئے ہیں کہ ان کی زندگی کا انحصار ہی فسطائیت کی صورت میں باقی رہتا ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ جو ممالک بھی معیشت کے ان گلے سڑے نظاموں کو سینے سے لگائے رہیں گے آج وہیں یہ تسلطائی رجحانات ابھریں گے۔

پچھلے دس برس میں اس نیم براعظم میں کانگرس اور مسلم لیگ نے جو روش اختیار کی آج کے عوام دشمن، رجعت پسند اور تسلطائی رجحانات اسی کی کوکھ سے پھوٹے ہیں۔ اور جب اس سیاست نے برطانوی شہنشاہیت سے ناطہ جوڑا تو نہیں دبے ہوئے رجحانات کو ہوا ملی۔ اور آتش فشاں پہاڑ کی طرح پھٹ پڑے۔ ۱۵ اگست کے سوراج کی جب پہلی کرن پھوٹی تھی تو یہ کوئی نئے اور آزاد دور کا پیام نہ لائی تھی۔ بلکہ یہ اشارہ تھا کہ اس نیم براعظم میں پچھلے دس سال سے جو المیہ کھیلا جا رہا ہے یہ اس کے منتہائے عروج کا اعلان ہے۔

کہنے والے ممکن ہے کہیں کہ یہ تو ایک مخصوص رجحان کا اظہار ہے۔ لیکن ۱۵ اگست کے بعد کی تحریریں اس بات کی شاہد ہیں کہ تمام انسانیت دوست ادیب جن کا تعلق کسی سیاسی جماعت یا سیاسی فکر سے نہیں ان کو بھی اس

آزادی میں کچھ گھوٹ نظر آیا ہے۔ ان کے کام و دہن آج بھی اس تلخی کو محسوس کر رہے ہیں۔ اب یہ ان ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ اس تلخی اور اس گھوٹی آزادی کا تجزیہ کریں۔ کیونکہ اس کے بغیر یہ تلخی اور گھوٹ دور نہ ہو سکے گی۔

چنانچہ آج اس دور انتشار نے اگر ایک طرف ادیبوں کے خاص حصے کو متاثر کیا ہے اور ان کو خیر کی اقدار کی حفاظت کے لئے متحرک کیا ہے تو دوسری طرف کھلم کھلا طور پر عوام دشمن رجحانات کی تبلیغ بھی شروع ہو گئی ہے۔

لیکن افسوس کا مقام ہے کہ جو گروہ خیر کی اقدار کی حفاظت کا خواہاں ہے اس نے بھی حالات کا صحیح جائزہ نہیں لیا۔ اور شدت بحران کا احساس نہیں کیا۔ اگر کیا ہوتا تو یقینی طور پر ڈاکٹر عظیم جیسی شخصیت خالی خولی عقلوں تک اپنے مقالے کو محدود نہ رکھتے بلکہ وہ اس دور انتشار کی وجوہات کی تلاش کرتے۔ اور ان غلط رجحانات کو تشکیل کے قاری کے سامنے پیش کرتے۔

کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ۱۸۵۷ء کا دور ہمارے ہاں شدت بحران کی وجہ سے ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ یہ دور بھی دور انتشار تھا۔ لیکن اس دور انتشار نے سر سید، شبلی، نذیر احمد، محسن الملک کو پیدا کیا۔ ان کی اہمیت یہ ہے کہ وہ بھی مسلمان تھے۔ اسلام کے نام لیوا تھے۔ لیکن اسکے باوجود ان کا اسلام جمہور کا اسلام تھا۔ اور شبلی اسی لئے دوزخ سے زیادہ جمہوریت کے مبلغ تھے۔ انکو تمام وہی اسلامی شخصیتیں مرغوب تھیں، جو جمہوریت کیلئے قابل تقلید تھیں لیکن آج اسلام جمہوریت دشمن رجحانات کیلئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ اس وقت اسلام کی حفاظت کی ذمہ داری گلے سڑے جاگیرداروں اور انکے کاسہ برداروں کے ہاتھ میں ہے۔ اور جب ایک رو بہ زوال طبقہ کسی بھی فکر کو استعمال کرتا ہے تو اس کو وہ اپنے طبقاتی مفاد کی حفاظت کے لئے استعمال کرتا ہے۔ مگر ہمارے کتنے ادیبوں نے اسکے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ اور تو اور وہ ادیب بھی خاموش ہیں جو مسلم غیر مسلم عوامی کلچر اور نہ جانے کیا کیا مسلم کے قائل ہیں۔

اقبال کو لیجئے، آج اقبال کو رجعت پسندوں، جاگیرداروں کی حمایت میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ اسکے اشعار کی غلط تفسیریں کی جا رہی ہیں اور اس کے نام پر حکمران طبقہ اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہا ہے۔

کتنے ادیبوں نے اسکے خلاف آواز اٹھائی۔

اسلامی نظام حکومت کے نام پر فسطائی نظام تیار کیا جا رہا ہے۔ اور جو ادارے ایسے نظام کے محرک ہیں انکو حکومت کی پشت پناہی حاصل ہے۔ انکو تبلیغ اور نشر و اشاعت کی پوری سہولتیں مہیا کی جا رہی ہیں۔

ریڈیو کو ملک و قوم کی تہذیبی نشو و نما کیلئے نہیں بلکہ حکمران طبقے کے مفاد خصوصی کی حفاظت کیلئے استعمال کیا جا رہا ہے۔

پرانے اور دقیانوسی رسوم کو سرکاری حمایت حاصل ہو رہی ہے۔ سائنس سے زیادہ MYTH پر زور دیا جا رہا ہے۔

ایسے موقع پر یہ مطالعہ کافی پر لطف رہیگا کہ یورپ میں فسطائی نظام سے پہلے کیا کیا رجحانات ابھر رہے تھے۔ مگر مضمون کی طوالت مانع ہے۔ بہرحال آج ان رجحانات کا ہر ادیب کو مقابلہ کرنا ہوگا۔ ورنہ یہ بحران اور شدت اختیار کر جائیگا۔ اس لئے آج کے حالات میں یہ بھی ضروری ہے کہ ہمارا ادیب نہ صرف ان حالات کا تجزیہ کرے، بلکہ وہ ان حالات کو بدلنے کیلئے ان طبقوں سے رشتہ جوڑے جو ایک نئے نظام کی تخلیق کیلئے کوشاں ہیں۔ اسلئے نہیں کہ یہ مزدوروں اور کسانوں کی لڑائی ہے۔ بلکہ اس لئے کہ یہ ہماری اپنی لڑائی ہے۔ اگر آج یہاں پر سماجی اونچ نیچ ختم نہیں ہوتی تو اس کا نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ ہمارے فن کو بھی جلا نہ مل سکیگی۔ اگر فسطائیت یہاں پر مسلط ہو گئی تو صرف ایک مخصوص سیاسی رجحان کے ادیبوں کو ہی چو میخہ کر کے نہیں چھوڑ دیا جائیگا بلکہ پوری تہذیب اور ادب کا ہی گلا گھونٹ دیا جائیگا۔

انتظار حسین

# قیوما کی دُکان

صبح ہی صبح جب میں لحاف میں منہ لپیٹے پڑا ہوتا اور نیم غنودگی کی کیفیت مجھ پہ طاری ہوتی تو یکایک بدھن کی "دودھ لو دودھ" کی دلآویز صدا دور کی کسی دوسری دنیا سے خواب میں لپٹی ہوئی آتی معلوم ہوتی۔ ادھر اس نے آواز لگائی اور ادھر میری آپا نے مجھے جھنجھوڑا "اٹھ اٹھ بے کرتیں، جا دودھ لے کے آ۔" اور میں کروٹ لینے نہیں پاتا تھا کہ پھر ایک وار ہوتا "ارے اٹھتا کہ نہیں، پڑھنا نہ لکھنا۔ شام سے سنّاتا ہے۔ دنیا کے بچوں کو دیکھو بارہ بارہ بجے رات تک پڑھتے ہیں اور پھر اندھیرے سے اللہ کے کتاب پہ جُٹ جاتے ہیں۔ اس کم بخت نے ہر طرح سے ڈوب ڈال رکھی ہے۔" اور میں قہر درویش بر جان درویش اٹھتا اور گلاس لے کے دودھ لینے چلا جاتا۔ خیر صاحب دودھ لانا میرے ذمے تھا اور میں لا دیتا تھا لیکن بات یہاں آکر ختم تھوڑا ہی ہوتی تھی۔ میں نے دودھ کا گلاس آپا کے ہاتھ میں تھمایا۔ انہوں نے اسے غور سے دیکھا، ایک دو جھٹکے دئے اور پھر چلانا شروع کر دیا "اے لوٹے کی باتیں۔ یہ دودھ دیا ہے کم بخت نے۔ نرا پانی۔ جا اسے اس کے منہ پہ مار آ۔ ایسے کوئی مفت کے پیسے آ گئے ہیں ہمارے پاس۔" اور دودھ کو اس کے منہ پہ مار آنا ہی بس اپنے بس کا نہیں تھا بدھن ایسا کوئی گیا گذرا تو تھا نہیں۔ اسے تو اس کی پروا بھی نہیں تھی کہ کون اس کا دودھ خریدتا ہے کون نہیں خریدتا۔ اس کے خریدار تو بہتیرے تھے۔ مجھے ذرا بھی دیر ہو جاتی تھی تو وہ ٹکا سا جواب پکڑا دیتا تھا "دودھ نئیں ہے جی اب۔" اور پھر آخر ہمارے پاس اس بات کا ثبوت ہی کیا تھا کہ بدھن دودھ میں پانی ملاتا ہے۔ یہ تو دراصل نظریات کا فرق تھا۔ اسی دودھ کے لئے بدھن مکھن کی تشبیہ استعمال کرتا تھا۔ اور جب گھر لے کے پہنچتا تھا تو آپا اسے "نرا پانی" بتاتی تھیں۔ اس نظریاتی اختلاف سے قطع نظر بدھن اپنی قسم کا ایک ہی آدمی تھا۔ لمبا تڑنگا۔ کالا رنگ۔ گٹھا ہوا جسم۔ ہاتھ میں ہر وقت لاٹھی لگی رہتی تھی۔ دودھ دوہتے وقت بکری کی ٹانگ اس انداز سے دباتا تھا کہ مجال نہیں ذرا چوں چرا کر جائے۔ نیوٹ غضب کی جانتا تھا۔ دور دور کے گاؤں میں اس کی لٹھیا کی دھوم تھی۔ بڑے بڑوں کے اس نے سر توڑے تھے۔ اسی لئے اس کے دشمن بھی بہت ہو گئے تھے۔ کئی دفعہ تو جنگل میں اسے ڈاکوؤں نے گھیر بھی لیا تھا۔ لیکن بدھن بھلا مار کھانیوالا تھا۔ اسے تو اپنی لٹھیا پہ بھروسا تھا۔ بیٹھے بے کھٹکے رات بیرات کو جہاں جی چاہے گھومتا تھا۔ رات کو قیوما کی دوکان پہ آ کے اس کی باتیں سنو۔ قیوما کی دوکان پہ رات کو بلا ناغہ دودھ پینے آیا کرتا تھا۔ مگر دودھ پینے کے معنی یہ تھوڑا ہی ہیں کہ آئے دودھ پیا کلھڑ پھوڑا پیسے پھینکے اور چلتے بنے۔ اور قیوما کی دوکان پہ دودھ پینے والے تو دودھ کو ثانوی حیثیت دیتے تھے۔ میں تو آپا کے ڈر کے مارے گیارہ بارہ بجے گھر چلا آتا تھا اور پھر بھی ڈانٹ پڑتی تھی۔ اللہ ہی جانے یہ بیٹھک رات کو کب تک جمی رہتی تھی۔ بدھن، حسینی گدی، رمضانی قصائی، الطاف پہلوان، مُرچی اور کہاں تک نام گناؤں یوں سمجھ لو کہ محلہ کے سارے چھٹے چھٹائے آ کے بیٹھ جاتے تھے اور پھر وہ زمین آسمان کے قلابے ملائے جاتے تھے کہ بس دیکھا ہی کرو۔ حسینی گدی کی تو خیر الگ بات تھی۔ اس کا تو کام ہی ایسا تھا کہ وہ باقاعدگی سے نہیں

آسکتا تھا۔ چنانچہ کبھی کبھی تو وہ مہینہ مہینہ دو دو مہینہ کو غائب ہوجاتا تھا۔ اور اگر کہیں پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا تو سالوں کی خبر لاتا تھا۔ اس کی بات تو کچھ سندباد جہازی کی سی تھی۔ تھوڑے دن کے لئے گھر آیا۔ پیسہ کوڑی گھر میں رکھا۔ فیوما کی بلاں پہ مہر کے سلنے۔ اور پھر جہاد کی نیت سے روانہ ہوگیا۔ الطاف کا یہ تھا کہ وہ پہلوان آدمی تھا۔ بڑی باقاعدگی سے دودھ پینے آتا تھا اور ویسے بھی استاد نے اس سے کہہ رکھا تھا کہ "بے الطاف جورو کے پاس گیا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا" سو اس کا بس چلتا تو وہ ساری رات فیوما کی دوکان پہ ہی گذار دیا کرتا۔ الطاف کی کاٹھی بڑی اچھی تھی۔ تھوڑے دنوں میں اس نے تو وہ رنگ دکھایا کہ سارے میں ہوا بندھ گئی۔ اور جب ہوا تو اس نے پچھاڑ دیا تو ہر ایک کی زبان پہ الطاف ہی الطاف تھا۔ رمضانی قصائی کی بات ہی الگ تھی۔ اگر ایک طرف وہ حسینی کی ٹکر کا تھا تو دوسری طرف بدبن سے بھی کم نہ تھا۔ ہم میں اس کی ذات پہ بڑی بڑی بحثیں ہوتی ہیں۔ حبیب کی رائے یہ تھی کہ رمضانی کا نام ہی نام ہے دم خم کے تو وہ بیر کے۔ پر یہ بھی نہیں ہے۔ لیکن منے کا کہنا یہ تھا کہ "بدبن تو کل کا چھوکرا ہے۔ لٹھیا کے جو ہاتھ رمضانی کو معلوم ہیں انکی تو بدبن کو ہوا بھی نہیں لگی ہے" اور منتا اپنی بات کے ثبوت میں بہت سے تاریخی شواہد بھی پیش کرتا تھا۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس سلسلہ میں منے کی رائے اعتدال پسندانہ ہونے کے باعث زیادہ وقیع تھی۔ جب حبیب اور منے میں بہت زیادہ گرما گرمی ہونے لگتی تو وہ کہتا کہ "دیکھو بھئی بات یہ ہے کہ بدبن تگڑا بہت ہے۔ جس کے اس کی لٹھیا پڑ جائے سالا اللہ نہیں سکتا۔ مگر پھر وہ ابھی کل کا بچہ ہے۔ رمضانی بہت گھاگھ ہے۔ داؤں اسے بہت یاد ہیں" اور اس بات کا تو وہی ہوتا جو مرزا باسط کے اس جملہ کا ہوا تھا کہ "ایک کا کلام آہ ہے اور ایک کا واہ ہے"۔ یہ دونوں بھی ہے۔ جس طرح ہم میر کو سودا پر اور سودا کو میر پر ترجیح نہیں دے سکتے۔ اسی طرح یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ رمضانی بدبن سے بڑھا ہوا تھا۔ یا بدبن رمضانی سے بڑھا ہوا تھا۔ رہی حسینی اور رمضانی کے مقابلہ کی بات تو حسینی کی عظمت اسی سے ثابت ہے کہ کوئی یہ نہیں بتا سکتا کہ وہ جیل میں زیادہ رہا ہے یا گھر پہ زیادہ بیٹھا ہے۔ لیکن بہت سی باتوں میں رمضانی اس سے بڑھا ہوا تھا۔ جس طرح کوئی شخص حسینی کے قید میں رہنے کی مدت کا تعین نہیں کر سکتا تھا اسی طرح کوئی شخص رمضانی کی بیویوں کی تعداد بھی ٹھیک نہیں بتا سکتا۔ جب بھی وہ مہم سے واپس آتا تھا تو اور بہت سی چیزوں کے ساتھ ایک بیوی بھی لاتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس محنت کے باوجود کسی نے اسکے گھر میں کبھی دو سے زیادہ عورتیں یک وقت نہیں دیکھیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ رمضانی حسینی اور بدبن وغیرہ کا آپس میں موازنہ کرنا غلط ہے ان کی تو اپنی الگ الگ شخصیتیں تھیں۔ نہ وہ آپس میں کسی سے بڑے تھے نہ کسی سے چھوٹے تھے۔ خیر تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ان سب کا جمگھٹا فیوما کی دوکان پہ رہتا تھا۔ اور جس نے بھی فیوما کی دوکان دیکھی ہے وہ حسینی، رمضانی، بدبن، الطاف، اور کرچی کو نہیں بھول سکتا۔ آپ کرچی کے لفظ پر لاکھ ناک بھوں چڑھائیں لیکن میں تو کرچی ہی کہونگا۔ میں کوئی ماہر لسانیات تو ہوں نہیں کہ یہ تحقیق کرتا پھروں کہ کنورجی بگڑ کر کرچی کیسے بن گیا۔ اور نہ مجھے زبان دانی کا خبط ہے کہ زیر زبر درست کرکے کنورجی کہوں۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ کرچی کی پوری شخصیت کا اظہار کرچی میں ہی ہوتا ہے "کنورجی" میں نہیں۔ کرچی بھی واقعی کیا چیز تھے۔ انہیں غمگین تو کسی نے آج تک دیکھا ہی نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ مجلس میں رونے والوں میں ان کی آواز سب سے بلند ہوتی تھی۔ لیکن اس قسم کی عینی شہادت کوئی نہیں ملتی کہ انکے آنسو بھی واقعی نکلتے تھے۔ اور پھر غم حسین میں گریہ و زاری تو اپنا ایک الگ خانہ رکھتی ہے۔

اسے آپ عام قسم کے غم و حزن میں خلط ملط کیوں کریں۔ یہاں مجھے ایک بات اور یاد آگئی کمرچی کے خسر کی بلی
کو بلی لے گئی تھی۔ اس موقعہ پر انہوں نے ایک بڑا پر سوز نوحہ لکھا تھا۔ اور اگر یہ نوحہ انیس کی بکری کے مرثیہ کی طرح
مشہور نہیں ہو سکا تو اسے ان کی بے نیازی سے تعبیر کیجئے یا بدقسمتی سے۔ کم از کم ان کی شعری صلاحیتوں پر اس وجہ
کی بنا پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ دورہ لگانے کا مرض کمرچی کو بھی تھا۔ لیکن وہ دو تین دن سے زیادہ کہیں نہیں ٹکتے
تھے۔ ہر دورہ کے بعد وہ کسی نئے نواب نئے رئیس کا ذکر کرتے آتے تھے۔ اور جب وہ اپنی عقلمندی اور اس
نواب کی قدردانی کا ذکر کرتے تو ان کی باتوں میں ایک دبی دبی حسرت جھلکتی کہ کاش وہ بھی کسی راجہ مہاراجہ کے مصاحب
ہوتے۔ انہیں اس بات کا احساس کبھی نہ ہوا کہ قیوما کی دوکان کے چبوترہ پہ ان کی حیثیت خود ایک راجہ کی سی تھی۔ کمرچی
کو دوسروں کو آپس میں لڑانے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ بس ان کا کام تو یہ تھا کہ کوئی شوشہ چھوڑ دیا اور پھر لگ بھگ آپس میں گتھ
جاتے تھے اور کمرچی تماشہ دیکھتے رہتے تھے۔ اگر ان بحثوں کا کبھی کوئی بیا تلا نتیجہ نہیں نکلا تو یہ اک الگ بات ہے۔ الطاف
اپنے خلوص اور عقیدتمندی کے باوجود کبھی یہ ثابت نہ کر سکا کہ اس کا استاد بندے کلو خاں سے اچھا گویّا ہے۔ یوں
بحثیں تو بہت ہوتی ہیں اور حسینی نے اپنی صفائیاں بھی بہتیری پیش کی ہیں۔ لیکن یہ مسئلہ آج بھی اتنا ہی پر اسرار اور اتنا ہی
الجھا ہوا ہے کہ نوا تیلی والے کے پاس اتنے روپے منڈوے اڑانے کو پیسے کہاں سے آتے تھے۔ بات کبھی کبھی
سیاست تک بھی پہنچ جاتی تھی۔ صدیق نائی اگرچہ "انجام" بلاناغہ پڑھتا تھا اور ممبر صاحب کی بیٹھک میں حجامت کے
دوران میں اس نے سید بھائی کی بصیرت افروز سیاسی بحثوں سے استفادہ بھی کیا تھا۔ پھر بھی وہ بدہن کو کبھی قائل
نہ کر سکا۔ یوں صدیق اسے اپنی علمیت کے زور سے گھیرے میں لے آتا تھا۔ لیکن بدہن کا ایک آخری حربہ اتنا موثر
تھا کہ صدیق چاروں خانے چت جاتا تھا۔ بدہن کہتا "بس جی۔ ہمیں تو تم ایک بات بتا دو۔ یہ تمہارے جناح صاحب
ڈاڑھی کیوں نہیں رکھتے"۔ اور یہاں آکر صدیق واقعی بغلیں جھانکنے لگتا۔ لیکن رمضانی نے ایک روز اس بات کا
بڑا منہ توڑ جواب دیا۔ کہنے لگا کہ "بھیا یہ جتنے تمہارے مولبی لوگ ڈاڑھی رکھے رکھے پھرے ہیں سب ڈاڑھی
کی اوٹ میں شکار کھیلے ہیں"۔ بدہن کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ کہنے لگا "دیکھ بے رمضانی علماؤں کی شان
میں بے ادبی ہوگی تو تو ہی جانے گا"۔

رمضانی بولا "ابے سچی بات کہہ دی تو تتئے لگ گئے"۔

"بیٹا تیرے لگ گئے یا میرے لگ گئے" بدہن بولا "جواب نہیں بن پڑا تو علماؤں پہ آگیا۔ ابے یہ تمہارے
جناح صاحب مسلمانوں کے لیڈر بنے ہیں۔ نماز یہ نہیں پڑھتے۔ روزہ یہ نہیں رکھتے۔ اور بھئی خدا کی قسم انگریز سے
انہیں تنخواہ ملتی ہے"۔

"پیارے یہ بات تمہارے علماؤں میں ہے۔ ایک ایک علما کی کانگرس سے تنخواہ بندھی ہوئی ہے۔ مزے
کرتے ہیں پٹھے"۔

"دیکھ بے رمضانی۔ زبان سنبھال کے بول" بدہن پھر بھنایا۔

رمضانی کو بھی طیش آگیا "ابے بے کس بھلاتے ہیں۔ چیر کے دو کر دونگا سالے"۔

کمرچی نے جو دیکھا کہ بات بگڑتی ہی جا رہی ہے فوراً بیچ میں آ گئے "ابے سالا سڑہ کیا کرتا ہے۔ کونسی

"تو نے بہن بیاہ دی ہے مجھا پنی۔ اور ادھر بدبن تجھ میں بڑی گرمی آرہی ہے۔ سالے بیاہ کیوں نہیں کرلیتا۔ ورکوئی نہیں تو ستو ہی سہی۔ اگر بینگی ہے تو کیا ہے۔ ویسے تو پھول کے دنبہ ہو رہی ہے۔"

اور پھر تو چاروں طرف سے وہ قہقہے پڑے کہ بدبن اور رمضانی دونوں کا اچھے خاصا تن جھنس گیا۔ کرچی نے پھر اپنا رخ دوسری طرف پلٹا۔ "ابے خبے اختر والے۔ یہیں سوئے گا کیا۔ گھر نہیں جانا؟"

"ڈر لگے ہے کرچی"۔ بندو نے کہا۔

اور منا فوراً بولا۔ "ابے بندو پیپل کے سامنے سے سنبھل کے نکلیو۔"

حسینی نے ڈانٹ بتائی۔ "کیوں ڈراتا ہے بے لونڈے کو جا بندو بھیا چلا جا کچھ بھی نہیں ہے۔ تو سالا کیا ہے؟"

"بیا سے اس پھلائے سے مت رہنا۔ مار کھا جاؤ گے۔" الطاف بولا۔

"ہاں کھائی مار۔"

"اچھا جی۔ یاں بیٹا تمہارا چقو کام نئیں آئے گا۔"

"الطاف بھیا چپکا بیٹھا رہ نا۔ کیوں بحث کرے ہے۔ صبح شام گئے ڈسٹرپیل آئے۔ قبوما کی دوکان پہ اسے گپیں مارلیں۔ تو نے دنیا دیکھی کاں ہے۔ ابے ہماری تو عمر ہی ان چکروں میں گذری ہے۔ وہ یاد نئیں اپے جب برس کے سال میرے پیچھے پولیس لگ گئی تھی تو ڈیڑھ مہینہ تک ایک ٹوٹی ہوئی قبر میں پڑا رہا تھا۔ حفیظا وقت بے وقت آکے کھانا دے جاتا تھا۔ چاروں طرف قبریں ہی قبریں تھیں۔ مگر یار کو تو کچھ نہیں ہوا۔"

الطاف بولا۔ "اجی یہ تو سو قصہ ہے کہ کچھ نہیں ہوا۔ مگر اگر کچھ ہو جاتا تو ساری مردی رکھی رہ جاتی۔"

"اچھا جی جیسے ہم نے کچھ دیکھا ہی نہیں ہے۔ بھئی قسم اللہ پاک کی ایسے ایسے جنگلوں میں گھوما ہوں جہاں آدم ہوتا تھا نہ آدم ذات بیٹا تم ہوتے تو کلیجہ پھٹ جاتا۔ ایک دفعہ تو مہینہ بھر تک جھاڑیوں میں چھپا پڑا۔ سالا سارا جنگل سائیں سائیں کرتا تھا۔ اور واں اک تلیا جو تھی واں سے تو کلام مجید کی قسم رات بھر چھپو چھپو کی آواز آئی تھی۔ آخر جی ایک دن میں اٹھ کے چلا۔ غضارات کے بارہ بجے ہوں گے۔ چاروں طرف سناٹا ہی سناٹا۔ اماں کیا دیکھوں ہوں کہ ایک لمبا تڑنگا آدمی چلا آرہا ہے۔ میں نے سوچا ہوگا کوئی سالا گنوار۔ بچکے نکل جاؤں۔ سوچ میں کھیت کے ڈول ڈول ہولیا۔ اماں تھوڑی دیر بعد کیا دیکھوں ہوں کہ وہ سالا پھر سامنے سے چلا آرہا ہے۔ اور آنکھ جو جھپکوں ہوں تو کھٹ سے میرے سامنے۔ کہنے لگا کہ پنجہ لڑا لے۔ ہم نے کہا کہ آجا سالے۔ بس ڈٹ گئے۔ نہ ہمارا پنجہ مڑے نہ اس کا۔ بھئی قسم اللہ پاک کی اس کا ہاتھ لوہا تھا لوہا۔ میں بھی سوچوں کہ یہ کون سا جودھا آگیا جو ہم سے ٹکر لیوے ہے۔ اس کے پیروں کو جو میں نے دیکھا تو میری ہوا ہی تو کھسک گئی۔ اس کے تلوے آگے اور پنجے پیچھے۔ میں نے جناب نل پڑھنی شروع کر دی اور زور کئے گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں سالا خنخناتا ہوا بھاگا۔"

"کوری گپ"۔ رمضانی نے فقرہ لگا

"بھئی اللہ پاک کی قسم جو ذرا سا بھی جھوٹ ہو۔" حسینی نے حلفیہ انداز میں کہا۔

الطاف بولا: "اچھا تو تو بیٹھے جمعرات کی شام کو اس پیپل کے نیچے سے نکل کے دکھا۔"

"اور نکل گیا تو؟"

"پر جی شرط یہ ہے کہ سر میں چنبیلی کا تیل ڈال کے اور ہاتھ میں دودھ کا کٹورا لے کے نکلو۔"

"ربی۔ بول کیا کھلائے گا؟"

"افیمی کے پیڑے"

"ربی؟"

"ربی"

"کرم جی سن رہے او۔ گواہ رہنا۔"

"ہاں بے سن رہے ہیں۔ گواہ ہیں۔"

کرم جی قیوما کی اسی دوکان پہ نہ معلوم کتنی شرطوں کے گواہ رہ چکے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں سے شاید ہی کسی شرط کے پورا ہونے کا موقعہ آیا ہو۔ لیکن قیوما جیسا بے نیاز آدمی بھی کم دیکھنے میں آیا ہے۔ اسے کیا مطلب کچھ بھی ہو۔ اگر اسے تو اپنی دودھ کی کڑھائی اور کڑھائی کے نیچے جلتی ہوئی آگ سے مطلب تھا۔ دنگل کی باتیں ہوتی رہتیں اور جن بری کے قصے چلتے رہتے، اور کبڈی اور گلی ڈنڈے کے میچوں پہ تبصرے ہوتے رہتے۔ اور قیوما اسی ایک انداز میں آنکھیں جھپکاتے ہوئے دودھ چلاتا رہتا۔ اور پھر آگ پھونکتا اور پھر دودھ چلانے لگتا اور پھر کسی کو دودھ دینے لگتا۔ اور یکایک کوئی لونڈا آتا اور آتے ہی ساری دوکان سر پہ اٹھا لیتا "ابے قیوما قیوما۔ جلدی دے نا۔ دو پیسے کی جا۔ ابے دیتا ہے یا نہیں؟" خواہش اس کی یہ ہوتی کہ جتنی دیر لگ جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ ایک ہاتھ سے وہ پیسے بجاتا اور دوسرے ہاتھ بڑی خاموشی سے نُقلوں کی تھال کا جائزہ لینا شروع کر دیتا۔ قیوما نے آج تک کسی لونڈے کو نہیں ٹوکا۔ اگرچہ یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ وہ اپنی نیکی کی وجہ سے خاموش رہتا تھا یا مروت میں مارا جاتا تھا یا اس کی بھٹی سے نکلتا ہوا دھواں اسے کچھ نہیں دیکھنے دیتا تھا۔ میں تو قیوما کو نیک ہی کہونگا۔ اگرچہ میری یہ رائے میری آپا کی رائے سے بالکل متضاد ہے۔ میں یہ بات تسلیم کرتا ہوں کہ قیوما کے دودھ کی دبیز ملائی سنگھاڑے کی بینگ کی مرہونِ منت ہوتی تھی۔ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ اس کے پیڑوں میں ماوا کم اور شکر زیادہ ہوتی تھی۔ مجھے اس سے بھی انکار نہیں کہ اس کے گھی میں مونگ پھلی کے تیل کا میل ہوتا تھا۔ یہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ لیکن اس سے قیوما کی نیکی پر آخر کیا اثر پڑتا ہے۔ اور ایک بات یہ ہے کہ میری آپا کی تنقید تو ہر ایک کے متعلق ہی کچھ تخریبی رنگ لئے ہوئے ہوتی ہے۔ بدھن کا دودھ نرا پانی ہوتا تھا اور قیوما کے گھی میں ملاوٹ ہوتا تھا۔ اور رمضانی بھینس کا گوشت دیتا تھا حالانکہ رمضانی تو میرا بہت ہی لحاظ کرتا تھا۔ جہاں میں پہنچا اور اس نے آواز لگائی "شیخ جی آج بڑا تگڑا جانور کیا ہے۔ کیا یاد کرو گے۔ بس جی میرے کہنے سے آج ہنڈیا میں گھی مت ڈالو تو۔ میں گوشت لے کے خوش خوش گھر آتا۔ آپا نے جہاں کھول کے دیکھا اور آسمان سر پہ اٹھا لیا۔ "اسے ہنے مٹے نے بھینسے کا گوشت دیدیا ہے۔ جا مار یا ای کے سر سے۔" اور ایک آفت ہو تو بھگتی جائے۔ اگر وہ بیچارہ ران کا گوشت دیتا تھا تو اعتراض یہ ہوتا کہ بالکل روکھا ہے۔ ذرا سی بھی تو چکنائی نہیں ہے۔ اگر دوسرے دن ردِ عمل کے طور پر سینہ کا گوشت دیتا تھا تو شکایت۔

ہوتی تھی کہ " اسکے ہیٹے نری ٹلہ ئیں گڈیں ہیں۔ بوٹی تو نام کو نہیں ہے" تو میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ تو کچھ
قوطیت پرست واقع ہوئی ہیں۔ ہاں بھگت جی کے سودے کے متعلق انکی رائیں بالعموم رجائیت پسندانہ ہوتی ہیں۔
ر بھگت جی کا معاملہ تو یہ ہے کہ وہ سارے محلہ میں ہی پاپولر تھے۔ بھگت جی کی دوکان کی دالیں بڑی چھپانی چھکی ہوتیں
نا کھرے کنبوں کا جھگی میں ذرا جو ملاؤ ہو۔ اور پھر اگرچہ وہ بنئے تھے مگر بالکل ٹھیک تولتے تھے۔ اور سب سے بڑی
بات تو یہ تھی کہ دن میں کتنی ہی مرتبہ تم سودا لینے جاؤ اور چاہے دھیلے کا ہی سودا لو لیکن بھگت جی اسی ایک سائز کی
مرخی گڑ کی ڈلی ہر دفعہ ہاتھ پہ رکھ دیتے تھے۔ پھر اس بات کو بھی نہ بھولنا چاہیے کہ انکی دوکان کا تختہ اتنا نیچا تھا کہ
اچک کر بیٹھ سکتے تھے۔ ورنہ بعض ناعاقبت اندیش دوکانداروں نے اتنی اونچی اونچی دوکانیں لے رکھی تھیں کہ
ں کے چبوترے تک بس ہماری گردن پہنچتی تھی۔ بھگت جی کی دوکان پہ تیج بڑی باقاعدگی سے آتا تھا۔ اور وہ اسے
خود ہی نہیں پڑھتے تھے بلکہ دوپہر کو آس پاس کے دوکانداروں کو جمع کرکے اس کی خبریں ہلکی ہلکی حاشیہ آرائی کے
ساتھ پڑھ کے سناتے تھے۔ مختصر یہ کہ سیاسی، سماجی، معاشی، اخلاقی، جغرافیائی غرض ہر اعتبار سے بھگت جی
کی دوکان بہت خوب تھی۔ لیکن پھر بھی وہ بات کہاں جو فیوما کی دوکان میں تھی۔۔ دوکان ان باتوں سے دوکان تھوڑا
ہی بنتی ہے۔ فیوما کی دوکان کی تو کچھ بات ہی اور تھی۔ رہا خوش اخلاقی اور دیانتداری کا معاملہ تو بھگت جی سے بڑھکے
عطار تھے بلکہ کھانسی کی گولیاں اور پیٹ کے درد کا چورن تو وہ لوگوں کو بالکل مفت دیتے تھے۔ بیچارے بڑے
نیک اور بقول شخصے بڑے پکے مومن تھے۔ اور پکے مومن ہونے کی وجہ سے ہی ان میں یہ عیب پیدا ہو گیا تھا کہ
محرم کے دنوں میں انکی دوکان زیادہ تر بند پڑی رہتی تھی۔ بات یہ ہے کہ انہوں نے تو اپنا کچھ فرض سا سمجھ رکھا تھا
کہ ہر مجلس میں شریک ہونگے۔ اور نہ صرف شریک ہونگے بلکہ روئیں گے بھی۔ ورنہ قاعدہ کی بات یہ ہے کہ کسی مجلس
میں شریک ہوئے کسی میں نہ ہوئے۔ اور جس میں شریک ہوئے اس میں کیا ضرور ہے کہ روئیں گے بھی ضرور۔ وقت
اور مصلحت بھی تو کوئی چیز ہے۔ ایک شیخ جی بھی تو تھے کہ چوپال کی مجلس کے سوا کبھی کہیں نہیں روئے۔ صوبیدار صاحب
ایسے بڑے حیدری تھے۔ لیکن ان پہ رقت اپنے امام باڑے میں ہی بیٹھ کر طاری ہوتی تھی۔ اور کرچی کی تو خیر قدریں
ہی الگ تھیں۔ وہ رونے میں بھی ان کا ضروری لحاظ رکھتے تھے۔ مختصر یہ کہ مجلس میں شریک ہونے اور رونے کے
معاملہ میں بقا عطار جتنے ناعاقبت اندیش تھے اتنا شاید دنیا میں اور کوئی نہیں۔ وہ تو یہ کہئے کہ محرم کے زمانہ میں
خوش قسمتی سے بہت سوں کو مخصوص طور پر کھانسی، زکام اور بدہضمی قسم کی شکایات ہو جاتی ہیں۔ ورنہ ان کی دوکان
دس دن تک پٹ پڑی رہا کرتی۔ اونچے والوں کے یہاں کی مجلس ختم کی اور لپک جھپک آئے اور دوکان کھولی۔ انکا
انداز ہی بتا دیتا تھا کہ اس وقت دوکان اپنے فائدہ کیلئے نہیں بلکہ خلقِ خدا بالخصوص مومنوں کے فائدہ کھولی جا رہی
ہے کسی کو ذرا سا چورن دیا کسی کو گولیاں دیں کسی نے آکے شکایت کی کہ "کیا بتاؤں جی نیاز کے ذرا سے چاول کھا
لئے تھے۔ اسی وقت سے پیٹ میں گڑبڑ ہو رہی ہے" انہوں نے جلدی جلدی ایک دو باتیں پوچھیں اور کوئی پڑیا دے
دی۔ کسی نے کہا کہ "جی رات سبیل کا شربت پی لیا تھا، ٹھنڈ سے زکام ہو گیا" اور انہوں نے چٹ پٹ چیز دے کے اسے
بھی نپٹایا اور تھوڑی دیر میں دوکان کو تالا لگا یہ جا وہ جا۔

یہ بات تو ہم نے فیوما کی دوکان ہی میں دیکھی کہ کچھ ہو جائے اسکی دوکان بند نہیں ہو سکتی۔ آندھی آئے۔

مہینہ آئے، مجلس ہو، میلاد ہو، شادی ہو، غمی ہو، کچھ ہو اس کی دکان کھلے اور پھر کھلے۔ اور کھلنے کا سوال ہی کیا تھا۔ اسکی دوکان بند ہوتی ہی کب تھی۔ میں رات کو بارہ بارہ اک اک بجے اسے یونہی کھلا چھوڑ گیا ہوں۔ اور جب صبح اٹھ کر منہ دھونے کے لئے مسجد سے گرم پانی لینے گیا ہوں تو اس کی دوکان کو کچھ اسی طرح کھلا پایا ہے۔ تیوما کی دوکان کے عین سامنے گل محمد صاحب کا امام باڑہ تھا۔ یہاں محرم میں کھچڑا بٹتا تھا اور بارہ وفات کے زمانہ میں میلاد بہت ہوتے تھے۔ اور ایک میلاد تو خاص طور سے حافظ جی کی طرف سے ہوتا تھا۔ بدائیوں کے پیڑے بٹتے تھے۔ بلا کی خلقت ٹوٹتی تھی۔ اور جو کور کسر رہ جاتی تھی وہ یا نبی سلام علیک کی آواز پوری کر دیتی تھی۔ اور اس سارے ڈرامہ میں ایک لمحہ آتا تھا جب سارا ہنگامہ سمٹا ہوا امام باڑہ کے پھاٹک کے پیچھے لہریں لے رہا ہوتا تھا اور سامنے کا چبوترا بالکل خالی ہوتا تھا۔ اور تیوما اسی طرح تنہا بیٹھا ہوا دودھ چلا رہا ہوتا تھا یا آگ پھونک رہا ہوتا تھا۔ کیا مجال کہ وہ کبھی اٹھ کے اپنا حصہ لے آئے۔ اس کا حصہ تو وہیں آجاتا تھا۔ تیوما کا یہ استقلال، یہ بے نیازی، یہ پابندی وقت تاریخ میں یادگار رہے گی۔ اور اس کی دوکان تو خود بہت بڑی تاریخ کو اپنے سینہ میں بند کئے ہوئے ہے۔ اگرچہ یہ بات اسے معلوم نہیں ہے۔ اسے یہ کبھی خبر نہ ہوئی کہ ہماری زندگی میں کونسا روحانی یا سیاسی انقلاب رونما ہونیوالا ہے۔ اور یہ کہ اس انقلاب کی روشنی اس کی دوکان کے پٹڑے سے کیسے پھوٹ رہی ہیں۔ لوگ باگ اچھے برے ہر طرح کے مقاصد لیکر اس پٹڑے پہ آکر بیٹھتے اور بیٹھے رہتے تھے۔ ان میں سے بعض ایسے ہوتے تھے جن کے جسم پٹڑے پہ ہوتے تھے اور روحیں سامنے والی گلی میں ہوتی تھیں۔ تیوما ان کی روح و قلب کے طوفان سے بے نیاز ہمیشہ اپنے اسی ایک کام میں لگا رہتا تھا۔ اس نے اس پراسرار مسئلہ کو سمجھنے کی کبھی کوشش نہ کی کہ اس کی دوکان کے سامنے مخصوص طور پر کیوں چند نقاب اٹھتے ہیں اور چند نقاب گر پڑتے ہیں۔ اس نے اس گتھی کو بھی سلجھانے کا کبھی ارادہ نہ کیا کہ آخر تواتیلی اتنا دودھ اور مٹھائیاں جو اڑا جاتا ہے اس کے پیچھے حسینی کیوں چکاتا ہے۔ اس نے یہ بھید بھی کبھی سمجھنا نہ چاہا کہ یہ بعض بعض لڑکے اس کی دودھ کی کڑھائی کی طرف پشت کر کے کیوں گھنٹوں ایک زاویئے سے بیٹھے رہتے ہیں۔ اور ان کی نگاہیں کیوں سامنے والی گلی کے ایک مخصوص جنگلے پر جمی رہتی ہیں۔ تیوما کی دوکان کھلی رہتی تھی اور لوگ اس سے فیض یاب ہوتے رہتے تھے۔

لیکن وقت بدلتے ہوئے بھی کیا دیر لگتی ہے۔ میں نے اپنی انہیں آنکھوں سے تیوما کی دوکان کو بند پڑے دیکھا ہے۔ اب کسی کو یقین تو کاہیکو آنے لگا ہے۔ لیکن میں قسم کھا کے کہتا ہوں کہ تیوما کی دوکان میں واقعی تالا پڑ گیا حالانکہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ نہ تو تیوما کا دیوالہ نکلا تھا۔ نہ اسکے گھر میں کوئی موت ہوئی تھی۔ اور نہ وہ بیمار پڑا تھا۔ اور پھر کچھ ایسی بات ضرور تھی کہ اسکی دوکان بند پڑی تھی۔ یہ درست ہے کہ اس روز بھگت جی کی دوکان بھی بند تھی۔ اور فقیرا کے چوک میں آلھا اودل پڑھنے والی چوکڑی بھی نہیں جمی ہوئی تھی اور بنا عطار کی دوکان میں بھی تالا لگا ہوا تھا حالانکہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس دن عشرہ نہ تھا۔ اور رمضانی کی دوکان پہ بھی پر مرے لٹک رہے تھے۔ اگرچہ وہ کسی جسم پہ گیا ہوا نہیں تھا۔ اور اس روز بدھن کی دودھ لو دودھ کی آواز بھی سنائی نہیں دی تھی۔ اور اطلاعاً بھی۔ دور کرنے کے لئے اکھاڑے نہیں گیا تھا۔ میں اپنے گھر کے کوٹھے پہ چڑھ گیا۔ چاروں طرف سناٹا ہی سناٹا تھا۔ بھگت جی کی دوکان بھی بند تھی۔ بنا عطار کی دوکان بھی بند تھی۔ چندو پنواڑی اور فقیرا حلوائی اور نھو سنار کی دوکانیں بھی بند تھیں

اور قیوما کی دوکان بھی بند تھی۔ میں نے پھر غور سے دیکھا قیوما کی دوکان واقعی بند پڑی تھی۔ اور اس کے چبوترے پر ایک لڑکا نیم غنودگی کے عالم میں لیٹا تھا۔ یہ بات میرے کیا کسی کے خواب و خیال میں نہیں آئی تھی کہ قیوما کی دوکان ایک روز بند پڑی ہو گی بلکہ قیوما کی دوکان واقعی بند پڑی تھی۔ یہ بات میں نے پہلی مرتبہ دیکھی تھی۔

میں دن تک جگت جی اور بنا عطار، اور جیندو میوا فروش اور نقیرا حلوائی کی دوکانیں بند پڑی رہیں۔ اور قیوما کی دوکان بھی بند پڑی رہی اور ٹوٹی پھوٹی سڑکوں اور کچی گلیوں کا وہ مختصر سا جال بھی ویران پڑا رہا۔ جو جگت جی کی دوکان کو بنا عطار کی دوکان سے اور بنا عطار کی دوکان کو جیندو میوا فروش اور نقیرا حلوائی کی دوکانوں سے اور جیندو میوا فروش اور نقیرا حلوائی کی دوکانوں کو قیوما کی دوکان سے ملاتا تھا۔ وہاں چلتے پھرتے اب پاؤں گنے دکھائی پڑتے تھے۔ یا ہاتھ۔ چھوٹی بزریا میں اور چوک میں مسجد کے پیچھے والی گلی میں خاک اڑ رہی تھی۔ اور بڑی حویلی کے سامنے والے چبوترہ پر پھیلی چپڑی سطح پر گرد کی موٹی تہیں ایسے جم گئی تھیں جیسے کسی پیالے کے ہونٹوں پر پپڑیاں جم جاتی ہیں۔ چھوٹی بزریا، چوک اور مسجد کے پیچھے والی گلی اور بڑی حویلی کے سامنے والا چبوترہ ہی ویران نہیں پڑا تھا۔ بلکہ ان کے اوپر کا آسمان بھی ویران تھا۔ ورنہ یہاں تو اتنی پتنگیں اڑتی تھیں کہ سارا آسمان ان سے ڈھکا ہوا دکھائی پڑتا تھا۔ اور چھتوں اور کوٹھوں پر لڑکوں کا وہ ہجوم ہوتا تھا اور وہ غل مچتا تھا کہ ساری فضا گونجتی ہوئی معلوم پڑتی تھی۔ یہاں کا آسمان شاید ہی کبھی دکھائی دیا ہو۔ پتنگیں نہیں اڑتی تھیں تو تمی لے اور حبیب کے اور مجو کے کبوتر اڑتے تھے سفید سفید معصوم کبوتر فضاؤں میں بلند ہوتے چلے جاتے تھے۔ اور چھوٹے ہوتے ہوتے چھپ جاتے تھے اور یہاں تک کہ تارا بن جاتے تھے۔ اور آسمان میں چمکتے ہوئے معلوم ہوتے تھے لیکن آج تمی اور حبیب اور مجو کے کبوتر بھی نہیں اڑ رہے تھے۔ بنیا کا چاند تارا بھی نہیں اڑ رہا تھا اور دیو نے لال لوہ اور کالے کنے بیچ بھی نہیں لڑ رہے تھے اور چوک میں گلی ڈنڈا بھی نہیں ہو رہا تھا اور چبوترہ پر ٹولیاں بھی نہیں کھیل رہی تھیں۔ چوک آج ننگا ننگا سا دکھائی پڑتا تھا۔ چوک بھی ننگا تھا اور مسجد کے پیچھے والی گلی بھی ننگی تھی اور چھتیں بھی ننگی تھیں۔ اور آسمان بھی ننگا تھا اور قیوما کی دوکان کا پٹرا بھی ننگا تھا اور ہم خود ہی جو ننگے ہو گئے تھے۔

خدا خدا کر کے کرفیو ٹوٹا، اور لوگ گھر سے ایسے بے تحاشا نکل رہے ہیں جیسے ڈربے سے مرغیاں باؤلی ہو کر نکلتی ہیں۔ شام کو جب میں قیوما کی دوکان پہ گیا تو ——— اور اب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو اسے آگے کیا کہوں قیوما کی دوکان واقعی بند نہیں تھی۔ اس کے کنواڑ کھلے ہوئے تھے اور اگرچہ کڑھائی بھی دھری تھی۔ لیکن قیوما بھی اسی انداز سے دودھ چلا رہا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ پیڑے باسی تھے۔ اور قُلفیوں کا رنگ بدلا پڑ گیا تھا۔ ورنہ بخاب وہ اسی پرانے قرینے سے چنی رکھی تھیں۔ اور پھر بھی جب میں یہ سوچتا ہوں کہ اگر دوکان کھلی ہوئی تھی تو میری آنکھوں میں تو مرے ناچنے لگتے ہیں۔ بدہن اور رمضانی اور حسینی اور الطاف اپنی پرانی بیٹھکوں پر بیٹھے تھے لیکن آج انہیں چپ لگ گئی تھی۔ اور کمری کو تو گویا جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ میں گھبرایا ہوا سا کھڑا تھا۔ قیوما سے دو پیسے کی چائے مانگ رہا تھا۔ آج واقعی اس کا ارادہ معلوم ہوتا تھا کہ چائے کی پڑیا لے کے جلدی سے گھر چلا جائے۔ اس کے ایک ہاتھ میں پیسے بج رہے تھے اور دوسرا ہاتھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خنک ہو گیا ہے۔ اور قُلفوں کی تھال پر مردنی سی چھائی ہوئی تھی۔ بدہن نے سفر بھی بھر کے رکھ دیا تھا اور وہ اونچے نیچے پایدان والی

بیچ بھی حسب معمول بچھا دی تھی اور پھر بھی بکنے کا کوئی نام نہ لیتا تھا۔ لوگ جلدی جلدی سودا سنبھالتے تھے اور پیسے پھینکتے تھے اور گلیوں میں کھسک جاتے تھے اور پھر کنواڑوں کے دھڑ دھڑ بند ہونے کی آوازیں آتی تھیں۔

رمضانی آپ ہی آپ کہنے لگا "کرجی کمیٹی والوں نے بھی کر دیا کمال۔"

"اور نہیں تو اتنک توبات بلا بھی بول دیا جاتا۔" الطاف نے جواب دیا۔

"بھئی ایمان کی بات یہ ہے کہ کمیٹی والے ہیں حبیدار۔"

بدھن تنک کے بولا "اور جی ہم تو بالکل ٹھیک ہیں۔ پیارے ایک دفعہ ہو جانے دے سالوں کے نوس بنیر بکھیر دے تو بات نہیں۔"

رمضانی نے جواب نہ دیا۔ اور الطاف اور حسینی اور کرجی بھی چپکے رہے اور قیوما بھٹی کی بجھی ہوئی آگ برابر پھونکتا رہا۔

بدھن پھر بڑبڑانے لگا "آمنے سامنے کی تیں ہوتی ہم بھی تو دیکھیں کونسا مائی کالال ہے جو ٹکتا ہے۔ کیوں بے حسینی بولتا کیوں نہیں لے بے؟"

"ہوں ہاں۔" حسینی پھر چپکا ہو گیا۔ اور الطاف اور حسینی اور کرجی گم صم بنے بیٹھے رہے۔ اور قیوما بدستور آگ پھونکنے میں مصروف رہا۔

"سن سالے کی تو میا مری جا رہی ہے۔ ابے ناک پھوا کے جورو کے پاس بیٹھ جا۔" پھر بدھن چپکا ہو گیا۔ اس کے چہرے کا تناؤ دھیما پڑتا چلا گیا۔ اس کا جسم کچھ سکڑنے لگا۔ اور اس کی نگاہیں ٹھنڈے دودھ پر جم گئیں۔ پھر وہ بےحرکت بن گیا۔ اور اس کی نگاہیں ٹھنڈے دودھ پہ جمی کی جمی رہ گئیں۔ بدھن بت بن گیا تھا۔ رمضانی اور الطاف اور کرجی بھی بت بن گئے تھے۔ اور قیوما بدستور بجھی ہوئی آگ پھونکے جا رہا تھا۔ قیوما بدستور بجھی ہوئی آگ پھونکے چلا جا رہا تھا اور چولھے سے دھواں برابر اٹھے چلا جا رہا تھا۔ چولھے سے دھواں اٹھ رہا تھا اور بدھن اور رمضانی اور حسینی اور الطاف اور کرجی کے چہرے دھندلے دکھائی پڑ رہے تھے۔ اور پکوڑیوں اور پیڑوں کی تھالوں پہ بھی دھند چھا گیا تھا۔ اور گل محمد کا اما پارہ بھی دھندلا دھندلا نظر آتا تھا۔ اور سامنے والی گلی کا وہ دریچہ بھی ملگجا سا معلوم دے رہا تھا۔ اور مسجد کے سیاہی آلود سفید مینار بھی دھند میں اٹے دکھائی پڑتے تھے۔ پھر کرجی ایکا ایکی چونک پڑے۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ کہیں چپکے سے کھسک گئے تھے اور اچانک ہمارے درمیان پھر آ گئے ہیں۔ کہنے لگے کہ "ابے قیوما آج دودھ تو تو نے پیا چکا۔ ابے کہاں سے یہ ایندھن اٹھا لایا ہے۔ سالا سارا دھواں ہی دھواں کر دیا۔" اور پھر کرجی چپکے ہو گئے گویا ان کے جملے اپنا جواب آپ ہیں۔ قیوما جواب میں اور زور زور سے آگ پھونکنے لگا۔ لیکن آگ، شاید کہہ رہی تھی کہ اب میں نہیں جلوں گی۔ کبھی نہیں جلوں گی۔

بدھن اور حسینی اور رمضانی اور الطاف کو کیا ہو گیا تھا اور کرجی کی زبان کو کیوں تالا لگ گیا تھا۔ یہاں کب کب معرکے نہیں پڑے تھے۔ بدھن اور حسینی اور رمضانی نے یہ معرکے مارے تھے اور میں نے یہ معرکے کچھ دیکھے تھے کچھ سنے تھے۔ اور میں نے تو انہیں بڑی بری بری حالتوں میں بھی دیکھا ہے۔ مجھے وہ دن بھی یاد ہے جب بدھن کا سارا کرتا خون سے شرابور ہو رہا تھا۔ اس کی کھوپڑی سے خون کا فوارہ

جھوٹ رہا تھا اور پھر اسکی آنکھوں میں بھی خون اتر رہا تھا میں وہ دن بھی نہیں بھولا ہوں جب میں صبح ہی صبح گوشت خریدنے گیا
تھا اور دیکھتا کیا ہوں کہ رمضانی کی دوکان یاسی پڑی ہے اور ایک کتا سوکھی ہوئی ہڈی کو دانتوں سے توڑ رہا ہے میں اتنی کشش و پیچ
میں تھا کہ رمضانی ایکا ایکی کہاں اڑ گیا ہے اتنے میں ننھے میرے پاس دوڑا ہوا آیا اور بدحواسی کے عالم میں بولا۔ لیے رمضانی کو ڈاکو نے
زخمی کر دیا تھا۔ شفاخانے میں پڑا ہے۔" اور پھر ہم دونوں شفاخانے اٹھ چلے گئے۔ رمضانی کی بُری حالت تھی۔ اس کا سارا بدن
لہولہان ہو رہا تھا۔ اسکے ہاتھ کی ہڈی پہ بہت ضربیں پڑی تھیں۔ وہ مارے درد کے کراہ رہا تھا لیکن اسکی آنکھوں سے شعلے برس
رہے تھے اور اتنے میں ڈاکٹر جوشی اور اسکے پیچھے وہ گول مٹول کمپونڈر مرہم پٹی کا سامان لیکے چلا آیا اور ہم باہر کھسک آئے باہر
لوگ نیچے لوٹے کھڑے تھے اور بڑی سنجیدگی سے اس حادثہ فاجعہ پر بحث ہو رہی تھی۔ مجی کا کہنا تھا کہ بہت کیے تیج میں
رہا تھا ایک کسان نے اسے ٹوک دیا تھا۔ رمضانی نے اسے گالی دیدی۔ اور اس بات پہ سامنے گاؤں والے اس پر ٹوٹ پڑے جیب کا
کہنا یہ تھا کہ گنگا کے میلہ پہ گدیوں کی ایک ٹولی سے لڑائی ہو گئی تھی اور جنگی رمضانی نے خوب ٹھکائی کی تھی۔ یہ انہوں نے اپنا بدلہ لیا
ہے مگر ننھے کو یقین تھا کہ ہو نہ ہو یہ ان ڈاکوؤں کی کارستانی ہے جن سے رمضانی کی پارٹی کی ایکدفعہ جنگل میں ٹکر ہوئی تھی۔ اور جن سے
ہمارا بہت پیسہ اور زیور رمضانی نے دہروا لئے تھے لیکن اس بات پہ سب متفق تھے۔ بلا رمضانی پر محض اس وجہ سے ٹوٹی
ہے کہ اسکے پاس اسوقت لاٹھی نہیں تھی۔ اور جب ننھے نے یہ کہا کہ رمضانی کہیں اچھا ہو گیا تو سب ایک کے ایک اڑا دیگا۔ تو یہ
گویا اس نے سب کے دل جذبات کی ترجمانی کی تھی۔ یہ واقعہ ہے کہ زخمی رمضانی کی آنکھیں یہی کہہ رہی تھیں لیکن رمضانی آج اچھا
ہو گیا تھا اور پھر بھی اسکی آنکھوں میں مروتی تیر رہی تھی۔ اور بدہن کے سر سے خون کا فوارہ نہیں چھوٹ رہا تھا لیکن پھر بھی اس کا جی چھوٹا
ہو رہا تھا اور جسینی کے پیچھے پولیس لگی ہوئی نہیں تھی مگر پھر بھی اسکے چہرہ کا رنگ اڑا سا گیا تھا میرا تو یہ ایمان تھا کہ رمضانی، بدہن، جسینی
اور الطاف کسی سے نہیں ہار سکتے کسی سے نہیں ہار سکتے۔ لیکن آج یہ ان چاروں کو کیا ہوا جا رہا تھا۔

اتنے میں نمبردار نہ معلوم کدھر سے نکل آئے اور بدہن کو دیکھتے ہی برس پڑے۔ "لبے یہاں بیٹھا باتیں بنا رہا ہے۔ تیری ڈیوٹی ہے
... اور دیکھنا ادھر آنا" پھر بدہن اور وہ بڑے مرلیا انداز میں باتیں کرتے ہوئے گلی میں مڑ گئے۔ پھر تھوڑی دیر میں سپاہی تو بیچ
گئے تھے اور سپاہیوں نے لوگوں کو تتر بتر کرنا شروع کر دیا۔ فیوما اپنی دوکان بند کرنے لگا اور ہم سب اپنے اپنے گھروں کو چلے
میں نے فیوما کی دوکان اپنی آنکھوں سے بند ہوتی ہوئی دیکھی۔

پھر میں پاکستان چلا آیا یہاں آکر مجھے نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ ایک بوریت سی ذہن پہ طاری رہتی ہے مجھے گھن لگ گیا
ہے میں گھلتا چلا جا رہا ہوں۔ ایک روز انارکلی بازار میں نمبردار سے مڈھ بھیڑ ہو گئی۔ بیچارے بہت روتے تھے۔ انکی بہت جائیداد
تھی بڑا زیور اور روپیہ تھا سب کچھ چھوڑ آئے میرے جی میں آئی کہ ان سے فیوما کی دوکان کے متعلق کچھ پوچھوں مگر وہ تو اپنی باتوں میں
ایسے الجھے ہوئے تھے کہ پھر میری ہمت نہیں پڑی۔ یہ انارکلی کا بازار بھی خوب ہے۔ بچھڑے ہوئے یہاں اکثر ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔
کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی لاہور میں ہو اور اس سے کبھی نہ کبھی انارکلی میں ٹکر نہ ہو جائے۔ فیوما بھی ایکدن مجھے اسی بازار میں ملگیا تھا۔ اس
بازار میں جہاں عالیشان دوکانوں کی قطاریں دونوں طرف چلی گئی ہیں فیوما کتنا عجیب معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اسکی دوکان رام نگر
میں ہے۔ ایک روز میں چلا چلا رام نگر بھی پہنچ گیا پسینے تو میں کچھ سٹ پٹا سا گیا مجھے خیال ہوا کہ کسی اور کی تو یہ دوکان نہیں ہے لیکن فیوما
بیٹھا تھا ایکطرف بڑے قرینہ سے شیشہ کی الماری رکھی تھی۔ کچھ تھالیں بہت سلیقہ سے چنی ہوئی تھیں۔ بجلی کی روشنی سے ساری
دکان جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔ اسکے بعد پھر میں اسطرف کبھی نہیں گیا میں اب بھی کبھی کبھی یہ سوچنے لگتا ہوں کہ آخر فیوما نے مجھ سے
جھوٹ کیوں بولا۔ اور میرے سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ بس کچھ تمرے سے میری آنکھوں میں ناچنے لگتے ہیں۔

عبدالمتین عارف

# ماں

مرے سپوتو!

مرے عزیزو!!

میں ایک مدت سے اجنبی حکمراں کے زنداں کی سختیاں خود پہ سہہ رہی تھی،
سفید فام اجنبی ستمگر،
مجھے غلامی کی آہنی بیڑیوں سے بے دست وپا بنا کر،
میرے بدن کی جوان رعنائیوں کا رس یوں نچوڑتے تھے،
کہ جس طرح برگ گل سے عطرِ نشاط پرور کشید کرلیں،
میرے حسین وگداز پیکر کو روز وشب یوں جھنجھوڑتے تھے،
تمہاری ماں جیسے اک طوائف ہو، ایک مطعون بیسوا ہو!

تمہاری غیرت تمہاری جہدِ طویل نے آج مجھ کو اس شرمناک اندازِ زندگی سے رہائی بخشی
اور آج انہیں کے طفیل میں ایک غیر پابند عالمِ رنگ و نو میں سانس لے رہی ہوں،
مگر بصد افسوس آج ہی تم الجھ گئے ایک دوسرے سے،
اور ایسے الجھے کہ اپنی اس پا بریدہ ماں کو بھی روند ڈالا،
تمہاری تیغوں نے میرے سینے کے گھاؤ دو چند کر دیئے ہیں،
مرے عزیزو!
مرے سپوتو!!
ذرا جبینوں سے خون پونچھو،
مجھے سنبھالو — میں ورنہ جانبر نہ ہوسکوں گی!
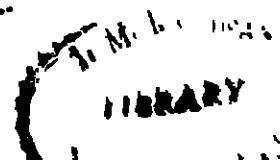
نومبر ۱۹۴۷ء

افضل پرویز

# دیپک راگ

پ تال بلمپت سے سمپورن دیپک راگ استھائی۔ ابھوگ برھت انترہ اور سنچاری
ان سانگی کی اور متماپ کھاوج پر دیپک پہ سنہری جالا، زندوں کی فنکاری
رے کی ترتیب اور سرگم کی بندش خوب پر بجھے ہوئے دیپک میں استاد جی! آگ کہاں
ن نغمے کے اجزا اس دیپک کی کرنیں جو میں تن آیا ہوں وہ دیپک راگ کہاں
کنواریاں پو پھٹتے مٹی کے گھڑے اٹھائے اٹھلاتی ہوئی نکلیں گاؤں کے دھندلکے سے
ی پگڈنڈیوں پر بل کھاتی ہوئی ابھریں پیکاں برساتی ہوئیں متوالی پلکوں سے
اؤں سے نکلتے ہی کھیتوں میں پہنچتے ہی ماہیا کے سجل گیتوں کا کورس گانے لگیں
ت ٹپکانے لگیں شعلے برسانے لگیں ماحول لرزنے لگا ماحول پہ چھانے لگیں
ن نغمے کے اجزا اس دیپک کی کرنیں ان قہقہوں کی گمکیں، ان باتوں کی سرگم
ال آنچل کی لَے پازیبوں کی جھنکار چنگاریاں اور شعلے آواز کا زیر و بم
ول سے چھنتی ہوئی انترے کی اٹھان بڑھی گاؤں کو گھیرے ہوئے ٹیلوں کے ٹاپے تک
مدھم ہوتی ہوئی استھائی لطیف و سبک قلقل جاموں کی کھنک رنگیں کلیوں کی چٹک
یتوں سے نکلتے ہی اور موڑ سے مڑتے ہی ٹھٹکیں۔ تانیں ٹوٹیں۔ اڑتے آنچل سمٹے
نی پلکیں جھپکیں۔ گالوں کی شفق بھڑکی آپس کے ٹھوکوں پر کمریں لچکاتے ہوئے

سرگوشیاں کرتے ہوئے۔ مبہوت مسافر پر ———— اک ایک نے قاتل۔ فنکارانہ نظر دا
دیپک سے چمکنے لگے شعلے سے لپکنے لگے ———— کھیتوں میں پہنچتے ہی اور موڑ سے مڑتے ہ
پھر آنچل اڑنے لگے پھر نغمے گونج اٹھے ———— پھر شعلے لپکنے لگے ماحول لرزنے لگ
گاؤں کو گھیرے ہوئے ٹیلوں کے آتاب ———— اُن دیپک کی کرنیں اُن نغمے کے اجز
اُس آگ میں جلتا ہے اک پردیسی اب تک ———— اُس دیس کی پریوں نے وہ دیپک گایا ہے
اُستاد جی! وہ ماہیا ہے وقت کی مانڈ سبھی ———— اُس مانڈ نے ہی لیکن من دیپ جلایا ہے
اس آپ کے دیپک کو تنویر کی حاجت ہے ———— اس گاؤں کے ماہیا سے کچھ آگ چرا لائیں
پر اس آنچل کی نے اُن قہقہوں کی گمکیں ———— ممکن ہو تو گاؤں کا ماحول بھی لے آئیں

●

سید جابر علی

# غزل

اسی پردے میں کوئی زمزمہ پرداز نہ ہو ———— نغمۂ ساز میں پنہاں مری آواز نہ ہو
کچھ بڑی بات نہیں ضبطِ تمنا لیکن ———— نگہِ ناز کہیں پردہ درِ راز نہ ہو
ضبطِ غم کا یہ بہانہ بھی نہ راس آئے گا ———— مسکراہٹ ہی کہیں درد کی غماز نہ ہو
لطفِ آغاز نہیں، کاوشِ انجام نہیں ———— یہ اسی چشمِ فسوں ساز کا اعجاز نہ ہو

فکرِ انجام نہیں باعثِ بیتابیٔ دل
خوف اتنا ہے کہ دامن کشِ آغاز نہ ہو

محمد صدیق کلیم

# پنڈت رتن ناتھ سرشار بحیثیت مزاح نگار

اردو ادب میں مزاح نگاری شعراء کے ہاں سے شروع ہوتی ہے۔ امیر خسرو اور سودا کے علاوہ پنڈت رتن ناتھ سرشار سے پہلے مزاحیہ تحریروں کا بیشتر حصہ ابتذال پر مبنی ہے۔ انشا۔ جرأت۔ رنگین اور جان وغیرہ یعنی ریختی کے لکھنے والوں نے فحش اور رکیک باتوں سے ہماری مزاحیہ حس کی تسکین کرنا چاہی ہے۔ ان لوگوں نے اپنے نوابوں کو خوش کرنے کے لئے درباری مسخروں کا سا مذاق روا رکھا ہے جسے اگر میر جعفر زٹلی اور چرکین کی مذلہ سنجی اور بیہودہ گوئی کو شامل کر کانوں پر ہاتھ رکھنا پڑتے ہیں۔

صحیح طور پر اردو میں ظرافت نگاری ۱۸۷۷ء میں اودھ پنچ کی اشاعت سے شروع ہوتی ہے۔ اس اخبار میں لکھنے والے آزادی کے ساتھ مختلف موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے جن میں اکثر طنز ظرافت اور رنگ کی چاشنی ملی ہوتی تھی۔ اگرچہ خلافِ تہذیب تحریریں یہاں بھی ملتی ہیں۔ مزاح نگاری کے اس اسکول میں منشی سجاد حسین اور پنڈت رتن ناتھ سرشار کے نام قابل ذکر ہیں مگر میں سمجھتا ہوں کہ پنڈت صاحب اپنی خوبیوں کی بنا پر ممتاز ہیں۔

ناول نویسی۔ قصہ گوئی۔ کردار نگاری اور مزاحیہ رنگ میں غالباً وہ اپنے وقت کے لکھنے والوں میں منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ سرشار کا فسانۂ آزاد جب اودھ پنچ میں چھپتا تھا تو لوگ دوسرے پرچے کے لئے بے تاب رہتے تھے۔ اگرچہ پلاٹ بے ربط ہے۔ لیکن طرزِ تحریر اتنی شگفتہ اور دلپذیر ہے کہ جگہ جگہ آدمی ہنسنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور یہی جی چاہتا ہے کہ فسانے کے ان طویل چٹخاروں کو ختم کر کے ہی کوئی اور کام کیا جائے۔

سرشار کے ہاں مزاح زندگی کی طرح وسیع اور مختلف النوع ہے۔ اس وقت کی سماج کے ہر پہلو اور ہر طبقے کے کردار کے مطابق انہوں نے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ امراء کے طبقے میں شاہزادے اور شاہزادیوں کے تشبیہ و استعارہ کی باتیں محبت اور عشق کے اظہار کے ساتھ ساتھ ظرافت کے نرم نرم جھونکے۔ وکیل۔ آغا۔ خانم، مولوی، استاد اور طلبا کا علمی اور سوشل قسم کا مزاح جس میں ذاتی پہلو بھی آ جاتا ہے اور لوگ طنز اور پھبتی پھبتی اڑاتے ہیں۔ دوسری طرف میاں آزاد کا مزاح سلجھا ہوا اور شگفتہ۔ جیسے آپ تبسم زیرلب کہہ سکتے ہیں۔ اور پھر نقلی آزاد کے کیریکٹر کا تصور ظرافت کی کان ہے۔ وہ شاعر بھی ہیں اور چور بھی۔ عاشق بھی اور سنگدل قاتل بھی۔ پھر نچلے درجے کے لوگوں کا بھونڈا مذاق اور رکیک قسم کا مذاق بھی عام ہے خوجی کا کیریکٹر خوب ہے۔ اس کے ساتھ علاوہ ازیں سبھی قسم کا مذاق وابستہ ہے لیکن فحش مزاح بھی ہے۔ لیکن اکثر قابل برداشت ہے۔

یہاں پر موزوں نہ ہوگا۔ اگر میں مزاح کی تعریف اور فلسفیانہ تشریح کرنا شروع کر دوں۔ مزاح زندگی کی طرح خوشبو کی طرح۔ محبت کی طرح اپنے معنوں میں بہت وسیع کی ہے۔ اس کی کئی تعریفیں ہیں اور کئی نظریے۔ اس لئے بہتر ہے

کہ اسے چلتے پھرتے کرداروں میں ہی دیکھا جائے۔ مزاح اپنے آپ کو کئی طرح سے ظاہر کرتا ہے۔ ایک مزاحیہ انسانی شکل، چہرے اور حرکات و سکنات دکھا کر آپ کو لوٹ پوٹ کر سکتا ہے تو دوسرا مزاحیہ صورتِ حالات آپ کو دنیا جہان کی تکلیفوں اور مصیبتوں سے کچھ وقت کے لئے نجات دلا دیتا ہے۔ یا محض زبان اور تحریر ہی خوش رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ مگر ان سب سے بڑھ کر پر اثر اور دلچسپ چیز ایک مزاحیہ کردار کی تخلیق ہے۔ سرشار کے ہاں یہ سب باتیں پائی جاتی ہیں۔

شکل و صورت اور حرکات و سکنات کی ادائیگی میں سرشار نے ہمیں مزاح کی بہت خوبصورت مثالیں پیش کی ہیں۔ مثلاً۔ "ہو مزی اور خوجی میں پہلے سے مشورہ ہو چکا تھا کہ برات میں باجے کے عوض تالیاں بجیں اور خچر پر برات کا نشان اور طالب علم بھی ساتھ ہوں۔ پانچ سات طلباجن کو فارسی اردو کے اشعار کئی دن سے رٹا رکھے تھے اور دو سر، دو بغل بغل چلے جاتے تھے۔ بیچ میں خوجی ٹٹو پر سوار اکڑے ہوئے بیٹھے ہیں۔ چولی قرول سنبھالتے۔ گیروے رنگ کی سیاہ پگڑی۔ اوپر پھولوں کا سہرا۔ افیون کی ڈبیا کمر میں۔ بار بار ٹٹو سے نیچے جاتے تھے ٹٹو کی دم اور پیشانی سرخ اور تمام پر نیلے نیلے رنگ کے گول گول داغ۔ خاصے ہولی کے سوانگ تھے۔ ۔ رات بھی چاندنی۔ خوجی کی صورت دیکھ دیکھ کر لوگ بے اختیار ہنستے تھے۔ جدھر سواری جاتی تھی۔ اس طوفان بے تمیزی کو دیکھ کر لوگ قہقہے لگاتے تھے۔"

سپہر آرا کی ان حرکات پر دبی دبی مسکراہٹ لبوں پر آتی ہے اور میرے خیال میں تبسم زیرلب کی بہترین مثال ہے:

"سپہر آرا چھتوں پر ہمایوں فر کی چاہ میں گئیں۔ لگی بڑی ہوتی ہے۔ کنکھیوں سے چپکے چپکے شہزادے پر نظر اس وقت مرزا ہمایوں فر دوشالہ اوڑھے ہوئے کمرے میں بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ سپہر آرا نے آہستہ سے کنکر پھینکا شہزادے نے چاروں طرف دیکھا تو چاند سا مکھڑا نظر آیا مگر سپہر آرا چھب دکھا کر فوراً ہٹ گئی۔

ہمایوں فر۔ واہ۔ بھلا ایسی ستم ظریفی سے کیا ملتا ہے۔ خدا کے لئے ایک نظر دیکھ لو۔

سپہر آرا نے شاید ہی صورت تو نہیں دکھائی۔ مگر دوپٹے کے آنچل کو ہوا کے رخ چھوڑ دیا۔ ایک خدمتگار نے جو ان کی اقتدر پرستی کو اور دیکھا اکیلے کھڑے ہوئے ہیں۔ گھبرایا یہ کیا ماجرا ہے۔ تو مؤدبانہ یوں کہا۔

خدمتگار۔ حضور کس سے باتیں کرتے تھے

ہمایوں فر۔ دیوار و در سے"

عشق کرتے ہوئے ان نوجوانوں کی حرکات و سکنات کو دیکھنے والا ایک خاص حظ اٹھا کر بہروں مسکراتا رہتا ہے۔ مزاحیہ صورتِ حالات میں تو ناتھ سرشار کی طرز تحریر بہترین ہوتی ہے۔ اس مزاح مزاح میں انہوں نے اپنے زمانے کی تصویر کھینچ دی ہے۔ بیگمات کی زندگی۔ نوجوان شہزادیوں کے اشغال۔ تماشے۔ شادی بیاہ۔ علمی ادبی مباحثے۔ پرانے رسم و رواج۔ غرضیکہ زندگی کا کون سا پہلو ہے جس کی انہوں نے عکاسی نہیں کی حالانکہ قصہ محض آزاد اور حسن آرا کی محبت سے متعلق ہے جن محبت کے طفیل میاں صاحب کو یہ خاک چھاننا پڑتی ہے۔

اب دیکھئے ایک آقا اور نوکر میں کشمکش ہو رہی ہے

آقا۔ بغیر خدمتگار کے جانا ہماری وضع کے خلاف ہے۔

مگر اس فسانۂ آزاد میں اُن کی سب سے بڑی خوبی کردار نگاری ہے۔ میاں آزاد اور پھر لفلی آزاد کا کیریکٹر۔ ثریا بیگم اور دیگر عورتیں۔ مزاحیہ کرداروں کی بھرمار جن میں خوجی سب سے ممتاز ہے اور شائد ظرافت کی دُنیا میں عجیب و غریب مخلوق دوبارہ پیدا نہیں ہوئی۔ اردو ادب میں خوجی اپنی مثال آپ ہی ہے۔ خوجی شروع سے لے کر آخیر تک ایک مسخرہ ہے۔ وہ اپنی پہلوانی اور شجاعت کے من گھڑت افسانے سُناتا جاتا ہے۔ یہ افیم کی ڈبیا یعنی چنیا بیگم کی محبت میں محو ہے۔ اور انیون کی پینک میں گیدی گیدی پکارتا رہتا ہے۔ اُس کے کیرکٹر میں یہ دونوں خبط کی سی باتیں شامل ہیں جو بہ نام کتاب کے مزاح کا دارومدار ہے اور حق تو یہ ہے کہ خوجی بنتا بھی خوب ہے اور اس کے ہاں بھی مزاح بہت دیتا ہے۔

خواجہ بدیع الزماں صاحب پاگل خانے میں اناپ شناپ بک رہے ہیں۔

جیلر۔ اجی کہی۔ تم پاگل نہیں ہو۔ غلط ہے

کلرک۔ یہ تو بے فائدہ یہاں آنے۔ تم پاگل ہو جی۔

خوجی۔ بلانے والے اور بھیجنے والے سب پاگل۔ میں شاعر ہوں اور شاعر پاگل نہیں ہو سکتا۔ کیا مجال ہے میں تو شاعر ہوں۔ مرے اشعار سُنئے اور داد دیجئے ؂

| | |
|---|---|
| پلا ساقیا مالوے کی افیم | کہ کر آؤں گلگشت باغِ نسیم |
| پیاسا کئی دن کا ہوں ساقیا | جھلک آبِ اسود کی جھٹ پٹ دکھا |
| نرالا ہے محفل کا کچھ آج رنگ | نہ کیوں زندگی سے طبیعت ہو تنگ |
| نہ مطرب نہ ساغر نہ مینا نہ چنگ | نہ چانڈو نہ افیوں نہ گانجا نہ بھنگ |
| کرم کر فقیروں پہ مائی ڈیر | میں قربان جاؤں ذرا کم ہئیر |

میاں آزاد اور خوجی ترکی کو جا رہے ہیں تو راستے میں جہاز میں خواجہ صاحب کا کردار اپنے صحیح معنوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ اتنے میں جہاز کے ایک کونے سے آواز آئی کہ (او گیدی۔ نہوئی قرولی نہوا پنچہ۔ ورنہ لاش پھڑکتی ہوتی اس وقت)

میاں آزاد کے پوچھنے پر یوں رقم طراز ہوئے :۔

خوجی (خو) یعنی خواجہ بدیع الزماں بدیع۔ اجی جاؤ جی یہاں شکار ہاتھ سے جاتا رہا۔ واللہ گرفتار ہی کر لیا تھا۔ گیدی کو پاتا تو اتنی قرولیاں لگاتا کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جاتا مگر میرا پاؤں پھسل گیا اور وہ نکل گیا۔

آزاد۔ (مسکرا کر) یار ایک آپ کی ہمیشہ کسر رہ جاتی ہے۔ خیر اب کی چیر غور کیا گیدی کو۔ یہ تھا کون؟

خوجی۔ تھا کون، تھا کون۔ یہ ہوتا کون۔ وہی بہروپیا مردود اور بس کوڑی بھی نہ تھا۔

آزاد۔ بہروپیا

خوجی۔ جی ہاں بہروپیا۔ بڑا تعجب ہوا آپ کو۔

آزاد۔ بھئی تعجب ہاں کہیں لیسے ہوا ہے کیا بہروپیا بھی جہاز پر سوار ہوا ہے۔ بڑا لاگو ہے بھئی۔

خوجی۔ سوار نہیں ہوا تو آیا کہاں سے۔ ٹھہر جا گیدی۔ تو خواجہ بدیع جو قرولیاں نہ بھونکی ہوں۔ (مونچھ

۔ تاؤ دے کر۔ انشاء اللہ!

آزاد۔ کیا سوتے تھے خوجی یا پینک میں تھے۔

خوجی۔ خوجی کی ایسی تیسی مردود کی۔ پھر تم نے خوجی کہا ہم کو۔ کیوں جی؟

یہ ہیں ہمارے خواجہ صاحب۔ اکثر افیم کی تان ہیں۔ قرولیاں اور گیدی کے نعرے بلند کرتے رہتے ہیں۔ اپنے
ہمر کر بڑھا چڑھا کے بیان کرتے ہیں۔ شجاعت و جرأت کے جھوٹے قصے دن رات سناتے رہتے ہیں۔ اکثر علمی و سیاسی
بحث بھی کرتے ہیں۔ مزاح پیدا کرنے میں ایک نہ ختم ہونے والا ذخیرہ۔ خود بھی ہنستے ہیں۔ اوروں کو بھی ہنساتے ہیں۔ اکثر
بھی جلتے ہیں اور اپنی گنجی چاندی کو بچاتے ہیں۔ مگر ایک بات جو ہمیں نہیں بھولنی چاہئے۔ وہ یہ ہے کہ یہ ایک مسخرے
کا کردار ہے اور اس میں ایک نقص یہ بھی ہے کہ اس کا شروع سے لے کر آخیر تک کوئی نفسیاتی مطالعہ نہیں کیا گیا۔

لیکن ایسے کرداروں کی مدد سے سرشار نے اس وقت کے سماج کی ہو بہو تصویر کھینچی ہے۔ ان کے کرداروں میں
[illegible]۔ وہ ہمارے سامنے زندہ انسانوں کی طرح بولتے چالتے۔ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ اگر چہ بعض جگہ مبالغے اور
[illegible] ظرافت باتوں سے کام لیا گیا ہے۔ مکالمات کے لکھنے میں اور پرانے رسم و رواج پر چوٹیں لگانے میں سرشار اپنے
تمام ہم عصروں سے بڑھ گئے ہیں اور ان کے سامنے رجب علی سرور کا فسانۂ عجائب بچوں کی سی بات معلوم ہوتا ہے۔

سوسائٹی کی تصویر انہوں نے ضرور دکھائی ہے۔ لیکن کیا اس تمام مزاح نگاری اور ظرافت سے ان کا مقصد اصلاح
تھا؟ شاید نہیں سرشار نے تو محض تفریح طبع اور خوش گپیوں کے طور پر یہ تمام طویل قصے لکھے ہیں اور ان میں اغلباً دکھتی
کی کھنی ہوئی رگ کو پکڑنے کا جذبہ بھی کام کر رہا تھا اور ہمیں کہیں کہیں تو فحش اور اخلاق سے گرے ہوئے مضامین بھی ملتے ہیں
لیکن پنڈت رتن ناتھ سرشار کا فسانۂ آزاد اس وقت کے ماحول کی تصویر ہے۔ اس میں زندہ کردار ہیں۔ رومان
[illegible]۔ شادی۔ مرگ۔ علم و عمل سبھی کچھ ہے۔ ہمارے خواجہ بدیع الزماں بھی ہیں اور میاں آزاد بھی اور ہماری بنیاری
بھی۔ مرزا ہمایوں فر بھی اور ہماری کنکر پھینکنے والی سپہر آرا بھی۔ قہقہے میں ہنسی ہے اور تبسم زیر لب بھی۔ غرضیکہ سرشار کے
[illegible] ہر نوعیت کا مزاح ہے۔ عام زندگی میں جس طرح اور جن جن موقعوں پر مزاح ہو سکتا ہے۔ اُن تمام پہلوؤں سے
[illegible] کی واقفیت ہو جاتی ہے اور اردو ادب میں بحیثیت مزاح نگار اُن کا اپنا ایک خاص مرتبہ ہے جو نظیر اکبر آبادی
[illegible] بیگ چغتائی اور مرزا فرحت اللہ بیگ اور دیگر موجودہ لکھنے والے بھی اُن سے نہیں چھین سکے۔

(پشاور ریڈیو)

## میکسم گورکی

# میشا

میشا کو جب بھی گھر سے باہر جانے کی اجازت نہ دی جاتی تو وہ کبھی چین سے نہ بیٹھتا۔ سارے گھر میں پتنگے کی طرح کودتا ناچتا پھرتا۔ ہر ایک کے کام میں موقع بے موقع اپنی ٹانگ اڑاتا۔ یہ بڑے بوڑھے بھی ہمیشہ کسی نہ کسی غیر دلچسپ کام میں لگے ہی رہتے ہیں۔ اور اسی لئے وہ ہمیشہ بچوں کو ڈانٹ کر یہی کہتے ہیں

"ہٹو — پریشان مت کرو، کام کرنے دو"

میشا نے بھی بارہا یہ جملہ اپنے ماں باپ سے سنا۔ ماں ہمیشہ ہی کسی نہ کسی کام میں مشغول رہتی، اور باپ سارا دن پڑھائی لکھائی میں مصروف رہتا۔ میشا کا اندازہ تھا کہ وہ کتابیں ضرور بیکار سی ہونگی۔ جب ہی اسے پڑھنے کی اجازت نہ دی جاتی۔

موسم بہار سے کچھ دن قبل، ایک روز جبکہ موسم بیحد خراب ہو گیا تھا۔ تمام دن برف گرتی رہی۔ اسلئے چارو ناچار میشا کو گھر میں ہی رہنا پڑا۔ اس حالت میں وہ والدین کے لئے مستقل آزار بن گیا۔ اسکے باپ نے دریافت کیا

"میشا — کیا تمہارا جی گھبراتا ہے؟"

"جی ہاں - بالکل، جیسا کہ ارتھمیٹک کا سوال نکالتے وقت" میشا نے جواب دیا۔

"اچھا تو یہ نوٹ بک لو۔ اس کو ڈائری کہتے ہیں۔ جو بات تمہیں اچھی اور دلچسپ معلوم ہو۔ اس میں لکھو۔"

"تو وہ کونسی اچھی اور دلچسپ باتیں ہونگی؟" میشا نے ڈائری لیتے ہوئے سوال کیا۔

"— مجھے کیا معلوم" باپ نے سگریٹ سلگاتے ہوئے ذرا ترش روئی سے جواب دیا۔

"کیوں؟ — تم کیوں نہیں جانتے؟" میشا نے دوسرا سوال جڑا۔

"اس لئے کہ جب میں تمہاری طرح بچہ تھا تو کبھی اپنا سبق یاد نہ کرتا تھا اور ہمیشہ اپنے فضول اور بیکار سوالات سے اپنے بزرگوں کو تنگ کیا کرتا تھا — سمجھے — اچھا اب ایک - دو - تین ہو جاؤ"

میشا تاڑ گیا کہ باپ کا اشارہ اس کی ہی طرف ہے۔ اور وہ اس وقت اس کی بیکار باتوں میں الجھنا نہیں چاہتا۔ لیکن ان سب کے باوجود اُس نے باپ کی آنکھوں میں رحم اور محبت کی جھلک دیکھی۔ اس لئے اس نے چلتے چلتے ایک سوال اور کیا

"اچھا — تو وہ دلچسپ باتیں کون کریگا؟"

"تم خود — لو اب چل دو - ایک اچھے بیٹے کی طرح۔ مجھے ابھی بہت سا کام کرنا ہے"

میشا خاموشی کے ساتھ اپنے کمرے میں چلا آیا۔ نوٹ بک میز پر رکھدی اور تھوڑی دیر سوچنے کے بعد لکھنے لگا۔

"یہ ڈائری ہے ——— ڈیڈی نے مجھے دی ہے۔ جو بات ہیں اس میں لکھوں گا وہ اچھی اور دلچسپ ہوگی۔"
پھر اس نے قلم ایک طرف رکھ دیا اور کمرے کی ایک ایک چیز کو دیکھنے لگا۔ ساری جانی پہچانی چیزیں ہیں۔ ان میں کوئی چیز بھی تو ایسی نظر نہ آئی جو کسی دلچسپی کا باعث ہو۔ وہ اٹھا اور سیدھا باپ کے کمرے کی طرف گیا۔

"تم پھر نازل ہو گئے" باپ نے ترشی سے کہا۔

"دیکھو —— میں نے اپنی کتاب پر کیا لکھا ہے" بیٹا نے ڈائری دکھاتے ہوئے کہا "کیا یہ ٹھیک ہے؟"

"ہاں —— ہاں —— ہاں" باپ نے غصے سے جواب دیا۔

"اچھا۔ اب آگے کیا لکھوں؟"

"جو تمہارا جی چاہے —— کچھ سوچو اور لکھو، کوئی نظم ہی ——"

"نظم ——!" بیٹا نے تعجب انگیز لہجے میں کہا "لیکن کونسی نظم؟"

"کوئی سی نہیں ——— خود بناؤ اور لکھو۔ چلو اب یہاں سے نکلو" باپ نے تنگ آ کر زبردستی اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکال دیا اور دروازہ بند کر لیا۔

"باپ کا یہ برتاؤ۔ محبت اور ہمدردی کے تمام اصولوں کے خلاف تھا" بیٹا نے سوچا۔ اس برتاؤ سے اسے بہت دکھ پہنچا۔ وہ اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ اور کافی دیر خاموش بیٹھا رہا۔ وہ بہت تھک گیا تھا۔ اس کا ذہن پراگندہ تھا۔ ماں باورچی خانہ میں کسی کام میں لگی ہوئی تھی اور وہاں اسے جانے کی اجازت نہ تھی۔

"نہ جانے ان ماں باپوں کو کیا ہوتا ہے جو بچوں کو ہمیشہ اچھی چیزوں سے دور ہی رکھتے ہیں" وہ سوچنے لگا۔ لیکن اس کی سمجھ میں کوئی معقول وجہ نہ آئی۔ باہر سڑک پر ہر طرف کہر دھوئیں کے مانند چھایا ہوا تھا۔ اس لئے وہ باہر بھی نہ جا سکتا تھا۔ آخر کیا کرے۔ لیکن یکایک اس کی نظر گھڑی پر پڑی —— ابھی تو نو ہی بجے ہیں۔ پھر وہ مسکرایا اور نوٹ بک پر جھک گیا۔

THERE IS A CLOCK ON THE WALL ITS HANDS

LIKE WHISKERS RISE AND FALL

"واہ —— کیا اچھا شعر بنا" وہ اپنی اس کامیابی پر خوشی سے اچھل پڑا۔ اور چلاتا ہوا باورچی خانہ کی طرف دوڑا۔

"ماں —— ماں —— دیکھو میں نے کیسا عمدہ شعر کہا"

"نو —— " ماں نے جھاڑن گھنتے ہوئے کہا "جاؤ مجھے کام کرنے دو ...... ٹن ..... گیارہ"

بیٹا نے جھٹ ماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور دوسرے ہاتھ سے ڈائری آنکھوں کے بجائے ناک میں اڑا دی۔

"بارہ ...... تیرہ ....."

"ہائے اللہ —— تم مجھے ڈھکیلے دے رہی ہو"

ماں نے ٹالنے کی غرض سے نوٹ بک لی اور پڑھ کر بولی "ضرور تمہارے باپ نے مدد دی ہے —— خیر جاؤ فضول پریشان مت کرو —— اور کچھ کرو"

"لیکن کیا کروں؟"

"اور شعر لکھو ——"

"شعر ــــ نہیں اب میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

"اچھا لکھو ــــ گھڑی ٹک ٹک کرتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اسی طرح آگے۔"

بیشا دوڑتا ہوا کمرے میں آیا اور لکھنے لگا

"THE LITTLE CLOCK TICKS AWAY, AND I AM BORED ALL THE DAY."

یہ سچ بھی تھا۔ بیشا واقعی بہت آزردہ تھا۔ پھر بھی وہ شعر کہنے کی خوشی میں اچھلتا ہوا باپ کے کمرہ کی طرف دوڑا اور دروازہ زور زور سے کھٹکھٹایا۔

"کون ہے؟" باپ نے دریافت کیا۔

"جلدی دروازہ کھولو ــــ میں ہوں ــــ میں نے شعر لکھے ہیں۔"

"بہت اچھا۔ شاباش شاباش ۔ ۔ ۔ جاؤ اسی طرح اور لکھو۔" باپ نے دروازہ کھولے بغیر ہی جواب دیا۔

"لیکن میں سنانا چاہتا ہوں۔"

"پھر سنانا ــــ ابھی جاؤ۔"

"نہیں ــــ میں ابھی سناؤں گا۔" بیشا جھکا اور دروازہ کے سوراخ سے بلند آواز میں پڑھنے لگا تاکہ اس کا باپ سن لے۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ اس کی آواز گنبد پر اخروٹ کے مانند تھی۔ اس لئے کہ باپ نے بالکل ہی چپ سادھ لی۔ بیشا کو بہت دکھ پہنچا۔ وہ اپنے کمرے میں آکر بڑی دیر تک خاموش کھڑا ہوا اپنی گرم پیشانی کو کھڑکی کے ٹھنڈے شیشے سے رگڑتا رہا۔ اسے قدرے سکون محسوس ہوا۔ وہ پھر اپنی میز پر آکر بیٹھ گیا اور لکھنے لگا۔

"ڈیڈی نے مجھے دھوکا دیا۔ انہوں نے بتلایا کہ ڈائری لکھنا ایک دلچسپ مشغلہ ہے۔ لیکن یہ قطعی جھوٹ ہے انہوں نے یہ سب مجھے دور رکھنے کے لئے کہا۔ کل جب میں ان کے چاندی کے سگریٹ کیس سے کھیل رہا تھا تو انہوں نے مجھے بہت ڈانٹا اور جب بینا نے چینی کا پیالہ توڑ دیا تو بولے کوئی ہرج نہیں اور آجائیگا۔ اور اگر کہیں مجھ سے ٹوٹ جاتا تو میں پھر کیا تھا۔ شامت ہی تو آجاتی۔"

اور اس خیال سے کہ ماں باپ اس کے ساتھ کتنا ناانصافی کا برتاؤ کرتے ہیں وہ قریب قریب رونا ہو گیا۔ اسکے والدین کتنے اچھے تھے۔ لیکن پھر بھی اس کے ساتھ اچھا برتاؤ نہ کر سکتے تھے۔ وہ سوچنے لگا۔

"کیا ساری دنیا میں ماں باپ ایسے ہی ہوتے ہیں؟"

وہ پھر اٹھا اور کھڑکی کے قریب گیا۔ اس نے دیکھا کہ کھڑکی کے کارنس پر ایک چڑیا گویا دھوپ میں پر پھیلائے اپنے گیلے پر سکھا رہی ہے۔ اور بیشا کے شاعرانہ دماغ نے سوچنا شروع کیا۔

WITH LEGS LIKE TOOTHPICKSAND BEADY THIS BIRD HIS WHISKERS LIKE DADDY EYESUPON MY WORD

پھر اس کے شاعرانہ خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ وہ اپنی میز پر آیا اور لکھنے لگا۔

"شعر کہنا بہت آسان ہے۔ بس کسی چیز کی طرف دیکھو اور الفاظ خود بخود شعر کی شکل میں ڈھلتے جائینگے میں بھی

ڈیڈی کی طرح کتابیں لکھ سکتا ہوں. شعروں میں۔ اور مجھے ڈیڈی سے مدد لینے کی بالکل ضرورت نہیں۔ بس ذرا الفاظ ہی یاد کرنے پڑینگے۔ شعر کہنا کوئی بہت بڑا کام نہیں..... ماں...... کاں..... شاں..... ہاں یہ سب شعر ہی ہوتے۔ میں ان سے پوری نظم بنا سکتا ہوں. لیکن میں ایسا ہرگز نہیں کرونگا۔ اور نہ میں ڈائری ہی لکھونگا۔ ماما اور ڈیڈی کو میرے کاموں سے دلچسپی نہیں..... خیر نہ سہی چلو چھٹی ہوئی" بیشا اس خیال سے یکایک آزردہ ہوگیا۔ اتنے میں اس کی استانی اینگزینا آگئی۔

"گڈ مارننگ بے بی..... ارے تم روکیوں رہے ہو؟" اس نے سوال کیا۔

بیشا ذرا اپنی آن رکھنے کے لئے تن گیا۔ اور باپ کی سی بھاری آواز بنا کر بولا۔

"میرے کام میں مت دخل دو" اور پھر لکھنے لگا۔

"ڈیڈی اینگزینا کو نکمی گڑیا کہتے ہیں"

"بیشا کیا لکھ رہے ہو؟" اینگزینا نے دریافت کیا۔

"ڈائری ----- میں اپنے تمام دلچسپ خیالات اس میں جمع کر رہا ہوں"

"اچھا ----- یہ بات ہے" اینگزینا نے نوٹ بک پر جھکتے ہوئے کہا

"ذرا دیکھوں تو کیا لکھا ہے تم نے۔

"ابھی کچھ نہیں۔ صرف چند شعر"

"اچھا تو آپ شاعر بھی ہوگئے ----- ذرا غلطیاں تو دکھاؤ..... ..... لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ڈیڈی نے انہیں مدد دی ہے"

"ڈیڈی نے -----" بیشا کو ایک دم غصہ آگیا۔ "کسی کو بھی میرا یقین نہیں آتا۔ اگر ایسا ہی ہے تو میں اب کوئی کام نہیں کرونگا"

"کیوں ؟ -----" اینگزینا نے سوال کیا۔

"اس لئے کہ میں کرنا نہیں چاہتا" بیشا نے جھنجھلا کر جواب دیا۔

یکایک اینگزینا کی نظریں اُن الفاظ پر پڑیں جو بیشا نے اس کے بارے میں لکھے تھے۔ اس کے چہرے کا رنگ یاقوتی ہوگیا۔ وہ لپک کر آئینے کے سامنے گئی۔

"تو تم نے میرے بارے میں بھی لکھا ہے۔ کیا تمہارے ڈیڈی نے میرے متعلق ایسا ہی کہا۔؟"

"کیوں ؟ ----- تم سمجھتی ہو کہ وہ تم سے ڈرتے ہیں"

اینگزینا ایک بار پھر سنجیدہ ہوگئی۔ اور آئینہ کی طرف مڑی۔

"کیا تم اپنا سبق یاد کرنا نہیں چاہتے ؟"

"جی ---- نہیں"

"اچھا۔ میں ممی سے دریافت کرتی ہوں" یہ کہتی ہوئی اینگزینا کمرے سے باہر نکل گئی۔

بیشا نے آنکھ کے گوشوں سے دروازہ تک اس کا تعاقب کیا۔ اور پھر اپنی ڈائری پر جھک گیا۔ اور لکھنے لگا۔

"میں نے اینگزینا کے ساتھ وہی برتاؤ کیا جیسا ممی ڈیڈی کے ساتھ کرتی ہیں اب وہ مجھے ہرگز پریشان نہ کریگی

اگر کوئی مجھے اچھا نہیں سمجھتا تو نہ سمجھے۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ میں ڈیڈی کی طرح تمام تمام دن اپنی نوٹ بک میں لکھتا رہونگا۔ یہاں تک کہ کھانا، پینا، اور سونا تک چھوڑ دونگا۔ بس ہر وقت لکھتا ہی رہونگا۔ اور پھر ممی پریشان ہوکر کہیں گی بیٹا اتنا زیادہ مت پڑھو، اس سے تمہاری تندرستی خراب ہو جائے گی۔ لیکن میں اُن کی بالکل پرواہ نہ کرونگا جب کوئی مجھے اچھا نہیں سمجھتا تو پھر میں کیوں انکی بات سنوں"

بیشا اتنا ہی لکھنے پایا تھا کہ مس ایگزیتیا کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ اور خاموشی سے اس کے ہاتھ سے ڈائری لیکر پڑھنے لگی۔

"یہ سب کیا ہے؟ —— چلو میں تمہارے ڈیڈی کو دکھلاتی ہوں" اور وہ انکے کمرے کی طرف چل دی۔

"اب شاید مار پڑیگی" بیشا ڈر گیا۔ اور پھر ایگزیتیا کی طرف مخاطب ہوا۔

"تو تم نے ممی سے میری شکایت کی"

"ہاں —— تم نے میرا حکم جو نہیں مانا ——"

"حکم —— میں کوئی گھوڑا ہوں۔ میں ایک وقت میں ایک ہی کام کر سکتا ہوں" بیشا اور کچھ کہنا چاہتا تھا کہ ملازمہ داخل ہوئی اور بتلایا کہ ڈیڈی نے اس کو بلایا ہے۔

"ادھر تشریف لائیے جناب" ڈیڈی نے نوٹ بک اٹھاتے ہوئے کہا۔ ان کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ اور ممی ایک طرف صوفہ میں دھنسی ہوئی تھیں۔ بیشا تاڑ گیا کہ ایسا گھبرا خطرہ نہیں ہے۔ اس لئے وہ خاموشی سے باپ کے قریب آگیا۔

"تم بہت شریر لڑکے ہو —— کیوں؟"

"جی ہاں ——!" بیشا نے جواب دیا

"لیکن کیوں؟"

"اس لئے ...... اس لئے ...... میں نہیں جانتا ...... آپ مجھ سے ناراض رہتے ہیں۔ ماما پیار نہیں کرتی۔ ایگزیتیا تو ہر وقت ہی ڈانٹتی رہتی ہیں"

"تو اس لئے تم ناراض ہوگئے"

"جی اسی لئے"

"نہیں —— تمہیں ناراض نہیں ہونا چاہئے۔ ہم تم کو ناراض کرنا نہیں چاہتے۔ وہ دیکھو تمہاری ممی ہنس رہی ہیں"

"لیکن اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

"میں تمہیں ابھی بتلاتا ہوں۔ ذرا ٹھیرو"

"لیکن میں تو ابھی جانا چاہتا ہوں" بیشا نے ضد کی۔

"دیکھو —— تم بہت ہی شریر لڑکے ہو" باپ نے اس کو گود میں اٹھا لیا "اب ہمیں ذرا سنجیدگی سے بات کرنی چاہئے"

"بہت اچھا ——" بیشا نے ذرا سنجیدہ صورت بنا کر کہا۔

"دیکھو —— کوئی بھی تم کو ستانا نہیں چاہتا۔ یہ صرف موسم کی خرابی کی وجہ ہے۔ اگر موسم اچھا رہتا تو تم مزے سے

ملتے پھرتے اور پھر تم کو ہر چیز اچھی معلوم ہوتی۔ اور تم نے اپنی ڈائری میں بہت سی بیکار باتیں بھی لکھی ہیں:

"آپ ہی نے تو لکھنے کو کہا تھا"

بیٹا۔ میں نے بیکار باتیں لکھنے کو تھوڑا ہی کہا تھا"

"شاید ـــ مجھے اس وقت ٹھیک یاد نہیں"

ماں ہنسی ضبط کرتی ہوئی صوفے سے نکل دوسرے کمرے کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس لئے کہ وہ کافی کی کیتلی اسٹو پر بھول آئی تھی۔ لیکن بیتشا نے دیکھ لیا کہ ماں ہنس رہی تھی۔ گو اپنی ہنسی ظاہر کرنا نہ چاہتی تھی۔

"یہ بڑے بوڑھے بھی کیا ہنستے ہیں" بیتشا نے سوچا۔

باپ نے بھی اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے اور مسکراہٹ کو دباتے ہوئے کہا۔

"بیٹا ـــ اچھا لکھنا بہت ہی مشکل کام ہے۔ میں بھی اکثر لکھتے لکھتے بہت سی بیکار باتیں لکھ جاتا ہوں۔ خیر ـــ بہتر یہ ہے کہ تم ڈائری لکھنا بند کر دو"

"بہت اچھا ـــ" بیتشا نے ایک کاغذ پر لال نیلی لکیریں بناتے ہوئے کہا "یہ کام بھی سبق کی طرح غیر دلچسپ ہے"

"چلو ـــ اب ہم دونوں کو اگنیتا سے معافی مانگنی چاہئے۔ کیونکہ ہم نے جو کچھ کہا اور لکھا وہ اچھا نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ اسکی ناک چپٹی اور چھوٹی ہے لیکن ہمیں اس کا احساس دلانا نہیں چاہئے الفاظ سے تو وہ درست ہے رہی"

"ٹھیک ـــ" بیتشا نے متانت سے جواب دیا۔

یہ تھا بیتشا کی ڈائری کا دلچسپ انجام۔

(مترجمہ جاوید منظر)

## ایوان فیدوثیف

# سوویٹ یونین میں تعلیم

- انقلاب سے پہلے صرف ۷ء۸ فی صدی بچے اسکول جاتے تھے
- انقلاب کے بعد ۱۰۰ فی صدی بچے اسکول جاتے ہیں
- انقلاب سے پہلے چالیس سے زیادہ قوموں کے پاس اپنی تحریری زبان نہ تھی
- انقلاب کے بعد ہر قوم کے پاس تحریری زبان ہے
- ۱۹۱۹ء تا ۱۹۳۰ء ۶۰ ہزار نئے اسکول کھولے گئے
- ۱۹۴۱ء میں ۱۹۱۴ء کی بہ نسبت اسکولی طالب علموں کی تعداد ۵ گنی زیادہ ہوگئی

| انقلاب سے پہلے | انقلاب کے بعد |
|---|---|
| ۹۱ اعلےٰ تعلیمی ادارے<br>اور<br>ایک لاکھ ۱۲ ہزار طالب علم | ۸۰۰ تعلیمی ادارے<br>اور<br>۶ لاکھ ۷۰ ہزار طالب علم |
| تھوڑے سے ٹیکنیکل اسکول<br>اور<br>۳۵ ہزار طالب علم | تین ہزار چار سو ٹیکنیکل اسکول<br>اور<br>۱۲ لاکھ طالب علم |

سوویٹ یونین نے تیس سال کے اشتراکی نظام میں جو اعلیٰ ترین چیزیں ایجاد کی ہیں۔ اُن میں سے ایک اُس کا تعلیمی نظام ہے جسے ساری دنیا میں شاندار قرار دیا گیا ہے۔

انقلاب سے پہلے روس میں تعلیم کی برکت آبادی کی محض ایک چھوٹی سی اقلیت کو میسر تھی اور وہ اقلیت دولتمند طبقہ پر مشتمل تھی۔ ۱۹۱۴ء کے سرکاری اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ صرف ۷ء۸ فیصدی بچے اسکول جایا کرتے تھے۔ جو قومیں زار کی غلام تھیں۔ اُن میں تعلیم کو خاص طور پر نچلی سطح پر رکھا گیا تھا اور اس کی اشاعت میں جان بوجھ کر رکاوٹیں پیدا کی گئی تھیں۔ زار کے روس میں چالیس سے زیادہ قوموں کے پاس اپنی کوئی تحریری زبان نہیں تھی۔

اکتوبر ۱۹۱۷ء کے اشتراکی انقلاب نے روس کی قوموں پر علم اور ادب کا دروازہ کھول دیا۔ تعلیم کی باگ ڈور حکومت نے اپنے ہاتھ میں لے لی اور اسکولوں کو یہ کام سپرد کر دیا گیا کہ وہ نئی سوسائٹی کی تعمیر کے لئے تعلیم یافتہ اور

درمیان نمایاں معیار پیدا کریں۔

سوویٹ یونین کے رہنما اسٹالن نے کہا کہ ہم اپنے تمام کسانوں اور تمام مزدوروں کو مہذب اور تعلیم یافتہ بنانا چاہتے ہیں اور کچھ عرصہ میں ہم ضرور اس مقصد کو حاصل کر لیں گے۔

سوویٹ حکومت اپنی آمدنی کا بیش از بیش حصہ لوگوں کے تعلیمی اور تہذیبی معیار کو بلند کرنے میں صرف کر رہی ہے۔ گذشتہ جنگ سے پہلے دس یا بارہ سال کے عرصہ میں ساٹھ ہزار نئے اسکول کھولے گئے جن میں مجموعی طور پر دو کروڑ لڑکے طالب علم تھے۔ انقلاب سے پہلے کے مقابلے میں ۱۹۴۲ء میں اسکول جانے والے شاگردوں کی تعداد پانچ گنی زیادہ تھی۔

نہ صرف ابتدائی اور ثانوی تعلیم کو ترقی نصیب ہوئی بلکہ اعلےٰ تعلیم کو بھی۔ انقلاب سے پہلے روس میں اعلےٰ تعلیم کے صرف ۹۱ ادارے تھے۔ جن میں ایک لاکھ بارہ ہزار طالب علم تھے اور اب اعلےٰ تعلیم کے آٹھ سو ادارے ہیں جن میں چھ لاکھ ستر ہزار طالب علم موجود ہیں۔ ٹیکنیکل اسکولوں کی تعداد بھی بڑھتی گئی اور اب پورے سوویٹ یونین میں تین ہزار ٹیکنیکل اسکول ہیں۔ اس وقت ان اسکولوں میں بارہ لاکھ طالب علم تربیت حاصل کر رہے ہیں۔ یہ تعداد انقلاب سے پہلے کی بہ نسبت ۳۵ گنی زیادہ ہے۔

سوویٹ یونین میں تمام اسکول اور تعلیمی ادارے حکومت کی ملکیت ہیں۔ اس لئے تعلیم اور تربیت میں ایک خاص ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور اسکولوں اور تعلیمی اداروں کی بہت منصوبہ بندی ہو سکتی ہے۔ ان کے لئے ضروری ساز و سامان مہیا کرنے میں آسانی ہوتی ہے اور نصاب تعلیم کو یکساں بنانا اور اس میں تسلسل پیدا کرنا سہولت آمیز ہو جاتا ہے۔ سرکاری نظام تعلیم کی بدولت سوویٹ یونین کے تمام باشندوں کو اپنے تعلیمی حقوق عمل میں لانے کا موقع مل جاتا ہے۔ سرکاری منصوبہ بندی کی بدولت وہاں کے نظام میں اب کسی قسم کا انتشار نہیں رہا اور نہ اب تعلیم کا دارومدار لوگوں کی خیرات پر ہے۔

سوویٹ یونین میں تمام لوگوں کے لئے سات سال تک تعلیمی ادارے میں رہنا لازمی ہے۔ اس تعلیم کے تمام اخراجات حکومت برداشت کرتی ہے۔ سوویٹ یونین میں جتنی قومیں شامل ہیں۔ ان سب کو تمام معاملات میں مکمل مساوات حاصل ہے۔ چنانچہ تعلیم کے میدان میں بھی ایسا ہی ہے۔ سوویٹ یونین میں شامل ہر ملک میں وہیں کی مادری زبان کے ذریعہ تعلیم دی جاتی ہے۔ تعلیم کے سلسلہ میں عورتوں اور مردوں کو مکمل مساوات عطا کی گئی ہے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے عام تعلیم کا معیار ایک ہی ہے۔ سوویٹ یونین میں تعلیم کا بہت ہی ہم آہنگ نظام قائم کیا گیا ہے جس کے تحت ایک طرف تو ایسے اسکول ہیں جن میں عام تعلیم اور خاص پیشوں کی تعلیم دی جاتی ہے اور دوسری طرف اعلےٰ تعلیم کے اداروں کی بہت بڑی تعداد موجود ہے۔ عام تعلیمی اداروں کے ضمن میں مندرجہ ذیل اسکول آتے ہیں:-

1 - بچوں کے لئے ابتدائی اسکول جہاں سات سے لے کر دس سال کی عمر تک کے بچے پڑھتے ہیں اور چار سال تک تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ یہاں کا نصاب سات سالہ اسکول کے، تین اور ثانوی اسکول کے چار درجوں کے نصاب سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

2 ۔ سات سالہ اسکول (جونیر سکنڈری) یہاں ۷ سے ۱۴ سال کی عمر تک کے لڑکے پڑھتے ہیں۔ یہاں کا نصاب ثانوی اسکول کے اوّلین سات درجوں کے نصاب سے ہم آہنگ ہے۔

3 ۔ ثانوی اسکول ۔ یہاں ۷ سے لے کر ۱۷ سال تک کی عمر کے لڑکے پڑھتے ہیں اور دس سال تک تعلیم ہوتی ہے پہلے چار سال میں ابتدائی اسکول کا پروگرام مکمل ہوتا ہے اور دوسرے تین سال میں جونیر سکنڈری اسکول کا نصاب۔ جنگ کے زمانے میں خاص طور پر ملازمت پیشہ نوجوانوں کے لئے اسکول کھولے گئے تھے۔ تاکہ وہ ملازمت ترک کئے بغیر اپنی فرصت کے اوقات میں کام پر رہ کر ثانوی تعلیم مکمل کر سکیں۔ عام تعلیمی اداروں میں وہ اسکول بھی شامل ہیں جو خاص طور سے اندھوں، بہروں اور گونگوں کے لئے کھولے گئے ہیں یا دماغی لحاظ سے ناکارہ بچوں کے لئے۔

سات سالہ اسکول سے نکلنے کے بعد طالب علم اگر چاہے تو کسی ایسے ثانوی اسکول میں داخل ہو سکتا ہے جس میں کسی فن یا علم کی خاص تعلیم ہوتی ہے۔ جیسے ٹیکنیکل، میڈیکل، ٹیچرس ٹریننگ اسکول، موسیقی یا تھیٹر کے اسکول ان اسکولوں میں تین یا چار سال تک کا نصاب ہوتا ہے۔ یہاں ایک معقول درجے اور درمیانی درجے کے اسپیشلسٹ (خاص خاص فن یا علم کے ماہر) تیار کئے جاتے ہیں۔

سکنڈری اسکول سے نکلنے کے بعد طلبا اعلیٰ تعلیمی ادارے میں داخل ہونے کے مجاز ہوتے ہیں۔ مثلاً یونیورسٹی یا انسٹی ٹیوٹ یا اکیڈمی۔ یہاں چار سے لے کر ۵ سال تک کا کورس ہوتا ہے۔ تمام وہ طلبا جو اپنے مضامین میں اچھا کام دکھلاتے ہیں۔ سرکاری وظیفہ پاتے ہیں۔

سوویٹ یونین کے اسکولوں میں بچوں کے مختلف ادارے پائے جاتے ہیں۔ مثلاً بچوں کے کتب خانے اور ریڈنگ روم، کلب، بچوں کے سینما اور تھیٹر۔ قدرتی زندگی کا تجزیہ کرنے والے چھوٹے بچوں کے تعلیمی مرکز، نو جیز (؟) ماہرین کے مرکز، بچے سیاحوں کے حلقے، بچوں کے تہذیبی پارک اور آرام گاہیں۔ اس قسم کے ادارے سوویٹ یونین میں جتنی تعداد میں پائے جاتے ہیں اتنے دنیا کے کسی بھی ملک میں نہیں پائے جاتے۔ بعض ادارے تو ایسے ہیں۔ جو دوسرے ملکوں میں سرے سے پائے ہی نہیں جاتے۔

سوویٹ یونین کے نظام تعلیم میں بالغوں کے لئے بھی کچھ خاص ادارے ہیں۔ مثلاً کلب، تہذیب محل، پنچایتی کھیت، اور دیہی کلب، دیہی مطالعہ گاہیں، تہذیبی پارک اور آرام گاہیں، کتب خانے، میوزیم اور لکچر بیوریو۔

یہ ہے سوویٹ یونین کا نظام تعلیم۔ اس میں تمام باشندوں کے لئے تعلیم حاصل کرنے کے وسیع امکانات موجود ہیں۔ اس سے فائدہ اٹھا کر وہ اپنی صلاحیتوں میں اضافہ اور اپنی ذہنی دلچسپیوں کی تسکین کر سکتے ہیں۔

(مترجم طفیل احمد)

سلطانہ مہر

# گیت

ندی دیپ جلائے پگلی پائے گھور اندھیرا
کون کہے اب اسے ہیلی، انت یہی ہے تیرا

رین کی گودی خالی کر کے چاند ستارے بھاگے
اندھیارے ہیں پیچھے پیچھے جیوتی آگے آگے
ہوتے ہوتے نینوا سے اوجھل ہوا سویرا
چھایا گھور اندھیرا
انت یہی ہے تیرا

دُور دُور تک ایک اداسی پڑی لمبی اِک چھایا
دھرتی سے آکاش تک اُڑ کر آشا نے کیا پایا
چاروں کھونٹ چلی اندھیاری چِنتاؤں نے گھیرا
چھایا گھور اندھیرا
انت یہی ہے تیرا

کون چنے اب ٹوٹے تارے؟ جوت کہاں سے آئے
کون گگن پر سیج بچھائے؟ پھول تو ہیں مُرجھائے
کون ہے جو اس نگری میں اب آ کر کرے بسیرا؟
ندی دیپ جلائے پگلی پائے گھور اندھیرا
کون کہے اب اسے ہیلی انت یہی ہے تیرا

اخترؔ ہوشیارپوری

# اجنبی

جب کہیں ملتے ہیں دو دوست تو دیکھا ہے یہی
گھنی پلکوں پہ سرک آتی ہیں لاکھوں یادیں
دیکھتے دیکھتے لَوٹ آتی ہیں بیتی گھڑیاں
گزرے ایام دبے پاؤں پلٹ آتے ہیں
اک دن اُس سے بھی یونہی اپنی ملاقات ہوئی
اور کئی ڈوبے ہوئے تارے اُفق پر اُبھرے
جن کی تابانی سے ہر سمت چراغاں تھا کبھی
زندگی پیکرِ انوار نظر آتی تھی
وہ حسیں لمحے بھی آنکھوں میں مری تیر گئے
جن سے امید کا دامن کبھی وابستہ تھا
جن کی آغوش میں ہم راتوں کی تنہائی میں
آرزوؤں کے جواں خواب بُنا کرتے تھے
اور میں اُس کی نگاہوں کا سہارا پاکر
زلف شبگوں کی گھنی چھاؤں میں سو جاتا تھا

یہ مری نیند گراں گزری دلِ عالم پہ
میں مگر بے خبرِ رنگِ جہاں سوتا رہا
اک حزیں صبح کو جب آنکھ کھلی تو دیکھا
میرے خلوت کدے میں کوئی نہیں - وہ بھی نہیں
جیسے گلزار میں ہر سمت خزاں آتے ہی
پتے گرتے ہیں حسیں پھول بکھر جاتے ہیں
اور پلٹ جاتا ہے یوں قافلۂ نکہت و رنگ
جیسے اِس رہ پہ اندھیرے میں چلا آیا ہو
اور اِس رہ پہ منزل کا نشاں کوئی نہیں
اس نے پھر مجھ کو کچھ اُن نظروں سے دیکھا جیسے
وہ کبھی مجھ سے مرے غم سے شناسا ہی نہ تھی
اور میں درماندہ مسافر تھا جو تاریکی میں
اپنے رستے سے بہت دور بھٹک آیا تھا
اور کسی اجنبی منزل کا نشاں پوچھتا تھا

ابنِ انشا

# انتہائے ابتدا

## کردار

کشوری :- عمر ۵۵ سال ؛ فربہ اندام - گنجا
پھمی :- کشوری کی بیوی - عمر ۴۵ سال بڑی سلیقہ شعار عورت ہے
نین سکھ :- ایک پڑوسی - کشوری کا ہم عمر - دبلا پتلا - بڑی بڑی مونچھیں - نظر بہت کمزور ہے۔

منظر :- ایک وسیع باورچی خانہ - دہنے ہاتھ آتشدان - کچھ کرسیاں چوکیاں اور میز - ایک طرف ایک الماری جس پر گراموفون رکھا ہے - پشت پر ایک دروازہ اور دروازے کے بائیں ہاتھ ایک کھڑکی - دروازے کے دہنے ہاتھ ایک میز جس پر الارم ٹائم پیس رکھا ہے - ایک کھونٹی سے تولیہ لٹک رہا ہے - میز پر جھوٹے برتن پڑے ہیں - آتشدان کے دہنے ہاتھ ایک کوٹھڑی ہے جس میں ڈلی پھوٹی چیزیں پڑی رہتی ہیں - چھت سے بجلی کا ایک بلب لٹک رہا ہے - سامنے کی دیوار پر گتے کی ایک تختی نظر آ رہی ہے - جس پر جلی حروف میں لکھا ہے - "آج کا کام کل پر نہ چھوڑو"۔
تیسرے پہر کا وقت ہے۔

کشوری (دروازے کے پاس والی میز پر بیٹھا داڑھی مونڈ رہا ہے) پھمی! پھمی! ادھر آؤ تو - ادکھو حجامت کے لئے یہ کیا پانی دیا ہے تم نے - برف کی طرح ٹھنڈا ہو رہا ہے - اسے گرم کر دو - بہری ہو گئیں کیا؟

پھمی (ادھر ادھر کمرے میں کام کرتی پھر رہی ہے) میں اس وقت کام کر رہی ہوں - تم خود ہی الاؤ کر لو۔

کشوری - بہت خوب! تو گویا یہ بھی میرا ہی کام ہے - جتنا کام تم دن بھر میں کرتی ہو گی - اس سے تگنا کام کرنا پڑتا ہے مجھے - اس پر بھی تمہارا یہ حال ہے۔

پھمی :- اور تمہارا یہ حال ہے کہ مجھ سے آدھا کام بھی تمہیں کرنا پڑے تو غش کھا جاؤ - یہ حالت ہو جائے کہ شام کو چار مزدور منگانے پڑیں تمہیں اٹھانے کے لئے۔

کشوری - سچ؟

پھمی - ہاں سچ کہہ رہی ہوں۔

کشوری۔ تم سے آدھا۔
چھمی۔ ہاں۔ بلکہ آدھے سے بھی کم
کشوری۔ چار مزدور کا ہے پھر بھی ۔۔؟
چھمی۔ ہاں پورے چار۔
کشوری (درشتی سے) چھمی! میں تم سے کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ اپنا سرم جھال اور تمارا کام یہی کرتا ہوں
تم ذرا میرا کام کر دیکھو۔ چند گھنٹے کے لئے ہی سہی۔ لیکن۔ تم تمہارے کام کے کرتے لگیں۔ میں
دیکھ لوں کہ کتنے پانی میں ہو تم ۔۔ میرا کام تمہیں ایک دن بھی کرنا پڑے تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے
چھمی۔ جاؤ۔ اور جا کر مشین پر پانی کا چارہ کاٹ لو۔ ابھی تو کچھ روشنی ہے۔ پھر سورج غروب ہو جائے گا تو کچھ نہیں
کشوری۔ کچھ پروا نہیں۔ کل دیکھا جائے گا۔ اور ویسے آج تم ہی یہ کام کیوں نہ کرو۔ کچھ گھر کا کام میں سنبھال لوں
منظور ہے؟
چھمی۔ مجھے منظور ہے۔
کشوری۔ اچھا تو بولو۔ گھر کا کیا کیا کام کرنا ہے۔
چھمی۔ بچھیا کو چارہ ڈالنا ہے۔ پانی پلانا ہے۔ مرغیوں کے آگے چگا ڈالنا ہے۔ کھانا پکانا ہے۔ کپڑے سینے
ہیں اور ۔۔ سینے ہیں۔
کشوری۔ سینے ہیں۔ بہت خوب۔ دیکھی ہے تمہاری سلائی۔ میری واسکٹ سی ہے نا تم نے؟ بازار سے
گزرتا ہوں تو لوگ دیکھ دیکھ کر تالیاں پیٹتے ہیں۔
چھمی۔ خیر ۔۔ تو میں جاتی ہوں۔ تم گھر کا کام نپٹاؤ۔
کشوری۔ نپٹا لوں گا جی ۔۔ تم جاؤ۔ دفان ہو جاؤ۔ کام تب چلتا ہے اگر انسان ٹھنڈے سبھاؤ سے لے
تمہاری طرح چڑ چڑ کرتے رہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔
چھمی۔ بچھیا کو چارہ دینا ہے اور پانی بھی دکھانا ہے سُنا؟
کشوری (جی میں تو خائف ہے کہ یہ تو واقعی جانے پر تُلی ہوئی ہے ۔۔ بظاہر) ابھی اب جاؤ بھی کیوں سر کھا رہی ہو؟
چھمی۔ اور میرے پیچھے کلموہی ایشری کو گھر میں قدم رکھنے دیا تو دیکھ لینا۔
کشوری۔ کون ایشری۔
چھمی (تیز ہو کر) ہونہہ ۔۔ کون ایشری ۔۔! وہی جس سے کل ہنس ہنس کر باتیں کی جا رہی تھیں ۔۔ وہی ایشری
جس نے تمہارے دل میں یہ وہم ڈال دیا ہے کہ تمہاری توند نکلتی تو ہزاروں میں ایک گبرو جوان نظر آتے
اور جس کا دل موہنے کے لئے تم نے یہ الٹی سیدھی کسرتیں شروع کر رکھی ہیں ۔۔ اس بڑھیا کی عمر ۵۰ سال
سے اوپر ہو رہی ہے اور ابھی تک اپنے آپ کو اٹھارہ سال کی چھوکری ظاہر کرتی ہے۔
کشوری۔ ابھی میں کیا جانوں ایشری کون ہے ۔۔ تم تو خواہ مخواہ بک جھک کر رہی ہو۔
چھمی۔ اب جھوٹ بولنے سے فائدہ ۔۔ جب تمہیں خیال ہوتا ہے کہ میں سو گئی ہوں تم آئینے کے سامنے جا کر

ورزش کرنی شروع کر دیتے ہیں۔ اگر سب کچھ ایشوری کی خاطر نہیں چھوڑا تو اور کس کے لئے چھوڑا ہے۔
وری (طیش میں آکر) بھلا کتنا بھول بھاگ جاؤ۔ وہاں ہو جاؤ یہاں سے
ی۔ بہت اچھا میں تو سمجھا، بتا دینا چاہتی ہوں کہ نقصان اٹھاؤ گے اس کلونی کے ہاتھوں — اسے
منہ مت لگاؤ۔ کہ تمہیں بھی کھا جا رہی ہے اور اس بڑے کو بھی۔ جیسے پاس کھڑا ہاتھی بھی دکھائی نہیں دیتا۔
وری۔ چلی بھی اب جاؤ۔ پھر کوئی گھر کا کام نہیں کیا۔
ی۔ اور میں تو کھتی ہوں۔ بھگوان کرے میرے واپس آنے تک دیواریں ہی سلامت رہیں۔
باہر نکل جاتی ہے۔ کشوری دروازے کے سامنے آ جاتا ہے اور اسے جاتے
ہوئے دیکھتا ہے
وری (حقارت سے) ہونہہ۔ چارہ کاٹنے گئی ہے۔ قدر عافیت معلوم ہو جائے گی ابھی۔
[دروازہ بند کر دیتا ہے۔ گھنٹہ گھر کے گھڑیال میں پانچ بجنے کی آواز آتی ہے۔ کشوری
مڑ جاتا ہے۔ الارم ٹائم پیس کی طرف دیکھتا ہے۔ ٹائم پیس ٹھہر گیا ہے۔ اٹھ کر اس
کے پاس سے جاتا ہے اور پھر چابی دینا شروع کر دیتا ہے۔ ایک جگہ چابی اٹکتی ہے
سارا زور دے کر گھماتا ہے۔ ٹائم پیس کے اندر سے پھرررر کی آواز آتی ہے جیسے
کوئی سپرنگ ٹوٹ گیا ہو۔ ٹائم پیس کو میز پر رکھ کر کچھ دیر سوچتا ہے۔ پھر ٹائم پیس کو
پچھلی طرف سے کھولتا ہے۔ ایک ٹوٹا ہوا سپرنگ باہر نکل پڑتا ہے۔ وہ جلدی سے
اسے پھر وہیں دھکیل دیتا ہے اور ٹائم پیس کو اس کی پہلی ہی جگہ پر لگا دیتا ہے
ی (آہستہ سے) کبھی نہ آ جائے کم بخت کہیں۔
گراموفون پر نظر جاتی ہے۔ کچھ دیر سوچتا رہتا ہے۔ پھر الماری میں سے ایک ریکارڈ
نکال کر گراموفون پر لگا دیتا ہے۔ قمیص کے گلے کے بٹن کھول دیتا ہے۔ سیدھا کھڑا
ہو جاتا ہے۔ توند پر ہاتھ پھیرتا ہے اور اسے زور لگا کر اندر کی جانب کھینچتا ہے اور
پھر گراموفون چلا دیتا ہے۔ کمرے کے وسط میں جا کر پیٹھ کے بل فرش پر لیٹ جاتا ہے
کشوری گراموفون کی ہدایتوں کے مطابق بھدے پن سے ورزش کرنے کی کوشش کرتا ہے]
ون۔ پیٹھ کے بل لیٹ جاؤ۔ ہاتھ گردن کے نیچے رکھو۔ پاؤں جوڑ لو۔ تیار۔ دہنا گھٹنا موڑ لو اور کمر کے
پاس لاؤ۔ شروع کرو۔
یا تو کشوری سست ہے۔ یا گراموفون کا ریکارڈ چل رہا ہے۔ بہر حال کشوری ہدایتوں
کے ساتھ ساتھ نہیں چل پاتا۔ کشوری اپنی رفتار تیز کر دیتا ہے اور گراموفون کا ساتھ
دینے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن پھر بھی پچھڑ جاتا ہے۔ ہانپنے لگتا ہے اور پیچھے رہ
جاتا ہے۔
اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور گراموفون کے اسپیڈ کی سوئی کو slow کی طرف کھسکا دیتا ہے

کشوری - اُف - بہت تیز چلتا ہے - بہت تیز ہے

[ گرامو فون چلا دیتا ہے۔ دوڑ کر پھر کمرے کے وسط میں پہنچتا ہے اور پیٹھ کے بل لیٹ جاتا ہے۔ ورزش شروع ہوتی ہے۔ لیکن اب کے گراموفون بہت سست ہو گیا ہے اتنا کہ کشوری اب بھی اس کے ساتھ ساتھ نہیں چل سکتا۔

دروازہ کھلتا ہے۔ نین سکھ داخل ہوتا ہے۔ اس کے کندھے سے ایک طنبورہ لٹک رہا ہے اور آنکھوں پر ایک بہت بڑے فریم اور موٹے موٹے شیشوں والا چشمہ بہار دے رہا ہے۔ ]

نین سکھ (گنگناتا ہوا) ہر روز حسینوں کا دیدار نہیں ہوتا ـــ ہر روز حسینوں کا ـــ ارے یہ کیا کر رہے ہو تم؟

کشوری - اندھے ہو؟ نظر نہیں آتا تمہیں؟ چشمہ اتار کر دیکھو۔ جسم بنا رہا ہوں اپنا جسم ـــ!

نین سکھ - لیکن میرے بھائی گراموفون بہت آہستہ چل رہا ہے۔ تم اسی لئے تو ٹھیک طرح کر نہیں رہے ہو۔

کشوری - اوہو ـــ تو انڈی کیٹر اپنی جگہ سے ہل گیا ہوگا۔ تم ذرا اسے MEDIUM پر کر دو۔ اس کے بعد آؤ دونوں مل کر ورزش کریں گے۔

نین سکھ - اور بھئی۔ کل ہمیں سکول کے جلسے میں کوئی گانا بھی تو گانا ہے۔ تیار کر لیا تم نے؟

کشوری - ابھی پانچ منٹ ٹھہرو۔ یہ کسرت کر لیں۔ پھر اکٹھے تیاری کر لیں گے

نین سکھ - لیکن بھیا۔ میں نے تو کبھی گراموفون کے ساتھ ورزش کی نہیں۔ میں تو کر نہیں سکوں گا شاید۔

کشوری - تم تو بیوقوف ہو رہے ہو۔ گراموفون کے ساتھ ورزش کرنا تو آسان ہے۔ ورنہ تم میری طرف دیکھ دیکھ کر کئے جانا۔ جیسے جیسے میں ہاتھ پاؤں ہلاؤں اور رگوں پٹھوں کو جنبش دوں۔ تم بھی ساتھ ساتھ کئے جانا۔

[ نین سکھ با دلِ ناخواستہ آمادہ ہو جاتا ہے۔ طنبورہ ایک طرف رکھ دیتا ہے۔ پھر گراموفون کے پاس جاتا ہے اور پھر ناک انڈی کیٹر کے بالکل قریب لے جا کر اسے تیز FAST پر کر دیتا ہے۔

کشوری - اصل میں ورزش ٹھیک طرح کرنے کے لئے تمہیں نیکر پہننی چاہئے تھی۔ لیکن خیر ـــ اچھا اب گراموفون کے ساتھ ساتھ چلنا۔ ورنہ سارا مزا کرکرا کر دو گے۔ گراموفون چلا دو اور خود میرے برابر آ جاؤ۔

[ نین سکھ گراموفون چلا دیتا ہے۔ پھر بھاگ کر آتا ہے اور کشوری کے بالمقابل پیٹھ کے بل لیٹ جاتا ہے۔ اس طرح کہ دونوں کے پاؤں کے تلووں کے درمیان چند انچ سے زیادہ فاصلہ نہیں رہتا ]

گراموفون (رفتار بڑی تیز ہے) پیٹھ کے بل لیٹ جاؤ۔ ہاتھ گردن کے نیچے رکھو۔ پاؤں جوڑ لو۔ تیار۔ دہنا گھٹنا موڑو اور کمر کے پاس لے آؤ۔ شروع ـــ ع ـــ کرو!

[ چونکہ گراموفون کی رفتار تیز ہے۔ اس لئے انہیں بہت محنت کرنی پڑتی ہے کشوری

تھک کر ٹھہر جاتا ہے۔ نین سکھ ورزش جاری رکھتا ہے ]

کشوری ۔ اسے۔ اسے۔ بس۔ او۔ ٹھہرو بھی۔ ایک منٹ شانتی کرو میرے بھائی۔ یہ کیا کر دیا گراموفون کو تم نے۔

نین سکھ ۔ کچھ بھی نہیں۔ میں نے تو کچھ نہیں کیا،

کشوری ۔ پھر یہ اتنا تیز کیوں چل رہا ہے۔ میں تو ہلکان ہی ہو گیا۔ تم نے انڈی کیٹر کو FAST پر تو نہیں کر دیا (گراموفون کے پاس جا کر انڈی کیٹر کو ٹھیک کرتا ہے ) ہم ورزش کر رہے ہیں۔ کوئی مصیبت نہیں آ پڑی ہم پر۔

[ وہ پھر آ کر زمین پر لیٹ جاتا ہے۔ گراموفون چلنے لگتا ہے اور دونوں ورزش شروع کر دیتے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں کشوری کی حرکات سست پڑ جاتی ہیں، اور وہ جھنجھلا کر اپنا غصہ نین سکھ پر اتارنے کی کوشش کرتا ہے ]

کشوری ( ورزش جاری رکھتا ہے لیکن بے تال) ارے میاں گراموفون کے ساتھ ساتھ چلنے کی کوشش کرو۔ دُہ ، دُا دُوا — دُہ دا۔ دُوا۔ اس طرح۔ دُہ دا دُوا — ادھر دیکھو۔ میری طرف دُہ دا دُوا —

[ ہانپنے لگتا ہے۔ پھر ٹھہر جاتا ہے اور نین سکھ پر برسنے لگتا ہے حقیقت یہ ہے کہ وہ خود تھک گیا ہے اور سستانا چاہتا ہے

کشوری ( بڑی متانت سے ) نین سکھ! دیکھو میاں۔ تم اپنے بے ڈھنگے پن سے سارا کھیل خراب کئے دیتے ہو اپنے بازو اور ٹانگیں ڈھیلے ڈھالے کیوں رکھتے ہو۔ جیسے ان میں جان ہی نہ ہو۔ پٹھوں کو ذرا اکڑائے رکھو۔ سمجھے — ہاں — اب شروع کرو۔

[ وہ پھر شروع کرتے ہیں۔ کشوری پھر پیچھے رہ جاتا ہے اور بے طرح ہانپنے لگتا ہے نین سکھ بڑی اچھی طرح گراموفون کے ساتھ ساتھ ورزش جاری رکھتا ہے ]

کشوری ۔ ارے میں کہتا ہوں، تم اتنی تیزی سے کام کیوں لیتے ہو۔ ذرا آہستہ چلو۔

نین سکھ ۔ نہیں تو۔ میں تیز تو نہیں ہوں۔ گراموفون کے ساتھ ساتھ چل رہا ہوں۔

کشوری ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تم گراموفون کے ساتھ ساتھ چلو تو میرے ساتھ ساتھ نہ رہو پھر؟ — پتہ نہیں کیا نقص ہے تم میں۔ تم کبھی مجھ سے پیچھے رہتے ہو اور کبھی آگے ہو جاتے ہو۔

نین سکھ ۔ میں تو گراموفون کے ساتھ ساتھ چل رہا ہوں۔ البتہ تم چوک جاتے ہو۔

کشوری (غصے میں آ جاتا ہے) ہوں — میں چوکتا اس لئے ہوں کہ تم نئے آدمی ٹھہرے۔ مجھے تمہیں ساتھ لینا پڑتا ہے۔ لیکن بیکار تم نہیں سیکھ سکتے۔

نین سکھ ۔ لیکن میں اپنی طرف سے تو ٹھیک ہی ہوں۔ کیا نقص ہے آخر۔

کشوری ۔ ہوں۔ کیا نقص ہے آخر۔ تمہاری حرکات دیکھ کر تو رونا آتا ہے (اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ نین سکھ ورزش بدستور جاری رکھتا ہے ) او میاں! تمہارے ہاتھ پاؤں میں موچ آ جائے گی کہیں عمر بھر کے لئے روگی ہو جاؤ گے ۔ ادھر آؤ۔ اب ذرا گانے کی مشق ہو جائے ( نین سکھ ورزش اب بھی جاری رکھتا

ہے) میں کہتا ہوں ادھر آؤ۔ بہت ہوئی کسرت۔

(نین سکھ بادلِ ناخواستہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ کشوری جا کر گراموفون بند کر دیتی ہے)

نین سکھ۔ میں بھی چکّی ورزش کر رہا تھا۔ تم نے خواہ مخواہ ٹانگ اڑا دی۔

کشوری (حقارت سے) تم مجھ سے جھوٹے بھلے نہیں تھا۔ جیسے تم نے پہلوان کہیں کے

(دونوں تنبورے اٹھا لیتے ہیں اور پاس پاس بیٹھ جاتے ہیں)

کشوری۔ اچھا تو اب بھی شروع کرو۔

نین سکھ (گلا صاف کرتے ہوئے) کون سا شروع کروں؟

کشوری۔ وہی۔ بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

نین سکھ۔ اچھا (گنگناتے ہوئے)۔ عشق میں اپنا جی نہ تیاگ عشق نہیں ہے آگ ہے آگ
کس کی لگاوٹ کس کی لاگ

کشوری۔ بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

نین سکھ۔ حسن کے گُن کیا گاتا ہے حسن تباہی لاتا ہے
حسن گلے کٹواتا ہے

کشوری۔ بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

نین سکھ۔ حسن کے ارماں ٹھیک نہیں جی کا نقصاں ٹھیک نہیں
ٹھیک نہیں ہاں ٹھیک نہیں

کشوری۔ بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

نین سکھ حسن کا دم کیوں بھرتا ہے خونِ دل کیوں کرتا ہے
جیتے جی کیوں مرتا ہے

کشوری۔ بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

نین سکھ حسن سے دھوکا کھائے گا رنج و اذیت پائے گا
دیکھ بہت پچھتائے گا

کشوری۔ بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

نین سکھ حسن کو پہلے زر دے گا بعد ازاں پھر گھر دے گا
آخر آخر سر دے گا

کشوری۔ بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

نین سکھ ہجر کا غم بھی قاتل ہے وصل کا سم بھی قاتل ہے

کشوری۔ کم سے کم بھی قاتل ہے
بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

نین سکھ ۔ جس کا جھوکر کیا ہے گا سر سے پاؤں تک کھائے گا
بھاگ نہیں آ پائے گا
کشوری ۔ بھاگو بھاگو بچائے جس سے بھاگ

[ گانا ختم ہو جاتا ہے ۔ کشوری اپنے کان اونچے کر لیتا ہے اور کچھ سننے کی کوشش کرتا ہے ۔ دور سے چارہ کاٹنے کی مشین چلنے کی آواز آتی ہے ]

نین سکھ ۔ اس گیت کو ایک بار پھر دوہرالیں
کشوری ۔ مشین ۔ سنتے نہیں ہو ؟ (گھنٹہ گھر پھر بجتا ہے) اوہو ۔ میں تو بھول ہی گیا تھا مجھے تو کام بھی کرنا ہے ۔
نین سکھ ۔ کیا کام کرنا ہے ؟
کشوری ۔ یہی ۔ گھر کا کام ۔ اگر ممی کے آنے تک میں نے گھر کا کام ختم نہ کیا ۔ تو بس ۔
نین سکھ ۔ گھبراؤ نہیں ۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا رفتہ رفتہ ۔
کشوری ۔ گھبراؤں نہیں ۔ اور وقت جو اڑا جا رہا ہے ۔ اگر میں چبوترے پر چڑھ کر سورج سے کہوں ۔ سورج بھگوان ذرا میرے لئے رک جائیے تو کیا سورج رک جائے گا
نین سکھ ۔ میں جانتا ہوں نہیں رکے گا ۔ لیکن اگر تم نے گھبراہٹ میں ادھر ادھر دوڑنا شروع کیا تو کام کیسے ہو جائیگا
کشوری ۔ بس یہی تو تمہیں معلوم نہیں ہے ۔ کوئی کام جلدی کرنے کی کوشش نہ کریں تو جلدی ہو کیسے جائیگا اب اگر تم زمین پر لیٹ کر الٹی سیدھی لائنیں چلانا شروع کر دو تو کام کیسے ہو سکتا ہے اور پھر جب تم طنبورہ لے کر بے معنی راگ الاپنے شروع کر دو تو کون کر سکتا ہے کام ؟
نین سکھ ۔ ورزش کرنے کو بھی تم نے مجھ سے کہا تھا اور گانے کے لئے بھی ۔ ورنہ میں تو ۔
کشوری ۔ ہوں ۔ میں نے کہا تھا تمہیں ۔ نین سکھ ۔ تم اتنا جھوٹ کیوں بولنے لگے ہو ۔ کیا تم خود طنبورہ کندھے پر لٹکائے نہیں آئے ۔
نین سکھ ۔ ٹھیک ہے لیکن ۔
کشوری ۔ اور پھر گلا پھاڑ کر گاتے رہے ۔
نین سکھ ۔ بے شک ۔ مگر ۔
کشوری ۔ اور جس وقت تم آئے ہو ۔ میں کسرت کرنے کی کوشش کر رہا تھا ۔
نین سکھ ۔ میں جانتا ہوں ۔ لیکن ۔
کشوری ۔ اور پھر تم بھی زمین پر لیٹ کر میری نقل اڑانے کی کوشش کرنے لگے
نین سکھ ۔ ایک منٹ ٹھہرو ۔
کشوری ۔ نانانا ! مجھ میں بحث کرنے کی ہمت نہیں ۔ مجھے کام بھی کرنا ہے کچھ ۔ تم میرا ہاتھ بٹا سکتے ہو تو ٹھہرو ۔ ورنہ اپنا راستہ لو ۔

نین سکھ۔ بھئی میں مدد کرتا ہوں تمہاری — مجھے کوئی کام تو بتاؤ
کشوری (ٹائم پیس کی طرف دیکھتے ہوئے) ارے۔ گھڑی ٹھیر گئی ہے کیا؟
نین سکھ (اٹھا کر کان کے پاس لاتا ہے) ٹِک ٹِک تو کرتی نہیں ہے۔ اور یہ بھی گھنٹوں پیچھے
کشوری۔ ہوں۔ سب تمہاری لاپرواہی کے کرشمے ہیں۔ اچھا اب اسے ذرا چابی دے دو اور سوئیاں ساڑھے ۹ پر کر دو۔

نین سکھ چابی دینی شروع کرتا ہے۔ کشوری میز کے پاس جا کر برتن دھونے شروع کرتا ہے اور گنگناتا ہے — تمہی نے درد دیا ہے تمہی دوا دینا۔ نین سکھ چابی دیتا ہے۔ لیکن چابی خالی گھومتی رہتی ہے۔ نین سکھ کی سمجھ میں کچھ معاملہ نہیں آتا۔ وہ پھر چابی دیتا ہے۔ اور ٹائم پیس کو واپس میز پر رکھنے لگتا ہے۔ کشوری مڑ کر اس کی طرف دیکھتا ہے

کشوری۔ توڑ دیا نہ آخر؟
نین سکھ۔ میں نے تو ہاتھ بھی نہیں لگایا گھڑی کو۔
کشوری۔ ہوں۔ ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ جیسے میں اندھا ہوں۔ گھنٹہ بھر پہلوانوں کی طرح کشتی لڑتے رہے ہو اور اب کہتے ہو۔ چھوا تک نہیں (نین سکھ کے پاس جا کر) دکھاؤ مجھے (نین سکھ کے ہاتھ سے گھڑی لے کر پچھلی طرف سے کھولتا ہے۔ اسپرنگ باہر آ کر گرتا ہے) دیکھ لو اپنی کرتوت۔ ابھی کہہ رہے تھے۔ میں نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ خدا کے لئے ہمارے گھر پر رحم کیا کرو۔ بڑی قیمتی چیز تھی یہ۔ چچ چچ چچ (اسپرنگ کو پھر اندر دھکیل دیتا ہے اور گھڑی کو آہستہ سے میز پر رکھ دیتا ہے) تمہارے ہاتھ کسی دیو کے ہاتھ ہیں ادھر آؤ۔ میں برتن دھو رہا ہوں۔ تم صافی لے کر انہیں پونچھتے رہو۔

[دونوں برتن دھونے لگتے ہیں۔ کشوری نین سکھ کی طرف دیکھتا رہتا ہے۔ نین سکھ کی نظر بہت کمزور ہے۔ اس لئے بے چارہ برتن بالکل عینک کے پاس لے جا کر صاف کرتا ہے]

کشوری (یکایک) دیکھو۔ دھیان سے کام کرو۔ پیالی کو ٹھیک سے میز پر رکھو۔ گر جائے گی تو نقصان ہوگا خواہ مخواہ
نین سکھ۔ نہیں تو۔ گھبراؤ نہیں۔ گرتی نہیں۔
کشوری (گنگناتا ہے) ہر روز حسینوں کا دیدار نہیں ہوتا
نین سکھ (جھک کر اور ایک ہاتھ بلند کر کے) یہ طور کا جلوہ ہے جو ہر بار نہیں ہوتا
کشوری۔ شاباش۔ بہت خوب (لہک کر) ہر روز حسینوں کا — اجی ہر روز حسینوں کا دیدار نہیں ہوتا
نین سکھ (چکر کاٹتے ہوئے) یہ طور کا جلوہ ہے ہر بار نہیں ہوتا۔

(اس کے ہاتھ سے پیالی گرتی ہے اور چکنا چور ہو جاتی ہے)

کشوری (غضبناک ہو کر) اندھے! بدمعاش!! کہیں پی تو نہیں رکھی تم نے۔ میں کہتا ہوں۔ تم انسان ہو کہ
نین سکھ (عذر گناہ کرتے ہوئے) اتنی سی تو پیالی تھی۔ کیا ہوا ٹوٹ گئی تو۔
کشوری (گرم ہو کر) کیا ہوا ٹوٹ گئی تو۔ اب اگر میں سر پھوڑ دوں تمہارا تو بھی کہو گے کیا ہوا۔ ادھر بیٹھ جاؤ ایک کونے میں

آرام ہے ۔ بیٹھے بیٹھے خون کو جوش آگیا۔ تیرے جیسے نین کی بات ہوتو تمہیں زنجیر باندھ کر رکھا کروں۔ اچھا اب میرا تھکے سے کسی چیز کو ہاتھ مت لگانا ۔ اگر کچھ کیا تو کچھا دوں گی۔

[کشوری آگ کی طرف بڑھتی ہے، جسے دیکھ کر نین سکھ گھبرا جاتا ہے۔ پھر دروازہ کھلا چھوڑ کر باہر نکل جاتا ہے۔ نین سکھ ایک کونے میں سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر ایک آواز آتی ہے اور اس کے ساتھ کشوری کی چیخ سنائی دیتی ہے۔ پھر بعد کشوری بھاگتی ہوئی آتی ہے۔ ناک پر رومال رکھا ہے جو خون سے بھر رہا ہے۔ وہ آکر پلنگ پر بیٹھ جاتی ہے اور ناک کو رومال سے زور زور سے دباتا ہے]

کشوری۔ (کراہتے ہوئے) بھاگ کے کوئی ٹھنڈی چیز لاؤ ۔ ذرا۔

نین سکھ۔ بھگوان کے لئے کچھ بتاؤ تو سہی تمہیں کیا ہوگیا ہے

کشوری۔ ہائے رے میں جلدی میں باہر کے دروازے کی طرف جو لپکا۔ چوکھٹ سے ٹکرا گیا۔ ہائے ۔ ہائے۔ اب کھڑے کیا دیکھ رہے ہو۔ بھاگ کے کوئی ٹھنڈی چیز لاؤ۔ کسی طرح یہ خون تو بند ہو۔

نین سکھ۔ اب تم اپنی جلد بازی کی سزا بھگتو۔ میں ٹھنڈی چیز کہاں سے لاؤں؟ میں نے تو پہلے نہیں کہہ دیا تھا کہ یوں جلدی بھاگنے سے کام نہیں بنے گا۔

کشوری۔ (بگڑ کر تیوری چڑھا لیتا ہے) ارے چلے جاؤ۔ ہوش کی دوا کرو۔ میں درد سے مرا جا رہا ہوں اور تمہیں چالیں سوجھ رہی ہیں۔

نین سکھ۔ اچھا تو برف کا ٹکڑا چاہئے ہے تمہیں؟

کشوری۔ ہاں بس تھوڑی سی برف چاہئے۔ لیکن یہ بتاؤ۔ برف لاؤگے کہاں سے؟ اور سے بھی آئے۔ تو میری گردن پر باندھوگے کس طرح۔ اب بولو۔ کہاں سے لاؤگے برف؟

نین سکھ۔ اب میں کیا جانوں کہاں سے ملے گی برف۔

کشوری۔ تو اب تمہارا خیال ہے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسی طرح لیٹا رہوں ---

[اس مکالمے کے دوران میں نین سکھ کمرے میں ادھر ادھر چکر کاٹتا ہے۔ میز کی درازوں میں جھانکتا ہے۔ میز پر جو برتن پڑے ہیں۔ ان کے پاس جاکر دیکھتا ہے جیسے وہاں برف چھپا رکھی ہو کسی نے۔ برتن کھٹکنے کی آواز آتی ہے]

کشوری۔ ارے او میاں! کیا کر رہے ہو ادھر۔ پھر کوڑ دوگے کچھ --- میں یہاں لہو لہان ہو رہا ہوں اور تم ادھر برتنوں سے گھوم رہے ہو۔ کیا تمہیں کوئی ٹھنڈی چیز نہیں مل رہی؟

نین سکھ۔ مجھے تو کچھ نظر نہیں آتا۔

کشوری۔ اچھا تو بھاگ کے اوپر جاؤ۔ اور اس بڑے کمرے کی چابی لاؤ۔ کمرے کے پرلے سرے پر جو انگیٹھی ہے اس پر پڑی ہوگی۔

[نین سکھ گرتا پڑتا اوپر جاتا ہے اور پھر جلد ہی واپس آجاتا ہے]

کشوری۔ کیوں کیا ہوا ۔۔۔ سے آئے ؟

نین سکھ۔ بجلی کا بٹن کہاں ہے۔ وہاں تو گھُپ اندھیرا ہے

[ کشوری تِلملا کر اُٹھ بیٹھتا ہے۔ لیکن درد کی شدت سے مجبور ہو کر پھر زمین پر لیٹ جاتا ہے ]

کشوری۔ ہائے بیٹھا بھی نہیں جاتا (نین سکھ سے) وہاں کوئی بٹن نہیں ہے۔ اب ہم تمہاری آسانی کے لئے کمرے میں پیچھے پیچھے پر تو بٹن لگانے سے رہے۔ تمہیں بتا دیا نا۔ کمرے کے پرلے کونے میں انگیٹھی ہے۔ اگر تم انگلیوں سے دیوار کے ساتھ ساتھ ٹٹولو تو اس پر چابی تمہیں مل جائے گی

[ نین سکھ پھر اُوپر چلا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد برتنوں کے گرنے اور ٹوٹنے کی آواز آتی ہے کشوری ہمت کرکے اُٹھتا ہے۔ لیکن درد بہت شدید ہے۔ اس لئے بچارا پھر لیٹ جاتا ہے ]

کشوری۔ ارے ارے یہ کیا کر دیا تم نے اندھے ! (بآوازِ بلند) ابے نین سکھ یہ کیا کر رہے ہو۔ کیا توڑ دیا تم نے۔

نین سکھ (اوپر سے) کچھ نہیں ۔۔ ایک لوٹا گر گیا تھا۔

کشوری (غصے میں) ہوں ۔۔ کچھ نہیں ۔۔۔ اور اتنا شور کاہے کا ہوا ہے ؟ تمہیں تو زنجیر باندھ کے نہ رکھا جائے تو گھر بھر کا ستیاناس کر دو۔ اتر آؤ نیچے۔ ورنہ آج ہمارے گھر کی خیر نہیں۔

نین سکھ۔ (اوپر سے) اب کچھ کچھ آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہونے لگی ہیں۔ اب کچھ نظر آنے لگا ہے۔ اب میں ڈھونڈ لوں گا چابی۔

[ وہ پھر کمرے میں چلا جاتا ہے اور کشوری بے حس و حرکت بیٹھا رہتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہائے ہائے کرتا ہوا اور غصے میں جلا بھنا باہر نکلتا ہے۔ ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی مٹھی میں دبائے ہوئے ہے۔ سیڑھیوں پر سے بھاگا بھاگا نیچے آتا ہے اور الماری میں سے کپڑے نکال نکال کر پھینکنے شروع کر دیتا ہے۔ پھر ہاتھوں کو دونوں گھٹنوں میں بھینچ کر بیٹھ جاتا ہے ]

نین سکھ (دیوانگی کے عالم میں) ڈھونڈ لو اپنی چابی جا کے۔ ڈھونڈ لو خود ہی۔ میں نے تو تمہاری خاطر اپنا ہاتھ بھی زخمی کر لیا۔ تم استرے کے بلیڈ کہیں سنبھال کے کیوں نہیں رکھتے۔ انگیٹھی پر کیوں ان کا ڈھیر لگا دیتے ہو۔ اب یہاں کوئی چیتھڑا بھی تو نظر نہیں آتا۔ جس سے کوئی اپنا ہاتھ ہی باندھ لے۔ جاؤ خود ہی تلاش کر و اپنی چابی ۔۔۔ کہہ دیا میں نے۔

کشوری۔ ارے گدھے کہیں کے۔ تم میری حالت نہیں دیکھتے۔ میں کیا یہاں آرام سے بیٹھا ہوں ۔۔ ہائے۔

نین سکھ تمہیں معلوم ہونا چاہئے۔ میری انگلیاں علیحدہ ہوتے ہوتے بچی ہیں ہاتھوں سے (زخمی انگلیوں کو اس کی آنکھوں کے سامنے پھیلا دیتا ہے) دیکھو آنکھیں کھول کر دیکھو۔ ذرا سا تسمہ لگا رہ گیا ہے ورنہ ۔۔ ہائے رے ۔۔۔ اب میں طنبورہ کیسے بجایا کروں گا ؟

کشوری۔ اگر تمہاری ساری انگلیاں جڑ بنیاد سے غائب ہو جاتیں۔ جب اچھا تھا۔ پھر تم خوب مزے میں طنبورہ بجاتے

نین سکھ (اپنی زخمی انگلیوں کو اس کی آنکھوں کے سامنے معلق رکھتا ہے۔ پھر دوسرے ہاتھ سے ایک میلا کچیلا رومال نکال کر) یہ لو اور اسے کس کر زخموں پر باندھ دو۔

کشوری۔ تم تو خواہ مخواہ ان خراشوں کو زخموں کا نام دے رہے ہو۔ کیا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے تم پر آخر۔۔۔؟

(کشوری رومال لے کر نین سکھ کا ہاتھ باندھ دیتا ہے)

نین سکھ۔ اچھا اب بتاؤ میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔

کشوری۔ چلو اتنا تو اچھا ہوا کہ تم اب ہمارے گھر کی چیزیں پٹخنے کی نسبت کم توڑو گے ۔۔۔

(وقفہ)

کشوری۔ نین سکھ، ذرا بھاگ کے جائیو۔ بچپا کی خبر لیجیو۔ باہر بندھی ہوئی ہے

[نین سکھ دروازے کے باہر جاتا ہے۔ گھنٹہ گھر کی گھڑی سات بجاتی ہے۔ باہر سے آواز دیتا ہے]

نین سکھ۔ بھئی اب تک بچھی نے تو سارا چارہ کاٹ لیا ہوگا اور تم نے ابھی کچھ بھی نہیں کیا۔

کشوری۔ جب تک خون بند نہ ہو۔ میں کر بھی کیا سکتا ہوں۔

نین سکھ۔ اور اپنی بھاگ دوڑ میں تم نے فرش پر جو بے شمار چیزیں گرا دی ہیں۔ انہیں بھی تو سنبھالو۔

کشوری (کراہتے ہوئے) کیا تم سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا کہ ایک جھاڑو لے کر انہیں ایک کونے میں اکٹھی کر دو۔ تم بھی تو انہیں پاؤں میں روند رہے ہو۔ میرا تو جو حال ہے تم دیکھ ہی رہے ہو۔

[نین سکھ جھاڑو لے کر دروازے کے باہر جھاڑو دینا شروع کر دیتا ہے]

نین سکھ (کشوری سے) اب کیسی حالت ہے؟

کشوری (اٹھتے ہوئے) خون تو بند ہو گیا ہے۔ البتہ ذرا احتیاط رکھنی پڑے گی۔

[نین سکھ جھاڑو دیتے ہوئے اس کے دستے سے کھڑکی میں جالے صاف کرنے لگتا ہے اور ایک شیشہ توڑ دیتا ہے۔ ایک لمحہ کا وقفہ]

نین سکھ (خود بخود جیسے کچھ جانتا ہی نہ ہو) کیا ہوا؟

کشوری (طنزاً) کیا ہوا۔ کیا ہوا۔۔۔ اندھے ہو رہے ہو تم؟ دیکھتے نہیں ہو کہ جھاڑو کے دستے سے شیشہ توڑ دیا ہے تم نے۔

نین سکھ (سوراخ میں سے باہر جھانکتے ہوئے) اچھا! عجیب بات ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے۔ جھاڑو کا دستہ کھڑکی سے چھوا ہی نہیں۔ البتہ دروازے میں سوراخ ضرور ہے اور سوراخ بھی کافی بڑا ہے۔

کشوری۔ ہاں ٹھیک ہے۔ تمہیں کاہے کو خیال ہوگا۔ خدا کی قسم۔ تم ہمارے گھر کو تباہ کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہو۔

نین سکھ۔ خیر اب تو جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب ہم اسے جوڑ تو سکتے نہیں۔

کشوری (جھلاہٹ سے) او بھئی۔ ادھر آ جاؤ۔ ادھر آ جاؤ۔ ادھر آ بیٹھو۔ سنتے نہیں ہو۔ سات بج گئے ہیں اور مجھے کچھ کام بھی کرنا ہے۔

کشوری - کیا اول جلول بک رہے ہو۔ پہلے کیا یہاں دن چڑھ رہا تھا۔ کباڑ کی کوٹھڑی میں تیل کا ایک ڈبہ

اگر اس میں تیل ہوا تو ہم لیمپ تو کم از کم جلا ہی سکتے ہیں۔ وہ دیوار پر لیمپ ٹنگ رہا ہے۔ اسے اتارو

میں ادھر تیل دیکھتا ہوں۔

[کشوری کباڑ کوٹھڑی میں گھس جاتا ہے۔ نین سکھ دیوار سے لیمپ اتارتا ہے۔ اس کی

چمنی الگ کرنے اسے روشن کرنے کی فکر میں ہے۔ لیکن اسے نظر آتا نہیں اور بتی تو

جب جلے اگر وہ دیا سلائی کو بتی کے قریب لائے۔ کشوری کوٹھڑی سے باہر نکلتا ہے]

کشوری: اخوش ہے امیرے یار تیل تو کافی ہے ۔۔ ارے میاں تم دیا سلائی بتی کے قریب تو لاؤ۔۔۔

مجھے دکھاؤ۔ میں دیکھوں۔

[کشوری نین سکھ کے ہاتھ سے دیا سلائی لے کر بتی روشن کر دیتا ہے]

کشوری۔ اچھا اب دوسرا لیمپ بھی لاؤ۔ صحن کے پرلی طرف کے اصطبل میں دہنے کے ہاتھ کے کسی طاق میں ہا

نین سکھ۔ مجھے کیسے نظر آئے گا؟

کشوری۔ ایک دیا سلائی جلا کر دیکھ لینا۔ وہ تو دور ہی سے نظر آ جاتا ہے۔ ادھر میں پیپے سے تیل کا ایک ڈبہ

لاتا ہوں۔ پھر کافی روشنی ہو جائے گی اور ہم کام کر سکیں گے۔

نین سکھ۔ مجھے معلوم ہے۔ مجھے نظر نہیں آئے گا۔

[کشوری ٹین کا ایک ڈبہ لے کر جس میں بڑی سی ٹونٹی لگی ہوئی ہے۔ کباڑ خانے میں گھس

جاتا ہے ۔۔ وقفہ ۔۔ اس کے بعد کشوری چنگھاڑتا ہوا بھاگا بھاگا باہر آتا ہے]

کشوری۔ نین سکھ۔ نین سکھ! بھاگ کے آؤ ذرا۔ میں نے پیپے کے سوراخ میں سے ڈاٹ نکال دیا اور

ہاتھ سے کہیں گر پڑا۔ اب نہ سوراخ بند ہوتا ہے۔ نہ تیل کی دھار رکتی ہے۔ اب روشنی ہو تو ذرا

فوراً ڈھونڈھ نکالتا۔ بھاگ کے آؤ۔ ورنہ ابھی سارا تیل بہہ جاتا ہے۔

[وہ پھر بھاگ کر کوٹھڑی میں چلا جاتا ہے۔ ایک اور چھوٹا سا وقفہ ۔ پھر بھاگا بھاگا

باہر آتا ہے۔ دونوں بازوؤں میں پیپا تھامے ہوئے ہے۔ انگوٹھا سوراخ پر رکھ دیتا ہے]

کشوری، سکھ و ۔۔ ابے نین سکھ ۔۔ مر گئے کہیں؟ میں اسے کب تک اس طرح روک سکوں گا۔ بھاگو جلدی

ارے کدھر مر گئے ۔۔

[باہر سے کچھ منکیوں۔ پیپوں اور دوسری چیزوں کے گرنے کی آواز آتی ہے ۔۔

پھر خاموشی]

کشوری۔ ہے بھگوان۔ اب کے کیا چھوڑ دیا ہے اس نے ۔۔

نین سکھ (باہر سے آواز دیتے ہوئے) کشوری۔ او کشوری۔ میں تو ادھر ہی چلا تھا۔ کدھر ہے دروازہ۔ مجھے

کچھ سوجھتا ہی نہیں۔

کشوری (بھاگ کر دروازے میں جا کھڑا ہوتا ہے) اسے ادھر بھئی ادھر۔ بائیں ہاتھ (نین سکھ داخل

پیشہ گر دیں اٹھے ہوئے ہیں اور گھبرایا ہوا ہے) اب کے کیا توڑا ہے تم نے؟

کراہتے ہوئے) اسے میں توڑ رہی گیا تھا۔ جوڑ جوڑ ہل گیا ہے۔

بھگوان کے لئے حوصلہ کرو۔ جوان آدمی ہو۔ آخر مرمت بھی کیا ہو۔

(ہانپتے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) لیمپ سب سے اوپر والے تختے پر رکھا تھا۔ اب وہاں تک ہاتھ
نہیں اور چوکی یا سیڑھی کمرے میں کوئی تھی نہیں۔ نیچے کے تختوں پہ پاؤں رکھ کر چڑھا ۔ اور یکایک سارے
اور ان کے اوپر کا سامان جو کچھ تھا ۔ دھڑ دھڑا کر اوپر آ گرے ۔

[کشوری پیپے کو زمین پر رکھ دیتا ہے ۔ سوراخ کو اب تک انگوٹھے سے دبائے ہوئے ہے]

مگر تم چڑھے تختوں پر چڑھے کیوں تھے؟ کیا لینا تھا ان پہ چڑھ کر۔ مرے کہیں گے تمہیں اتنا نظر نہ آیا
سارا بوجھ سہارنے کے قابل نہیں ہیں۔ مجھے تم یہ بتاؤ۔ تم ان پر چڑھے کیوں تھے؟

میں چاہتا تھا کہ کام ذرا جلدی ہو جائے۔

پھر وہی حماقت ۔ جلد بازی کی ۔ اب کچھی آئے گی تو کیا کر لی؟

ہر تختوں کے ساتھ ساتھ میرا چشمہ بھی نیچے آ رہا۔

اور جب تختے گر رہے تھے تم نے انہیں سنبھالا کیوں نہیں؟

میں تو خود گر رہا تھا ۔ تختوں کو کیسے سنبھالتا ۔

(منہ پھلا کر) اچھا جانے دو اب ۔ لیمپ اٹھاؤ اور کوٹھری میں سے پیپے کا ڈاٹ ڈھونڈ کے لاؤ

اور میرے ہاتھ سے لیمپ گر کے مکان میں آگ لگ گئی تو --- ؟

عجب عذاب میں ہے جان (چونک کر) ارے کرسی ۔ کرسی لینا ۔ پھسلی پھسلی چلی ۔

[کرسی جس سے رسی بندھی ہے ۔ کمرے میں گھسٹنے لگتی ہے ۔ زمین سکھ اسے پکڑ لیتا ہے
لیکن اس کی مردانہ وار کوششیں بھی کرسی کو نہیں روک سکتیں]

(چلاتے ہوئے) ادھر آ کے میری مدد کرو ۔ ورنہ میں بھی چلا اس کے ساتھ

[کشوری پیپے کو نیچے رکھ دیتا ہے ۔ بھاگ کر زمین سکھ کے پاس جاتا ہے ۔ رسی کو پکڑ
لیتا ہے اور زیادہ احتیاط کے طور پر رسی کو کرسی کے پائے سے کھول کر اپنی کمر کے گرد
باندھ لیتا ہے ۔ وہ دونو سارا زور صرف کرنے پر رسی کو تھوڑا سا اپنی طرف کھینچ لیتے
ہیں ۔ پیپے کا سارا تیل بہ کر فرش پر پھیل جاتا ہے]

مضبوطی سے تھامے رکھو ۔ ورنہ ہم دونو روشندان سے جا لگیں گے ۔

ہائے رے آج میں چشمے کے بغیر گھر کیسے واپس جاؤں گا ۔

ارے صبر رکھو ۔ پہلے اس رسی کی فکر کرو ۔ اس کے بعد تمہارے چشمے کے بارے میں بھی سوچ لیں گے

(اس کی نظر اچانک تیل کے پیپے کی طرف جاتی ہے) ارے یہ کیا؟ تیل ۔ تیل ۔

[وہ رسی کو چھوڑ دیتا ہے اور پیپے کی طرف بھاگتا ہے ۔ کشوری جھٹ سے روشندان

بھاگ جاتا ہے]

نیین سکھ (پیچھے کو اُٹھا کر بلاتا ہے) اسے اس میں تو ایک بوند بھی باقی نہیں تو بہی نہ ایک قطرہ بھی تو نہیں ہم ....

[پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے کہ کشوری دروازے میں پھنسا ہاتھ پاؤں مار رہا ہے اور چلا رہا ہے]

پھمی (باہر سے چلانے کی آواز آتی ہے) ارے بچھیا۔ بچھیا۔

کشوری (چلاتا ہے) پھمی! — پھمی!

[پھمی بھاگ کے اندر آتی ہے۔ اُدھر کشوری بید سے نیچے آگرا ہے اور کپڑے جھاڑتا ہوا، کراہتا ہوا، گھٹنے سہلاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوتا ہے]

پھمی۔ ارے بھگوان کے لئے — یہ کیا ہو گیا ہے۔

کشوری (پھمی سے) دیکھ لیا نہ اپنی مرضی کرنے کا پھل۔ جب تم بچھیا کے گلے سے رسی کھولی تو اسے پکڑے کیوں نہیں رکھا۔ چھوڑ کیوں دیا۔ ہائے — ہائے —

پھمی۔ مجھے کیا خواب آیا تھا کہ رسی کے دوسرے سرے سے تم لٹک رہے ہو۔

کشوری (طنزاً) ہوں۔ تمہیں کاہے کو خواب آنا تھا۔ میں کہتا ہوں تمہیں کبھی کوئی کام کرنے کا سلیقہ بھی آئے گا۔ کوئی بات کبھی ٹھیک سے کر سکو گی ...

پردہ

●

## جاوید قمر

# گیت

یہ چندا، یہ جھلمل کرتے چنچل تارے سارے
سارے روپ تمہارے
تم بھی سُندر یہ بھی سُندر
تم من موہن پیارے
تم سب ایک لڑی کے موتی اک نگری کے باسی

تم سب دُور ہی دُور سے ہنس کر پاس بُلانے والے
تم سب اک جھلک دکھلا کر پھر چھپ جانے والے
تم سب گورے مکھڑوں والے اور من کے سب کالے
تم سب من کے کالے

●

یہ چندا، یہ جھلمل کرتے بیکل تارے سارے
سارے روپ ہمارے
ہم بھی بیکل، یہ بھی بیکل
ہم دکھیارے چارے
ہم سب ایک ہی بن کے پنچھی اک نگری کے باسی

ہم سب دُکھیارین نگر میں باتیں کرنے والے
ہم سب چپکے چپکے مل کر آہیں بھرنے والے
ہم سب ساتھی، پریم پجاری اور سب ہیں متوالے
ہم سب ہیں متوالے

●

## شاہد نصیر

# غزل

بسکہ ہر بات کچھ عجیب سی ہے
آپ کی ذات کچھ عجیب سی ہے

جیسے پہلے کبھی ملے ہی نہیں
یہ مُلاقات کچھ عجیب سی ہے

اب کے آنکھیں برسنا بھول گئیں
اب کے برسات کچھ عجیب سی ہے

آج کی رات آپ آئیں گے
آج کی رات کچھ عجیب سی ہے

آپ اور کھا گئے فریبِ وفا
ہاں، مگر بات کچھ عجیب سی ہے

اے خدا تیری کائنات تو کیا
خود تری ذات کچھ عجیب سی ہے

جانے کب ڈوب جائے اے **شاہد**
نبضِ حالات کچھ عجیب سی ہے

●

## ممتاز مفتی

# سخن گسترانہ

میں کیا جانوں کا ہے منوا رہ رہ شور مچائے
جی ترپائے

میں بیٹھی تھی اپنے گھر میں
جھلمل جھلمل سکھ ساگر میں

دُور کہیں سے بینا باجی، پران مرے گھبرائے
راما ہائے

بینا باجے، سمجھ نہ آئے
چھتیا دھڑک دھڑک رہ جائے

من ہی من میں جیسے کوئی پنچھی اُڑتا جائے
ہاتھ نہ آئے

آؤ چندروا سے پوچھیں
جھکتے نینوا سے پوچھیں
گاتی بوندنیا سے پوچھیں

اُتھل پتھل کے بھیدی سارے بیٹھے بھید چھپائے
کون بتائے؟

نکر تونسوی کے اس گیت کو پڑھ کر مجھے وہ مشہور تصویر یاد آتی ہے جس میں ایک دوشیزہ کی محبت کی اوّلیں بیداری کے عالم میں پیش کیا گیا ہے۔ مصوّر نے دوشیزہ کی آنکھوں اور ہونٹوں میں اس کے دل کی مبہم مگر شدید کیفیت کو اجاگر کیا ہے۔

اس گیت میں نکر تونسوی نے بھی ایک ایسی ہی مبہم مگر اضطرابی کیفیت کی تصویر پیش کی ہے۔ دوشیزہ ایک بے نام اضطراب کی شدید رو کو ایک حادثے کی طرح بند بند میں محسوس کرتی ہے۔ پہلے تو وہ اس عجیب سی فوری تبدیلی پر حیران سی ہو جاتی ہے۔ جوانی کی آن دیکھی چیپ چاپ اس کے جسم پر اور روح پر چھا گئی ہے۔ پھر سوچنے لگتی ہے اور سوچ بچار سے تھک ہار کر بیٹھ

۔ے لیا ہے مجھے! جانے کیا ہے! ۔ مجھ پگلی کو کچھ پتہ بھی چلے "

۔ں میں ایک بھیڑ سی لگی ہوئی ہے۔ انگ انگ میں ایک تڑپ سی لہرا رہی ہے ۔ نہ جانے کیوں!! کوئی خاص
۔ ہوئی آج ۔۔ روز کی طرح گھر میں بیٹھی تھی۔ دھندوں میں کھوئی ہوئی تھی، روز کی طرح ۔۔ پھر جانے کیا ہوا
جانے کہاں سے بینا کی آواز آئی، ہر شے کی نس نس تھرکنے لگی۔ جیسے بینا کی دھن پر تال دے رہی ہو۔
۔ پھڑکنے لگیں۔ دم رکنے لگا اور جیون پنچھی سینے میں یوں تڑپنے لگا گو یا نکل کر اڑ جانے کے لئے بیقرار ہو میں
جانے ہم ! ! جانے کیا ہونے والا ہے "

یہ تو وہی تھی جو میں نے کئی بار سنی تھی۔ وہی میٹھے رسیلے سُر تھے۔ پھر میری چھاتیاں یوں پھڑکنے کیوں لگی تھیں۔
۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی جنگلی پنچھی میرے سینے میں پھڑک رہا ہو! اس ڈر کے مارے اُٹھے جا رہا ہو کہ
ہے ۔۔ جانے کیا ہوا تھا مجھے، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، اور اب ۔۔ اب نہ جانے دل میں اک بھیڑ سی کیوں
لگی ہوئی ہے، کا ہے کو جی یوں تڑپ رہا ہے، تڑپے جا رہا ہے۔

۔ گیت تو گیت میں دوشیزہ کی اس انوکھی، بے نام اضطرابی کیفیت کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ تیسرے بند میں
۔ ۔ ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے دوشیزہ اپنے دل کی اُس اضطرابی کیفیت سے مانوس ہوتی جا رہی ہے، حیرانی
۔ ہوتی جا رہی ہے۔ حیرانی کی جگہ وہ اب ایک مبہم سی رنگینی اور بے نام سی لذت محسوس کرنے لگی ہے۔ لاشعوری
۔ نے کی ہے۔ کہ اس نے دل کی کیفیت کو رومانی چیزوں سے ایک تعلق ملا ہے۔

۔ یا ندر جگمگانے تو اس کے دل میں پھر وہی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جب شوخ نینوا اُس کی طرف دیکھتے ہیں
۔ تو ویسا ہی طلاطم بپا ہونے لگتا ہے۔ جب برکھا میں چھوٹی چھوٹی بوندنیا ناچتی ہیں تو دل میں وہی پنچھی پھڑپھڑا کر
۔ لگتا ہے۔ وہ سب اس بھید سے واقف معلوم ہوتے ہیں۔ وہ مسکراتا ہوا چندا، تکتے ہوئے نینوا اور ناچتی
۔ وہ سب جانتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ بیٹھے بٹھائے پران کیوں گھبرا جاتے ہیں، چھتیاں کیوں پھڑکنے
۔ پنچھی کیوں اڑتے ہیں، لیکن وہ سب چپ کیوں ہیں، وہ اس راز کو چھپاتے کیوں ہیں، یہ کیا بھید ہے؟
۔ رام کیسے جانوں گی میں، میں تو سوچتے سوچتے ہار گئی۔ کچھ پتہ نہیں چلتا جانے کیا ہے مجھے!!

شاعر نے دوشیزہ کے دل میں جذبات کی پہلی کروٹ دکھانے کے لئے فلیش بیک (FLASH BACK) سے
۔ ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ دوشیزہ کو پہلی بیداری کے عالم میں پیش کرتا تو تصویر میں حیرانی اور اضطراب کے سوا
۔ ایسا کرنے سے بیداری کی کیفیت وقت کے ایک نقطے سے متعلق ہو کر رہ جاتی اور فن کار اس کیفیت کی طرف
۔ سی جھلک ہی دکھا سکتا۔ اس کی کینوس (CANVAS) محدود ہو کر رہ جاتی۔ فلیش بیک کی مدد سے
۔ نے کیفیت میں تسلسل اور وسعت پیدا کر دی ہے اور تصویر میں تحرک ۔۔ اس طرح اس قلمی تصویر کی حیثیت ایک
(STILL) کی سی نہیں رہی۔ بلکہ ایک ریل (REEL) کی سی ہو گئی ہے اور اس میں زندگی پیدا ہو گئی ہے۔ بیداری
عالم کو پورے طور پر وضاحت سے پیش کرنے کے لئے لازم تھا کہ دوشیزہ اس کیفیت سے کچھ کچھ مانوس ہو چکی ہوتی
حیرت کی مجذوبیت سے نکل کر اضطراب کی رنگینی کو جان چکی ہوتی۔ اُس جذباتی بھانے سے آشنا ہو چکی ہوتی۔ جو ہر

جو اس کے عقب میں چلا آتا ہے اور چھا جاتا ہے۔

"بھگشے" کے فوراً بعد ہی دوشیزہ اس کیفیت کے دور کی بات چھیڑ دیتی ہے جسے بیتے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ شاعر نے دوشیزہ کی پہلی بیداری کو محبت یا محبوب سے متعلقہ کسی واقعہ سے منسوب نہیں کیا۔ اگر وہ مسکاتے نین اسے دیکھتے اور پھر چھیڑ کر چلے جاتے تو اس کا اضطراب بے نام نہ رہتا۔ اس کی توجہ اپنی نفسیاتی کیفیت سے ہٹ کر ان چھیڑ دینے والے نینوں کی طرف منعطف ہو جاتی۔ اس لئے اس نے اولیں بیداری کی نفسی کیفیت کو پیش کرنے کے لئے بینا کی آواز سے کام لیا ہے۔ وہ آواز کانوں سے ہوتی ہوئی اس کے دل میں گونجتی ہے اور ایک ہنگامہ بپا کر دیتی ہے۔ پھر چھاتی کا دھڑکنا اور من میں کسی آوارہ پنچھی کا اڑنا، جگر کا کٹنا، ہاتھ نہ آنا، حقیقت نگاری کا ایک خوبصورت نمونہ ہے۔

یہاں فلیش بیک ختم ہو جاتا ہے۔ اب ہمارے روبرو وہ حیران اور ڈری ہوئی دوشیزہ نہیں۔ اس کی نفسیات میں دھندلے اندھیرے نہیں اندر رہے۔ بلکہ رومان بھرے جذبات کی ہلکی سی رو پہلی سپیدی چھا رہی ہے۔ چھلنے جا رہی ہے۔ اولین اضطراب کا جوار گزر چکا ہے۔ اس کی جگہ لطیف و رنگین اور رومانی بھاٹا چھا گیا ہے۔ دوشیزہ کی نفسیت کے میدان پر ہلکی ہلکی چاندنی کھل گئی ہے۔ بھیگی بھیگی بوندنیا برس رہی ہیں اور وہ تکتے نینوا سے دوچار ہونے کی لاشعوری خواہش ابھر رہی ہے جو اسے اس بھید سے واقف کر سکتے ہیں ——

## سنہ ۱۹۴۷ء

ہندوستانی زندگی کا انقلاب انگیز اور تاریخی سال ہے

### اس سال

غیرملکی سامراج کا طلسم ٹوٹا۔ ہندوستانی ملک دو خطوں میں بٹ گئی۔ لاکھوں مرد، عورتیں، بچے اور بوڑھے جاگیری سیاست اور سامراج نے موت کے گھاٹ اتار دیئے ... اور ہندوستان اور پاکستان، دونوں آبادیاں کڑی آزمائشوں سے گذریں

### ایسے خونیں اور انقلابی دور میں

ہمارے فن کاروں کا قلم خاموش نہیں رہا۔ ہندوستان کے بلند پایہ شاعروں، افسانہ نگاروں، نقادوں اور ادیبوں نے سال بھر کی سماجی، سیاسی، معاشی اور اقتصادی زندگی کی رفتار کو اپنے فنی زاویۂ نگاہ سے دیکھا اور پیش کیا ہے

### ان تمام نمائندہ نگارشات کو

## ۱۹۴۷ء

### کا

# بہترین ادب

میں جمع کیا گیا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے چوٹی کے ادبی رسائل کا نچوڑ

### اردو ادب کی تاریخ میں

ایسی نوعیت کے ادبی انتخاب کی مثال نہیں ملتی چونکہ تمام ادبی رسائل کا مطالعہ ہر آدمی کے بس کا روگ نہیں ہوتا۔ اس لیئے اہلِ ذوق حضرات کے لئے یہ منتخب مجموعہ ان کی دیرینہ آرزوؤں کی تسکین کا باعث ہے۔ اور انہیں سال بھر کے اردو ادب کی رفتار سے آگاہ کرتا ہے

اس میں سال بھر کے بہترین افسانے، نظمیں، مقالے، ڈرامے، گیت اور غزلیں شامل ہیں

### مرتبہ:۔ ادارہ ادب لطیف لاہور

قیمت چھ روپے

## مکتبہ اردو • لاہور

ـــــــــ ایوب احمد کرمانی

"چودھویں اور پندرھویں صدی میں یورپ کی نشاۃ ثانیہ جو مسلمانوں کے اثر سے شروع ہوئی، علم و فضل کی لہریں یونان و روم سے فرانس، اسپین اور انگلستان پہنچیں۔ مغرب نے مشرق سے سیکھا۔ اب مشرق مغرب سے سیکھ رہا ہے۔ خواہ برنارڈ شا کی ادبی تخلیقات ہوں یا کیوری اور آئن اسٹائن کی سائنسی ایجادات۔ خواہ وہ انقلاب فرانس ہو یا انقلاب روس ہندوستان اور پاکستان بلا امتیاز ان سے متاثر ہوئے ہیں اور ہوتے رہیں گے اس ذہنی اور تہذیبی رابطہ کو اگر مسٹر ایٹلی، اور مسٹر بیون، اطلانٹک پیکٹ، ایٹم بم یا کامن ویلتھ کے ذریعہ روکا جاتا ہے۔ دیں تو صرف ان کی خواہش سے تاریخی تقاضے نہیں رک جائیں گے۔ ہمیں علم ہے کہ کس طرح زار شاہی کے خاتمے کے بعد وسط ایشیا کے مسلم علاقے کا نیا اور درخشاں دور شروع ہوا ادب اور تہذیب کی کیونکر آبیاری ہوئی۔ قومیتوں کا مسئلہ کیوں کر سلجھایا گیا۔ بھوک ماری اور بے روزگاری کیسے سد باب ہوا —— اور اب ہم اس سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں ہم ضرور استفادہ کریں گے ——!"

# ادب لطیف

چوہدری برکت علی، میرزا ادیب اور قتیل شفائی نے مرتب کیا

مکتبہ — اردو — لاہور

زرِ سالانہ ـــــ ۵ روپے

فی کاپی ـــــ ایک روپیہ

# ترتیب

جلد ۲ — جولائی اگست ۱۹۴۹ء — شمارہ ۴، ۵



(ملت الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام چوہدری برکت علی پرنٹر پبلشر چھپ کر شائع ہوا)

ہو تو سیاسی انجمن کے طور پر اس پر پابندی لگائی جا سکتی ہے، مگر ان تصورات پر تو پابندی نہیں لگائی جا سکتی جو اس سرزمین میں ہر طرف پھیلے ہوئے کروڑوں انسانوں کے دلوں کی دھڑکن سے ہم آہنگ ہیں — یہ تصورات زندہ ہیں — زندہ رہیں گے — اور لاکھوں پابندیوں کے باوجود آگے بڑھتے رہیں گے!

خفیہ پولیس کے اس طرزِ عمل کو، نظریاتی اختلافات کے ہوتے ہوئے بھی ملک کی کوئی انجمن مستحسن کی نظروں سے نہیں دیکھ سکتی۔ چنانچہ بمبئی میں ادب دوست اچھے مصنفین نے اپنے اجلاس میں ایک قرارداد منظور کرکے گورنر پنجاب اور سیاسی جماعتوں سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ خفیہ پولیس کے اس طرزِ عمل کی مذمت کریں۔ جو انہوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے اجلاس کے سلسلے میں روا رکھا ہے۔

اس قرارداد میں کہا گیا ہے کہ اگرچہ ہمیں انجمن ترقی پسند مصنفین سے نظریاتی اختلاف ہے مگر پھر بھی ہم خفیہ پولیس کے اس غیر جمہوری رویے کی مذمت کرتے ہیں۔

**جعفری کی دوبارہ گرفتاری:-** حکومت بمبئی نے اپنے مخصوص مصالح کے تحت نظر بند ترقی پسند شاعر علی سردار جعفری کو گرفتار کر لیا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد وہ رہا کر دئے گئے۔ مگر اب معلوم ہوا ہے کہ حکومت نے انہیں دوبارہ جیل خانے میں ڈال دیا ہے۔

جعفری ہندوستان و پاکستان کے محبوب عوامی شاعر ہیں۔ دونوں ملکوں میں ان کی جرأت آفریں شاعری یکساں طور پر مقبول ہے اور دونوں ملکوں کے عوام انہیں اپنا حقیقی ترجمان سمجھتے ہیں۔ اسلئے ان کی گرفتاری — پر ہر جگہ احتجاج ہو رہا ہے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ حکومت نے وہ الزام بتانے کی بھی تکلیف گوارا نہیں کی جو ان پر لگایا گیا ہے اور جس کی وجہ سے ان کی گرفتاری عمل میں لائی گئی ہے۔ بمبئی کے ترقی پسند ادیب بمبئی کے ہوم منسٹر کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے کہ انہیں جعفری کے جرم سے آگاہ کیا جائے مگر ان کی یہ کوشش رائیگاں گئی۔ ہوم منسٹر نے کوئی الزام کی توجیہہ کی اور نہ اس بات پر رضامند ہوئے کہ کھلی عدالت میں ان پر مقدمہ چلایا جائے!

حکومت بمبئی کا یہ اقدام — جمہوری نقطۂ نظر سے سخت غیر آئینی ہے۔ اور ہم اس غیر آئینی اقدام کے خلاف سخت احتجاج کرتے ہیں۔

**اردو کالج:-** غیر منقسم ہندوستان میں انجمن ترقی اردو ہند نے اردو کی ترقی و فروغ کے سلسلے میں جو کوششیں کی تھیں وہ تاریخ اردو کا ایک مستقل اور نہایت اہم باب بن چکی ہیں۔ انجمن نے اردو کے تصنیفی اور تالیفی شعبوں میں ایسا کام کیا ہے جو ہمیشہ زندہ رہے گا — قیامِ پاکستان کے بعد جب انجمن دلی سے کراچی چلی آئی تو ہم یقیناً یہ توقع قائم کرنے میں حق بجانب تھے کہ انجمن کے بلند ہمت ناظم اور ان کے شرکائے کار اردو کو پاکستان میں ہمہ گیر اور ہمہ رس بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کریں گے اور ہمیں مسرت ہے کہ انجمن نے اردو کالج کے قیام سے اپنے بہت بڑے اور نہایت اہم کارنامے کا آغاز کر دیا ہے۔ انجمن ترقی اردو یہ ثابت کرنا چاہتی ہے کہ ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے اردو کی تنگ دامانی کے متعلق جو رائیں قائم کی گئی ہیں وہ قطعاً درست نہیں، چنانچہ اسی مقصد کے پیش نظر کراچی میں اردو کالج قائم کیا گیا ہے جس میں سندھ یونیورسٹی کے نصاب کی تعلیم انگریزی کے بجائے اردو میں دی جائے گی۔

انجمن کا یہ اقدام — ایک تاریخی حیثیت لئے ہوئے ہے اور ہمارے عوام انجمن کے اس اقدام پر بڑی مسرت کا اظہار کر رہے ہیں۔ ہمیں کامل امید ہے یہ کالج اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے میں بہت ممد ثابت ہوگا۔

**احمد آباد میں ادبِ لطیف پر پابندی:-** احمد آباد کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ایک نوٹس کے ذریعے احمد آباد میں ادب لطیف کا داخلہ غیر معین عرصے کے لئے بند کر دیا ہے۔ چنانچہ جو لوگ "ادب لطیف" کو منگوا کر فروخت کریں گے، ان کو قانون اس دفعہ کے ماتحت گرفتار کر لیا جائیگا۔

اس اقدام کے پس منظر میں جو جذبہ کار فرما ہے وہ ہم سے پوشیدہ نہیں اور نہ پوشیدہ رہ سکتا ہے۔ "ادب لطیف" ترقی پسند رجحانات کو آگے بڑھا رہا ہے اور عوام کو ان کے رجحانات سے زیادہ سے زیادہ قریب لانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور یہی اس کا قصور ہے — یہی اس کا جرم ہے۔

ہم احمد آباد کے مجسٹریٹ کو یقین دلاتے ہیں کہ ان کا یہ تشدد آمیز رویہ ادب لطیف کی پالیسی پر قطعاً کوئی اثر نہیں ڈال سکتا۔ ادب لطیف جس راہ پر گامزن ہے، ہمیشہ اسی راہ پر گامزن رہیگا!

**ادب لطیف کا افسانہ نمبر:-** اکتوبر میں ادب لطیف کا معرکۃ الآرا افسانہ نمبر شائع ہو رہا ہے۔ ادب لطیف کی روایات شاہد ہیں کہ ادب لطیف کا ہر نمبر دنیائے ادب میں سنگ میل ثابت ہوا ہے اور یہ افسانہ نمبر بھی ایک تاریخی کارنامے کی حیثیت اختیار کرے گا۔

# انجمن ترقی پسند مصنفین ہند کا اعلان نامہ

۲۷، ۲۸، اور ۲۹ مئی کو کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس بھیونڈی (بمبئی) میں منعقد ہوئی جہاں یہ اعلان نامہ متفقہ طور پر منظور ہوا۔

آج ہندوستانی ادب میں فیصلہ کن تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ آج ترقی پسند اور رجعت پسند رجحانات بہت زیادہ صفائی کے ساتھ ایک دوسرے سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ اس کش مکش میں اس جدوجہد کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ جو ہندوستان کی جنتا جمہوریت اور اشتراکیت کے لئے لڑ رہی ہے۔ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان کی عوامی جدوجہد نے ایک نیا رخ بدلا۔ ہندوستان کا سرمایہ دار طبقہ جو قومی تحریک کے زمانے میں سامراج سے سمجھوتے کی کوشش میں برابر لگا ہوا تھا۔ اب کھلم کھلا اس کا ساجھی اور دوست بن گیا۔ اس سمجھوتے کی سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ ہند کی حکومت نے برطانوی کامن ویلتھ میں رہنے کا فیصلہ کر دیا ہے۔ یہ فیصلہ ہندوستانی جنتا کی مرضی کے خلاف ہے۔ اس لئے کہ ہندوستان کے عوام ایک آزاد اور خود مختار جمہوریت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

پچھلی لڑائی کو ختم ہوئے ابھی بہت دن نہیں ہوئے ایک دفعہ فاشزم کو شکست دینے کے بعد اب پھر دنیا کے عوام کو تیسری عالمگیر لڑائی کی تیاری میں لگایا جا رہا ہے اور ہندوستان کی جنتا کو بھی اس بھنور میں پھنسانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ پچھلی لڑائی میں جمہوری طاقتوں نے سوویٹ یونین کی رہنمائی میں فاشزم کے خلاف یہ فتح حاصل کی تھی۔ اس کی وجہ سے آج جمہوریت اور اشتراکیت کی تحریکوں نے بہت زور پکڑ لیا ہے۔ لیکن برطانوی اور امریکی سرمایہ دار جو اپنے منافع کو نہ صرف قائم رکھنا بلکہ بڑھانا چاہتے ہیں۔ اس بات کی سازش کر رہے ہیں کہ ڈالر اور ایٹم بم کے ذریعے ساری دنیا کو غلام بنا لیں۔ معاشی بحران بڑھ رہا ہے۔ عوام کا معیار زندگی گرتا جا رہا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ حیوانی لوٹ مار کے خلاف جنتا کی لڑائی بھی تیز ہوتی جاتی ہے۔ ان حقیقتوں پر پردہ ڈالنے کے لئے سرمایہ دار ملکوں کا حکمران طبقہ ایک نئی لڑائی کی فضا تیار کر رہا ہے۔ سوویٹ یونین، پوربی یورپ کی عوامی جمہوریتوں اور ایشیا کے عوام کی جدوجہد کے بارے میں تہمتیں تراش کر اور جھوٹی خبریں پھیلا کر لوگوں کے دماغوں کو لڑائی کے لئے آمادہ کیا جا رہا ہے۔ سامراجی طاقتیں ملایا کے عوام کو دبانے کے لئے پوری بربریت سے کام لے رہی ہیں۔ اور برما، انڈونیشیا اور ویٹ نام میں مداخلت کر کے وہاں کے عوام کو آزادی حاصل کرنے سے باز رکھنا چاہتی ہیں۔

ہندوستان کا سرمایہ دار طبقہ اور اس کی حکومت عوام پر ظلم و ستم ڈھا رہے ہیں۔ ہزاروں آدمی جن میں مزدور کسان ادیب اور فنکار سبھی شامل ہیں ہندوستانی قید خانوں میں طرح طرح کی مصیبتیں جھیل رہے ہیں۔ ان لوگوں کو قید کرنے سے پہلے رسمی طور پر عدالت کے سامنے پیش کرنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ کانگریسی حکومتیں ایک طرف لوٹ مار کرنے والے طبقے کے مفاد کی حفاظت کرتی ہیں، برطانوی اور امریکی سامراج کے ساتھ مل کر ہندوستان کو جمہوریت کے خلاف فوجی مرکز بنانے اور کامن ویلتھ کی زنجیروں کو مضبوط کرنے میں مدد دیتی ہیں، عوام کی شہری آزادی اور ان کے جمہوری حقوق کو سلب کرتی ہیں، مزدوروں، کسانوں اور متوسط طبقے کی جدوجہد کو دبانے کی بھرپور کوشش کرتی ہیں اور دوسری طرف تہذیب و ثقافت اور ادب کے بارے میں وہی رویہ اختیار کرتی ہیں جو جرمنی اور اٹلی کے فاسسٹوں نے اختیار کیا تھا۔ مثلاً سوویٹ یونین کی فلموں پر پابندی لگائی جاتی ہے۔ خود ہندوستان میں ترقی پسند فلموں کے بنانے میں طرح طرح کی رکاوٹ ڈالی جاتی ہے۔ لیکن امریکہ اور دوسرے پچھمی ملکوں سے آنے والی سڑی گلی غیر جمہوری فلموں کو دکھانے کی پوری آزادی دی جاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر امن کی کانفرنس میں شریک ہونے والوں کے پاسپورٹ چھین لئے جاتے ہیں اور ترقی پسند ملکوں سے تہذیبی اور سماجی تعلقات قائم کرنے کی ہر کوشش کو روکا جاتا ہے۔ یہ حکومتیں جمہوری اخباروں اور رسالوں کو بند کر رہی ہیں۔ لیکن [illegible] کمپنیوں اور ہندوستانی [illegible] کو پوری آزادی ہے کہ وہ سب کو اپنے جال میں پھنسائے رکھیں اور غیر جمہوری پروپیگنڈا کرتے رہیں۔

ان حالات میں ترقی پسند ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ اظہارِ خیال کی آزادی کے لئے جدوجہد کریں۔ جمہوری رسالوں اور اخباروں کو باقی رکھنے کی پوری کوشش کریں اور عوام کے ساتھ مل کر معیارِ زندگی کو بڑھانے اور تعلیم، مذہب و تمدن کو آزادی کے ساتھ حاصل کرنے کی جدوجہد میں پورا پورا حصہ لیں۔
ہماری آزادی کی لڑائی کے اس نئے دور میں ادب کے اندر بھی دو رجحانات صاف صاف دکھائی دے رہے ہیں۔ ایک طرف وہ ادیب ہیں جو شاہی سرمایہ دارانہ تشدد کی مخالفت کرتے ہیں، عوامی اور جمہوریت کے لئے جدوجہد کرنے والوں کا ساتھ دیتے ہیں اور جو پرانے ادب کی جمہوری روایات کو آگے بڑھاتے ہیں۔ دوسری طرف وہ ادیب ہیں جو ہندوستان کو سامراجیوں کی غلامی میں رکھنا چاہتے ہیں۔ جو سرمایہ دار حکومتوں کے ظلم و ستم کو سراہتے ہیں، جو دنیا کی جمہوری طاقتوں کے خلاف طرح طرح کی تہمتیں تراشتے ہیں اور جو پرانے ادب کی بہترین روایات کو ابھرنے سے روکتے ہیں۔ ان دونوں گروہوں کے درمیان کسی طرح کا سمجھوتہ ناممکن ہے۔ جو ادیب ان کے بیچ میں کھڑے ہو کر ایک تیسرا گروہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں وہ دراصل عوام کو دھوکا دیتے ہیں اور رجعت پسند ادیبوں کی عوام دشمنی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔
ہندوستان کا حکمران طبقہ خاص قسم کے تصورات کو پیش کر کے بہت چالاکی کے ساتھ اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ عوام کے ادیبوں کو الجھن میں ڈال دے اور آج کے اصلی اور بنیادی سماجی مسئلوں سے ان کے دھیان کو موڑ دے۔ وہ ادیب جو سرمایہ داروں کے دستِ نگر ہیں "ادب برائے ادب" کا پرچار کرتے ہیں، ادب میں انفرادیت کو سراہتے ہیں اور ایسا ادب پیش کرتے ہیں جو عریانی، فحش اور سنسنی پیدا کرنے والا ہوتا ہے اور اس طرح لوگوں کو اس دھوکے میں رکھنا چاہتے ہیں کہ ان کو کسی سیاسی گروہ سے کوئی تعلق نہیں ہے، وہ اس طرح لوگوں کو اس دھوکے میں رکھنا چاہتے ہیں کہ ان کو کسی سیاسی گروہ سے کوئی تعلق نہیں ہے، وہ اس بات کا پرچار کرتے ہیں کہ سوشلزم ادیب کی آزادی کو سلب کرتا ہے اور سوویٹ یونین میں ادیبوں کو کسی طرح کی آزادی حاصل نہیں ہے۔ وہ عوام کو فریب دینے کے لئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ پرانے زمانے میں ہندوستان کی شان و شوکت کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں طبقاتی کشمکش نہیں تھی اور اگر آج ہندوستان کے لوگ گزشتہ عظمت کو دوبارہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اہنسا کے راستے پر چلیں اور مختلف طبقوں میں سمجھوتہ کرانے کی کوشش کریں۔
ان سب مسائل کے بارے میں ترقی پسند ادیبوں کا نقطۂ نظر واضح ہے اور اس میں شک و شبے کی گنجائش نہیں ہے۔ ادب میں انفرادیت، اسلوب پرستی اور اسی طرح کے دوسرے رجعت پرست رجحانات سرمایہ دار اور لوٹ کھسوٹ کرنے والے طبقے کے مفاد کو آگے بڑھاتے ہیں۔ اس طرح کا ادب جو بظاہر سیاست سے الگ معلوم ہوتا ہے دراصل عوام کو نشہ پلا کر دھوکا دیتا ہے اور ان کے دماغوں کو الجھائے ہوئے رکھنا چاہتا ہے۔ سرمایہ دارانہ سماج میں جمہوریت پسند ادیبوں کو اظہارِ خیال کی آزادی نہیں ہے۔ سوویٹ یونین کے اشتراکی سماج میں سرمایہ داروں کی آزادی ختم کی جا چکی ہے۔ کہ وہ عوام کو دبا سکیں، اسی لئے جمہوریت پسند ادیبوں کو پوری آزادی ہے اور سوویٹ یونین کا ادب اس وقت دنیا بھر کے ترقی پسند ادیبوں کی رہنمائی کرتا ہے۔
ترقی پسند ادیب ماضی کے کلچر اور ادب کے صحیح وارث ہیں اور وہ انسانی تہذیب کی بہترین روایات کو لے کر آگے بڑھتے ہیں۔ سماج کے تاریخی ارتقا کے پس منظر میں وہ اپنے کلچرل ورثے کو تنقیدی نظر سے پرکھتے ہیں۔ وہ کلچر کو قومی تعصب اور تاریک اندیشی کا ہم معنی نہیں سمجھتے۔ وہ اس قسم کی تمام حرکتوں کا پردہ فاش کرتے ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ وہ خود اپنے ادب کو احیا پرستی کے رجحانات سے محفوظ رکھیں۔
ترقی پسند ادیب جانتے ہیں کہ ظالم و مظلوم میں سمجھوتہ نہیں ہو سکتا اور یہ کہ اس مسئلہ میں سچ اور اہنسا کی بات کرنا ایک ایسا پردہ ہے جس کے پیچھے سرمایہ دارانہ لوٹ کھسوٹ کی بربریت کو چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے۔
اپنی تحریک کی ابتدا ہی سے ترقی پسند ادیب کہتے آئے ہیں کہ سامراج اور سرمایہ داری کے خلاف جنگ میں کوئی سمجھوتہ بازی نہ ہونا چاہیئے۔ وہ جانتے تھے کہ ایسی جدوجہد جنتا ہی چلا سکتی ہے۔ جب ۱۹۳۲ء میں سول نافرمانی کی تحریک ناکام ہوئی اور انگریزی راج کے سایہ میں کانگریسی لیڈروں نے وزارتیں قبول کیں تو قومی لیڈروں کی پالیسی کے متعلق ہندوستانی جنتا کے بہت بڑے حصے کی خوش فہمیاں دور ہوئیں اور سامراج کے خلاف ڈٹ کر لڑنے کے لئے انہوں نے اپنی طبقاتی تنظیمیں بنائیں۔ سامراج سے کسی قسم کا معاہدہ یا سمجھوتہ بازی نہ کرنے کا جذبہ بہت عام ہو گیا اور اس کا عکس اس وقت کے ادب میں ملتا ہے۔ اس خواہش نے ترقی پسند مصنفین کی تحریک میں تنظیمی شکل پائی۔ سامراج کے خلاف جنگ میں ادب غیر جانبدار نہیں رہتا۔ مکمل آزادی اور جمہوریت کی جدوجہد

ہیں اسے کامیابی کے ساتھ جنتا کی رہنمائی کرنی چاہیئے اور اس میں جوش پیدا کرنا چاہیئے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ جنتا کی خواہشوں اور امیدوں کو پیش کرے جنہیں صرف بیرونی سامراج ہی نہیں لوٹتا۔ بلکہ ہندوستانی سرمایہ دار، جاگیردار اور رجواڑے بھی لوٹتے ہیں۔ یہ ہیں وہ مقاصد جنہوں نے ترقی پسند ادب کی رہنمائی کی۔

اگر ہم پچھلے بیس سال کے ادب پر نظر ڈالیں تو بلا مبالغہ کہہ سکتے ہیں کہ اردو کے مقابلے میں ترقی پسند ادیب ہی تھے جنہوں نے اپنے ادب ہماری تحریک آزادی کے نئے موڑوں کو پیش کیا ہے۔ انہیں نے ان فاشسٹ طاقتوں کی جم کر مخالفت کی جو دنیا کو غلام بنانا چاہتی تھیں۔ انہوں نے سوویت یونین کی جنتا کے ساتھ جو فاشزم کے خلاف لڑ رہی تھی اپنی رفاقت کا اظہار کیا، جاپانی فاشزم کے خلاف لڑتی ہوئی چینی جنتا سے دوستانہ رشتہ قائم کیا۔ اور مغربی سامراج کے خلاف جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک جو جدوجہد کر رہے ہیں ان کا ساتھ دیا۔ انہوں نے قحط کے زمانے میں بنگال کیلئے سب بھر کے لوگوں کو متحد کیا اور آزادی کی جنگ میں جس نے آگے چل کر ملاحوں کی شاندار بغاوت کا روپ اختیار کیا، انہوں نے ہندوستانی جنتا کا ساتھ دیا۔ ترقی پسند ادیب ہی ہیں۔ جنہوں نے عوامی اتحاد اور امن کا پرچم بلند کیا۔ جب کہ پورا سرمایہ دار پریس فرقہ وارانہ فساد کو بڑھانے اور پھیلانے میں عملی حصہ لے رہا تھا۔

ایسا بھی نہیں ہے کہ ترقی پسند ادب میں خامیاں نہ ہوں اور ہم اسے اسی طرح آگے بڑھا سکتے ہیں۔ جب ہم ان خامیوں کو سمجھیں اور دور کریں۔ مجموعی طور پر اس زمانے کے ترقی پسند ادب کی خاص کمزوری یہ رہی ہے کہ اس نے پورے طور پر عام جنتا سے اپنا رشتہ نہیں جوڑا۔ جس کی رہنمائی مزدور کا مزدور طبقہ کرتا ہے۔ اسی لئے ایسے تخلیقی ادب کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ جس میں مزدوروں اور کسانوں کی زندگی اور جدوجہد کی جھلک ہو۔ اسی لئے ادیب ان مختلف رجعت پرست رجحانات کو ختم نہ کر سکے۔ جنہوں نے صحت مند عوامی ادب کی ترقی میں رکاوٹ کا کام کیا۔ ترقی پسند ادیبوں نے کبھی کبھی رائج رجعت پرست ادیبوں کے نظریے اور [illegible] کے ساتھ سمجھوتے بازی بھی کی اور ابھی تک خود ترقی پسند ادب پر کافی تنقید کو فروغ نہیں دیا جا سکا

ہندوستانی ادب کا مستقبل مزدور طبقے کی رہنمائی میں لڑتی ہوئی اس جنتا کے مستقبل سے الگ نہیں ہے۔ جو آج ایک آزاد زندگی کی آزادی اور خود مختاری، جمہوریت اور سوشلزم کے لئے جدوجہد کر رہی ہے۔ اور جو انسانی لوٹ کھسوٹ کے تمام طریقوں کو ختم کر دینا چاہتی ہے۔ ہمارے ادیب اس تحریک کے جتنا نزدیک آئیں گے۔ ان کے ادب میں صورت اور معنی دونوں اعتبار سے اسی حد تک گہرائی پیدا ہوگی۔

ادب کے رجعت پرست رجحانات جو عوام کے مفاد کی مخالفت کرتے ہیں، ختم ہو کر رہیں گے۔ صرف عوامی ادب ہی کا مستقبل روشن ہے چاہے اس کی ترقی کی راہ میں آج کتنی ہی دشواریاں کیوں نہ حائل ہوں۔

کوئی ادب اس وقت تک عظیم نہیں ہو سکتا اور عوام کی توجہ کو اپنی طرف مبذول نہیں کرا سکتا۔ جب تک کہ اس کا ایک اعلیٰ سماجی مقصد نہ ہو ترقی پسند ادب عظیم انسانی آدرشوں سے کسب نور کرے گا۔ جیسے امن سے محبت، قوموں میں دوستانہ تعلقات پیدا کرنے کی خواہش، انسانی دوستی، جو جنگ اور انسانی لوٹ کھسوٹ کی مخالفت کرتی ہے۔ ادب کا یہ عظیم اخلاقی مقصد مطالبہ کرتا ہے۔ کہ تمام ادیب اپنی تحریروں کے بارے میں سنجیدگی اختیار کریں، ان میں تاثر پیدا کریں، انہیں مقبول اور خوبصورت بنائیں۔ تاکہ ہماری جنتا ان سے محبت کر سکے، ان سے جوش حاصل کر سکے اور ان پر فخر کر سکے۔ عوامی ادب اور کلچر کا مستقبل ترقی پسند ادیبوں کے ہاتھ میں ہے۔ یہ ثابت کرنا ان کا فرض ہے۔ کہ یہ مستقبل محفوظ ہاتھوں میں ہے۔

[illegible] جالندھری

# ڈالر امداد

اُدھر نہ دیکھو

اُدھر تمدّنِ حرّیت کے ہاتھوں میں بزم آرا چراغ تو ہے

پر جس کی تابانیاں سیہ فام حبشیوں کے گھروں میں اب تک رسا نہیں ہیں

اُدھر نہ دیکھو

کہ زر پرستوں کی حرّیت زر پرست کی ملکیت رہی ہے

اُدھر نہ دیکھو

اُدھر ہمارے لہو کی بوندوں سے ہے چراغاں

سمیٹ کر لے گئے ہیں گالوں کی سُرخیاں، گرمیاں بدن کی

شباب کی تازگی، نظر کی شگفتگی، شوق کی جوانی

نچوڑ کر لے گئے ہیں رس، رنگ، راگ اور رقص زندگی کا

اُدھر نہ دیکھو

اُدھر تو چربی کی تہ پہ تہ چڑھ رہی ہے تن پر

اُٹھا لیے ہیں فلک رسا مسکنوں کی منزل پر اور منزل اک اور منزل!

کہ یہ غبار اتنا بڑھ چکا ہے کہیں بھی تل پھینکنے کو اب تو جگہ نہیں ہے

اُدھر نہ دیکھو

اُدھر اُٹھائی نگاہ جس نے پھر اُس نے اپنا پتہ نہ پایا

اُدھر نہ دیکھو
کہ اک درم کے عوض میں سیروں ہی ڈانس دینا پڑے گا تن پر
پھر اس پہ بھی کب ہوس کی آفاق دامنی اکتفا کرے گی

اُدھر نہ دیکھو
اِدھر ہی دیکھو
اِدھر کہ سینے ہیں چوڑے چکلے تنا وجن کا نظر رُبا ہے
بس ایک دھچکا — زمیں اُگل دے بہار، سرو سمن، شگوفے، نشاط و مستی
تمام کھیتوں کو لہلہا دیں بلند فصلوں کی گود میں چہچہے بسا دیں
ہر ایک پُرسوز راہ پر سایہ دار اشجار جو لگا دیں
اِدھر ہی دیکھو
اِدھر کہ بازو ہیں لمبے لمبے کساؤ تعذیر ساں ہے جن کی مچھلیوں کا،
بس ایک جھٹکا — ابھی ابھی زندگی کا سیلاب فیل پیکر کلوں میں دوڑ جائے
برہنہ سینہ لپیٹ دیں جو ابھی ابھی مخملیں قبا میں
ابھی ابھی جو کھلے ہوئے سر پہ ڈال دیں ریشمی دوپٹہ
پلک جھپکتے محل اُٹھا دیں
اُدھر نہ دیکھو
اِدھر ہی دیکھو

اِدھر ہی پھیلا اُٹھا اپنا دامن
کہ چھین کر تند و تیز جبڑوں سے لا رہے ہیں یہی تو واپس
لہو کی گرمی، شگفتگی دل کی، آرزو کی بھری جوانی ...

# مُلاقات

بچھڑ چکے تھے ہم اک دوسرے سے آج ہمیں ایک ایسی صورتِ حالات نے ملایا ہے
ہوا ہے جنگ کے میداں میں سامنا اپنا یہ روزِ بد بھی ہمیں وقت نے دکھایا ہے

مرے رفیق! مقابل ہیں آج ہم دونو تجھے ترے مجھے میرے وطن نے بھیجا ہے
مگر یہ جنگ لڑی جا رہی ہے کس کیلئے کچھ اس میں فائدہ میرا ہے اور نہ تیرا ہے

میں اپنے ذہن میں اک خلفشار پاتا ہوں میں سوچتا ہوں یہ قربانیاں ہیں کس کے لئے
ہمیں تو ملتے ہیں چند ایک دھات کے ٹکڑے ہمارے خوں کی یہ ارزانیاں ہیں کس کے لئے

جدا کیا تھا ہمیں جس فریبِ فردا نے حقیقت اُس کی ہمیں ہو چکی ہے اب معلوم
خوشی ہی آئی نہ دکھ ہی ہمارے مقدر ہوئے ہم آج بھی ہیں اُسی طرح بے کس و مظلوم

یہ دو دلوں کی تنگ و دو یہ سیلِ آتش و خوں فسانے کہتے ہیں مجبور آدمیت کے
کبھی نہ سمجھیں گے اک دوسرے کو ہم انساں؟ کبھی نہ توڑ سکیں گے یہ بُت حمیت کے؟

یہ ٹینک اور یہ طیارے، گولیاں اور بم گھروں کو کھیتوں کو ویران کر کے دم لیں گے
بڑھاؤ ہاتھ کہ دشمن کو پا گئے ہیں ہم لڑانے والوں سے اب انتقام ہم لیں گے

شریف کنجاہی

# برکھا

آج برکھا ہوئی

آج صحنِ چمن

آج میدان، بن، سب ہیں نکھرے ہوئے

آج دہقان کتنے ہی دھندوں سے آزاد ہے

یاں تو ہر کرمِ معاش آج دلشاد ہے

آج پھوٹی ہے امید کی وہ کرن

جس سے فاقوں کی تاریکیاں اور اندھیارے

ہوں گے ہرن

آج گلکار کے بھاگ پھوٹے مگر

اس کا آٹے کا آوا اب اک گیلی مٹی کا انبار ہے

اس کی محنت گئی

اس کی دولت گئی

اور چھوٹے بڑے گھر کے افراد کے چھ تنورِ شکم

ان کو ہر حال ایندھن تو درکار ہے

آج برکھا ہوئی

آج بنجر زمینوں کو بھی مخملیں گھاس کی آس ہے

آج مزدور کے خانۂ نوری میں لواحق بجھے اداس ہے

آج اس کی مشقت کا پرساں نہ کوئی خریدار ہے

اور بنیے سے آٹا بھی دشوار ہے

اس کا کتنے دنوں سے وہ مقروض ہے

آج برکھا ہوئی

وقت کی چیز تھی

اور بے وقت ہو تو بھی اپنی خطا

لیکن اس کا صلہ ——

کوئی مسرور ہے کوئی رنجور ہے

آؤ سوچیں کوئی حل سکے تو بہم

جس سے تشنہ تمنائیں تو ہوں کم سے کم

پائمال و پریشاں نہ ہوں [illegible]

# ایک خط

بتاؤں دوست!
تمہیں خط لکھوں کہ آج کے دن
تمہارے جذبۂ اخلاص پہ چڑھا کے کر
پھر اس چمن میں گلستاں کے رنگ اڑا لاؤں
کبھی جسے مری تخیل نے سنوارا تھا

— وہ ابتدائے محبت وہ خواب ہائے نشاط
وہ ایک گلشن وہ پیپل کی چھاؤں جس کے تلے
کبھی سے کرشن کی رادھا کا روپ دھارا تھا!

— وہ میری دوسری الفت اودھ مال روڈ کی رات
وہ ایک شوخ سی تتلی وہ شام جبکہ مجھے
غزل نے اپنا عہد جوان کا پکارا تھا!

— وہ میری تیسری چاہت یہ ایک ساز کی بات
یہ اک حسینہ یہ گھڑیاں اب آگے کون کہے
جمال و دل بھی تو کافی یہی اشارہ ہے!
مگر تو دوست! تمہارے لئے میں کیا لاؤں
مرا خیال تھا اک تازہ نظم بھیجوں گا
مگر خیال سے پہلے کہ جو بیاں نہیں

— شراب ایک بہانہ ہے پی کے آیا ہوں
اجل اب تک میں وہ کچھ پی کے آیا ہوں
گمان یہ ہے کہ ایسے میں شعر لکھوں گا
مگر یہ زود تخیل میں تاب اڑان نہیں!

— تو بات یہ ہے کہ یہ لکھنؤ جہاں سے تمہیں
میں لکھ رہا ہوں بڑے شوق سے یہ چند سطور
زمین عالم تعمیر ایک گلشن ہے
بلبل ہے ہیں گل و لالہ میں جہاں ناشاد!

— عجیب بات ہے اس تازہ گلستاں میں
مجھے خزاں کی وہ انگڑائی یاد آتی ہے
جب ایک پھول نے دم توڑ کر پکارا تھا
— ذرا مصنفۂ شام لکھنؤ سے کہو
کوئی فساد نہیں اب ستاروں سے آگے
اداس اداس فضاؤں میں موت رقصاں ہے
وہاں حیات نہیں ہے چناروں سے آگے!

— نگار خانۂ شام اودھ کے مالی ہیں
بہار آئے تو مرجھا کے لوٹ جاتی ہے

ستاروں سے بھی پرے صرف اک نگاہ سا تھا!

— مرا قصور کہ اس بزمِ نغمہ بار میں بھی
مرا قصور کہ اس صبحِ زر نگار میں بھی
مرا قصور کہ اس عالمِ بہار میں بھی
قدم جو سوئے گلستاں بڑھا نہیں سکتا
جو لیے میں خلشِ دل چھپا نہیں سکتا
جو سازِ نو پہ کوئی گیت گا نہیں سکتا

— وہ ایک گاؤں وہ پیپل کی چھاؤں جس کے تلے
میں اپنے خواب کا رنگین محل بناتا تھا
وہاں ندی سے ذرا فاصلے پہ اک مسجد
وہاں ندی کے کنارے ذرا سا مندر ہے
مری بہن کی سہیلی، لتا کی شادی تھی
وہیں جہاں پہ ہمارے رفیق کا گھر ہے!
— مری نظر میں ہیں اب تک وہ گاؤں کے لڑکے
میں جن کو نغمۂ حبِّ وطن سناتا تھا
— اب آج جبکہ مرا خواب کامیاب بھی ہے
مرے ہمالہ کے ماتھے پہ آفتاب بھی ہے
عزیز مادرِ گنگ و جمن میں آب بھی ہے
— میں اپنے گاؤں میں جاؤں تو لوٹ آتا ہوں
میں حال رفتہ سے گزروں تو جھینپ جاتا ہوں
میں زیرِ پرچمِ ترنگ بھی تھرتھراتا ہوں
عزیز دوست! یہ میرا قصور ہے ورنہ



نگار خانۂ شام اودھ کے آئینے
ہزار حسنِ تبسمِ مہر و ماہ در آغوش
ہزار جلوۂ تقلیب و نگاہ در آغوش
ہزار دعوتِ ذوقِ گناہ در آغوش
خود اپنا شیشۂ دل چور چور ہے ورنہ
مجھے بھی ایک حسینہ کی دلربائی نے
کنارِ گومتی ہنستے ہوئے پکارا تھا،
— "پھر آپ بھی تو ترقی پسند شاعر ہیں
تو آپ لوگ ادب میں حیات ڈھونڈتے ہیں
سہانی شب ہے، گل و نسترن کی بات کریں
محل کے پاس غریبوں کی رات ڈھونڈتے ہیں!"
— اُجالی رات میں خاموش حال تھے دوست!
کسی چڑیل کی صورت ہنسی اڑانے لگی
اور اس چڑیل کے بے رحم قہقہے گویا
عجیب طرح سے ٹکرا کے "چھتر منزل" سے
مرے اُجاڑ سے مسکن میں مجھ کو چھوڑ آئے!
— یہاں سے بھی تو وہ مدہوش حال روح اب تک
مرے دریچے سے رہ رہ کے مسکرانے لگی!
سویرا ہونے لگا چار بجنے والے ہیں
دھواں بھی اٹھنے لگا ہے چراغ کے دل سے
اجل ہمیشہ کے آتی ہے موت کے ہالے!
اور اس سے پہلے کہ بے رحم صبح کی ناگن
شفق کے سرخ لبادے میں جھپٹ آجائے
بہت خلوص سے پیش کر رہا ہوں تم کو سلام —!

فارغ بخاری

# تشنگی

کتنی مسرور تھی امید کی دولت پا کر — شادمانی کے کنول آنکھوں میں ابھراتے رہے
رقص کرتا ہوا ماحول بنایا تو نے — مسکراتی ہوئی دنیا کے خیال آتے رہے
خود فریبی نے تصور کے حسین جال بُنے — جو تری فطرتِ احساس کو بہلاتے رہے

تو نے بڑھتے ہوئے سایوں سے پناہیں مانگیں — ایک آوارہ کرن کو بھی غنیمت جانا
غم واماندہ کی تعبیر شکن دنیا میں — جھوٹے وعدوں کے ہمی کو بھی غنیمت جانا
ہر طرف یاس کی تاریک گھٹائیں پا کر — فرصتِ چشم زدن کو بھی غنیمت جانا

اپنی معصوم دعاؤں کی یہ تاثیر بھی دیکھ — اب ترے درد کی تکمیل ہوا چاہتی ہے
گھٹ کے رہ جائیں بہاروں کے ترانے جن میں — ایسے زندانوں کی تشکیل ہوا چاہتی ہے
جس کرن کو تری نظروں نے سہارا سمجھا — وہ بھی اب سایوں میں تحلیل ہوا چاہتی ہے

وہ ارادے جو امنگوں کے نگہبان رہے — آج خود بیکس و لاچار نظر آتے ہیں
لہلہاتے تھے جو کل شانِ دلآویزی سے — آج وہ پھول بھی بیمار نظر آتے ہیں
تو تو افلاس سے بھاگ آئی تھی لیکن اب تو — ہر طرف قحط کے آثار نظر آتے ہیں

نریش کمار شاد

# اجنبی

محترم خاتون مجھ کو دیکھتے ہی یک بیک
کھل دہک اٹھی ہیں تیرے حسن کی رعنائیاں

کس لیے تیرے رخِ شاداب کی تیوری پہ
چھا گئی ہیں جذبۂ تحقیر کی پرچھائیاں

میں انہیں اجداد کا فرزند ہوں جن کا لہو
جل رہا ہے تیرے گھر کے قمقموں کے روپ میں

سینچتے آئے جو اب تک تیرا گلزارِ طرب
حادثاتِ زندگی کی چلچلاتی دھوپ میں

خوف کھا مجھ سے کہ اب میرے خیالوں کی لپک
توڑ سکتی ہے ترے خونی تمدن کے ستوں

گڑگڑاتا ہے جو تیری بے بصر نظروں سے دور
میں اسی طوفانِ ہیبتناک کی اک لہر ہوں

اپنی آنکھوں میں لیے نفرت کا زہریلا غبار
دیکھتی کیا ہے مرے یہ چیتھڑے اے سیم پوش

سیم و زر کی چار دیواری سے باہر جا کے دیکھ
بھوک کی ماری ہوئی جانوں کا طوفانی خروش

دیکھ ابھر کر اپنے کجلائے ہوئے ماحول سے
میرے جیسے ان گنت محنت کشوں کے کارواں

زرد چہروں پر دمکتے عزم کی رخشندگی
خشک آنکھوں میں بغاوت کی لپکتی بجلیاں

وسعتِ کون و مکاں کی تلملاتی روح میں
گونجتے ہیں انقلابِ نو کی شہنائی کے راگ

پھوٹنے کو ہیں بطونِ شب سے انوارِ سحر
محترم خاتون اپنے عنبریں خوابوں سے جاگ

اب زیادہ دیر تک انساں کی عظمت کا جمال
لٹ نہیں سکتا حصارِ نخوت و جبروت میں

آقا و بندہ کا یہ معیارِ کہنہ امتیاز
مر کے سج جانے کو ہے تاریخ کے تابوت میں

یہ حقارت جس کو پالا ہے تری تہذیب نے
وقت کے بڑھتے ہوئے سیلاب میں بہ جائے گی

قہقہے ماریں گے صدیوں کے فسردہ ولولے
تیری آبائی رعونت دیکھتی رہ جائے گی

جعفر طاہر

# سیج

طاعت آبادِ جہاں کے اُس طرف
وسعتِ کون و مکاں کے اُس طرف
زندگی کے ہونکتے شعلوں سے دُور
خوابگوں تنہائیوں کی گود میں
دیکھتا ہوں، گوش بر آوازیں
شبنمی ساۓ، لپکتے آبشار
بہرِ تشریفِ قدوم عاشقاں
دست بر سینہ، سراپا انتظار
اللہ اللہ وعدۂ صبحِ ظہور
مژدۂ صبر و سکوں، نور و سرور
نغمۂ بے مثل پیکر، بے وجود
غنچۂ سربستہ گلزارِ شہود
روح کی جاگیر، الہامِ شباب
دستِ منشورِ خدا، دیدِ بہار
انتشار و انتظار و انتظار

دیکھتی ہو استرانِ بار زیر
جھنجھناتی جھانجھنوں کے ساز پر
زیرِ لب کچھ سرگمیں گاتے ہوئے
[illegible] پہ اٹکاتے ہوئے
[illegible]

جنتوں کے پھول برساتے ہوئے
آنکھ میچے جا رہے ہیں تیز تیز
اور یوں ہی چاند تارے بے حساب
مشتری، مریخ، زہرہ، آفتاب
نیلگوں پہنائیوں میں روز و شب
ایک مدت سے ہیں سرگرمِ سفر
گاڑ کر قطبِ تمنّا پر نظر
قدسیوں کی محفلوں سے دُور دُور
صندلیں بانہوں کے خم سے بے نیاز
قرب کی موہوم امیدوں سے پاک

ہائے دُولابِ ازل کی گردشیں
دوریوں کی ذوق ساماں لذتیں
قُرب، ذوقِ آرزو کا اختتام
قُرب، امیدوں کی ارمانوں کی موت
قُرب، شاعر کی اڑانوں کی شکن
کتنے احساسات کی مرگِ دوام

بُعد کی رنگینیاں لیکن نہ پوچھ
حضرتِ یزداں کا یہ جادو جلال
یہ فرشتوں کا طلسمی طمطراق

مغبچے، ساقی، بتانِ سیم ساق
تُندتیسی تکیے، سنہری مسندیں
اور بھی تیرے خدا کی جنتیں
بعد کی مرہونِ منت ہی تو ہیں
مثلِ چشمِ کوثریں مینا و جام
صورتِ ماہِ شکستہ ہر سبو
کاش اتنا جانتی اے کاش تو
مے بھلا اِن آبگینوں میں کہاں
بعد کا لیکن چھلکتا ہے لہو

وہ طرب گاہیں — طلائے ناب کے
نقرۂ نایاب کے رخشاں محل
کاخِ نیلم کے زمرد کے مکاں
زرفشاں محراب و در میزاب و بام
مرمریں ایواں، طرازیدہ ستون
مخمل و دیباج و اطلس کے فروش
جن پہ رقصاں خلد کی شہزادیاں
برہنہ کولہوں کو مٹکاتی ہوئی
گت پہ زلفوں کی لہراتی ہوئی
بیبرا آہنگانِ جنت نغمہ خواں
محوِ خدمت تولیانِ سفتہ گوش
جھوم اٹھتے ہیں جوانانِ ارم
گونجتا ہے نعرہ اللہ ہو

سدرہ و زیتون کی شاخوں تلے
جنتی مل کر صف بہ صف لیٹے ہوئے
سیکڑوں سینوں پہ لب رکھے ہوئے
ریشمیں خاموشیوں کی چھاؤں میں
ناچتی ہیں نرم رو سرگوشیاں
روح کی مدہوش کن موسیقیاں
صبح کی دھندلی فضا میں جس طرح
لب کشا ہونے لگیں شہنائیاں
اللہ اللہ اذنِ وصل و اختلاط
بازوؤں میں نوجواں حوریں لیے
دے رہے ہیں پارسا دادِ نشاط
دیکھتا ہے، مسکراتا ہے خدا
اور لحظہ بعد پھر وہ بار بار
نعرۂ اللہ ہو، اللہ ہو

آج کی شب تو بھی ہوتی دور کاش
اور میں اک سچے مومن کی طرح
دیکھتا رہتا سدا جنت کے خواب
سوچتا رہتا تصوف کے نکات
قرب کی اس دعوتِ بے کیف پر
خون روتی ہے کنواری چاندنی
بجھ گئی فکر و نظر کی روشنی
سینۂ ہستی میں پیدا ارتعاش
ربطِ ہستی شکستہ پاش پاش
— آج کی شب ایک تھا سوا تھکن
اک جواں شاعر کی میں از وقت موت —
— سینۂ پاک مہکا ہوا [illegible]
پھول [illegible]

باقر [illegible]

# کارواں

منتشر راہوں پہ کتنے راہرو بھٹکے ہوئے	قافلہ سالار کے وعدوں میں آ کر رہ گئے
ان سنہری منزلوں کا خواب دیکھا تھا اگر	ریگ زاروں میں بڑی ہمت سے جا کر رہ گئے
چیختی چلتی رہی ہر سمت سے بادِ سموم	یہ خزاں میں فصلِ گل کے گیت گا کر رہ گئے

لٹ رہا ہے کارواں خود رہنما کے ہاتھ سے	قافلوں کو عشق کی منزل پہ اب لائے گا کون؟
آرزوؤں کے حسیں خوابوں کی تعبیریں کہاں	زندگانی کے حقائق آج سمجھائے گا کون؟
جن کی محفل میں شرابِ عشق ہی سے جان تھی	ان کی محفل سے لہو کا جام لے جائے گا کون؟
جن کے گلشن میں محبت کے ترانے جرم ہوں	ان کے گلشن میں شکستہ ساز پر گائے گا کون؟
جن کا مسلک رہبری تھا ان کا مقصد رہزنی	ایسے میر کارواں کے ساتھ اب جائے گا کون؟
جب طلسمِ رہبری ٹوٹا تو ہوش آ ہی گیا	ریگ زاروں میں بگولوں کا خیال آ ہی گیا
عالمِ وحشت میں سودائے محبت بڑھ گیا	جیسے منزل کا خیال اک بار تڑپا ہی گیا

یہ شکستہ دل مسافر سوئے منزل چل پڑے	نامرادوں کا نیا اک کارواں بنتا گیا
ان کی آنکھوں میں محبت کی چمک رقصاں رہی	زخمِ دل رہ رہ کے نقشِ جاوداں بنتا گیا

قافلے جوشِ جنوں میں سوئے منزل ہیں رواں	جیسے خوابیدہ سی راہوں میں نئی جان آ گئی
جیسے ویرانوں پہ اک رنگیں گھٹا سی چھا گئی	جیسے دیوانوں کو کوئی یاد پھر تڑپا گئی

(انجمن ترقی پسند مصنفین علی گڑھ میں پڑھی گئی)

خاطر غزنوی

# خانہ بدوش

زندگی رقص میں ہے، رقص حسیں کرنوں کا  
نقرئی نغمے ہیں شب تاب فضاؤں پہ محیط  
شہر سے دور، جنوں زارِ محبت کے قریب  
چند خیموں میں سمٹ آئی ہے دنیائے بسیط

مسکراہٹ کے ہر اک سمت ہیں پرچم پرّاں  
قہقہے بہکی فضاؤں میں ہیں رقصاں رقصاں  
دودھیا چہروں پہ ہے کیف کا عالم طاری  
غم کہیں دور چھپا بیٹھا ہے مضطر، حیراں

ہر الاؤ پہ ہے آزاد ترانوں کا ہجوم  
سرد نغمے بھی یہاں آ کے پگھل جاتے ہیں  
اور ان گیتوں کی آزاد دھنوں میں گھل کر  
اسی ماحول کی رنگینی میں ڈھل جاتے ہیں

ہر نئی صبح کو رہ جاتے ہیں کچھ راکھ کے ڈھیر  
دور اڑتا ہے کہیں کشمکشِ زر کا غبار  
ہر پڑاؤ پہ انہیں کرتی ہے رخصت آ کر  
نئے جذبوں کی مہکتی ہوئی زرکار پھوار

زندگی ایک چھناکا ہے، پری زادوں کا  
کون اڑتے ہوئے نغمات کو محبوس کرے  
کون بہتی ہوئی آوارہ کرن کو روکے  
کون آزاد کو زندانوں سے مانوس کرے

ظہور نظر

# آڑ

(ڈان، سٹینڈرڈ، زمیندار اور دوسرے اخبارات کے اُن اداریوں کے جواب میں جو ادب پر احتساب عائد کرنے کے سلسلے میں لکھے گئے ہیں)

میں جانتا ہوں
میں خوب پہچانتا ہوں
اور صرف میں نہیں —
زندگی کو آزاد اور خوشحال دیکھنے کی تڑپ میں
مر مر کے جینے والا ہر ایک انسان جانتا ہے
کہ یہ جو فرسودگی کے پیغامبر فحاشی کی آڑ لے کر
تمام ادب کو اسیر کرنے کے مشورے دے رہے ہیں حکامِ ملکِ نو کو
یہ کون ہیں
کس گروہ کے کاسہ لیس ہیں
اور آج تک اُن کا فعل و کردار کیا رہا ہے

یہ وہ ہیں جن کی رگوں میں اوروں کی محنتیں لہر کھا رہی ہیں
یہ وہ ہیں جن کے طفیل انسانیت کی معصوم و پاک قدریں
درندگی اور موت کا زہر پی رہی ہیں
یہ وہ ہیں جن کی زباں کو انسانوں کے خون کی چاٹ پڑ گئی ہے

یہ وہ ہیں جن کی نگاہِ خونیں
حیات کے مثالی اصولوں پہ گڑ گئی ہے
یہ اُن کے مہرے ہیں اُن کے ایجنٹ ہیں کہ جو
حفاظِ زندگی اور امن و انصاف کی حفاظت کا نام لے کر
حیات کے گرد گاڑ دیتے ہیں کالے قانون کی سلاخیں

مرے رفیقو!
مرے جوان اور حوصلہ مند ساتھیو!!
زندگی کو آزاد اور خوشحال دیکھنے کی تڑپ میں مر مر کے جینے والو!!!
ادب پہ احتساب بھی اک سلاخ ہے
جس کو آدمیت کے نرم سینے میں گاڑنے کی غلیظ تجویز ہو رہی ہے
اور اس کا باعث یہ ہے کہ اب ہم
ادب میں اُن آہنی سلاخوں کو توڑ دینے کا صاف اظہار کر رہے
جو زندگی کے چہار جانب گڑی ہوئی ہیں ——"

احمد فراز

# اعتراف

مضحکہ خیز تھے کس درجہ خیالات مرے
تجھ سے کہتا تھا کہ پابند فضاؤں سے نکل
پھاند کر دولت و سرمایہ کی دیواروں کو
جھونک کر افلاس کے آزاد بیابانوں پر
اپنی پابند بہشتوں کو چھپا دیکر تے .
وقت آیا ہے زمانے سے بغاوت کر لے

میں مگر عقل کا اندھا تھا مجھے کیا معلوم
ٹوٹ بھی جائے زر و سیم کی دیوار اگر
کٹ بھی جائیں ترے پاؤں کی گراں زنجیریں
کھل بھی جائے جو کبھی آہنی زنداں کا در
تجھ کو پھر ایک قفس دوست پرندے کی طرح
اسی زنداں کے خرابے میں چلا جانا ہے
کہ تجھے جرأت پرواز نہیں ہو سکتی —
— اور اس عہد طلائی کی جھنکاروں سے
جسم تو جسم تری روح بھی آزاد نہیں

ٹھیک ہے تو نے جو سمجھا تھا بجا سمجھا تھا
کہ میں ناداں ہوں دیوانہ ہوں سودائی ہوں
مصلحت کوش نہیں میری جنونی باتیں

عزیز الحق

# دو نظمیں (۲)

(۱)

غم دوراں کے ستائے ہوئے انسانوں کو
پیار کرنے کی اجازت بھی نہیں مل سکتی
کالی تقدیر کے ٹھکرائے ہوئے انسانوں کو
چند کرنوں کی سہولت بھی نہیں مل سکتی
خواب لہراتے رہیں بھیگی ہوئی پلکوں پر
سانس چلتی رہے آہوں کا تسلسل بن کر
آج چاندی کے ترازو میں تلے گی ہر چیز

(۲)

سر سراتے ہیں ہیولے لاکھوں
ذہن مفلس کے صنم خانوں میں
رقص کرتے ہیں بگولے لاکھوں
میری تقدیر کے ویرانوں میں
دور آکاش کے اس پار کہیں
لوگ کہتے ہیں خدا رہتا ہے
اور انکار نہیں ہو سکتا

قتیل شفائی

# ٹمپل روڈ

(لاہور کی ایک پُرشور سڑک)

رنگ رنگیلے محل دو محلے جگمگ جگمگ جاگ رہے ہیں
ان محلوں میں رہنے والے میٹھی نیندیں تیاگ رہے ہیں

ایک محل کا جھوم جھما کر ڈگمگ ڈگمگ ڈول رہا ہے
جس میں اک سونے کا پنچھی اڑنے کو پر تول رہا ہے

ایک حویلی چھنن چھنن چھن پائل گت پر ناچ رہی ہے
موتی چگنے والی چڑیا جس کی چھت پر ناچ رہی ہے

ایک جھروکہ سانسوں کے گرمیلے پن سے ہانپ رہا ہے
جس کے پائیں باغ کا منظر اپنا چہرہ ڈھانپ رہا ہے

ایک دریچہ روشنیوں کے فوارے سے پھوٹ رہا ہے
جس کے بہتے سایوں میں اک پردیسی دم توڑ رہا ہے

رات کی چلتی گاڑی کے چمکیلے پہیے بھاگ رہے ہیں
رنگ رنگیلے محل دو محلے جگمگ جگمگ جاگ رہے ہیں

ڈاکٹر عبادت بریلوی

# تنقیدی جھلکیاں

ادب اور تہذیب، کلچر اور سماج کیلئے یہ بڑا نازک وقت ہے۔ کیونکہ خود زندگی کا قافلہ اس وقت پُرخار راہوں سے گزر رہا ہے۔ یہ زمانہ بڑا آشوب ہے، لیکن یہ صورت حال حیرت انگیز اور تعجب خیز نہیں، کیونکہ ادب اور تہذیب، کلچر اور سماج ان حالات سے برابر دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ، وہ اسی کشمکش کی ایک کہانی ہیں — زندگی کے ابتدائی دور سے لیکر اس وقت تک انہیں ایسی ایسی کٹھن منزلوں سے دوچار ہونا پڑا ہے جن سے ان کی روح زخمی ہو گئی ہے، لیکن ان کے قدم ڈگمگائے نہیں ہیں۔ بلکہ وہ اس بھٹی میں تپ کر کندن بنکر نکلے ہیں — اس کی وجہ یہ ہے کہ خود انسانی زندگی کی تاریخ خیر و شر، نیکی و بدی انسانیت و درندگی کی باہمی کشمکش کی ایک مستقل اور مسلسل داستان ہے۔ اور ادب چونکہ تہذیب اور ثقافت کلچر اور سماج، زندگی اور انسانیت کی ترجمانی کرتا ہے، اس لئے اس کشمکش کے اثرات سب سے زیادہ اسی کے اندر نمایاں ہوتے ہیں۔

پروہت کال سے لے کر سامنت کال، جاگیرداری، فسطائیت اور سرمایہ داری تک ہر زمانے میں برسر اقتدار طبقے نے ادب کو اپنا آلۂ کار بنانے کی کوشش کی ہے، تاکہ ادب ایک مضبوط ہتھیار بن کر ان کے خلاف صف آرا نہ ہو جائے۔ کہیں کہیں ادب ان کے چنگل میں پھنس بھی گیا ہے۔ اور اس نے ان کے نظریات کے پرچار میں کسی حد تک مدد بھی کی ہے، لیکن اسی زمانے میں صحت مند ادب کے علمبرداروں نے ایسے ادب کے خلاف محاذ بھی بنایا ہے۔ اور شر کی قوتوں کو شکست دینے کی کوشش بھی کی ہے — خصوصاً یہ صورت حال اس وقت اپنے شباب پر نظر آتی ہے۔ جب ادب کی تخلیق کرنیوالوں میں سماجی شعور بیدار ہونے لگا ہے۔ چنانچہ آج ادب میں یہ کشمکش بھی اسی وقت سے بڑھتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

پروہت کال کے ادب میں مذہبی جاگیرداری کی برتری کے اثرات نمایاں ہیں، لیکن انسانیت کا خیال بھی پس پشت نہیں ڈالا گیا ہے۔ سامنت کال کا ادب ملکی اجارہ داری کا ترجمان ہے، لیکن انسانی قدروں کو یہاں بھی بالکل نظرانداز نہیں کیا گیا ہے۔ فسطائیت نے اپنے زہریلے جراثیم پھیلانے کے لئے ادب کو بھی اپنانے کی کوشش کی۔ اور ایک حد تک اسے اپنے مقصد میں کامیابی بھی ہوئی۔ لیکن جمہوریت کے علمبردار اور انسانیت کے پرستار اس کی شر انگیزی کو بے نقاب کرنے سے باز نہیں آئے — اور انہوں نے اس تاریکی میں بھی اقدار خیر کے نور سے دنیا کو منور رکھا۔ حالانکہ اس سلسلے میں قید و بند کی مصیبتیں بھی جھیلنی پڑیں۔ جلاوطنی کے مصائب بھی برداشت کرنے پڑے۔ لیکن چونکہ انسانیت کی قدریں انہیں عزیز تھیں، اسلئے انہوں نے یہ سب کچھ گوارا کیا۔ کون نہیں جانتا کہ ہٹلر اور اس کے حواریوں نے ٹامس مان، ارنسٹ ٹالر، لین فینشوینگر، لڈوگ رین، جیکب ویسرمان، اردم لینڈاو، والٹر مہرنگ اور کارل زوکمیر وغیرہ کو کیسی کیسی تکلیفیں پہنچائیں، لیکن انہوں نے ایک لمحے کے لئے بھی نازی اصولوں کے پرچار کو گوارا نہ کیا — آج وہ زندہ ہیں، ان کے اصول زندہ ہیں — زمانے نے ہٹلر اور اس کے فسطائی اصولوں کو موت کی نیند سلا دیا ہے — اور فسطائیت کے بعد آج سرمایہ دارانہ آمریت اپنی بدترین شکل میں دنیا پر چھا جانے کے منصوبے باندھ رہی ہیں۔ چنانچہ اسکی بھی آج یہ خواہش رہے کہ زیادہ سے زیادہ ادیب اور فنکار اس کے اصولوں کی نشر و اشاعت کے لئے اپنی تخلیقات کو وقف کر دیں۔ بعض ادیب اس کے لئے تیار بھی ہو گئے ہیں، لیکن جنہوں نے اس کی اصلیت کو سمجھ لیا ہے، وہ ایک پہاڑ کی طرح اپنی جگہ پر اٹل ہیں — اور ان اصولوں کو دام

کرنے میں پیش پیش ہیں جس سے انسانیت کو سرمایہ دارانہ آمریت کے جبر و استبداد سے نجات مل سکتی ہے۔ حالانکہ انہیں اس سلسلے میں بڑی بڑی شدید مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ ان کے لئے اس وقت قید و بند کی سختیاں بھی ہیں، حکمران طبقے کی خود ساختہ عدالتیں بھی ہیں، پھانسی کے تختے بھی ہیں، گولیوں کی بوچھاڑیں بھی ہیں — غرض یہ کہ انسانیت کو تباہ و برباد کرنے کے کون سے ذرائع ہیں، جن کو انسانی قدروں کے علمبرداروں کے خلاف استعمال نہیں کیا جا رہا ہے — لیکن کیا انسانیت کی آواز اس طرح دب سکتی ہے؟ — تاریخ بتاتی ہے کہ آج تک تو ایسا ہو نہیں سکا — وہ تو جبر و تشدد کا ناگزیر منطقی نتیجہ ہے۔ اس کو دبانا اتنا آسان نہیں۔

جو کچھ آج ہو رہا ہے اس کو دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے، لیکن ساتھ ہی اس بات کی خوشی بھی ہوتی ہے کہ یہ ساری مصیبتیں انسانیت کا بول بالا کرنے کے سلسلے میں اٹھائی جا رہی ہیں — اس سے حق کی فتح کے لئے زمین تیار ہوگی۔ انسان جبر و استبداد کے پنجوں سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکے گا — اور اس طرح اس کو دائمی خوشی نصیب ہوگی۔

انسانیت کے علمبرداروں کے خلاف آگ اور خون کا یہ کھیل خصوصیت کے ساتھ آجکل امریکہ میں کھیلا جا رہا ہے۔ کیونکہ امریکی ریاست اس وقت سرمایہ دارانہ آمریت کے بدترین مظاہرے میں نمایاں ہو رہی ہے۔ وہاں آج وہ سب کچھ ہو رہا ہے، جو فسطائیت کے زیر سایہ آج سے چند سال پہلے جرمنی اور اٹلی میں ہو چکا ہے۔ لکھنے والوں کو وہاں آج تحریر و تقریر کی کوئی آزادی باقی نہیں۔ برخلاف اس کے سرمایہ دارانہ آمریت نے آج مختلف ہتھکنڈے بدل کر ہر ادیب اور فنکار کا بھاٹ بنانے کی کوشش کی ہے۔ سب سے بڑا ہتھیار انہوں نے جو اس سلسلے میں استعمال کیا ہے۔ وہ وطنیت اور قومیت کا تصور ہے۔ یہ فرسودہ تصورات لکھنے والوں کے ذہنوں پر مسلط کئے گئے ہیں۔ چنانچہ وہاں کے اکثر لکھنے والے اس خول سے باہر نکل کر زندگی کے کسی ترقی پسند معیار کو اپنانے کے قابل ہو نہیں رہے ہیں۔ انہوں نے وطن پرستی کے روپ میں امریکی سرمائے کے گیت گانے کو اپنا شعار بنا لیا ہے۔ لیکن ان کے ساتھ ہی وہاں بعض ایسے ادیب بھی موجود ہیں، جو امریکی سرمایہ دارانہ آمریت کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے۔ ان کے خیال میں اس کے منصوبے بھی وہی ہیں، جو فسطائیت کے تھے۔ چنانچہ وہ ان نظریات کو انسانیت کے خلاف سمجھتے ہیں۔ انہیں اس میں چند مٹھی بھر سرمایہ داروں کا مفاد نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے امریکی سرمایہ دارانہ آمریت کی مخالفت کی ہے۔ اور آج بھی کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے ان کی اس "جرأتِ رندانہ" کو سرمایہ دارانہ آمریت برداشت نہیں کر سکتی۔ اس تحریک کی ترقی اسے منظور نہیں۔ کیونکہ اس کی ترقی اس کی موت ہے۔

چنانچہ امریکی سرمایہ داری نے ان ترقی پسند عناصر کو طرح طرح سے روکنے کی کوشش کی ہے۔ لکھنے والوں کو ایسے شکنجوں میں کس دیا ہے کہ وہ اس سے باہر نکل کر سوچ ہی نہیں سکتے۔ فنکاروں کو اس طرح اسیر کر دیا ہے کہ ان کی آواز نکل ہی نہیں سکتی۔ محکمۂ احتساب کی تلوار ہر ادیب اور فنکار کے سر پر لٹک رہی ہے۔ اور ذرا سی جنبش میں اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ حکومت کی طرف سے ایک کمیٹی بنائی گئی ہے جس کو UN AMERICAN ACTIVITIES COMMITTEE کہا جاتا ہے۔ اس پر سرمایہ داروں کا قبضہ ہے۔ چنانچہ ذرا سے شبہ پر بھی یہ کمیٹی کسی لکھنے والے کو جیل بھیج سکتی ہے، اس کی تخلیقات کو ضبط کر سکتی ہے، اس کی نقل و حرکت پر پابندی لگا سکتی ہے۔ اس کو جلا وطن کر سکتی ہے۔ اور اس سلسلے میں ساری کارروائی یک طرفہ کی جاتی ہے۔ چنانچہ امریکہ کے ترقی پسند ادیبوں اور فنکاروں میں سے سنکلیر لیوس، ہووارڈ فاسٹ، اپٹن سنکلیر، تھیوڈور ڈریزر، پال رابسن، ہینس آئسلر اور نہ جانے کتنے ایسے لوگ ہیں، جن پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا ہے۔ ان میں سے بعضوں کو قید و بند کی سختیاں جھیلنی پڑی ہیں، بعضوں کی تخلیقات کو ضبط کیا گیا ہے۔ بعضوں پر پابندی لگائی گئی ہے اور بعض جلا وطن کئے گئے ہیں۔ لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری ہے — آج بھی وہ تحریر و تقریر سے اس بات کی کوشش کر رہے ہیں۔ کہ ترقی پسند قوتیں آگے بڑھیں۔ انہوں نے ہووارڈ فاسٹ کے الفاظ میں اس بات کا عہد کیا ہے کہ وہ "قلم اور الفاظ کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر لڑتے رہیں گے۔ اس وقت تک لڑتے رہیں گے جب تک ان امریکی کمیٹیوں اور اسی طرح کے دوسرے فسطائی مظاہرات ماضی کی ایک بھولی ہوئی یاد نہ بن جائیں۔" چنانچہ یہ لڑائی جاری

ہے۔ اور ہمیشہ ہمیشہ جاری رہے گی۔ کیونکہ یہ سوال کسی فرد، کسی قوم، کسی ملک، کسی ادارے اور کسی تحریک کا نہیں، بلکہ انسانیت کا ہے۔

امریکہ میں ایک طوفان تو یہ چاپا ہے کہ لکھنے والے رجعت پسندانہ اور غیر انسانی قوتوں کے خلاف صف آرا ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ایسے بھی ہیں جنہوں نے اپنے فن کو اور خود اپنے آپ کو ان قوتوں کے ہاتھ بیچ دیا ہے۔ اور اس طرح امریکہ سرمایہ دارانہ آمریت ادب اور فن کا گلا گھونٹنے میں کامیاب ہو گئی ہے۔ ایسے لکھنے والوں کی ایک فوج تیار کر دی ہے جن کے اقوال و افعال اور افکار و خیالات کی بنیادیں جھوٹ، افترا اور بہتان پر قائم ہیں۔ اور جنہوں نے ادب جیسے مقدس پیشے کو ایک طوائف کے پیشے کا مصداق بنا دیا ہے۔ مشہور امریکی ترقی پسند ادیب بکلر نے اپنے ایک مقالے MONEY WRites میں ان حالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ جارج سیلڈس نے بھی اس سلسلے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ نیو یارک کے والٹر لیپمان ایسے ادیبوں کی آج وہاں قدر ہو رہی ہے۔ جو پہلے ترقی پسند تھا اور جن کے سہارے اس نے خاصی شہرت حاصل کی تھی۔ لیکن آج وہ امریکن سرمایہ داروں کا بھاٹ ہے۔ اور ایسے رسائل و اخبارات کو اگر آسمانوں پر چڑھا رہے ہیں جن کی پالیسی غیر ترقی پسندانہ بلکہ آمریت پرستانہ ہے۔ اور ترقی پسند ادیبوں کا یہ حال ہے کہ ناشروں نے ڈر کے مارے ان کی کتابیں تک شائع کرنے سے انکار کر دیا ہے، جس کی وجہ سے اپٹن سنکلیر اور ہورورڈ فاسٹ ایسے ادیبوں کو اپنی تخلیقات کو منظر عام پر لانے کے لئے خود کوشش کرنی پڑتی ہے۔ ظاہر ہے اس کی ذمہ دار حکومت کی سختیاں اور سرمایہ داروں کی حلقہ بندیاں ہیں۔ جنہوں نے زندگی کے ہر شعبے پر اپنا قبضہ جما رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لایعنی چیزوں کی نشر و اشاعت کا سلسلہ وہاں عام ہے۔

سرمایہ دارانہ آمریت کے یہ اثرات امریکہ ہی تک محدود نہیں۔ دوسرے ممالک میں بھی کم و بیش یہی سب کچھ ہو رہا ہے۔ بڑی مشکل یہ ہے کہ ان بھیانک مناظر پر ایسے پردے ڈال دیئے گئے ہیں کہ ہم میں سے بہت کم کو اس کا علم ہوتا ہے۔ خود ہمارے برعظیم میں ترقی پسند ادیبوں اور فن کاروں کے ساتھ جو سلوک ہو رہا ہے، اس کا علم کتنے افراد کو ہے۔ شاید گنتی کے چند ہوں گے جنہیں اصل صورت حال کا علم ہوگا۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ حکومتوں کی گرفت بڑی سخت ہے۔ فکر احتساب جو کچھ کرتا ہے۔ اس کو ظاہر نہیں کر سکتا۔ ہر بات پردے کے پیچھے ہوتی ہے۔ اور دوسرے ہمارے یہاں ادیب اور فن کار معمولی کام کرنے والے مزدور کے برابر بھی اہمیت نہیں رکھتا۔ ہماری صحافت میں برساتی مینڈکوں کی طرح پیدا ہونے والے سیاسی لیڈروں کی تقاریر و بیانات کو تو نشر کرنے کی جگہ ہوتی ہے، لیکن ادیب اور فن کار کی ہر بات کو اس کا ہر مسئلہ اس کے نزدیک مہمل، لایعنی اور ناقابل توجہ ہوتا ہے۔ چنانچہ عوام کو بیوقوف بنا کر ووٹ حاصل کر لینے والے سیاسی لیڈر اور چندے سے پیٹ پالنے والے قومی رہنما کے حالات کا تو اخبارات سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ لیکن ادیبوں اور فن کاروں کی کوئی خبر نہیں مل سکتی۔ اسلئے کسی کو ان کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ ہمارے ادیبوں اور فنکاروں پر اس وقت جو کچھ گزر رہی ہے اس کو سنکر شاید کوئی فرد ایسا ہو جو آنکھوں سے "جوئے خون" بہانے کے لئے مجبور نہ ہو جائے۔

ہمارے اسی برعظیم میں آج جو مظالم ادیبوں اور فن کاروں کے ساتھ روا رکھے جا رہے ہیں۔ ان کے سامنے جاگیردارانہ دور کی سختیاں بھی شرماتی ہیں۔ آج نہ صرف انہیں جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا گیا ہے، بلکہ بعضوں کو جسمانی تکلیفیں تک پہونچائی جا رہی ہیں۔ تازیانے تک لگائے جاتے ہیں۔ اسی برعظیم میں ایسے حصے بھی ہیں۔ جہاں ادیبوں اور فن کاروں کی نقل و حرکت پر پابندیاں ہیں۔ پولیس کے پہرے ہیں۔ مکانات کی تلاشیوں کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ شاہانہ اور جاگیردارانہ اذیت پرستی کے مظاہر ایک ادیب کی آنکھیں نکال کر بھی کئے گئے ہیں۔ قید خانے میں ایک ادیب کے مسودے کو اس کی آنکھوں کے سامنے جلا کر بھی اپنی تشنگی کو بجھایا گیا ہے۔ حالانکہ یہ بے چارہ ادیب زندگی بھر ملکی کاموں میں پیش پیش رہا ہے۔ اور جس مسودے کو اس کی آنکھوں کے سامنے جلایا گیا ہے، وہ کسی سیاسی موضوع پر نہیں تھا۔ بلکہ ادب کی تاریخ سے متعلق تھا۔ جس کے لئے اس نے ذہنی جگر کاوی اور محنت کی تھی۔ شاید متعلقہ حکومت کے ارباب حل و عقد کو بھی ان باتوں کا علم نہ ہو۔ لیکن یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ اگر علم نہیں ہے تو اس میں قصور کس کا ہے؟ اسی سلسلے میں مزید تفصیلات لکھنا میرے بس کی بات نہیں۔

یہ اس صورتِ حال کی بھرپور جھلک ہے، جس کے زیرِ سایہ اس برِّ عظیم کے ادیب ان دنوں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے ان حالات میں ادب کی تخلیق کا سلسلہ کیسے جاری رہ سکتا ہے۔ جب ادیب کو اتنی بھی آزادی نہ ہو کہ وہ سکون کے ساتھ کسی جگہ بیٹھ کر کام کر سکے۔ اور خیالات و جذبات کے متعلق اپنے ہی ضمیر کو خلوص کے ساتھ وضاحت کر سکے، تو پھر ادب اور تہذیب، کلچر اور سماج کی ترقی کا سوال ہی کیا پیدا ہوتا ہے۔ یہیں تک ہوتا تب بھی غنیمت تھا۔ کیونکہ ادیب اور فنکار اس منزل کو آسانی کے ساتھ طے کرنے کی کوشش کرتا اور تھوڑی سی کوشش کے بعد اسے کامیابی بھی ہو جاتی لیکن جب اس کی تخلیقات کا گلا پابندیوں کے شکنجوں میں کس کر گھونٹ دیا جائے اور نہ صرف یہ بلکہ اس کی برسوں کی محنت کو اس کی آنکھوں کے سامنے نذرِ آتش کر دینے سے بھی گریز نہ کیا جائے، تو پھر ادیب اور فنکار صرف یہی کر سکتا ہے کہ اپنے ماحول اور گردوپیش کے خلاف بغاوت کرے۔ کیونکہ یہ سب کچھ فسطائیت کے بدترین مظاہرے ہیں اور فسطائی مظاہر کو ادیب اور فنکار تہذیب کی خاطر، کلچر کی خاطر، سماج کی خاطر کسی حال میں برداشت نہیں کر سکتا کیونکہ وہ اپنے آپ کو تہذیب، کلچر اور سماج کا نمائندہ، امانت دار، اور علمبردار سمجھتا ہے۔ اس لئے اس ظلم و تشدد کے خلاف تحریر و تقریر اور فکر و عمل دونوں سے اس کے لئے آواز اٹھانی ضروری ہے۔ کیا سیاسی بازیگر اور قانونی شعبدہ باز یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس جھانسے میں آ جائیگا؟ —— کیا وہ اس کا منہ بند کر دینے میں کامیاب ہو سکیں گے؟ —— کیا ان کی چالبازیاں چند سکوں کے عوض اس کی صلاحیتوں کو خرید لینے میں کامیاب ہو جائیں گی؟ —— ایں خیال است و محال است و جنوں!

آخر الذکر بات میں نے یونہی نہیں کہہ دی ہے بلکہ یہ حقیقت ہے۔ ادیبوں اور فنکاروں کی صلاحیتوں کو خرید لینے کے منصوبے آج بڑی شدت اور تیزی سے باندھے جا رہے ہیں —— یہ ظلم و تشدد بھی اسی سلسلے کی پہلی منزل ہے۔ تکنیک یہ ہے کہ پہلے ادیبوں کو طرح طرح سے پریشان کر کے ان پر مظالم کے پہاڑ توڑ کر ان کے اوپر عرصۂ حیات تنگ کر دیا جائے۔ یہاں تک کہ ان کے لئے جینا دوبھر ہو جائے اور پھر ان کی ان پریشانیوں اور ذہنی حالت سے غلط فائدہ اٹھا کر انہیں اپنے اندر شامل کیا جائے۔ تاکہ وہ اپنی تخلیقات کے ذریعے ان کے مقاصد کا پرچار کریں، اور جمہوریت کے روپ میں جو فسطائیت آج نظر آ رہی ہے اس کی کوئی مخالفت صفحۂ ہستی پر باقی نہ رہے —— چنانچہ ایک منظم تحریک کا نقشہ اس وقت حکمران طبقے کے ذہنوں میں موجود ہے۔ ترقی پسندوں کی مخالفت میں ایک انجمن بنانے کی کوشش جاری ہے۔ اس کام کے لئے ایک خاصی رقم بھی صرف کرنے کا تہیہ کیا جا چکا ہے —— اس تحریک اور انجمن کا سب پہلا مقصد یہ ہوگا کہ وہ ترقی پسندوں اور ان کے بنیادی خیالات و نظریات کی مخالفت کرے —— اور سرمایہ دارانہ آمریت کے لئے کھلم کھلا فسطائیت کے لئے زمین تیار کرے۔ جمہوری قبا میں نظر آنے والے "ریاستی استبداد" کی یہ فسطائی تکنیک نہیں تو اور کیا ہے؟ بہت سے ادیب اس وقت تک خریدے جا چکے ہیں بہت سے خریدے جا رہے ہیں۔ بہت سے خریدے جائیں گے۔ وہی جو نازیوں نے کیا تھا۔ یہاں بھی ہو رہا ہے۔ وہی کھیل جو امریکی سرمایہ دارانہ آمریت اپنی سرزمین پر کھیل رہی ہے۔ اس کی صدائے بازگشت یہاں بھی سنائی دے رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کل کے نام نہاد عوام پرست ادیب آج وزیروں کی شان میں قصیدے پڑھ رہے ہیں۔ حکومتوں کے ہر اقدام کو سراہنا انہوں نے اپنا شعار بنا لیا ہے۔ کل تک جو اپنے الحاد اور لامذہبیت کا ڈھول پیٹتے پھرتے تھے اور اس پر فخر محسوس کرتے تھے حالانکہ ترقی پسندوں کو اس وقت بھی ان کی حقیقت معلوم تھی۔ آج بیچاروں کو دھرم اور مذہب نے ایسا ستا رکھا ہے کہ کہیں تو وہ رام راج کے گن گاتے ہیں۔ اور کہیں اسلامی حکومت کا خواب دیکھتے ہیں۔ کہیں ان کے قلم سے دیوتاؤں کی تعریفیں نکلتی ہیں —— اور کہیں بیچاروں نے سب کچھ چھوڑ کر اب حمد اور نعت لکھنی شروع کر دی ہے۔ ان کی ابن الوقتی اس سے ظاہر ہے۔

ترقی پسند اور حقیقت پرست تو ایسے ادیبوں کے لئے صرف دعائے خیر ہی کر سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ جب ان میں شامل تھے، اس وقت بھی انہیں ان کے خلوص پر شبہ تھا —— بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کی صفوں میں گھس کر ایسے ہی ادیبوں نے تحریک کو بدنام کیا۔ اور لوگوں نے اس میں شامل ہونے والے ادیبوں کو ملحد، لامذہب، فرقہ پرست، اور نہ جانے کیا کیا کہہ ڈالا۔ حالانکہ ان بے چاروں کو ان باتوں سے کچھ بھی سروکار نہیں تھا۔ وہ تو صرف انسانیت کی کو اپنا نصب العین سمجھتے تھے۔ چنانچہ آج بھی ان کا نصب العین یہی ہے۔ اور دنیا جب تک ہے ہمیشہ یہی رہے گا۔ دنیا بدل جائے گی لیکن وہ نہیں بدل

سید حسن طاہر

# ایک ادیب — ایک انسان

ایک بہترین شکاری، ایک مشاق کرتباز، ایک تجربہ کار سپاہی، ایک بہترین مصنف اگرچہ آج کل کے زمانے میں معجزے یا "خرق عادت" کا تصور مٹ رہا ہے۔ پھر بھی انسانی فکر و عمل کے معجزے ہوتے ہی رہیں گے۔ "گھنٹی کس کیلئے بجتی ہے" (FOR WHOM THE BELL TOLLS) اور "جنگ کو خیرباد" کا مصنف (FAREWELL TO ARMS) ارنسٹ ہیمنگ وے ایک ایسا ہی معجزہ ہے۔

یہ ادیب جو پچاس سال کی عمر میں ایک بہترین صحت کا مالک ہے اور دیکھنے میں بیشتر سپید ریش نظر آتا ہے، اب تک چار شادیاں کر چکا ہے۔ دنیا کی دو بڑی جنگوں میں نہ صرف اطلاعات رسانی کرتا رہا ہے۔ بلکہ باقاعدہ سپاہی کی حیثیت سے لڑا ہے، زخمی ہوا ہے۔ قید ہوتے ہوتے بچا ہے۔ اور فوج کے محکمہ جاسوسی کے مشکل سے مشکل فرائض کم از کم وقت اور خرچ پر سرانجام دیتا رہا ہے۔

اس کا باپ ڈاکٹر تھا اور پہلے درجے کا شوقین شکاری تھا۔ اس کی ماں اپنے گرجا کی بہترین مغنیہ تھی۔ یہ دونوں خوبیاں اس نے ورثے میں پائی ہیں۔ ایک طرف سے شکار، دوسری طرف سے موسیقی۔ اس نے زندگی کے تضاد کو ایک اور ڈھنگ سے بھی نمایاں کیا۔ دوسری جنگ عظیم میں شامل ہونے سے پہلے اس نے ایک پادری کی طرح چھاج ایسی ڈاڑھی بڑھا لی اور "باکسنگ رنگ" میں اپنے چوڑے شانوں، بالوں بھری چھاتی اور ڈاڑھی کے اوپر ایک صحت مند مسکراہٹ سمیت ایک زبردست اور آزمودہ کار باکسر کی حیثیت سے مشہور ہو گیا۔ جسمانی ریاضت وہ اسلئے کرتا تھا کہ جنگ کی ضروریات کے مطابق جسم میں پھرتی اور قوت مدافعت بڑھ جائے۔

وہ صبح جلدی اٹھتا ہے۔ دیکھنے سے حیرت ہوتی ہے کہ ایک اچھا کامیاب مصنف جسمانی طور پر اتنا مکمل صحت مند انسان ہے۔ یہ چیز دنیا کے دوسرے ملکوں میں شاید باعث حیرت نہ ہو مگر ہمارے ایشیائی ملکوں اور خصوصاً اس برصغیر ہند و پاک کے لئے ضرور ہے۔ یہاں کی کہانی کا سا اثر رکھتی ہے یہاں تو فنکار کے لئے ایک دبلا پتلا نحیف و نزار جسم جسے غزل میں جان ناتواں کہہ کر خوش کیا جاتا ہے، اور عجیب بے ہنگم سراپا ایک لازمے کے طور پر پایا جاتا ہے۔ یہاں فنکار کے لئے چھپر کھٹ پر بیٹھی بنی کی جستجو سے زیادہ صدیوں کی بھوک، اپنی زندگی سے محرومی، حالات کی ناسازگاری، زندگی کے تلخ تجربے اور زندگی کی لطافتوں کے یکسر فقدان کا احساس، اور اس میں اضافے کے طور پر جنسیاتی سوال۔ یہ سبھی کچھ معتوب ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس تقابل میں کتنا تفاوت ہے، ایک طرف بھرپور صحت مند زندگی، دوسری طرف اس کا مکمل فقدان، ایک طرف زندگی مجسم ہو کر رہ گئی ہے اور دوسری طرف اس کا فقدان ہی مجسم ہو کر رہ گیا ہے۔

"ہیمنگ وے" نے ابتک چار شادیاں کی ہیں۔ تین بیویوں سے طلاق پر منتج ہوئی ہیں۔ کوئی خاص ناخوشگوار واقعہ اس سلسلے میں بیان نہیں کیا گیا۔ پہلی شادی اس نے بائیس سال کی عمر میں کی۔ اس کی پہلی بیوی "ہیڈلے رچرڈسن" ایک الھڑ دوشیزہ تھی۔

دوسری شادی اس نے ایک اخبار نویس خاتون سے کی۔ شکل و صورت اور جسمانی وجاہت کے سلسلے میں یہ خاتون کچھ زیادہ قابل ذکر نہیں تھی۔ تیسری شادی اس نے چین کی خانہ جنگی کے دوران میں کی۔ اس کی یہ بیوی بھی ایک صاحب قلم خاتون تھی۔ جسے ہیمنگ وے سے بہت محبت ہو گئی تھی۔ یہ خاتون بہت خوبصورت تھی۔ اس کی موجودہ بیوی میری ویلش ہے۔ وہ بھی عمر کی سنجیدہ منزل میں پہنچ چکی ہے

وہ ابتدائی تعلیم کے زمانے میں سکول سے کچھ زیادہ مانوس نہیں تھا۔ دو دفعہ اس نے سکول سے بھاگنے کی کوشش کی۔ وہ اپنے سکول کے پرچے

اخبار بھی تھا اور سکول کے رسالے کے لئے کہانیاں بھی لکھتا رہتا تھا۔ سکول کی فٹ بال ٹیم کا بہترین کھلاڑی تھا۔ اور تیراکی میں ہمیشہ اول رہتا تھا۔ اس کے باوجود وہ سکول سے ناخوش تھا۔ عام طور پر کھیلوں کو بہت زیادہ پسند کرتا تھا۔ مقابلہ کرنے کی اس میں بے پناہ قوت تھی۔ وہ ایسا کھلاڑی نہیں تھا جس نے لکھنے کا فن اختیار کیا ہو۔ بلکہ ایسا ادیب تھا جس نے بڑی مشقت سے کھیلنا سیکھا ہو

سکول کی تعلیم کے اختتام پر ہیمنگ وے کالج میں داخل ہوا مگر ڈگری حاصل کرنے سے پہلے ہی اُس نے کالج سے علیحدہ ہونے کی ٹھان لی۔ پہلی جنگ عظیم کے اختتام سے کچھ پہلے امریکہ بھی حلیفوں کے ساتھ جنگ میں شامل ہو گیا تھا ہیمنگ وے نے سوچا چلو فوج میں بھرتی ہو جاؤ۔ مگر ان دنوں اس کی ایک آنکھ کھیل میں چوٹ لگ جانے کی وجہ سے خراب ہو گئی تھی لہٰذا ڈاکٹر نے اُسے فوج میں لینے سے انکار کر دیا۔

ہیمنگ وے کالج واپس نہیں گیا۔ اور اپنی عمر کے متعلق جھوٹ بول کر ایک اخبار کے ادارے میں شامل ہو گیا۔ اور اس کے بعد وہ ریڈ کراس کے ذریعے مختلف ملکوں کی فوجوں کے ساتھ کام کرتا رہا۔ اور اسی سلسلے میں اٹلی بھی گیا۔ کیونکہ ان دنوں ریڈ کراس والے زیادہ سخت طبی معائنہ نہیں کرتے تھے۔ یہاں ایک بم سے زخمی ہو کر وہ ہسپتال چلا گیا۔ جہاں اُس کی ٹانگ میں سے ڈاکٹروں نے لوہے کے ۲۳۷ ٹکڑے نکالے۔ وہاں سے اطالوی فوج کے دو بہت بڑے اعزازات سے نوازا گیا اور پچاس ڈالر سالانہ کی پنشن بھی ملی۔ وہ گھر لوٹا اور جنگ کی یہ نشانیاں بھی ساتھ لیتا گیا جن میں ایک ایلومینیم کی ٹوپی اور مصنوعی ہڈی اور کچھ لوہے کے ٹکڑے جو ابھی تک نکالے نہ جا سکے تھے شامل تھے۔ ان میں سے ایک اب بھی تیس سال کے بعد اسکے گھٹنے میں سے باہر نکل رہا ہے۔ وہ ایک عرصے تک راتوں کو سو نہیں سکتا تھا ان کو لیٹتے اُسے چند سی آتی تھی۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ بم کا حادثہ رات کے وقت پیش آیا تھا۔ اب پھر اُس نے نوکری ڈھونڈنا شروع کی۔ اس زمانے میں اس کی کہانیاں مقبول ہو رہی تھیں۔ ان دنوں وہ شیروڈ اینڈرسن سے ملا۔ اور بھی بہت سے فنکاروں سے اس کی ملاقات ہوئی۔ اینڈرسن اُسے لکھنے کے متعلق مفید مشورے دیتا اسکے بعد وہ ایک بار پھر ترکی۔ یونانی جنگ میں بطور نامہ نگار کے کام کرنے چلا گیا۔ اب تک اس نے جو کچھ لکھا تھا۔ اس کے پاس ایک سوٹ کیس میں محفوظ تھا۔ اور یہ سوٹ کیس اثنائے سفر میں گم ہو گیا۔ مگر اس حادثے نے ہیمنگ وے کو زیادہ متاثر نہ کیا۔ بلکہ اس نے اور بھی توجہ اور محنت سے لکھنا شروع کر دیا۔ اُس نے فن تحریر کو ایک اہم فن سمجھ کر اُس کا مطالعہ کیا اور اس میں اتنی محنت کی جیسے ایک سائنس کا طالب علم اپنے علم میں کرتا ہے گرٹروڈ سٹائن اور ایذرا پاؤنڈ اس زمانے میں اُسکے استاد تھے۔ بعد میں ہیمنگ وے نے ایک دفعہ کہا تھا کہ "ایذرا پاؤنڈ اکثر رائے دیتا تھا۔ مگر جب کبھی مجھے اس کی رائے غلط معلوم ہوتی وہ اس حد تک غلط ہوتی تھی۔ کہ کوئی بھی دوسرا شخص اسکے غلط سمجھنے میں تو برابر شرکت بھی نہیں کر سکتا تھا۔

مگر گرٹروڈ سٹائن کے متعلق اُس نے کہا وہ ہمیشہ درست رائے دیتی تھیں۔

اس کی دو چھوٹی چھوٹی کتابیں فرانس میں چھپیں۔ پھر افسانوں کا ایک مجموعہ ہمارے زمانے میں IN OUR TIME امریکہ میں چھپا۔ مگر اس میں اُسے مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ صرف ۱۳۳۵ کاپیاں چھپوائی گئی تھیں۔ مگر ان میں سے چند سو بک سکیں۔ اگلے سال اس کی کتاب THE TORRENTS OF SPRIN بھی غیر معمولی تھی لیکن پھر "THE SUN ALSO RISES" چھپی۔ اسے فوری کامیابی تو ہوئی۔ مگر زیادہ نہیں۔ ڈیڑھ سال کے عرصے میں صرف پچیس ہزار جلدیں فروخت ہوئیں (یہ غور طلب ہے ہمارے یہاں تو کوئی روزنامہ اخبار بھی شاید اس تعداد کو پہنچتا ہو) اب رفتہ رفتہ لوگوں نے محسوس کیا کہ ایک بہت مقبول ادیب سامنے آ رہا ہے۔ ہیمنگ وے نئی نسلوں کیلئے ایک نیا پیغام دے رہا تھا۔ جیسا کہ ایک صدی پیشتر بائرن نے دیا تھا اور اب لوگوں میں اس کی مقبولیت اس حد تک پہنچ گئی۔ کہ وہ اسکے کرداروں کو بہت پسند کرنے لگے۔ اور ان کی طرح حرکات و سکنات بھی کرنے لگے۔ اس کی کتابوں کے نکالے ہوئے فقرے زبان زد ہونے لگے۔ اس زمانے میں وہ پیرس میں رہتا تھا۔ اور دن کا کھانا وہ کسی خوانچہ فروش سے چند پیسوں کے عوض خرید کر کھاتا تھا۔ اس نے اپنی اہمیت محسوس کر لی تھی۔ اور بڑی سے بڑی قیمت پر بھی اپنی مرضی کے خلاف وہ لکھنے کو تیار نہ تھا۔ وہ امریکہ واپس گیا۔ اور اب اُس نے A FARE WELL TO ARMS لکھنا شروع کیا۔ ۱۹۲۹ء میں اس نے کتاب مکمل کر لی پھر وہ مچھلیاں پکڑنے میں مصروف ہو گیا۔ اور امید سے زیادہ کامیاب رہا اسکے بعد سپین میں خانہ جنگی شروع ہو گئی اُسے سپین سے بہت محبت تھی۔ اور اس نے محسوس کیا کہ اُسے سپین کے لئے ضرور کچھ کرنا چاہیئے۔ وہ گئی

بار سپین گیا۔ وہاں اس نے جمہوری فوجوں کے لئے چالیس ہزار ڈالر بھیج دئے۔ جن سے ایمبولینس گاڑیاں خریدی گئیں۔ آخری بار سپین سے واپس آکر جب کہ وہ اپنی دوسری بیوی سے علیحدہ ہو چکا تھا، اس نے FOR WHOM THE BELL TOLLS جیسی عظیم کتاب کی تخلیق میں مصروف ہو گیا۔ آندرے مالرو اور ہیمنگ وے نے پیرس میں طے کیا کہ وہ دونوں سپین کی جنگ کے متعلق لکھیں گے۔ مالرو نے بہت جلدی کی اور اپنی کتاب L'ESARO "یا انسان کی امید" اُسی سال شائع کر دی۔ مگر جب تک ہیمنگ وے اپنی کتاب ختم کرے، میڈرڈ فتح ہو چکا تھا۔

اس کتاب کے متعلق اُس کا اپنا خیال ہے کہ یہ اس کی عزیز ترین تصنیف ہے۔ اب تک اس کی دس لاکھ جلدیں امریکہ میں فروخت ہو چکی ہیں۔ دوسرے ممالک میں بھی بہت بڑی تعداد میں یہ کتاب بکی۔ اور دوسری جنگ عظیم میں امریکی اور روسی فوجوں نے اسے فنِ جنگ پر ایک مبسوط اور مدلل کتاب سمجھ کر چھاپہ مار دستوں کی جنگ کے لئے ہدایات نامے کے طور پر استعمال کیا۔

ہیمنگ وے کے لکھنے کا طریقہ بھی عجیب ہے۔ اس کی بڑی بڑی کتابیں کافی وقفے کے بعد لکھی گئی ہیں AFAREWELL TO ARMS لکھنے میں اس نے پورا ایک سال صرف کیا اور FOR WHOM THE BELL TOLLS لکھنے میں اُسے پندرہ مہینے لگے۔ وہ آجکل ایک اور ناول لکھ رہا ہے اور اس وقفے کو نکال کر جب تک کہ وہ گزشتہ جنگ عظیم میں بری، بحری اور ہوائی فوج میں رہا، اسے اس کتاب پر پانچ یا چھ سال کام کرتے ہوئے ہو جائیں گے۔

وہ جب اپنا ناول لکھنا شروع کرتا ہے تو بالکل ایسے ہی شروع کرتا ہے، جیسے کوئی سیاح کسی نامعلوم خطے میں سفر کر رہا ہو۔ اُس کو انجام کے متعلق کچھ ہلکا سا اندازہ ہوتا ہے۔ مگر یہ انجام بدل بھی سکتا ہے۔ اُسے اپنے سفر میں ایک سیدھا راستہ تو نظر آتا ہے۔ مگر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اُسے کتنا سفر کرنا پڑے گا، یا راستے میں اُسے کیا کیا نظر آئے گا۔

وہ صبح سویرے اٹھ کر چھ بجے اپنی میز پر ڈٹ جاتا ہے۔ کام شروع کرنے سے پہلے وہ پہلے لکھے ہوئے حصے کو بغور دیکھتا ہے۔ کہ خیالات میں تسلسل پیدا ہو جائے۔ یہ عمل وہ جاری رکھتا ہے، جب تک کہ ناول کے وسط میں نہ پہنچ جائے۔ اسکے بعد وہ کم از کم پچھلے چند ابواب ضرور پڑھتا ہے۔ وہ پنسل سے لکھتا ہے اس کی دوسری بیوی پالین، کہا کرتی تھی، کہ وہ اپنی انگلیوں سے سوچتا ہے۔ ساڑھے بارہ بجے دوپہر تک وہ قریباً قریباً اپنے دن کے کام سے فارغ ہو جاتا ہے اکثر وہ ڈیڑھ دو گھنٹے اضافہ بھی کر دیتا ہے۔ اس کا مقولہ ہے کہ لکھتے لکھتے اس وقت رُکنا چاہیئے۔ جب ابھی خیالات میں تسلسل جاری ہو اور زیادہ لکھنے کو جی چاہے ایسا کرنے سے کبھی بھی ذہن مجہول نہیں ہوگا۔ فاکنر FAULKNER کو وہ بہترین لکھنے والا سمجھتا ہے۔ مگر اُسے اُس سے یہی شکایت ہے۔ کہ وہ جب تھک کر چور ہو جاتا ہے پھر بھی لکھنا جاری رکھتا ہے۔ اور پھر وہ کانٹ چھانٹ بالکل نہیں کرتا۔

ہیمنگ وے اپنی روزنامہ ڈائری لکھتا ہے۔ اور اپنے کام کا احتساب کرتا رہتا ہے۔ ایک ہفتے میں اس نے پیر کے روز ۴۵۰ الفاظ لکھے، منگل کے روز ۵۱۴، بدھ کے دن ۴۲۸، جمعرات کے روز ۹۱۲/ اور جمعہ کے روز ۷۰۹، یعنی مجموعی طور پر ہفتے بھر میں اُس نے ۲۸۲۷ الفاظ لکھے۔ ہفتے کے روز وہ مچھلیاں پکڑنے چلا گیا اور اتوار کو اس نے میٹانزاس MATANZAS کی سیر کی۔ ناول کے اہم مقامات پر پہنچ کر اُس کی رفتار بہت مدھم ہو جاتی ہے مثلاً ۲۰۰ الفاظ یومیہ۔ مکالمے لکھتے ہوئے وہ بہت تیزی سے کام کر سکتا ہے۔ اور اُس کا کہنا ہے۔ کہ اگر وہ چار کرداروں کو مکالمے میں مشغول کر سکے، تو سارا کام ایک خواب کی سی تیزی اور آسانی سے ہو جاتا ہے۔

جب وہ پہلی بار ایک ناول ختم کر لیتا ہے تو پھر کانٹ چھانٹ کرنے بیٹھ جاتا ہے۔ وہ بے رحمی سے اپنے لکھے ہوئے صفحوں پر لکیریں کھینچتا چلا جاتا ہے۔ جہاں کہیں اُسے تصنع یا احساس کی بہت زیادہ بڑھی ہوئی شدت نظر آتی ہے، وہ اُس حصے کو خارج کر دیتا ہے۔ اس کی رائے ہے کہ اگر کوئی مصنف ایک دفعہ مصنوعی طور پر زندگی کی ترجمانی کرتا ہے۔ اور سستی جذباتیت سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ تو وہ اپنے سب کئے دھرے پر پانی پھیر دیتا ہے۔ بالکل ایسے جیسے ایک سیب خراب ہو کر سارے ٹوکرے کو خراب کر دے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ کہ وہ ہمیشہ اپنے معیار کو بلند سے بلند تر کرتا چلا جاتا ہے۔ اسی مقصد کے تحت وہ اپنی کتابوں پر پہلے کی نسبت زیادہ وقت صرف کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ لکھنا بھی ایک سا ہنر ہے۔ اور میں ابھی اسے اچھی طرح [illegible] کی ہر ممکن کوشش

مسعود اشعر

# چین میں عوامی جدوجہد

ہم نے ملکیت کی مہر کھیتوں میں دھانوں کو لگا دی
ہماری امیدوں کے ساتھ ساتھ دھان کے پودے بھی پھلے پھولے ۔

کڑی محنت کے بعد بیل گھاس چر رہے ہیں ۔
آقا لوگ مزے سے چاول کھا رہے ہیں ۔
اور ہم کسان لوگ دھان کے چھلکوں کے لئے ترس رہے ہیں !

اور —
سرکاری دفتر کا پھاٹک جنوب کی سمت کھلتا ہے ۔
جہاں ہمیں نقد لگان دینا پڑتا ہے
جس کی نہ کوئی وجہ ہے
اور نہ ہی کوئی تُک ہے !! "

یہ ہے چینی قوم کا احساس جو سینکڑوں سال پہلے کے لوک گیتوں میں بھی نمایاں ہے ! یہی احساس تھا جس نے ملکی شاہنشاہوں اور غیر ملکی سامراجیوں کے خلاف چینی عوام کے دلوں میں نفرت کی آگ بھر دی ۔ یہاں تک کہ ان کی کوششیں کامیاب ہوئیں اور آج سارا چین، ان کا اپنا پیارا چین — ان کے ہاتھوں میں ہے ۔

چینی زبان کے پروفیسر تان یی شان نے اپنے ایک مضمون میں ایک لوک گیت نقل کیا تھا۔ جس میں انہوں نے یہ دکھانے کی کوشش کی تھی کہ چینی قوم بہت صابر و شاکر اور ہر چیز پر قناعت کرنے والی ہوتی ہے ۔ وہ گیت تھا ۔

" جب سورج نکلتا ہے تو میں بیدار ہو جاتا ہوں ۔
اور جب سورج ڈوبتا ہے میں آرام کرتا ہوں ۔
پانی پینے کے لئے کنواں کھودتا ہوں
اور کھانے کے لئے زمین جوتتا ہوں ۔

شہنشاہ کی حکومت اس کے پاس رہے ۔
مجھے اس سے کیا لینا دینا ہے ؟

ٹیگور پروفیسر صاحب جس ذہنیت کے قائل ہیں ۔ اسی ذہنیت کے لوگوں کی ترجمانی یہ گیت کرتا ہے ۔ جہاں لوگوں کے خیال ہیں جن کے ذہن میں رعیت پسندانہ خیالات کوٹ کوٹ کر بھر دیئے گئے تھے جنہیں بتا دیا گیا تھا کہ وہ بلندی کا احساس بھی نہیں کر سکتے تھے ۔ اس قسم کے خیالات تو بس غلام ہی کر سکتے ہیں ۔ جنہیں زبردستی قناعت سکھائی جاتی ہے ۔

چینی عوام میں جب یہ احساس اور بیداری پیدا ہوئی ہے تو وہ یہ نہیں کہتے کہ شاہنشاہ کی حکومت اس کے پاس رہے ۔ مجھے اس سے کیا لینا دینا ہے ۔ بلکہ وہ شاہنشاہ اور حکومت دونوں کا خاتمہ کرنا اپنا فرض سمجھنے لگے ہیں وہ اپنی بھلائی اسی میں دیکھنے لگے کہ اس حکومت کا ہی خاتمہ کر دینا چاہیئے جس سے لینے دینے کا سوال پیدا ہو ۔ !

پرل بک کا ناول GOOD EARTH شاہد ہے کہ چینی عوام ہمیشہ سے انقلابی تحریکیں ابھارتے چلے آتے ہیں ۔ جب کبھی ان میں سے کوئی شخص بہت زیادہ امیر ہو جاتا اس نے کوٹھیاں اور بنگلے بنوائے ۔ نوکر غلام رکھنا شروع کئے ۔ تب ہی بھوکے ننگے عوام نے اس پر حملہ کر کے سب لوٹ لیا ۔ اس کا سارا سامان ۔ سارا مال ۔ آپس میں تقسیم کر لیا ۔ — یہ تحریکیں مختلف طریقوں سے مختلف زمانوں میں ہوتی چلی آئی ہیں ۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے حکمران اپنی فوجی طاقت کے بل پر حکومت کرتے تھے ۔

چین نے ایک وہ بھی زمانہ دیکھا تھا جب " چو " کے عہد ( ۱۱۲۲ ق م تا ۲۵۵ ق م ) میں " چنگ ستاین " کا رواج تھا ۔ ساری زمین حکومت کی سمجھی جاتی تھی اور سب میں برابر تقسیم کر دی گئی تھی ۔ ہر مربع " لی " کے نو حصے کئے گئے تھے ہر حصہ میں نو سو " موؤس " زمین تھی ۔ اس نو سو موؤس زمین میں سے آٹھ سو موؤس عوام میں ان کے گزارے کے لئے تقسیم کر دی گئی تھی اور باقی ایک سو موؤس سرکاری یا پنچایتی زمین کے طور پر چھوڑ دی گئی تھی ۔ جس سے سرکاری کام چلتا ۔ آس پاس کے کسانوں کا فرض ہوتا تھا کہ وہ باری باری پنچایتی زمین کو جوتیں ۔ سارے ملک کی زمین اسی طرح وہ حصوں میں منقسم تھی ۔

اور اس کے ساتھ ہی اس نے " شیہ ہوانگ تی " کا وہ دور بھی دیکھا تھا ۔ جب دیوار چین بنوانے کے لئے کروڑوں جانیں ضائع کی گئی تھیں ۔ جب تمام علم و ادب کی کتابیں جلا ڈالی گئی تھیں اور سارے ملک کے پڑھے لکھے لوگوں کو قتل کرا دیا گیا تھا ۔

لیکن " افیون کی جنگ " ( ۱۸۴۰ تا ۱۸۴۲ ) کے بعد جو مسلسل ظلم و ستم چینی لوگوں پر ہونا شروع ہوئے وہ ان تمام باتوں سے مختلف تھے ۔ یورپین اقوام کے ذلیل ترین اخلاق کا نمونہ تھے ۔ چاروں طرف سے چین پر یلغار کر دی گئی تھی ۔ غیر ملکی لٹیرے چین کے حصے بخرے کرنے لگے تھے ۔ ایک طرف جاپان اپنا اقتدار جمانے کی کوشش کر رہا تھا تو دوسری طرف فرانس امریکہ جرمنی اور روس اپنی تجارت کے لئے چین کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بانٹ لینے کی فکر میں تھے ۔ چین کو سب ملکوں نے آپس میں متحد ہو کر اسے شریک کر لینے کی کوشش کی ۔ انہوں نے بہت سی اپنے حق میں اقرار نامے بنام " ناہموار معاہدے " چین سے زبردستی لکھوا لئے ۔ اور لاکھوں ٹن چیزیں ٹیکس فری اپنے لئے مراعات اور پٹے کے علاقے حاصل کئے ۔

برطانیہ فرانس جرمنی اور روس نے " اقتدار کے علاقے " کے نام سے چین کے اکثر علاقوں میں اپنی حکومت قائم کر لی ۔ جرمنی نے کیاؤچو کی بندرگاہ و چنگتاؤ پر قبضہ کر لیا اور اردگرد کے ۲۰۰ مربع میل زمین بھی ہتھیا لی اس کے ساتھ ہی جرمن کارخانہ داروں کے لئے کانیں کھودنے اور ریلیں چلانے کی اجازت بھی حاصل کر لی ۔ فرانس نے ۹۹ سال کے پٹے پر صوبہ کوانگ تنگ میں کوانگ چو وان کا ۱۹۰ مربع میل کا علاقہ حاصل کر لیا ۔ روس نے ۲۵ سال کے لئے پورٹ آرتھر پٹے پر لے لیا اور اس کے آس پاس ۱۴۰۰ مربع میل علاقہ اور ریل کی سہولتیں حاصل کر لیں ۔ برطانیہ نے چین کو مجبور کیا کہ اسے ویہائی وے بندرگاہ دے دے ۔ ان کے ساتھ ہی جاپان بھی پہلو میں بیٹھا چین کو گھور رہا تھا وہ بھی وقتاً فوقتاً حملے کرتا رہتا تھا

امریکہ سب سے بازی لے گیا اس نے شکریہ کے طور پر [illegible] اس نے اپنے لئے آزادانہ تجارت کی پالیسی کا اعلان کر کے تمام [illegible]

ڈالر نے اس نے اپنے ہاتھ پاؤں پھیلا دیئے۔ گراموفون اور ریڈیو سیٹ کی تجارت سے لے کر دیا سلائی، کیکس اور سینٹ سے کپڑے دھونے کی تجارت پر
اس نے قبضہ کر لیا۔ سارا چین اس کے قبضہ قدرت میں آگیا۔ اس نے چین کو اپنے بازار کا غلام بنا لیا۔ چیانگ جیسا شخص تو اس کا نمک خوار غلام تھا ہی۔
چینی عوام بھی اس زمانہ میں خاموش نہیں بیٹھے تھے۔ وہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ انہیں تمام چیزوں کا احساس تھا۔ وہ ان غیر ملکی ڈاکوؤں کو اچھی طرح سمجھتے تھے
اور ان کے سینہ میں آگ بھڑک رہی تھی یہ آگ پہلی مرتبہ بغاوت کی شکل میں نمودار ہوئی۔
بغاوت "تائپنگ" سوچاؤ ہو کی بغاوت میں ۱۸۵۱ء میں ہوئی تھی۔ جو شروع تو مذہبی رنگ سے ہوئی تھی۔ لیکن بعد میں قومیت کا روپ اختیار کر گئی۔ اکثر
لوگ اس تحریک میں شامل تھے۔ وہ غیر ملکی تاجروں اور ملکی حکمرانوں کے خلاف اٹھے تھے گویا انہوں نے انقلاب کی بنیاد ڈالی تھی ...
حالانکہ یہ بغاوت چینی حکومت نے انگریزوں کی مدد سے کچل دی۔ لیکن جو چنگاری عوام کے سینوں میں سلگ رہی تھی وہ پھر شعلہ بنتی گئی۔
اور پھر ۱۹۰۰ء کے بعد پھر پھٹ پڑا۔ اس مرتبہ غیر ملکی مشنری اور عیسائیوں کو خوب مارا پیٹا گیا۔ انہیں قتل کیا گیا۔ یورپین اور فرانسیسی دفتر کارخانہ
اور عبادت خانے گھیر لئے گئے۔ انہیں نقصان پہنچایا گیا۔ لیکن ابھی ظلم کا بدلہ پوری طرح لینے بھی نہ پائے تھے کہ فرانس، برطانیہ، امریکہ، جرمنی، جاپان اور روس کی
فوجوں اور توپ گولوں سے اس بغاوت کا گلا گھونٹ دیا۔ عوام پر کھلم کھلا ظلم کئے گئے۔ گھروں کو بے دردی سے جلایا گیا۔ لاکھوں کو گرفتار
کیا گیا۔ عورتوں بوڑھوں کو اور بچوں تک کو قتل کر دیا گیا۔ اسکے باوجود تحریک ختم نہ ہو سکی۔ عوام کے دل کی لگن ختم نہ ہو سکی۔ اور ۱۹۱۱ء کا انقلاب
آیا۔ چینی قوم نے ایک مرتبہ پھر اپنی قسمت کو پلٹنے کی کوشش کر ہی لی۔
لیکن ڈاکٹر سن یات سین جس پالیسی کے ماتحت انقلاب لانا چاہتے تھے، وہ کامیاب نہیں ہو سکی۔ ان کے بنائے ہوئے اصول ان کے سامنے ہی
نظر انداز کر دیئے گئے۔ ان کا لایا ہوا انقلاب ان کے سامنے ہی ناکام ہو گیا — ان کی زندگی ہی میں "یوآن" نے دھوکے سے اپنی حکومت قائم کر لی۔ یہی
وہ ناکامی تھی جس کے متعلق انہوں نے لکھا تھا: "انقلاب کی تین منزلیں ہوتی ہیں۔

(۱) جدوجہد اور جنگ۔
(۲) انقلابی لیڈروں کے ہاتھوں میں تھوڑے دنوں حکومت کی باگ ڈور — اور پھر
(۳) عوام کے ہاتھوں میں طاقت۔

بدقسمتی سے چین میں یہ تمام چیزیں نہیں ہو سکیں۔ جس کی سزا ہم بھگت رہے ہیں۔"
اور جب سن یات سین کے بعد چیانگ کائی شیک ان کا جانشین ہوا یعنی ڈاکٹر سن کی جمہوریت کا مالک ہوا تو اس نے بے غیرتی اور بے حیائی کی انتہا کر
دی۔ اس نے غیر ملکی غلامی کو اپنے سر کا تاج سمجھا۔ اس نے امریکی ڈالروں کے آگے نیازمندانہ طور پر سر جھکا دیا۔ اور ان کے قدموں میں عقیدت کے پھول چڑھانے لگا
اس نے جان بوجھ کر غیروں کو اپنا گھر لوٹ لینے کی دعوت دی۔ یہی نہیں اس نے تو تمام ملک کی باگ ڈور ان مہاجنوں کے ہاتھ میں دے دی۔ اور ان جونکوں کو چین کا
خون چوسنے کی کھلی اجازت دے دی۔ انہوں نے بھی جہاں تک اس سے لوٹا جا سکتا تھا لوٹا۔ انہیں کیوں ہمدردی ہونے لگی تھی۔ ان کے لئے تو چیانگ کما آیا تھا۔ یہی تو
[illegible] لوٹتا تھا۔
چیانگ کی پالیسی کی وضاحت تو جب ہی ہو گئی تھی۔ جب اس نے کومنتانگ سے کمیونسٹوں کو علیحدہ کر دیا تھا اور روس سے دوستی کا معاہدہ توڑ ڈالا تھا
جاننے والے اسی وقت پہچان گئے تھے کہ چیانگ کس راستہ پر چل رہا ہے۔ اور وہ کیا چاہتا ہے۔ عوام نے بھی اس کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ چیانگ
وطن دوست نہیں بلکہ بڑا وطن دشمن اور ظالم شخص ہے۔
اور پھر اس کے عہد میں جو مصائب اور مشکلات کے پہاڑ چین پر ٹوٹ پڑے۔ ان سے بھی لوگ خوب واقف ہیں۔ غیر ملکی درآمد نے جو چینی صنعت
و تجارت پر کاری ضرب لگائی تھی۔ وہ بھی لوگ نہیں بھول سکتے ہیں۔ عام کساد بازاری، بھوک، قحط، جاپانی حملے اور اس کے ساتھ ساتھ حکومت کی [illegible]

یہ تمام چیزیں عوام کے سامنے تھیں۔ وہ اسے محسوس کر رہے تھے۔

اور ان سب سے زیادہ کومن تانگ کے ظالم فوجی تھے۔ جن کی زیادتیاں روز بروز بڑھتی ہی جا رہی تھیں۔

ڈاکٹر سن یات سین نے کومن تانگ کی بنیاد تین اصولوں پر رکھی تھی۔

(۱) من تسو چوئی — یعنی قومی خود مختاری۔

(۲) من چوان چوئی - یعنی جمہوریت۔

(۳) من شین چوئی۔ یعنی عوام کی معاشی تنظیم

لیکن یہ جماعت چیانگ کے ہاتھوں میں اپنی تمام باتوں کو بھول گئی۔ اس نے سن یات سین کی تعلیم کو بالکل فراموش کر دیا۔ اب وہ با اقتدار جماعت تھی، جو جو چاہتے کر سکتے تھے اور جو چاہتے دوسروں سے کرا سکتے تھے۔ غریبوں کی لوٹ کھسوٹ ان کا عام مشغلہ تھا۔ ویسے بھی وہ ہر چیز پر اپنا حق سمجھتے تھے کسی چیز کی ضرورت انہیں تکلیف نہیں دیتی تھی۔ وہ جب چاہتے اور جس سے چاہتے وہ چیز چھین سکتے تھے۔ عام طور پر ترقی پسند ادیبوں، طالب علموں اور شاعروں کے یہ لوگ سخت دشمن تھے۔ ان بے گناہوں کو گولی سے اڑانا ذلیل کرنا ان کے روزانہ پروگرام میں شامل تھا — لیکن جتنی زیادتیاں بڑھتیں۔ اتنی ہی عوام میں بیداری ابھرتی گئی۔ جس قدر ادھر سے عوام پر ظلم ہوتے تھے۔ عوام کے اندر اسی قدر بغاوت پھوٹتی تھی۔

"تاؤ ین شان" نے یہاں چینیوں کی خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سب سے پہلی اور سب سے بڑی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ چینی لوگوں میں قوت برداشت بہت زیادہ ہوتی ہے۔

لیکن برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ جب مسلسل کسی کو ستایا جائے تو آخر کسی وقت اسے بھی غصہ آ ہی جائیگا۔ اور جھنجھلا کر اس کا تدارک اس طرح کریگا جس سے یا تو اس ظلم کا ہی خاتمہ ہو جائیگا یا پھر وہ ظالم اسے بالکل ختم کر دے — اور چینی قوم تو پہلے ہی سے انقلابی تحریکوں میں حصہ لیتی چلی آئی ہے۔ اس کے لئے ظلم اور ناانصافی کے خلاف لڑنا کوئی نئی بات نہیں تھی۔

ان تمام باتوں نے مل جل کر ایک نئی تحریک کو جنم دیا۔ جس کا مقصد ظلم اور ناانصافی کا خاتمہ کر دینا تھا۔ چین سے تمام رجعت پسندوں کا صفایا کرنا اور ملک اور قوم کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرنا تھا۔

اس تحریک کی بنیاد تو اسی وقت پڑ چکی تھی۔ جب چیانگ نے کومن تانگ کو کمیونسٹوں سے پاک کیا تھا۔ لیکن جب کمیونسٹوں نے وسطی چین میں عوام کی مدد سے ۱۹۳۱ء میں ایک عوامی ریاست قائم کی تو اس وقت جوریریت چیانگ اور اس کے غلام کومن تانگ، کے فوجیوں نے عوام پر کی۔ اس نے اس تحریک کو اور بھی مضبوط بنا دیا۔ ان ظالموں نے نہایت بیدردی اور سفاکی سے عوام کے گھر بار لوٹ لئے ان کے کھانے پینے کی اشیا برباد کر دیں۔ انہیں انتہائی ذلیل کیا اور سینکڑوں عورتوں بچوں اور بوڑھوں کو وسطی چین سے "طویل سفر" کرنے پر مجبور کر دیا۔

لیکن عوام کے سینوں سے بھی لاوا ابل رہا تھا۔ انہوں نے اس وقت چیانگ کو اس کے برہنہ روپ میں دیکھا تھا۔ وہ مایوس نہیں تھے۔ بلکہ ان کے اندر استقلال اور ثابت قدمی اور پختہ ہو گئی تھی۔

- "ماؤ زے تنگ" نے اپنی ایک نظم میں اس "طویل سفر" کی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہا ہے۔

"سرخ فوج میں طویل سفر کی تکلیفوں سے کوئی خوف زدہ نہیں تھا۔

ہم ہزار چوٹیوں اور دس ہزار دریاؤں کو خاطر میں نہیں لائے۔

پانچ پہاڑ موجوں کی طرح اٹھے اور موجوں کی طرح غائب ہو گئے۔

ژو ولیانگ، کے پہاڑ ہماری نظروں میں مٹی کے سنگریزوں سے زیادہ نہیں تھے۔

جدوجہد میں چنگی اور کپڑے تہہ در تہہ کے ساتھ تھے ہوں اور انہیں شکست دے دینا آسان کام نہیں تھا ان کے پاس جذبہ تھا، جوش تھا اور سب سے بڑی بات تو یہ کہ ان کے اندر سچا خلوص تھا۔ وہ اپنے ملک و قوم کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اپنے وطن کو اس مصیبت سے نجات دلانا ہمارا فرض ہے۔ اور اپنے اس فرض کو فراموش کر دینا نہیں چاہتے تھے۔

حکومت کے ظلم و ستم کے باوجود ان کی تحریک روز بروز عظیم چین میں پھیلتی ہی چلی گئی۔ اس سرے سے اس سرے تک تمام لوگوں نے ان کی آواز پر لبیک کہا۔ عوام کے اندر احساس کی پاکیزگی، عزم کی پختگی اور کامیابی کا یقین پختہ سے پختہ تر ہوتے چلے گئے۔ اب وہ بڑی پامردی کے ساتھ حکومت سے ٹکر لینے کو تیار تھے۔

اور ۱۹۳۶ء میں نہایت دلیری سے انہوں نے چیانگ کائی شیک کو اغوا کر لیا۔ نازک گھڑی تھی لیکن حکومت نے ادھر تو ظلم و ستم کو کچھ روکا اور ادھر سمجھوتہ کی بات چیت کی۔ اور آخر کار چار شرطوں پر اسے چھوڑ دیا گیا وہ شرطیں یہ تھیں

(۱) جاپان کے خلاف جنگ کی جائے۔
(۲) خانہ جنگی روکی جائے۔
(۳) جاپانیوں کے مخالف سیاسی قیدیوں کو چھوڑا جائے۔
(۴) عوام کے شہری حقوق تسلیم کئے جائیں۔

کچھ دنوں۔ ــــ جب تک چیانگ کو اپنا اور اپنی حکومت کا فائدہ نظر آیا اس وقت تک تو سمجھوتہ قائم رہا۔ ۱۹۳۷ء میں دونوں نے مل کر جاپان کے خلاف جنگ کی۔ لیکن وقت ختم ہو جانے پر ــــ ۱۹۴۵ء کے بعد۔ چیانگ نے پھر وہی حرکت شروع کر دی۔ وہی ظلم و زیادتی اور غیر ملکی سامراجیوں کی لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہو گیا۔ وہی عوامی تحریک کو کچلنے کے منصوبے بنائے جانے لگے۔

آخر کار ۱۹۴۶ء میں کمیونسٹوں کو اپنی حکومت کا اعلان کرنا پڑا ــــ اور اس کے بعد سے عوامی تحریک نے ایک نیا روپ اختیار کر لیا اب چیانگ سے صلح و معاہدہ کی ضرورت کوئی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اب انہوں نے آگے ہی قدم بڑھانا شروع کر دیا تھا۔ وہ جس طرف بڑھتے۔ ان کے سامنے دریا اور پہاڑ اپنی شکست تسلیم کر لیتے۔ ان کے قدم جس سرزمین پر پڑتے اس جگہ بیل بوٹے درخت، کھیت، اونچے محل، نیچے جھونپڑے سب ان کے آگے سر جھکا دیتے۔ اور عوام تو بے چینی سے ان کا انتظار کرتے ہی رہتے تھے۔ ان کے دروازے عوامی فوج کے لئے ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ گو من تانگ کے فوجی ہزاروں کو گولی سے اڑاتے لاکھوں کو جیلوں میں ٹھونستے شکنجوں پر گھسیٹتے لیکن اس کے باوجود ان کی آنکھیں ہر وقت عوامی فوج کی راہ تکتی رہتی تھیں۔ ان کے کان ہر وقت خوشخبری سننے کے لئے باہر کی آواز پر لگے رہتے تھے۔ ان کے دل ایک طرف تو حکومت کے خوف سے کانپتے رہتے تھے دوسری طرف ان میں ہلکی سی خوشی کی لہر بھی دوڑتی رہتی تھی۔ ایک طرف تو ان کے دل اس ڈر سے دھڑکتے ہوتے تھے کہ کہیں گو من تانگ کے وحشی عوامی فوج کی مزاحمت نہ کریں۔ اور دوسری طرف ان کا یقین انہیں تسلی دیا کرتا تھا۔ جب وہ سنتے کہ عوامی فوج قریب آ گئی ہے۔ تو ان کی باچھیں کھل جاتیں۔ ان کے اندر ایک جوش پیدا ہو جاتا اور جیسے ہی ان کے کانوں میں آواز آتی کہ عوامی فوج آ گئی تو وہ بے چین ہو کر ان کے استقبال کے لئے دوڑ پڑتے۔

اسی طرح عوامی فوج، عوامی طاقت کے ساتھ آگے بڑھتی گئی۔ وہ مایوس ہونا نہیں جانتے تھے۔ انہیں اپنی طاقت ــــ عوام کی طاقت اور خلوص پر پورا اعتماد تھا۔ انہیں اپنی قوت کا اچھی طرح اندازہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ خلوص اور سچائی کے سامنے کوئی جھوٹی طاقت نہیں ٹھہر سکتی۔ اور وہ بڑھتے ہی چلے گئے۔ یہاں تک کہ ایک دن نانکنگ کی سڑکیں اور شنگھائی کی اونچی عمارتیں ان کا استقبال کرنے پر مجبور ہو گئیں۔

اب چاہے کتنے ہی چیانگ پیچ پر پیچ کیوں نہ خود کشی کریں۔ اب کیسی ہی ناکہ بندی کیوں نہ کر دی جائے۔ اب امریکہ کے منسٹر نئی حکومت تسلیم کریں یا نہ کریں۔ مگر چیانگ کے دو چار مہینے تو بہت دور ہیں۔ چند ماہ میں ہی سارا چین عوام کے ہاتھوں میں ہو گا۔ !!

" ماوزے تنگ " نے ایک مرتبہ کہا تھا۔ " نئی جمہوری تہذیب عوام کی تہذیب ہے۔ اسے محنت کش عوام مزدور، دہقان اور کسانوں کے لئے وقف ہونا چاہیئے۔ جو کہ کل قوم کا نوے فیصدی حصہ ہیں۔ اس لئے انہیں کی تہذیب اور انہیں کا کلچر نئی جمہوریت میں ہونا چاہیئے۔"

اور وہ لوگ جہاں بھی گئے۔ انہوں نے اسی قول پر عمل کیا۔ وہ عوام کے لئے لڑ رہے تھے۔ لہذا عوام کو فائدہ پہنچانا ان کا اولین فرض تھا جسے انہوں نے بڑی مستعدی کے ساتھ ادا کیا۔ اور عوام نے بھی اس کام میں ان کی انتہائی مدد کی۔

پی۔ ز راف نے " چین کے آزاد علاقوں کی تہذیبی ترقی " پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے: " چین کے آزاد علاقوں میں تعلیم اور کلچر کی زبردست ترقی ہوئی ہے۔ جمہوری حکومت اور کمیونسٹ پارٹی ان علاقوں میں بسنے والے عام لوگوں کی تعلیم پر خاص توجہ دے رہی ہے۔ شمالی چین کے شہروں اور گاؤں میں جہاں جہالت کا دور دورہ تھا۔ وہاں اب متعدد اسکول اور اعلیٰ تعلیمی ادارے قائم کئے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر شانسی، ہانسو وغیرہ علاقوں میں تین ہزار سے زیادہ اسکول قائم ہو چکے ہیں۔ صوبہ کیانگسی کے علاقوں میں پچھلے ۲ برس کے دوران میں ۲۲۰۰۰ ابتدائی اور ثانوی مدارس قائم ہوئے ہیں۔ ان میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کی تعداد ۲ لاکھ ۸۰ ہزار ہے۔ اس کے علاوہ ناخواندہ بالغوں کی تعلیم کے لئے ۲۴۰۰ کلاسیں کھولی گئی ہیں جن میں ایک لاکھ ۴۰ ہزار بالغ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ پرائمری اسکولوں میں بچوں کو مفت تعلیم دی جاتی ہے۔"

" سکول قائم کرنے اور تعلیم کو ترقی دینے کے لئے آزاد علاقوں کے کسان، مزدور جمہوری حکومت کو ہر طرح امداد بہم پہنچاتے ہیں۔ دیہات میں سکول کی رسم افتتاح پر بڑا جشن منایا جاتا ہے۔ مقامی حکام اور باشندے سکول کی ہر ضرورت پوری کرتے رہتے ہیں۔ مدرسین کے آرام کا بڑا خیال رکھا جاتا ہے۔ گاؤں کے سکول ماسٹر کو صاف مکان رہنے کو ملتا ہے۔ کھانے پینے کی اشیا مہیا کی جاتی ہیں۔ ایندھن دیا جاتا ہے۔ ایک قطعہ زمین بھی دیا جاتا ہے۔"

" چین کے آزاد علاقوں میں جمہوری حکومت اعلیٰ تعلیم پر بڑی توجہ کر رہی ہے۔ ینان میں ایک یونیورسٹی قائم کر دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ایک میڈیکل انسٹیٹیوٹ، فنون کی ایک اکیڈیمی، قدرتی سائنس کی ایک اکیڈیمی، اور انتظامی عملہ کی تربیت کے لئے بھی اکیڈیمی قائم کر دی گئی ہے۔ شانسی، چاہار، ہوپے کے آزاد علاقوں میں ایک مشترکہ یونیورسٹی قائم کی گئی ہے۔ دوسرے آزاد علاقوں میں متعدد اعلیٰ تعلیمی ادارے قائم کئے گئے ہیں۔ مثلاً شانتنگ یونیورسٹی، کیانگ سو یونیورسٹی، تنگ پی یونیورسٹی، ہائے شان آرٹس اکیڈیمی، فوجی و سیاسی اکیڈیمی، ایک صنعتی انسٹیٹیوٹ، ایک زراعتی انسٹیٹیوٹ وغیرہ ۔۔۔ ۱۹۴۶ء میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے لڑکوں کی تعداد تقریباً بیس ہزار تھی۔"

آگے چل کر رسالوں اور اخباروں کی اشاعت کے متعلق وہ لکھتا ہے۔ " آزاد چین کے علاقوں میں بہت سے رسائل اور اخبارات شائع ہوتے ہیں جن کی اشاعت بھی کافی وسیع ہے۔ مشہور اخبار " زنفا گرزی پاؤ " جس میں تقریباً ۱۱۰۰ نامہ نگار ہیں۔ ینان سے شائع ہوتا ہے ۔۔ اخبار " ہوآن شانگ پاؤ " کے بیان کے بموجب ۱۹۴۶ء میں آزاد چینی علاقوں سے ایک سو مختلف اخبارات شائع ہوئے ہیں جن میں " ریچ شو " ( علم ) با تصویر رسالہ " تنگ پی ہوا پاؤ " شمالی مشرقی علاقہ کا ادبی رسالہ " تنگ پی دین پی " ۔ چین من ان یوئی " ( عوامی موسیقی ) قابل ذکر ہیں۔ تمام چینی اخبارات جدید چینی حروف تہجی استعمال کرتے ہیں جو چینی محنت کش عوام باآسانی سمجھ لیتے ہیں ۔۔۔۔۔ آزاد علاقوں میں جمہوری تہذیب اور تعلیم کی ترقی نئے چین کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔"

یہ تو تعلیمی اعتبار سے چیزوں کی ترقی تھی۔ لیکن اس کے علاوہ بھی مختلف طریقوں سے ان تمام چیزوں کو ترقی دی جا رہی ہے۔ مختلف کارخانوں اور صنعتی اداروں میں آپس میں مقابلہ کے کام کرائے جاتے ہیں جن میں کامیاب ہونے والوں کو تمغے اور " قائد محنت " کے خطاب دیئے جاتے ہیں۔ ان کے اعزاز میں جلسے کئے جاتے ہیں۔ انہیں سپاسنامے پیش کئے جاتے ہیں ۔۔ یوم مئی ویسے موقعوں پر بھی خطابوں سے سرفراز کیا جاتا ہے۔ محنت کی تعریف کا پروگرام بنایا جاتا ہے۔ " مرد و مزدور کو زندہ کرو " کے نعرے لکھے جاتے ہیں۔ رسالے اور اخبار " تحریک محنت نمبر " نکالتے ہیں جن میں کامیاب مزدوروں کے بڑے بڑے فوٹو شائع کئے جاتے ہیں ۔۔۔ اسی طرح آزاد چین نے اتنی جلدی صنعتی ترقی کی کہ وہ لوگ جو ناامید تھے ۔ حیران رہ گئے ہیں

[illegible] ہوئی۔ سب سے پہلے تو زمینداروں اور جاگیرداروں سے زمین چھین کر کسانوں میں تقسیم کر دی گئی۔ انہیں بتایا گیا ہے کہ یہ سب تمہارا ہی ہے۔ تم اس پر جتنی محنت کرو گے اتنا ہی پھل پاؤ گے۔ عوام نے بھی اس کو محسوس کیا اور انہوں نے کڑی محنت کر کے زمین سے سونا اُگلوا لیا۔ آئندہ [illegible] زندگی نہ [illegible] کھیتوں سے لہلہانے لگا۔ بنجر زمین کا کہیں نام و نشان ہی نہیں رہا۔ کسانوں کو محنت مزدوری کرنا پڑتی تھی۔ مگر وہ اس کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں، سب اپنی بھلائی کر رہے ہیں۔ جتنا کمائیں گے۔ اتنا کھائیں گے۔ اور یہی ترقی کا راستہ تھا۔

آج آزاد چین کی نئی زندگی نے ہر چیز کو نیا روپ دے دیا ہے۔ آج وہاں ہر اس ترقی پسند چیز کو جسے پہلے بُرا تصور کیا جاتا تھا اچھا کہا جاتا ہے۔ تعلیم چین میں محنت ایک "ذلیل پیشہ" خیال کی جاتی تھی۔ امیر لوگ تو اپنے بچوں کو صرف تعلیم یافتہ بنانا ہی کافی سمجھتے تھے۔ ان کے یہاں تو محنت نام کا کوئی شے ہی نہیں تھی۔ اور غریب لوگ بھی تعلیم کا تصور تو نہیں کر سکتے تھے لیکن محنت کو وہ بھی بُرا سمجھتے تھے۔ ان کی بھی آرزو ہوتی تھی۔ کہ ان کے بچے بھی پڑھ لکھ کر افسر بن جائیں اور اس ذلیل پیشے سے نجات پا جائیں۔

لیکن اب آزاد چین ایسے لوگوں کو جنم دے رہا ہے۔ عوام میں ایسا تخیل پیدا کر رہا ہے۔ جس سے تمام رجعت پسندانہ خیالات کا قلع قمع ہو جائے اور ایک نئی زندگی، نیا سماج، نیا ماحول، نیا نظریہ پیدا ہو جس سے صرف چین ہی میں نہیں۔ تمام دنیا میں اور خاص کر تمام مشرق میں نئی زندگی کی لہر دوڑ جائے۔

جاپانیوں کی شکست اور منچوریا کی آزادی کی دوسری سالگرہ پر ہاربن میں ایک نمائش ہوئی تھی۔ اس موقع پر ایک بہت بھاری جلوس "ڈیموکریٹک یوتھ لیگ" کے نوجوان مرد اور عورتوں نے نکالا تھا۔ یہ جلوس ٹولیاں بنا کر چل رہا تھا۔ سب سے پہلی ٹولی میں عوامی فوج کا ایک سپاہی اپنی رائفل لئے، ایک مزدور ہاتھ میں ہتھوڑا لئے، اور ایک کسان ہاتھوں میں درانتی کا نشان لئے مارچ کر رہے تھے۔ ان تینوں کی بغل میں ایک ایک کتاب تھی — وہ نئے چین کے زندہ نمونے تھے — وہ چین جو امریکی ڈالروں اور چیانگ کائی شیک کی غلامی سے آزاد ہو گیا ہے۔ جس کا نعرہ ہے: "جنگ، محنت اور تعلیم!"

لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ نیا چین اس عالم کی جد و جہد میں بھی نمایاں حصہ لے رہا ہے۔ اور چین میں اس قسم کی ایک مستقل تنظیم قائم کئے جانے کی تجاویز کی گئی ہے — [illegible] کانگریس میں چینی نمائندوں نے اس قسم کی ایک تجویز پیش کی تھی جس میں کہا گیا ہے کہ چین کی تمام عوامی جماعتوں کے منتخب نمائندے اس طرح کی تنظیم قائم کرنے میں پہل کر رہے ہیں۔

اور — چینی نمائندوں نے عہد کیا تھا کہ وہ تازہ جوش و خروش کے ساتھ چین میں مکمل انقلاب برپا کرنے کی جد و جہد کریں گے اور چین کو زراعتی ملک سے صنعتی ملک میں تبدیل کر دیں گے تاکہ وہ جلد سے جلد کمیونزم کے راستے پر گامزن ہو جائے۔"

یہ حقیقت ہے کہ آج کا چین ساری دنیا کے پسے اور کراہتے ہوئے غریب مزدوروں اور کسانوں کے لئے نویدِ مسرت بنتا جا رہا ہے۔ اور وہ دن دور نہیں، جب چین کا کسان مزدور انقلاب دنیا کے بے کس اور بے بس عوام کی اندھی آنکھوں کو روشنی بخشے گا!! — زندہ باد نیا چین!!!

(بقیہ صفحہ نمبر ۳۴)

کر رہا ہوں۔ اور پھر ایسے فن کو کھا رہا ہونگا سطحی طور پر سوچنے والے کہہ سکتے ہیں۔ کہ اب فلاں ادیب لکھنے کے حق میں کامل ہو گیا ہے۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ اس فن میں کبھی کوئی کامل نہیں ہوا۔ اور نہ ہی ممکن ہے کہ کوئی اچھے سے اچھا لکھنے والا، اس سے بھی بہتر لکھ سکتا ہو۔ اسے یقین ہے۔ کہ خود اس نے محنت اور استقلال سے کامیابی حاصل کی ہے۔ اور ہر چیز کو رد کر دیا ہے۔ جو اسے اپنے معیار سے کم نظر آتی ہے۔

وہ کہتا ہے۔ لکھنا ایک آزمائشی مقابلہ ہے۔ جس میں ہم اپنی محنت کے علاوہ کسی بھی سفارش پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ معمولی سے معمولی درجے کا ادیب بھی نوبل انعام یافتہ ادیب ہوتا ہے۔ "ترقی پسند" ادیب، "انقلابی" ادیب غرضیکہ وہ صرف "ادیب" ہوتا ہے اور اس کا وسیع میدان میں اُسے اپنے جوہر دکھانے ہوتے ہیں۔ امتحان ایک معیاری مقابلہ ہے۔ ہاں کہیں کہیں ماحول ذرا تبدیل ہو جاتا ہے۔ مگر امتحان کہیں نہیں ہوتا۔ چھوٹے چھوٹے معمولی حادثے کچھ بھی اہمیت نہیں رکھتے۔ ہر شخص کو اپنا سر توڑ کوشش کرنا ہوتی ہے۔ اگر وہ کوشش کر سکتا ہے۔ تو کامیاب ہوگا۔ اگر نہیں تو پھر اُسے لکھنا چھوڑ دینا چاہیئے۔ اپنا کرا ہوا ساتھ نہیں، مواقع اچھے نہیں ملے، فضول ہے۔ یا تو کوئی شخص ادیب بن سکتا ہے یا نہیں بن سکتا۔ صرف یہی دو صورتیں ممکن ہیں۔

ایک مطالعہ

ریاض جاوید

# شفیق الرحمٰن

ہمارے افسانہ نگاروں میں اکثریت اُن نوجوانوں کی ہے۔ جن کا ادبی شعور زیادہ تر مریضانہ قسم کی رومان پسندی کا مرہونِ منت ہے۔ اور وہ اپنی ذات کی محدود دنیا کی اور نہایت فرسودہ نظریات پر اپنے فن ابھارنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے اکثر ادیب شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے طبقے کی ترجمانی کرتے ہیں۔ لیکن اُن کی اس ترجمانی کا انداز غلط اور گمراہ کن ہوتا ہے۔

شفیق الرحمٰن کے افسانے پڑھ کر کچھ ایسا ہی تاثر انسان پر ہوتا ہے —— انکے ہر افسانے میں "ہیرو" اور ماحول میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ شفیق الرحمٰن کا مثالی ہیرو، ہماری فلموں کے روایتی ہیرو کی طرح، خوبرو، طویل قامت، خوش پوشاک اور خوش گفتار ہوتا ہے۔ اور اونچے متوسط طبقہ کی تعلیم یافتہ لڑکیوں سے عشق لڑانا اس کا مشغلہ ہے۔ لڑکیوں کو متوجہ کرنے کے لئے شفیق کا ہیرو کبھی تکہ بازی میں اوّل نظر آتا ہے۔ کبھی تیراکی میں نمایاں درجہ حاصل کرتا ہے اور کرکٹ تو انکے نزدیک "عشق بازی" سے بھی اہم ہے۔

شفیق الرحمٰن کے افسانے پڑھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔ کہ کم سے کم ہمارے ادب میں ایک ایسا افسانہ نگار تو ہے۔ جس کے نزدیک زندگی کرکٹ کی گیند۔ اور حسین لڑکی کے درمیان لڑھکتی رہتی ہے۔ اور اسے دیگر مسائل سے کوئی سروکار نہیں۔ بظاہر افسانہ نگار کا یہ نظریہ کافی صحت مند معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس طرح زندگی کے مصائب اور الجھنوں سے تھکے ہارے اذہان پل بھر کیلئے "تفریح" حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن ایک عامیانہ فلم کی طرح یہ افسانے تفریح کے ساتھ ساتھ ایک اور الجھن بھی پیدا کرتے ہیں کہ آخر بیسویں صدی میں شہزادوں اور پریوں کے نام اور ماحول بدل کر ایسے بے سرو پا قصے لکھنے کا کیا مطلب ہے؟ اس کے لئے ہمیں افسانہ نگار کے ماحول اور طبقے کا تجزیہ کرنا پڑیگا۔ کیونکہ کوئی ادیب اپنے خارجی اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اور نہ اپنے طبقے کی حدود سے باہر نکل سکتا ہے۔ اس لیے وہ اپنے معاشی طبقے کی ترجمانی غیر شعوری طور پر کرتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے جو چیز ہمارے مشاہدے میں آتی ہے۔ وہ اونچے متوسط طبقہ کا نظریہ ادب ہے۔ چونکہ شفیق صاحب اس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ طبقہ ادب کو تفریح کا ایک ذریعہ سمجھتا ہے —— اس لئے ان کے تمام افسانے اپنے طبقے کے ذہنی رجحانات کو پوری دیانتداری سے پیش کرتے ہیں۔

یہ طبقہ جب اپنے ماحول کی یکسانیت سے اُکتا کر تنوع پیدا کرنا چاہتا ہے۔ تو اپنی توجہ کسی اور طرف مبذول کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر شام کو کوئی [illegible]، یا کوئی پارٹی یا کسی کھیل کے مقابلے کا پروگرام نہ ہوا۔ یا اُس وقت جنسی رجحانات کی تسکین کا بھی کوئی سامان نہ ہوا۔ تو پھر وہ کتابوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور اس طرح وہ اپنے فالتو اوقات ادب کی "سرپرستی" میں گذارتا ہے۔ لہذا اس طبقہ کے لئے لطیف ہی ادب کی ضرورت ہے جو کم از کم اس کے روحانی جذبات ہیں، جو زندگی کی غلط اقدار اور معاشی غلامی کے سبب [illegible] کے نیچے دبے ہوتے ہیں۔ [illegible] ذرا سا تغیر پیدا کر دے اور بس —— یہ تنوع یہ ذہنی حرکت جنسی بھی نہیں ہونی چاہیئے۔ کیونکہ جنس کے معاملہ میں وہ اتنا بھوکا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی بھوک صرف جذباتِ لطیف تک محدود ہے۔ جو اونچے متوسط طبقہ میں روز بروز عنقا ہو رہے ہیں لہذا ایسے ادب میں "تفریح" کا جزو بھی کافی مقدار میں شامل ہونا چاہیئے۔ کیونکہ حکمران طبقے کے مقابلے میں یہ طبقہ جس احساس کمتری کا شکار ہے اسے وقتی طور پر [illegible] ختم کیا جاسکے۔

سرمایہ پرست ہوتے ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ہمیں ان کی زندگی میں کوئی نظریۂ حیات یا زندگی کا واضح مفہوم نہیں ملتا — تضاد ہے [illegible] ہر حرکت ان کے ذہن کی ہر افتاد اور ان کی تنظیم کے ہر پہلو میں مکمل تضاد موجود ہے ——— اس لئے جن کا نظریۂ حیات مبہم اور فرسودہ روایتی اقتصادی [illegible] ہو۔ وہ ادب میں کیونکر صحت مند نظریہ پیش کر سکتے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد اس طبقے کی اہمیت میں کافی اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ طبقہ حکمران طبقے میں مدغم ہو رہا ہے۔ لہٰذا [illegible] ادب پر [illegible] اور ہمارے متوسط طبقہ کے ادیب جو ذہنی طور پر حکمران طبقے کی ثقافتی اقتدار کو جزو حیات کا درجہ دیتے ہیں۔ وہ آج [illegible] ایسے ادب کی حمایت کرتے ہیں جس کا کوئی واضح اصول نہ ہو۔ بلکہ جس میں حقیقت کا شائبہ تک نہ ہو۔ وہ حقیقت جو اس ناجائز طبقاتی تقسیم کو ختم کرنے کے درپے ہو۔ بلکہ ایسے ادب میں رومانی افسانے مصر ہیں۔ جس میں [illegible] جنسی [illegible] شامل ہو جسے ہم الف لیلہ کا بیسویں صدی کا اڈیشن ہی کہہ سکیں۔

اس طبقے کے ادیب ہیں امتیاز علی۔ امتیاز علی تاج۔ شفیق الرحمٰن۔ ایم اسلم۔ رئیس احمد جعفری۔ [illegible] حجازی ہیں۔
اور اس گروہ میں محمد حسن عسکری۔ ممتاز شیریں، جاوید اقبال کا اضافہ ہوا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ان ادیبوں کی اکثریت ترقی پسند تحریک کی دشمن تھی۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد ان کو حکومت کی مصلحت کوشی کی آڑ مل گئی ہے اور وہ اب اجتماعی زندگی کی ترقی و بہبود کو حکومت کی ذمہ داری کہہ کر ادب کو مبہم تصورات کا آئینہ بردار بنانا چاہتے ہیں۔

جب تک غیر ملکی حکومت تھی۔ تو یہ اونچا طبقہ متوسط معاشی لحاظ سے ترقی پسند تحریک کا اتنا دشمن اور خلاف نہ تھا۔ کیونکہ ملک کی اجتماعی زندگی کے ارتقائی عمل میں انہیں ہمارا ساتھ دینا تھا اور چونکہ آج یہ اپنی منزل مقصود پر پہنچ چکا ہے اور ہمیں تو منزل کچھ دور ہی نظر آتی ہے۔ اس لئے اب مخالفت محض ادبی قسم کی نہیں۔ بلکہ بوسیدہ اور جدید۔ نئے اور پرانے طریقۂ زندگی میں ایک کشمکش کا [illegible] رہا ہے۔

اور اس کشمکش میں رجعت پسند ادیبوں کی پشت پناہی حکومت کر رہی ہے اور ترقی پسند ادیبوں کو اپنے صالح مقاصد اور بے پناہ قوت حیات پر یقین کامل ہے۔ اور اس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ کہ فتح ترقی کی ہوگی۔ زندگی برابر بڑھتی رہے گی۔ رجعت پسند ادیب ماضی کے انہی فرسودہ اوراق میں مدغم ہو جائیں گے۔ جہاں ان سے پہلے ہزاروں ادیب اور فن کار ختم ہو چکے ہیں۔

لیکن اب اپنے معاشی طبقے کی ذہنیت سے مجبور، یہ کوئی ایسی تحریک پسند نہیں کرتے۔ جس میں حقیقت ہو یا جس میں ہماری اجتماعی زندگی کے تاریک پہلوؤں پر روشنی پڑ سکے۔ اور یہ کوئی ایسی تحریر بھی پسند نہیں کریں گے۔ جس میں طبقاتی تقسیم کو غلط اور غیر منصفانہ ثابت کیا گیا ہو۔ زندگی کا مسئلہ کوئی جذباتی یا ذہنی نہیں۔ بلکہ ماضی اور مستقبل کی جنگ ہے۔ جس میں وہ تمام نظریات جن پر موجودہ سماج کی بنیاد کھڑی ہے۔ اور خصوصاً یہ طبقاتی تقسیم جس کو یہ حکمران اور اس سے ملحق سرمایہ پرست طبقہ اجتماعی زندگی کا منطقی عمل سمجھتے ہیں۔ اور اس کے جواز میں قوم، تمدن اور مذہب کے نظریات پیش کرتے ہیں۔ اور تمام مادی مسائل کی بنیاد روح یا روحانیات پر رکھتے ہیں۔ اگر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جائے کہ یہ مذہب کی روایات اور نظریات کا بیجا [illegible] اور اپنے مادی مقاصد کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ تو زندگی کے علمبرداروں کو ملک و قوم کا دشمن قرار دیا جاتا ہے۔ اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب بھی فرسودہ روایات اور زندگی کی غلط اقدار کے خلاف آواز اٹھائی گئی۔ تو حکمرانوں نے ایسی ہی الزام تراشی سے کام لیا ——— مسلمانوں کی یہ تاریخ ہی [illegible] حقیقت اپنی تمام تلخی کے ساتھ عیاں ہوتی ہے۔ کہ بغداد میں خلافتوں کے زمانہ میں "ترقی پسند" شاعر کے خلاف حکمرانوں کی جد و جہد [illegible] ترقی پسند مسلمان نے خلیفہ وقت کے استبداد اور آمریت کے خلاف آواز اٹھائی۔ "کافر" کا فتویٰ دے کر اس کا سر اتار دیا گیا۔ آج بھی حکمران طبقے کے اس قسم کے رویہ سے ترقی اور فلاح کے علمبردار کیسے گھبرا سکتے ہیں۔ وہ اپنا تاریخی کردار پورا کر رہے ہیں اور ہم اپنا ———

ہمارا حکمران طبقہ جس قسم کے ادب کی تخلیق چاہتا ہے۔ اس کی مثال شفیق الرحمٰن کے افسانے پیش کرتے ہیں۔ ان افسانوں کا کوئی کردار حقیقت کا حامل نہیں۔ بلکہ ایک ہی محور پر گھومتا نظر آتا ہے۔ اور اس کے علاوہ ایک اور مفید اور کارآمد حربہ زبردستی کا مزاح ہے۔ ایسے مزاح کے [illegible]

میں طلب ہے محض اپنی تسکین حاصل کرنے کی کوشش —— وہ تسکین جس کا منبع انسانی فطرت کی مسرت نہیں۔ بلکہ تو صرف یہ زور دیکر سب اپنے کی کوشش ہے۔ ان کے نزدیک منبع قوتِ فیصلہ یا دل ہی کا دوسرا نام مزاج ہے۔ اسی قسم کا فلسفہ ہمیں "سماج" یا ہیں "عشق ہے" اور "شیطان" میں ملتا ہے۔
اس مکتبِ فکر کا تصورِ حیات شفیق الرحمٰن کی زبانی سنیئے!

> "دراصل یہ دنیا نہ تو غمکدہ ہے۔ اور نہ راحت کدہ نہ یہاں رنج بٹتے
> ہیں اور نہ خوشیاں تقسیم ہوتی ہیں۔ نہ یہ ایک عذاب ہے۔ اور نہ دلکش سپنا
> یہ تو ایک خلا ہے۔ ایک وسیع خلا —— جس میں بجائے خود زندگی کا نام و نشان
> تک نہیں —— یہاں ہمارا دل نور کا منبع ہے۔ اسی کی جلا سے ہماری روح
> روشن ہے۔ اسی سے ہماری آنکھوں میں یہ تر و تازگی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے۔
> جب تک یہ شمع جلتی رہتی ہے۔ ساری دنیا منور اور مسرور نظر آتی ہے۔ یہ چاند سورج
> ستارے سب ہماری اپنی روشنی سے نظر آتے ہیں۔ اور جس روز یہ شمع بجھ جائے گی
> تو چاروں طرف ظلمت ہی ظلمت چھا جاتی ہے۔ اور کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ تب قدرت کا
> یہ کھیل کس قدر بے معنی اور بے رنگ و بو لگتا ہے۔ اور دل کے نور کے ساتھ روح کی
> جولانی اور آنکھوں کی شگفتگی بھی ختم ہو جاتی ہے —— "

مد و جزر ۔ صفحہ ۱۹۶

یہ ہے وہ تصورِ حیات جس کی مبہم کیفیات پر یہ ادب اور فن کا قصرِ عظیم کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ انتہائی درجہ کی خود غرضی اور خود پسندی جسے انسانیت کے ہمہ گیر اصولوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ اپنے "دل" کو اس دنیا اور زندگی کا محور اور منبع بنانا تاریخ کا وہ سب سے بڑا فریب، دھوکہ اور جھوٹ ہے۔ جو انسان کو کبھی بیڑیاں اور کبھی طوق بنا کر پہنچاتا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ اٹھائیے۔ آپ پر پوری طرح واضح ہو جائے گا۔ کہ یہ دل یا روح کو دنیا ماننے والوں نے اپنی نسلوں کو ایک ایسی ذہنی غلامی سونپی۔ جو بیک وقت روحانی اور جسمانی تھی۔ اور موجودہ زمانہ میں یہ فلسفہ حیات ایک طرف سرمایہ دار حکمران کے استحصال کرتا ہے۔ اور دوسری طرف محنت کش کو قرونِ وسطیٰ کی غلامی پر قناعت کرنے کو کہتا ہے۔

شفیق الرحمٰن، جو اس سرمایہ پرست طبقہ کے نمائندہ ہیں۔ اور جو اپنے آپ کو ایک ہشاش بشاش بلکہ خوش باش ادیب کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔ وہ غیر شعوری طور پر وہ رجعت پسند فلسفہ پیش کرتے ہیں۔ جس کی رو سے حقیقت کو ہمیشہ واہمہ سمجھا گیا اور کوئی حقیقت پسند اور معقول ذہن جھٹلا نہیں سکتا کہ ایک خود سے دنیا ترقی پسند زندہ رہتی ہے۔ ایک فرد یا ذرہ اس دنیا کا جزو تو ہے۔ لیکن یہ دنیا جو ہر گیر زندگی اس روز میں افراد سے بیک وقت آزاد بھی ہے اور خود مختار بھی —— یہ انسان سے بڑھ کر تعداد افراد کے اجتماع کا نام زندگی ہے۔ اور اس اجتماع جو کبھی قبیلہ کبھی گروہ کبھی جماعت اور کبھی قوم یا پھر ملک بن گیا۔ انسان کے عروج کے مختلف مدارج ہیں۔ فرد —— اس اجتماع کے بغیر کچھ بھی نہیں —— اور اس اجتماع کی مسلسل کوششوں سے موجودہ تمدن اور تہذیب کا ظہور ہوا۔ انسان کو اس اجتماع اور اس اتحاد کے لئے اس کی مادی ضرورتیں مجبور کرتی ہیں۔ اور تاریخ کا یہی سب سے بڑا سبق ہے۔ اور یہی سب سے اہم اور بنیادی فلسفہ ہے —— اس کے برعکس انسان کی اس برادری کی اہمیت یا اسکے محرک کو فراموش کر کے روح یا وجدان کو زندگی کا منبع سمجھنا رجعت پسندی بلکہ فریب ہے۔ اور آج اس رجعت پسند فلسفہ یا اس قسم کے وجدانی نظریات کو اصول اور مقصدِ حیات تصور کرنے والے اس اجتماع کی ترقی میں سد راہ ہیں۔ وہ دوسرے الفاظ میں عوام کی اہمیت سے روگردانی کر رہے ہیں۔

چنانچہ آج کا ادیب شعوری یا غیر شعوری طور پر زندگی کے اس اہم مسئلے پر اظہار خیال کر رہا ہے۔ اور ادب میں زندگی کے ان دو متضاد فلسفوں

احمد ندیم قاسمی

# غزل

افق نہاں ہے تو حدِ نظر کا ذکر کریں  ستارے ڈوب رہے ہیں سحر کا ذکر کریں

فضا کا ذکر کریں، بحر و بر کا ذکر کریں  بہت بلند ہے فردوس، گھر کا ذکر کریں

صدف کو سامنے پا کر گہر کا ذکر کریں  نظر کے ساتھ ہی ذوقِ نظر کا ذکر کریں

خزاں کو بوئے گل و نسترن سے چھلکا دیں  اگر بہار نہیں، برگ و بر کا ذکر کریں

بہاؤ تیز ہے ـــ ساحل تو جھلملاتا ہے  سفر دراز ہے ـــ عزمِ سفر کا ذکر کریں

ہمیں تو عظمتِ انساں کو آزمانا ہے  حضورِ فلسفۂ خیر و شر کا ذکر کریں

فرار کا یہ نیا روپ ہے، اگر ہم لوگ  چراغ توڑ کے نورِ قمر کا ذکر کریں

ستارے کون چنے گا بدستِ شبنم آلود  چلو غبارِ سرِ رہگذر کا ذکر کریں

اگر نہایتِ بے چارگی ہے چارہ گری  تو کیوں امید پہ زخمِ جگر کا ذکر کریں

تمام عمر کئے چاک ہی سلے گئے  بطرزِ بخیہ گری، بخیہ گر کا ذکر کریں

مرے ندیم! با مرہی ذات کو سمجھو تو آپ
مرے کلام کے نقص و اثر کا ذکر کریں

غلام ربانی تاباں

# غزل

اشک وہی جو تارا بن کر پلکوں پر تھرّاتا ہے
درد وہی جو میٹھے میٹھے گیتوں میں ڈھل جاتا ہے

رنگِ حیا میں ڈوبے عارض پر یوں زلفیں بکھری ہیں
شام کی گہری چھاؤں میں جیسے کوئی کنول کھل جاتا ہے

کتنی مدت گزری اُن سے ربطِ تمنا ٹوٹ چکا
سامنے اب بھی آتے ہیں جب دھک سے جی ہو جاتا ہے

میں تو اک آوارہ شاعر ہوش و خرد سے بیگانہ
کوئی اہلِ ہوش و خرد پھر میرے منہ کیوں آتا ہے

خونِ انجم میں جب شامل خونِ تمنا ہوتا ہے
صبح کا رنگیں دامن جیسے رنگیں تر ہو جاتا ہے

تنہائی کی راتوں میں میں اکثر سوچا کرتا ہوں
پھولوں کا رومانی موسم ایسے میں کیوں آتا ہے

ایک وہ لمحہ جس نے تاباںؔ زیست کا دھارا موڑ دیا
میٹھے میٹھے سپنے بن کر نظروں میں لہراتا ہے

طفیل

# غزل

طلسمِ ظلمت کے ٹوٹنے سے تجلیوں نے افق کو گھیرا
ہماری شامِ الم کا لیکن نہ آج تک ہو سکا سویرا

طلوعِ خورشید کی چمک سے نہ چھٹ سکے ظلمتوں کے بادل
گرز نے آکر فضا کے دامن پہ چاند تاروں کا خون بکھیرا

کہاں ہیں وہ سامنے تو آئیں جو کہہ رہے تھے سحر ہوئی ہے
محیطِ عالم کی وسعتوں پہ وہی دھندلکے وہی اندھیرا

وہی تامل وہی تغافل وہی تعیش، وہی تساہل
ہوائے عالم کا رخ بدل کر مری سیاست نے رخ نہ پھیرا

سحر کی خاطر نہ جانے کتنے حسین تاروں کا خون ہوا ہے
وہی حوادث وہی مصائب فلک کی گردش نے رخ نہ پھیرا

چمن کا ماحول جل رہا ہے فضائے گلشن سلگ رہی ہے
شجر شجر بجلیوں کا مسکن کہاں کریں جا کے ہم بسیرا

چمن چمن کی روش روش پر خزاں نہ ہو کس طرح مسلط
ہر اک محافظ شریف ڈاکو ہر اک محافظ حسین لٹیرا

بجھی بجھی کائنات کیوں ہے گھٹی گھٹی سی حیات کیوں ہے
قصور کس کا قصور اپنا۔ قصور تیرا قصور میرا

زبانِ تنقید کو نہ خاموش کر سکے گی ستم شعاری
غلط سیاست کو بزمِ ہستی سے کوچ کرنا پڑے گا ڈیرا

نقاب اوڑھے ہوئے خضر کا نہ رہزنی کر سکیں گے رہبر
ہم اپنے ہاتھوں میں لے کے اٹھے ہیں عدل و انصاف کا پھریرا

احمد ظفر

# دو غزلیں

یہ بیاباں کہاں وہ گلستاں کہاں یہ خزائیں کہاں وہ بہاریں کہاں
تیری قربت کے لمحے گزر تو گئے تیری فرقت کے لمحے گزاریں کہاں

دل کے صحرا میں طوفان سے آ گئے زندگی پر بگولے سے لہرا گئے!!
کوئی ہمدم نہیں کوئی مونس نہیں کوئی ہو بھی تو اس کو پکاریں کہاں

ہر طرف مکر نے جال پھیلا دیئے ہر نظر پر ہوسناکیاں چھا گئیں
سوچتے ہیں فلک سے زمیں پر جنہیں ہم اتاریں تو آخر اتاریں کہاں

مانتا ہوں کہ آغازِ گل بار ہے اپنے انجام کو بھی ظفرؔ سوچ لو
زندگی کا چمن ہے خزاں آشنا زندگی کے چمن میں بہاریں کہاں

سلطان مسرور

وقت منزل بہ منزل بڑھے جا رہا ہے مگر تو ابھی تک پرستارِ اوہام ہے
اس تری کم نگاہی نے تجھ کو ڈبو دیا بھٹکا رہا زندگی گردشِ جام ہے

ان سیہ گیسوؤں کی گھنی تیرگی سے گریزاں رہو چاہتے ہو اگر زندگی
یہ اندھیرا اندھیرا نہیں نیند ہے اور پھر نیند بھی موت کا دوسرا نام ہے

کوئی تازہ مضمون ہم پہ کیا چل سکے گا کہ اس صبحِ نو کی حقیقت عیاں ہو چکی
جس کا آغاز تھا اک فریبِ تبسم مگر خون میں لتھڑا ہوا رسنے جام ہے

آسمانوں کا دل پھر بھی ہے اس کو زمانہ سمجھتا ہے اک کم نمائیگی
مصلحت ہے جو چپ ہے مگر قلبِ ذرات میں انتقامات کا ایک کہرام ہے

ساتھیو اپنی منزل کی جانب تڑپتی بجلیوں کی طرح آج سے تم لپکتے رہو!
کامیابی تو مسعود ہونے کو ہے کچھ دنوں کا ہی مہمان اب دورِ آلام ہے

## ابراہیم جلیس

# مائونٹ بیٹن

درزی رحمان خاں شہر کے خوش پوش لڑکوں اور کالج کے لڑکوں اور لڑکیوں میں بہت مشہور تھا۔ نئی نئی وضع کے سوٹ، شلوار، قمیص، بش شرٹ [illegible] سارے لدھیانے میں اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اپنے کام میں بڑا محنتی، مشاق اور ایماندار آدمی تھا۔ اکثر لڑکوں کا تو وہ ناپ بھی نہیں لیتا تھا بہت سوں کے ناپ تو اسے ازبر یاد تھے۔ ایک چلتی ہوئی نگاہ گاہک پر ڈالی اور اپنے ہونٹ سیکڑ کر ناپ لکھوانے لگا۔ [illegible] - سینہ ۳۴ - کمر ۲۹ شلوار ۴۰ کالر ۱۴ ........

پچھلے پہل جب اس نے لدھیانے میں درزی کا کام شروع کیا تو شہر کے پرانے ٹیلر ماسٹروں نے اسے جیسے یہ کام چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا لیکن وہ تھا اپنی دھن کا پکا۔ ایک دن چپ چاپ بمبئی چلا گیا۔ وہاں بمبئی میں پالونڈ کے سلیمان چیمبرس کے گراؤنڈ فلور پر اسی کے شہر کے چند درزی بڑی آسانی سے اپنا کاروبار چلاتے تھے۔ رحمان ان کے ہاں نوکر ہو گیا۔ اور بڑی محنت سے کام سیکھنے لگا۔ بمبئی تو فیشن کا شہر ہے۔ روز روز نئے فیشن کے کپڑے سلنے آتے تھے۔ رحمان نے اپنی رات دن کی محنت سے ایسا کام سیکھا کہ اس ٹیلرنگ فرم کا مالک حیران رہ گیا اور پھر ماہ بماہ اس کی تنخواہ بڑھانے لگا۔ تنخواہ کے علاوہ منافع میں بھی اسے حصہ ملنے لگا۔ جب رحمان کے پاس ایک سال کے عرصے میں گیارہ سو روپے جمع ہو گئے تو ایک دن اس کا جی چاہا کہ لدھیانے کا ذرا ایک چکر لگا آئے۔ یونہی تفریحاً۔ اپنے ماں باپ، رشتہ داروں اور یار دوستوں پہ رعب پڑ جائیگا۔ کہ بمبئی جا کر رحمان ٹھاٹھ سیٹھ بن گیا ہے۔ اور یہاں بھی وطن چھوڑے ایک سال گزر گیا تھا۔

لدھیانہ پہنچ کر اسے لدھیانہ بمبئی سے بھی زیادہ اچھا، بمبئی سے بھی زیادہ خوبصورت معلوم ہوا۔ حالانکہ وہ بچپن سے لدھیانے میں رہتا آیا تھا۔ لدھیانے اور بمبئی کا آخر کیا مقابلہ۔ لدھیانہ وطن ہونے کے باوجود اسے پسند نہ تھا۔ جہاں وہ ایک غریب ماں باپ کے چھوٹے سے گھر میں پیدا ہوا، جہاں تنگی اور مصیبت کی زندگی گزارتا رہا۔ تاآنکہ درزی کا کام سیکھنے کے باوجود بھوکوں مرتا رہا۔ اسی لئے اسے لدھیانے سے نفرت ہو گئی تھی اور اسی لئے وہ بمبئی بھاگ گیا تھا۔

مگر اب بمبئی سے آنے کے بعد لدھیانہ یک بیک اسے بڑا پیارا شہر محسوس ہوا ——— اس کے اس احساس میں جذبہ حب الوطنی کو نام کا بھی دخل نہیں تھا۔ بلکہ یہ ان گیارہ سو روپوں کا اعجاز تھا جس نے برسوں کے تلخ تجربے کو باطل کر کے لدھیانے کی گلی گلی کو خوبصورت بنا دیا تھا۔ دنیا کی اس زمین پر کوئی جگہ بذات خود نہ خوبصورت ہے اور نہ بے ڈھنگی ——— یہ صرف روپے کی کرامت ہے۔ اگر جیب میں روپے ہوں تو لدھیانے کی اجاڑ سب تحصیل جگراؤں بھی خوبصورت ہے۔ اگر جیب میں روپے نہ ہوں تو بمبئی بھی ایک قبرستان ہے۔

لدھیانہ پہنچ کر چار پانچ دن تک تو وہ ریل کے چار دن لمبے سفر اور ایک سالہ شب و روز مشقت کی تھکن اتارتا رہا۔ ابھی پندرہ سولہ دن باقی تھے۔ کیونکہ اس نے اپنے مالک سے وعدہ کیا تھا کہ وہ بیس پچیس تک بمبئی واپس چلا جائیگا۔ وہ دن بھر اپنے پرانے یار دوستوں کے ساتھ چوڑا بازار، جیل روڈ، ویک فیلڈ گنج، سول لائنز، محلہ [illegible] اور جانے کہاں کہاں آوارہ گھومتا پھرتا۔ اور دوپہر ہی سے دوستوں سے پوچھنے

کھا کر آج ریگل تھیٹر میں کون سی فلم لگی ہے اور نو لکھا تھیٹر میں کونسی فلم ——
مگر بمبئی کی انگریزی فلموں کی طرح یہاں فلم جلدی جلدی نہیں بدلتے تھے۔
کئی کئی شاذ و نادر پر بہار ہفتے چلنے والے فلم —— ریگل تھیٹر میں
فلم رتن رکے بائیسویں پر بہار ہفتے میں رحمان چار شو مسلسل دیکھ آیا۔ بمبئی
میں بھی وہ یہ فلم دوبارہ دیکھ چکا تھا۔ نو لکھا تھیٹر میں من کی جیت لگی ہوئی
تھی۔ مگر اس کے خیال کے مطابق وہ سالی پکچر بالکل بکواس تھی۔ پھر بھی اس نے
دوبارہ مزید اس پکچر کو دیکھ کر ڈالا۔ شام کو بالعموم وہ نو لکھا تھیٹر کے قریب
اقبال ہوٹل میں گھنٹوں بیٹھا رہتا تھا۔ مگر اس بے کام کی کاہل زندگی سے
جلد ہی تھک گیا تھا۔ ویسے اس کی ہر جگہ بڑی آؤ بھگت ہوتی تھی۔ دوست
احباب اس کے گرد ہمیشہ گھیرے رہتے تھے۔ کیونکہ وہ بمبئی سے سیٹھ بنکر
آیا تھا۔ چائے، پان، سینما، ناٹک کے علاوہ وہ مستقل تیمی سگریٹ بھی
پینے لگا تھا۔ اس کا سخت گیر باپ جو رحمان کے بمبئی جانے سے پہلے اس
سے ہمیشہ ناراض رہتا۔ اس پر ہمیشہ غصہ آتا رہتا تھا۔ اب اس پر بڑا مہربان
ہو گیا تھا۔ شام کے وقت گھر کے آگے چارپائی پر بیٹھے حقہ پیتے ہوئے
وہ اپنے دوستوں میں رحمان کی بڑی تعریفیں کرتا تھا۔ اور رات گئے تک
رحمان کے انتظار میں گھر کا بڑا دروازہ کھلا رکھتا کہ —— نوجوان
لڑکا ہے۔ تھیٹر و تھیٹر دیکھتا ہے۔ دیر ہو ہی جاتی ہے —— حالانکہ
پہلے اسی نوجوان لڑکے پر دس بجے رات کے بعد دروازہ صبح تک کے
لئے بند کر دیا جاتا اور صبح اس پر گالیاں اور جوتے برستے۔

گیارہ سو روپے ——— دراصل محبت اور روپے کا
آپس میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ ہر لڑکے کا حقی باپ یا ہر باپ کا کماؤ لڑکا
بالعموم بہت زیادہ چہیتا ہوتا ہے۔

رحمان نے اپنے باپ یا ماں کی محبت پر کبھی شک نہیں کیا۔ ماں
باپ کے بڑھاپے میں لڑکے کو کماؤ ہونا ہی چاہیئے۔ آخری وقت میں
ان کی خدمت کرنی ہی چاہیئے۔ صرف گیارہ سو روپے کیا چیز ہیں
گیارہ کروڑ، گیارہ ارب روپے بھی ماں باپ پر سے نچھاور کر دیئے
جائیں تو بھی کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ مگر اس کے گیارہ سو روپوں نے
ایک اور مسئلہ پیدا کر دیا تھا۔ اس کی ماں کے لئے ایک آخری کام رہ
گیا تھا —— یعنی بہو کی تلاش —— یعنی مرنے سے پہلے بیٹے کے
سر سہرا دیکھنے کی بہت پرانی بہت ہی عام خواہش —— جیسے ماں
کی زندگی صرف بیٹے یا بیٹی کی شادی کی خاطر ہی محدود ہوتی ہو، جیسے اولاد کی
شادی اس ملک میں ماں کی موت ہوتی ہو۔

چنانچہ رحمان کی ماں بھی مرنا چاہتی تھی۔ یعنی اپنے بیٹے کو دولہا تا دیکھنا
چاہتی تھی۔ اسی لئے وہ دن بھر برقعہ اوڑھے محلے کے گھر گھر لڑکیاں دیکھتی
پھرتی رہی۔ اور گھر گھر میں رحمان کے گیارہ سو روپوں کا تذکرہ بڑے فخر
سے کرتی رہی۔ گویا شادی کے لئے لڑکے کی اولیں خصوصیت اس کی
نوجوانی، اس کی شکل صورت، اس کا جسم اور اس کا کردار نہیں بلکہ روپیہ
ہے —— لیکن

چوڑا بازار کے کئی گھروں میں رحمان خان ہیرو بن گیا، وہ سو روپیہ بات
چیت کا موضوع بن گیا۔ اور گھروں کی کنواریاں چھپ چھپ کر ایک دوسرے
سے رحمان خان کے بارے میں تفصیلات معلوم کرنے لگیں کہ وہ کون
ہے۔ وہ کیسا ہے۔ رحمان خان خود ابھی شادی وادی کی جھنجھٹ میں
نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ لیکن بمبئی سے واپس آنے کے بعد اس کی ماں کی
ممتا میں بے حد شدت پیدا ہو گئی تھی۔ اور بمبئی میں وہاں کی شہوت انگیز
تہذیب میں اس کی پانچ سالہ ورزش کی بندش کئی بار ٹوٹ گئی تھی۔ اب
نئے اور نشہ آگیں چسکے کے بعد عمر کا چوبیسواں ورزنی سال سنبھالے
نہیں سنبھل رہا تھا۔ اس لئے اس نے سوچا کہ چلو بھی —— شادی کر
ہی ڈالو۔ آخر کس پری کے انتظار میں کب تک بیٹھا رہوں۔

ادھر ماں نے دار خوشی محمد کی لڑکی زینب سے اس کی بات پکی ہو
گئی۔ اُدھر رحمان کو سچ مچ ایک پری نظر آگئی۔ وہ پری اسکے دوست
محمد شفیع زرگر کی بہن تھی۔ اس دن حادثہ یہ ہوا تھا کہ رحمان محمد شفیع
سے ملنے اسکے گھر گیا۔ جیسے ہی اس کے دروازے پر پہنچا۔ دیکھا
ایک لڑکی، ایک بہت ہی سرخ و سپید لڑکی دروازے میں کھڑی ایک
بساطی سے دوپٹوں کی ململ خرید رہی ہے۔ رحمان کو دیکھ کر فوراً اس
نے دروازہ بند کر لیا۔ رحمان اسکے اور ململ کے دوپٹے کے درمیان
اس وقت حائل نہ ہونا چاہتا تھا۔ اس لئے شفیع کو آواز دیئے بغیر
آگے گزر گیا۔ مگر اسے ہر دم ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے اب وہ خواہ
مخواہ آگے جا رہا ہے۔ منزل پیچھے ہی چھوٹ گئی ہے ....

بڑی دیر تک اور اُس کے ہوٹل میں بیٹھ کر وہ اس برقِ تجلی کے بارے میں
سوچتا رہا۔ جو اُس کے دل کے طور پر ابھی ابھی گری تھی ۔

قمیص
ہری شلوار
ہلکے پیلے رنگ کا دوپٹہ
لمبا گداز جسم
چمکیلی لال اور لس ملائی سپیدی سے تراشا ہوا چہرہ

ایک لمحہ کیلئے چمکتا ——— دروازے بند ہو جاتے ——— جگمگاتا ۔ پھر
دروازے بند ہو جاتے ۔ بڑی دیر تک رحمان بھی دیکھتا رہا ۔ حتیٰ کہ اس کی
جانے ٹھنڈی ہو گئی ۔ رحمان کے دل میں پھر ایک بار اور دیکھنے ———
نظر بھر کر ، جی بھر کر دیکھنے کی شدید تمنا پیدا ہوئی ۔ یہ دیکھنا بھی بھلا کوئی
دیکھنا ہوا ۔ دیکھا بھی اور نہیں بھی دیکھا ۔ یہ تو بجلی کا ایک کوندا تھا ۔ یہ تو
ایک قوسِ قزح تھی ۔ یہ تو ٹوٹتے تارے کی منور لکیر تھی ۔ جو یوں چمکی اور
یوں چھپ گئی ۔ رحمان نے ارادہ کر لیا کہ وہ بہرصورت کسی نہ کسی طرح
اس لڑکی کو ایک بار اور دیکھے گا ۔ ضرور دیکھے گا ۔ اچھی طرح دیکھے گا ۔
اور جب تک نہیں دیکھے گا بمبئی بھی نہیں جائیگا ۔

پھر وہ روز روز شفیع کے گھر جانے لگا ۔ اس عرصے میں اسے
لڑکی کے بارے میں تھوڑی بہت تفصیلات بھی معلوم ہو گئیں ۔ لڑکی کا
نام معلوم ہو گیا تھا ۔

"ریشماں"

جیسی وہ خود تھی ۔ نام بھی ویسا ہی تھا ۔ ریشماں ، ریشمیں لڑکی
نام معلوم ہونے کے بعد ریشماں اسے اور بھی اچھی معلوم ہونے لگی ۔
اسے دیکھنے کی خواہش اور زیادہ بڑھ گئی ۔ اس خواہش کی ہر لمحہ دل میں
پرورش کرتے کرتے رحمان کبھی کبھی یہ محسوس کرنے لگا ۔ جیسے اسی خواہش
کے بطن سے ریشماں کے لئے اسکے دل میں گویا محبت بھی پیدا ہو چکی ہے
اور پھر اس پر طرفہ یہ کہ اس کا نام ریشماں تھا لیکن فوری طور پر اسے
دیکھنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی ۔ ٹھیٹ مسلمان لڑکی ، کٹر مسلمان گھرانے
کی پردہ دار لڑکی ۔

بیس مارچ بھی آ گئی ۔ اسے بمبئی جانا تھا ۔ مگر اس نے اپنے مالک

کو ایک کارڈ لکھ دیا کہ ——— دیگر احوال یہ ہے ۔ کہ ابھی آٹھ
روز تک بمبئی نہیں آ سکتا ۔ یہاں پر کچھ مانگی کام لاحق ہو گئے ہیں ۔ اگر آپ
مجھے اور آٹھ دن کی چھٹی دے دیں تو بڑی مہربانی ہو گی ۔ فقط آپ کا تابعدار
محمد رحمان خان ——— اور پھر آٹھ دن بھی گزر گئے
لیکن رحمان کا انتظار اور اس کی ریاضت بیکار رہ گئی ۔ فوکس تھیٹر
میں مسلمان عورتوں کے لئے کوئی عبرت انگیز درس آموز اصلاحی فلم لگی
ہوئی تھی ۔ دن کا شو تھا ۔ شفیع اپنی ماں اور بہن کو تھیٹر تک پہنچانے
جا رہا تھا کہ راستے میں رحمان مل گیا ۔ رحمان کو دیکھ کر شفیع نے "خود"
ہی کہہ دیا ۔

" یار رحمان ، کدھر جا رہا ہے ۔ اگر تو دس منٹ
یہیں میرا انتظار کر لے ۔ تو میں ابھی واپس آتا ہوں "

رحمان نے کہا ۔

" چل میں بھی وہاں تک ساتھ ہی چلتا ہوں ۔ یہاں
اکیلا کب تک کھڑا رہونگا "

فوکس تھیٹر کے پاس عورتوں کی بڑی بھیڑ لگی ہوئی تھی ۔ عورتوں
کی بھیڑ میں داخل ہو کر شفیع کی ماں اور ریشماں نے برقعوں کے نقاب
الٹ ڈالے تھے ۔ اور کچھ ایسا منظر تھا ۔ جیسے سورج ڈوبا ہو اور چاند
طلوع ہوا ہے یا چاند ڈوبا ہے سورج طلوع ہوا ہے ۔ ریشماں اس
سے بالکل بے خبر تھی کہ کوئی کھڑا اسے گھور رہا ہے ۔ اپنی نظروں میں
بھرتا جا رہا ہے ۔ معاً رحمان کو شفیع کا خیال آیا ۔ اس نے فوراً جیب سے
پیسے نکال کر کہا ۔

" یار ذرا اس دوکان سے ایک قینچی کا پاکٹ تو
لے ——— میں ذرا اس لڑکی کو دیکھوں "

رحمان نے ایک دوسری ہی لڑکی کی طرف اشارہ کر دیا ۔ شفیع رحمان
کا بڑا بے تکلف بڑا گہرا دوست تھا ۔ اس لئے ہنستا ہوا قینچی کا پیکٹ
لینے چلا گیا ۔ رحمان گھورتا رہا ۔

کالے کالے برقعے کے ہالے میں سرخی مائل
سفید چمکیلا چہرہ بڑی بڑی کالی آنکھیں جن کے کناروں
میں سرمے کی لکیریں تنی ہوئی تھیں ۔ سپید چمک دار

سیپوں جیسے دیدے۔
کشمیری سیبوں جیسے گال۔
وہ گلاب کی پتیوں جیسے ہونٹ۔
ایسی لڑکی جس پر پہلی نظر پڑتے ہی دل میں فوراً اسے اغوا کرنے کا خیال پیدا ہو۔

اس کے بعد شفیع آ گیا۔ اور رحمان کو مجبوراً لوٹنا پڑا۔ راستے بھر شفیع بہت سی باتیں کرتا رہا۔ مگر رحمان نے کسی بات کا جواب نہیں دیا چپ چاپ چلتا رہا۔ اس کی اس چپ سے تنگ آکر شفیع نے اس سے پوچھا۔

"کیوں یار ——— کیا وہ لڑکی بہت پسند آ گئی ہے کہ بس تو اپنے آپ ہی میں کھو گیا ہے۔ واہ یار — !"

رحمان کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ رحمان کا جی چاہا کہ وہ اس سے صاف صاف کہہ دے کہ وہ لڑکی وہ نہیں ہے۔ جس کی طرف اس نے اشارہ کیا تھا۔ بلکہ وہ لڑکی تو خود اس کی بہن ہے۔ مگر اپنی اس خواہش کو کسی اگلے مناسب وقت کے لئے ٹال کر رحمان نے اسے چائے پینے کی دعوت دے دی۔

رات بھر رحمان نوکھا تھیٹر کے احاطے میں کھڑا رہا۔ اور رات بھر ریشماں نقاب اُلٹے جلوہ ریز، جلوہ فگن کھڑی رہی۔ رحمان نے کہا۔ ریشماں فلم ختم ہونے دیر ہو گئی۔ اب گھر جاؤ۔ ریشماں نے شرما کر مسکرا کر پوچھا ——— کیا تمہارا گھر اور میرا گھر الگ الگ ہے —؟ اوہ میں تو بھول ہی گئی —— اچھا تو پھر تم مجھے میرے گھر پہنچا دو —— رحمان دوڑا دوڑا تانگے لینے گیا۔ واپس آیا تو ریشماں نہیں تھی۔

.... رات بھر ریشماں اسکے ساتھ آنکھ مچولی سی کھیلتی رہی۔

دوسرے دن اس نے اپنی ماں سے کہہ دیا کہ وہ تھانے دار خوشی محمد کی لاڈلی زینب سے ہرگز شادی نہیں کریگا۔ ماں بڑی ناراض ہوئی کہ اب کیا ہو سکتا ہے۔ بات چیت تو طے ہو گئی ہے۔ دونوں طرف کی بدنامی ہوگی یہ تو بڑی بُری بات ہے بیٹا — لیکن اب رحمان بحث پر وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا کہ کونسی بات اچھی ہے اور کونسی بات بُری ہے۔ اسے تو صرف ریشماں اچھی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے اپنی ماں کو مجبور کیا کہ وہ محمد شفیع رنگریز کے گھر جائے اور ریشماں کی ماں سے ملے، ریشماں سے ملے۔ ریشماں سے شادی کی بات کرے ریشماں سے کسی طرح شادی کرا دے۔ ریشماں۔ صرف ریشماں۔

ماں کچھ دیر سوچتی رہی۔ ماں پھر محمد شفیع رنگریز کے گھر گئی رحمان دوستوں کو گھر ہی پر سے ٹالتا رہا۔ ماں کی واپسی کا بڑی بے چینی سے انتظار کرتا رہا۔ ماں دو گھنٹے بعد ——— نہیں دو سال بعد واپس آئی۔ رحمان دوڑ کر ماں سے لپٹ گیا۔ اسکے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور پوچھا۔

"بات پکی ہو گئی نا ماں —— تو کتنی اچھی ہے ماں۔ ماں ماں"
مگر ماں نے کہا۔

"ارے کم بخت۔ سچ پوچھو تو آنا ہی نہ دے بات کہاں پکی ہوتی ہے۔ اور کیسے ہو سکتی ہے!؟"

رحمان کا دل ڈوب گیا۔ اس نے اس کے دونوں ہاتھ چھوڑ دیئے اور تیز تیز سانس میں پوچھا۔

"کیوں —— ؟"
ماں نے کہا۔

"اس کی تو اس کے چچیرے بھائی لطیف خاں سے منگنی بھی ہو چکی ہے۔ اور اگلے سال ربیع الاول میں شادی بھی ہونے والی ہے۔"

رحمان کو غصہ آ گیا اور وہ بولا۔

"نہیں ماں۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ اس کی منگنی کیسے ہو سکتی ہے۔! ریشماں سے صرف میں شادی کروں گا۔ میں لطیف خاں کو جان سے مار ڈالونگا؟"

ماں نے حیرت، خوف اور غصے سے ملی جلی نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔

"کیا پاگل ہو گیا ہے تو —— کیسی باتیں کر رہا ہے؟

نکالو وصیا پڑ گیا اور اس کے پیروں کے پاس بیٹھ کر گڑگڑانے لگا۔

"ماں ——— کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔ ریشماں سے میں شادی کرونگا۔ ورنہ میں مر جاؤنگا۔ کوئی ترکیب نکال میری اچھی ماں۔ مجھے زندہ اور خوش دیکھنا چاہتی ہے تو تجھے کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑیگا۔ اچھا خیر ——— میں خود ہی شفیع کے پاس جاتا ہوں"

رحمان نے جلدی جلدی کپڑے بدلے اور گھر سے نکل گیا۔ شفیع گھر پر ہی مل گیا۔ اس نے شفیع سے کہا کہ وہ اس سے بہت ضروری باتیں کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے ذرا اس کے ساتھ باہر تک چلے۔ پھر وہ اور شفیع اقبال ہوٹل گئے۔ رحمان نے شفیع کی خوب خاطر تواضع کی۔ کیک پیسٹری، کریم رولس، سموسے، چائے۔ گولڈ فلیک ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر بولا۔

"یار شفیع۔ ایسی بات ہے کہ میری زندگی کا سوال ہے تو میرا بچپن کا دوست ہے۔ تجھ سے میری کوئی بات چھپی نہیں ہے۔ مگر میں نے ایک بات تجھ سے ہمیشہ چھپائے رکھی ہے، اور اب اسے بھی بتانے پر مجبور ہوں مگر ڈرتا ہوں کہ تو کہیں ناراض نہ ہو جائے؟"

شفیع نے گولڈ فلیک کا ایک لمبا کش کھینچ کر اور گولڈ فلیک کے پیکٹ پر ہی انگلیاں رکھ کر بولا۔

"یار۔ زبان سے تو کچھ بول۔ ایسی کونسی بات ہوگی کہ میں تجھ سے ناراض ہو جاؤنگا؟"

رحمان نے کہا۔

نہیں پہلے تو خدا کی قسم کھا کہ تو ناراض نہیں ہوگا؟"

شفیع نے کہا ———

"یار قسم وسم کیا۔ پہلے کچھ بتا تو سہی"

رحمان نے اصرار کیا۔

"نہیں تو پہلے قسم کھا۔"

شفیع نے کہا۔

"اچھا بابا ——— خدا کی قسم ناراض نہیں ہونگا۔ لے اب بول۔"

رحمان نے شفیع کو ایک بار اور یاد دلانا چاہا۔

"دیکھ تو نے قسم کھائی ہے۔"

شفیع نے کہا۔

"ہاں یار یاد ہے۔ جانے آج تجھے کیا ہو گیا ہے"

رحمان نے کہا۔

"یہی بات تو ہے یار کہ نہ جانے مجھے کیا ہو گیا ہے خیر اب تو نے قسم کھا کر وعدہ کیا ہے تو اب سن لے کہ میں ریشماں سے محبت کرتا ہوں میں ریشماں سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں ریشماں کے بغیر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

شفیع نے غضبناک ہو کر کہا۔

"رحمان ——— !!"

رحمان بولتے بولتے رک گیا۔ ایک لمحے کے لئے شفیع کے سرخ دہکتے ہوئے چہرے کو دیکھا اور بولا۔

"تو ناراض ہو گیا نا آخر ——— مجھے معلوم تھا کہ تو ناراض ہو جائیگا مگر تو نے قسم کھائی تھی ——— شفیع میرے بھائی مجھے معاف کر دے۔ میں بہت مجبور ہو گیا تھا۔ میں تیرا دوست ہوں۔ اسی لئے تیرے پاس بھیک مانگنے آیا تھا۔ محبت ——— محبت کوئی بری بات تو نہیں ہے شفیع۔!"

شفیع کا غصہ کچھ کم ہو گیا تھا۔ وہ سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لینے لگا تھا

"رحمان ——— یہ صحیح ہے کہ تیری بات سن کر مجھے بہت غصہ آیا تھا۔ مگر خیر تو بھی مجبور ہے۔ اور میں بھی مجبور ہوں تجھے شائد نہیں معلوم کہ ریشماں کی منگنی ہو چکی ہے۔ میرے چچا زاد بھائی لطیف خاں سے اگلے سال ربیع الاول میں اس کا عقد ہے اب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

رات بھر رحمان کے کان میں شفیع یہی کہتا رہا۔ کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ رحمان نے ارادہ کر لیا کہ وہ آخر وقت تک ہمت

نہیں مارے گا۔ وہ بمبئی نہیں جاسکے گا یہیں ایک ٹیلرنگ فرم کھولے گا اور خوب کمائے گا محبت نہیں تو کم از کم پیسے کے زور سے ضرور ریشماں کو جیت لیگا آدمی محبت کرے تو کیا نہیں ہوتا محبت ہو تو آدمی دنیا جیت لیتا ہے ایک عورت کی بات ہی کیا ہے آخر۔

دو تین روز کی دوڑ دھوپ کے بعد ویک فیلڈ گنج میں رحمان نے کرائے پر ایک دوکان لے لی۔ اقساط پر دو سیونگ مشینیں خرید لیں۔ سائن بورڈ آرٹسٹ منجھی سے ایک بورڈ پینٹ کرالیا۔

ام رحمان خاں
ممبئی فیم شیلرا ینڈ اوٹ فٹر
ویک فیلڈ گنج لدھیانہ

چند ہی دنوں میں اس کا کام زوروں پر چل نکلا۔ رحمان خاں شہر کے خوش پوش لوگوں اور کالج کے لڑکوں اور لڑکیوں میں بہت مشہور ہو گیا۔ نئی نئی وضع کے سوٹ، مردانی، زنانی شلواریں، مردانی زنانی قمیصیں۔ لیڈیز گرم کوٹ، جیکٹ، بش شرٹ، فراکیں وغیرہ سینے میں سارے لدھیانے میں اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اپنے کام میں بڑا محنتی، بڑا مشاق اور ایماندار آدمی تھا۔ وعدے کا بڑا پابند تھا۔ اسی لئے دن بدن اس کے دوکان میں گاہکوں کی بھیڑ بڑھتی گئی۔ گورنمنٹ کالج کے سارے لڑکے اور لڑکیاں اُسی سے اپنے کپڑے سلوانے لگے آمدنی بڑھنے لگی۔ اس نے تین ملازم اور رکھے۔ ہر گاہک سے بڑے اخلاق سے بڑی خندہ پیشانی سے پیش آتا۔ کئی بڑے بڑے امیر گاہکوں سے تو اس کی جیسے دوستی ہو گئی تھی۔ اکثر لوگوں کا تو وہ ناپ بھی نہیں لیتا تھا۔ بہت سوں کے ناپ تو اسے ازبر یاد تھے۔ ایک چلتی ہوئی نگاہ گاہک پر ڈالی اور اپنے جونیر کو ناپ لکھوانے لگا۔ لکھو بھئی۔ سینہ ۳۴، کمر ۲۹، شولڈر ۲۵ کالر ۱۳ ۔۔۔۔۔۔

رحمان کو ماہانہ تین چار سو روپے کی آمدنی ہونے لگی۔ دوسرے

درزی اور اس کے یار دوست اس کو بڑی رشک و حسد کی نظروں سے دیکھنے لگے۔ وہ دیکھنے میں درزی معلوم ہی نہیں ہوتا تھا۔ اچھے سوٹ بوٹ پہنتا تھا۔ اتوار کو جب اس کی دوکان بند ہوتی وہ بہترین قیمتی سوٹ پہن کر ادھر اُدھر گھوما کرتا۔ سینما دیکھتا۔ اگر شفیع کہیں مل جاتا تو بس وہ اپنے بٹوے کا منہ کھول دیتا۔ ویسے اس نے شفیع پر دوبارہ کبھی یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ ریشماں سے شادی کرنے کے ارادے پر ابھی تک قائم ہے۔ البتہ شفیع کی خاطر تواضع سے اس کا صاف مقصد یہی تھا۔ کہ اس کی کمائی اور ٹھاٹ باٹ کا شفیع کے گھر خوب چرچا ہو جائے ـــــ ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی اس نے کسی نہ کسی طرح شفیع کی ماں اور خود ریشماں تک پہنچا دی تھی۔ کہ وہ ریشماں کو نہ صرف چاہتا ہے۔ بلکہ اس سے شادی بھی کرنا چاہتا ہے۔ یہ بات لطیف خاں کو بھی معلوم ہوئی تھی۔ اور بُری معلوم ہوئی تھی۔ لطیف خاں بیچارا میونسپل کارپوریشن میں ایک تھرڈ گریڈ کلرک تھا۔ پڑھا لکھا بابو ہونے کے باعث جسمانی اعتبار سے رحمان خاں سے کمزور تھا۔ اور لڑائی جھگڑے کو تہذیباً سخت ناپسند کرتا تھا۔ اسی لئے رحمان کو دیکھ کر وہ خون کے گھونٹ پی کر چپ ہو رہتا۔ ویسے وہ رحمان کی طرف سے بالکل مطمئن تھا۔ کیونکہ اس ملک میں منگنی توڑنا آسان کام نہیں ہے۔

ریشماں ـــــ ریشماں بھی کبھی کبھی رحمان کے بارے میں سوچا کرتی تھی۔ دو تین بار جب رحمان شفیع سے ملنے گھر آیا ہو تو ریشماں نے چوری چھپے دروازے کی درازوں سے جھانک کر دیکھا۔ پہلی بار اس نے دیکھا تو وہ اسے اچھا معلوم ہوا۔ دوسری تیسری بار دیکھا۔ تو رحمان اسے پسند آ گیا۔

ایک بار تو وہ رات گئے تک اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ بات یہ ہوئی تھی۔ کہ رمضان کی عید تھی۔ شفیع نے اپنے، اپنی ماں اور ریشماں کے کپڑے رحمان ہی کو سلنے دیئے تھے۔ ریشماں کے کپڑوں کے لئے شفیع نے حسب حیثیت معمولی سوتی چھینٹ کا کپڑا خریدا تھا ـــــ مگر جب کپڑے سل کر آئے۔ تو ریشماں نے جب دیکھا کہ معمولی سوتی چھینٹ نہیں ہے۔ بلکہ اور بھی چمکیلے رنگ کے ولایتی

سم کی قمیص اور شلوار سل کر آئی ہے۔ ریشماں نے واپس کرنا چاہا۔ تو رحمان نے کہا سمجھا کہ میرے پاس سے وہ کپڑا کہیں کھو گیا ہے۔ یہ کپڑا میرے پاس فالتو رکھا تھا اسی لئے اسی کے کپڑے سی دیئے ہیں۔ اس جواب سے شفیع چپ ہو گیا۔ اور رحمان نے دل ہی دل میں اس سے کہا۔

"احمق ——— ریشماں کو ریشم ہی پہننا چاہیئے

ایسے ملائم جسم پر تو سوتی چھینٹ چبھتی رہتی ہے"

ریشماں اس رات دیر تک رحمان کے سوتی چھینٹ کھو دینے اور ریشمیں قمیص اور شلوار سی دینے پر، ایسی غلطی پر، ایسی بھول پر، حیران ہوتی رہی۔ سوچتی رہی۔ اور ایک دو بار جانے کیا سوچ کر کچھ شرما بھی گئی۔

اس واقعے کے بعد سے رحمان ریشماں سے کچھ کچھ قریب رہنے لگا۔ شفیع کا تو وہ دوست تھا ہی۔ شفیع کی ماں بھی کبھی کبھار کہہ دیتی کہ شفیع کے دوستوں میں اگر کوئی دوست ہے تو بس رحمان ہے۔ بڑا ہمدرد ٹائپ . . . . کبھی کبھی رحمان شفیع کے گھر دیر تک بیٹھے رہنے کے بعد کھانا بھی وہیں کھا لیتا تھا۔ اب شفیع کی ماں دروازے کی اوٹ سے گھریلو معاملات پر اس سے صلاح مشورہ اور باتیں بھی کرنے لگی تھی

ایک دن شفیع ایک بڑی مصیبت میں پھنس گیا۔ محلہ بوباحٹ کے ایک گوہر لال دین سے کسی بات پر اس کا جھگڑا ہو گیا۔ اور ایسا بڑھا کہ شفیع نے اس گوہر کو زیر مرمت سڑک کے پتھروں پر دے مارا جس سے اس گوہر کے سر میں، پیٹھ میں اور کہنیوں میں زخم آ گئے۔ پولیس نے ضرب شدید میں شفیع کا چالان کر دیا۔ اور حوالات میں بند کر دیا۔ شفیع کی ماں روتی چلاتی رحمان کے پاس گئی اور رحمان نے دو سو روپوں کی نقد ضمانت دینے کے علاوہ پولیس والوں کی مٹھی بھی گرم کی۔ اور شفیع کو چھڑا لایا۔

شفیع کی ماں نے رحمان کو دل کھول کر دعائیں دیں۔ شفیع نے خود اس کے اس احسان کو عمر بھر نہ بھلانے کا وعدہ کیا اور ریشماں ——— ریشماں اپنی آنکھوں پر پلکیں ڈھانپ کر رحمان کو بہت قریب، بہت نزدیک سے دیکھتی رہی۔ اور قریب، بہت نزدیک ہو گئی۔

ایک دن جب شفیع گھر نہیں تھا۔ رحمان یہ جان کر بھی کہ شفیع گھر نہیں ہے۔ شفیع کے گھر گیا دوپہر کا وقت تھا۔ اس دن اتفاق سے شفیع کی ماں بھی کہیں اڑوس پڑوس میں گئی ہوئی تھی۔ گھر پر سوائے ریشماں کے اور کوئی نہ تھا۔ رحمان کے دل میں بھی سوائے ریشماں کے اور کوئی نہ تھا

تھا۔ اس نے بڑی ہمت کر کے رحمان نے ریشماں سے باتیں کیں۔ باتیں کرتے کرتے اسے پتہ چلا کہ ریشماں بھی اس سے باتیں کرنا چاہتی ہے۔ ریشماں کو بھی اس میں کچھ دلچسپی ہے۔

پھر اس کے بعد رحمان کو ایسے ہی دو تین سنہری موقعے ملے۔ اور یہ معلوم کر کے اس کی خوشی بے اندازہ ہو گئی کہ ریشماں بھی اس سے محبت کرتی ہے۔ اس کی محبت اور اس کی ریاضت بالآخر پھل پھول لے ہی آئی۔ ریشماں بھی تو ایک پھل تھی ——— میٹھا میٹھا پھل۔ ریشماں ریشماں بھی تو ایک پھول تھی۔ رنگین اور مہکتا پھول ——— !

اب اس پھول کے پاس صرف ایک ہی کانٹا رہ گیا تھا ———

لطیف خاں ——— لطیف خاں خیر کچھ اتنا طاقتور نہیں تھا۔ کہ رحمان اسے اپنے راستے سے ہٹا نہ سکے۔ منگنی البتہ بڑی مضبوط دیوار تھی۔ جو ریشماں لطیف خاں اور رحمان کے درمیان حائل تھی اور منگنی توڑنا اس ملک میں آسان کوئی آسان کام نہیں ہے۔

رحمان سوچ سوچ کر تھک گیا کہ اس منگنی کو آخر کس طرح توڑے ——— اُسے صرف ایک ہی راستہ نظر آتا تھا ——— اغوا ——— اور ریشماں تھی بھی کچھ ایسی لڑکی کہ اسے دیکھ کر پہلے پہل اغوا ہی کا خیال دل میں پیدا ہو ——— لیکن اغوا کس طرح کیا جائے۔ شاید ریشماں خود اسے پسند نہ کرے۔ پہلے ریشماں کی رضامندی حاصل کر لی جائے۔ وہ ممکن ہے۔ شاید وہ تیار بھی ہو جائے ——— !!

کئی دن تک رحمان موقعہ ڈھونڈتا رہا کہ ریشماں سے تنہائی میں ملے ایک دن اس نے اپنی ماں سے کہا کہ وہ ریشماں کی ماں کو کسی کام سے اپنے گھر بلا لے۔ ریشماں کی ماں رحمان کے گھر چلی گئی۔ شفیع اپنی دوکان پر تھا ——— رحمان ریشماں کے پاس گیا۔ ابھی ریشماں سے اس نے باتیں شروع بھی نہ کی تھیں کہ لطیف خاں اندر آ گیا۔ اس نے پہلے تو ریشماں کو گھور کے دیکھا اور پھر رحمان کو ———

رحمان لطیف کے اس طرح غیر متوقع اچانک آجانے پر بہت سٹپٹا گیا تھا
اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ لطیف ایک پاگل آدمی کی طرح اس پر
ٹوٹ پڑا۔ رحمان چاہتا تو لطیف کو بُری طرح پیٹ سکتا تھا۔ مگر لطیف نے
کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک چھرا نکالا اور رحمان کے شانے میں گھونپ
دیا۔ رحمان کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ ریشماں بڑی پریشان ہوگئی اس نے
اپنی ہمسائیوں کو آوازیں دیں۔ پڑوس کے گھر سے چند آدمی آگئے۔ پھر
پولیس آگئی۔ شفیع بھی آگیا۔ پولیس نے لطیف کو گرفتار کر لیا اور رحمان
کو "براؤن ہسپتال" پہنچا دیا گیا۔ رحمان کو کوئی ایسا کاری زخم نہیں لگا
تھا۔ وہ خطرے سے باہر تھا۔ البتہ لطیف کو چھ ماہ کیلئے جیل میں بند کر
دیا گیا۔

رحمان تین مہینے ہسپتال میں رہ کر باہر نکلا تو سیدھے ریشماں
کے گھر گیا۔ شفیع رحمان سے سخت ناراض تھا۔ کیونکہ اس واقعے کے بعد
سے ریشماں سارے شہر میں بدنام ہوگئی تھی۔ شفیع نے رحمان سے
ملنے سے انکار کر دیا۔

رحمان بڑا بدحواس ہوگیا۔ اتنی محنت سے بنا بنایا کام یوں بگڑ گیا۔
لطیف کی قید کے بعد آخری کانٹا بھی نکل گیا تھا۔ مگر رحمان فطرتاً دھن
کا پکا تھا۔ ہمت نہیں ہارا۔ پھر ایک داؤں لگایا۔ اس نے شہر کے
بڑے بزرگوں کو ہموار کیا اور ان کے ذریعے شفیع کو کہلوانا شروع کیا
کہ اب مفر بیکار ہے۔ ریشماں جس کے لئے بدنام ہوئی ہے اسی سے
اس کی شادی کرنا پڑے گی۔ کوئی دوسرا آدمی رحمان کی موجودگی میں
اس سے شادی کرنا کبھی گوارا نہ کرے گا۔ سب یہی سمجھتے ہیں کہ ریشماں
رحمان کے ساتھ خراب ہو چکی ہے۔ آخر کب تک بٹھائے رکھے گا
اسے ———؟

رحمان کا یہ داؤں کارگر ثابت ہوا۔ ایک دن شفیع خود ہی رحمان کے
گھر آیا۔ اور بڑے روکھے پھیکے کاروباری سے لہجے میں بولا کہ۔
شادی کی تاریخ مقرر کر دو
رحمان خوشی سے جیسے دیوانہ ہوگیا۔ اسے جیسے اپنے آپ پر ید

آگیا۔ اور وہ پنکج ملک کی طرز میں گانے لگا۔
آج اپنی منتوں کا مجھ کو ثمرہ مل گیا ......
شادی کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ ۱۰ اگست ۱۹۴۷ء دونوں گھروں
میں بڑے زور شور سے شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ رحمان بڑے
فخر کے ساتھ لوگوں سے کہتا ——— یارو۔ شادی تو یہ ہے ورنہ
لوگ تو یوں شادی کرتے ہیں جیسے گھر سے نکلے، بیاہ رچایا چلے گئے
عورت یا بیوی حاصل کرنا تو بہت معمولی بات ہے۔ بات چیت ہوئی
سو واسطے ہوا۔ نکاح ہوا۔ چلو جی شادی ہوگئی۔ جھٹ منگنی پٹ بیاہ۔
یہ بھی کوئی بیاہ ہوا بھلا۔ شادی کا اصلی مزا تو یہ ہے کہ تکلیفیں اٹھا کر
مصیبتیں جھیل کر جان جوکھم میں ڈال کر عورت حاصل کرو۔ تب شادی کا
مزا آتا ہے۔ میری شادی تو ایسی شادی ہے۔ کہ کوئی فلم کمپنی چاہے تو
اس کا فلم بنا ڈالے ——— کیوں یارو بمبئی ٹاکیز کو ایک خط
لکھ ڈالو ———!!!

اب شادی میں صرف سات روز باقی رہ گئے تھے لیکن رحمان
نے اپنے ماں باپ اور شفیع کی والدہ اور شفیع سے کہا کہ یہ سات روز
بھی بہت زیادہ ہیں۔ شادی کل یا زیادہ سے زیادہ پرسوں تک ہو جانی
چاہیئے۔ کیونکہ لدھیانے میں ہندو مسلم فساد کا بڑا اندیشہ پیدا ہوگیا ہے
اخباروں میں روز خبریں چھپ رہی ہیں کہ کلکتے سے بمبئی تک اور راولپنڈی
سے جالندھر تک فرقہ وارانہ فسادات کی ہولناک آگ بھڑک اٹھی ہے
لدھیانے کے چاروں طرف سے آگ بڑھتی ہی چلی آرہی ہے ———
لدھیانہ بھی بچ نہ سکے گا۔ جانے کب کوئی چنگاری گرے اور لدھیانہ بھی
بھڑک اٹھے ——— شفیع کا خیال تھا کہ نہیں لدھیانے میں سب
کچھ نہیں ہوگا۔ یہاں ہندو سکھ اور مسلمان برسوں سے بھائی بھائی
کی طرح رہتے آئے ہیں۔ یہاں جھگڑا ہو ہی نہیں سکتا۔

شادی میں دو روز باقی تھے۔ اچانک سارے شہر میں یہ خبر
مشہور ہوگئی۔ کہ چوک نیم والا میں ایک سکھ نے ایک مسلمان کو چھرا

کھر نپ دیا۔ چنگاری بھڑکی اور ملیحا نہ آن کی آن میں بھڑک اٹھا ——
۔ بڑا بازار کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ ریشماں چوڑا بازار ہی میں
رہتی تھی۔ اب چوڑا بازار دیک فیلڈ گنج سے بہت دور ہو گیا تھا۔
نیتے ہو شعلوں، سنسناتی ہوئی گولیوں جلتے مکانوں کے دھوئیں
میں کچھ بھی نہ دکھائی دیتا۔ زمین پر آدمیوں کا خون کیچڑ بن گیا تھا۔ اور
گ بھاگ رہے تھے۔ لوگ لڑ رہے تھے۔ لوگ گر رہے تھے۔ لوگ مر
رہے تھے۔ چوڑا بازار اور دیک فیلڈ گنج کے درمیان لاشیں گر گر کر
سے بے نیاز سڑ رہی تھیں

رحمان اپنے باپ اور ماں کے منع کرنے، و نے چلانے کے
باوجود گھر سے نکلا۔ چھپتا چھپاتا، نظریں بچاتا ریشماں کے گھر کی طرف
چلا —— ریشماں کے گھر کا بڑا دروازہ کھلا پڑا تھا۔ رحمان جب
اندر داخل ہونے لگا۔ تو ٹھٹک کر رک گیا۔ دہلیز پر ریشماں کا سبز
رنگ کا ململی دوپٹہ پڑا ہوا تھا۔ اور ریشماں نہیں تھی۔ رحمان دروازے
ہی سے چیخنے لگا۔

ریشم!
ریشماں!!
سناٹا گہرا سناٹا —— صحن میں شفیع کی لاش دو
ٹکڑے ہو کر پڑی تھی۔ اور اندر کمرے میں ایک بوڑھی عورت، سو رہی تھی
یا بیہوش پڑی تھی یا مر گئی تھی۔
رحمان غضبناک ہو کر باہر دوڑا ——
ریشم —— !
ریشماں —— !!
وہ دوڑنے لگا۔ جیسے کوئی اسی راستے پر ریشماں کو اٹھا لے گیا
ہو جیسے اس نے ابھی ہمت نہ ہاری ہو۔ جیسے اب بھی ریشماں کو ڈھونڈ
نکالنے اور اسے پا لینے کی اسے پوری امید ہو۔ جیسے وہ کبھی اعتراف
نہیں سکتی۔ حالانکہ خود اس کا خیال تھا کہ ریشماں ایسی لڑکی ہے۔ جس
کو دیکھ کر پہلے اخراجی کا خیال دل میں آتا ہے۔
وہ دوڑ رہا تھا۔ فضول بے مقصد دوڑ رہا تھا۔ اب کیا ہو سکتا

تھا۔ سچ کچھ ہو جانے کے بعد پھر کیا ہو سکتا تھا۔ بڑے بڑے لٹیروں
نے سب کچھ چھین لیا تھا۔ سب کچھ تقسیم کر ڈالا تھا۔ صرف ملک ہی
نہیں بلکہ غریبوں اور بے گناہوں کے جسم تقسیم کر ڈالے تھے۔ دل تقسیم
کر ڈالے تھے۔ معصوم محبتیں تقسیم کر دی تھیں جھنجھلاہٹیں تقسیم کر دی تھیں۔
رحمان دوڑتے دوڑتے دل ہی دل میں جانے کس سے پوچھ رہا تھا
کہ ریشماں کا قصور کیا تھا —— ؟ کس کا قصور کیا تھا۔ قصور صرف
یہ تھا کہ وہ ایک غریب رنگریز کی بہن تھی۔ وہ ایک درزی تھا۔ قصور
یہ تھا کہ وہ غریب تھے۔ جاہل تھے بیوقوف تھے —— اور
کوئی قصور نہیں ......
دوڑتے دوڑتے جیل روڈ کے چوراہے پر وہ دفعتاً چیخ مار کر
اوندھے منہ گر پڑا۔ اور سردار سنگھ ایک قہقہہ لگا کر اپنی لہو میں ڈوبی
ہوئی کرپان کو ریشماں کے دوپٹے سے صاف کرتا ہوا دوسرے
شکار پر جھپٹا۔

بڑی دیر بعد جب اسے ہوش آیا۔ تو اسے ریشماں نظر آئی
اس نے آنکھیں جھپکا کر آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ تو ریشماں نہیں تھی ——
نرس تھی۔ اور وہ براؤن ہسپتال کے ایک بیڈ پر پڑا تھا۔ رحمان چیخا۔
"ریشم —— ریشماں۔ ریشماں کہاں ہے۔
ریشماں !!"
رحمان کی چیخیں سن کر وارڈ کی دوسری نرسیں اس کے بیڈ کے
پاس آگئیں۔ ایک اینگلو انڈین نرس نے اسے ڈانٹا۔
"اے۔ یو۔ تم کیوں چلاتا ہے۔
چپ چاپ لیٹا رہو۔"
ایک ہندوستانی نرس نے اس پر ترس کھاتے ہوئے اینگلو
انڈین نرس کو مخاطب کر کے کہا۔
"اس کی عورت کو کوئی ۔ اغوا کر کے لے گیا
ہے —— بیچارا !!"
اسی اثنا میں ایک اور نرس تازہ اخبار لئے وارڈ میں داخل ہوئی

سب نرسیں اس کے گرد جمع ہو کر اخبار دیکھنے لگیں۔ جس کے پہلے صفحے
پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن، قائدِ اعظم محمد علی جناح اور پنڈت جواہر لال نہرو
کی تصویریں چھپی تھیں۔

رحمان بڑبڑائے جا رہا تھا۔

۔ ریشماں ــــ ریشماں کو کون لے گیا۔ بتاؤ۔

میں اسے جان سے مار دوں گا۔

اینگلو انڈین نرس کو بہت غصہ آیا۔ اور وہ اخبار لیکر اس کی طرف
بڑھی۔

"اے یو ــ ــــ تم بہت تنگ کرتا ہے

چپ کرو۔ لائی ڈاؤن۔ گو ٹو سلیپ"

رحمان پر اس ڈانٹ کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے نرس سے پوچھا۔

"میم صاحب ــــ میری ریشماں کو کون لے گیا

بتاؤ ــ میں اسے مار ڈالوں گا"

اینگلو انڈین نرس کو ایک شرارت سوجھی اور اس نے بڑے
مسخرے پن سے اخبار اس کی طرف بڑھایا اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن
کی تصویر پر انگلی رکھ کر بولی۔

"یہ آدمی تمہارا عورت کو لے گیا۔ سمجھ گیا تم!"

اور وہ زور زور سے ہنس پڑی۔ رحمان نے غصے سے نرس کے
ہاتھ سے اخبار جھپٹ لیا۔ تصویر کو غور سے دیکھا۔ اور پھر اس
کے پرزے پرزے کر ڈالے۔ جیسے سچ مچ اپنے آخری
رقیب کو بھی اپنے اور ریشماں کے راستے سے ہٹا دیا ہو۔

اخبار لانے والی نرس غصے سے چیخی۔

"اسے کیا کرتا ہے تم ــ پاگل ہو گیا ہے!؟"

دوسری نرسیں زور زور سے ہنسنے لگیں۔

رحمان پھر بستر پر گر گیا۔ جیسے اب اس نے بدلہ لے لیا ہو۔ جیسے
اب اس میں مطلق ہمت نہ رہی ہو۔ جیسے وہ پہلی بار ہارا ہو۔
اس نے درد اور دکھ کی شدت سے آنکھیں بند کر لیں

اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہار گیا

اے حمید

# شروع شروع میں

لاہور پہنچ کر سب سے پہلے مکان میں ہم نے بسیرا کیا وہ دو منزلہ تھا۔ یہ پرانا اور حویلی نما مکان باہر سے خاصا بڑا دکھائی دیتا تھا۔ مگر اندر چھوٹی چھوٹی اندھیری کوٹھڑیوں کی وجہ سے تنگ اور پیچیدہ ہو گیا تھا۔ اس کا مالک ایک ہندو تاجر تھا جو منڈی میں تیل اور سینگ کا دھندا کرتا تھا۔ اور جو ہندوستان جا چکا تھا۔ جب ہمارا کنبہ چچا اور چچی کے ساتھ یہاں آیا تو یہ بالکل ویران پڑا تھا اور اس کی خالی کوٹھڑیاں بھائیں بھائیں کر رہی تھیں۔ چھتیں نیچے کو جھک آئی تھیں کونوں کھدروں میں مکڑیوں نے جالے بُن رکھے تھے۔ کوٹھڑیوں میں ٹوٹے پھوٹے خالی ٹرنک اوندھے پڑے تھے۔ آنگن میں ادھر اُدھر میلے کچیلے چیتھڑے بکھرے ہوئے تھے۔ اور باہر برسات کے مارے اس قدر سیلن ہو رہی تھی اور سینگ کی تیز بُو تھی کہ خواہ مخواہ جی بُرا ہو رہا تھا۔ چچا اپنی خشخشی داڑھی پر الٹا ہاتھ پھیرتا ہوا باہر نکلا اور دیر سے گھما کر بولا۔

"خوش قسمتی سے تو ہر ایک شے کا صفایا کر گئے! حرامزادوں نے چوہوں تک کو دھار دیا۔ اب ہمارے لئے یہاں کیا دھرا ہے؟"

وہ دھوتی سنبھالتا ہوا دوسری کوٹھڑی میں گھس گیا۔ اندر جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد اُس کی آواز سنائی دی۔ آواز میں مدھم سی گونج تھی۔ جیسے کسی اندھے کنوئیں سے بول رہا ہو۔

"ارے یہ اندر تو کنواں بھی ہے!"

ہم لوگ جلدی سے اندر آ گئے۔ آرشٹ بھائی سب سے پہلے پہنچا کوٹھڑی میں بالکل اندھیرا تھا۔ بیٹھک کا فرش جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ چھت کے قریب ایک بوسیدہ روشندان میں سے دن کی روشنی کا دھندلا سا غبار اندر پھیل رہا تھا۔ چچا ایک جگہ جھکا نیچے جھانک رہا تھا۔

"میں نے تو کہا تھا بھیا۔ اس کنوئیں میں ضرور مال بنا رکھا ہوگا۔"

وہ ادھر اُدھر گھوم پھر کر ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بار بار کہہ رہا تھا۔

"اس میں ضرور کچھ نہ کچھ سامان، ہوگی۔ گھر والے گھبراہٹ میں سب کچھ یہیں پھینک گئے ہوں گے۔ کیا نام۔ میرا خیال ہے مجھے نیچے اترنا چاہیئے۔"

چچی غصے میں بولی۔

"تیرا دماغ تو چل گیا ہے۔ یہ سانپ سنپولوں کی جگہ ہے۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو میں تو اس کوٹھڑی کو تالا لگا دوں گی۔"

چچا نے کاغذ کا ایک چیتھڑا دیا سلائی سے جلا کر اندر پھینکا۔ کنوئیں کے اندھیرے غار میں ایک دم روشنی ہو گئی۔ اور دور نیچے پانی کی ساکن سطح کے گدلے آئینے میں ایک جلتا ہوا چیتھڑا جیسے ہماری طرف بڑھنے لگا۔ کاغذ بجھ گیا اور غار میں پھر تاریکی چھا گئی۔ چچا نے باہر نکلتے وقت آرشٹ بھائی کے کان میں کہا۔

"تم چپکے ہو رہو۔ اس کنوئیں کی ضرور خبر لیں گے۔ کیا پتہ اس میں کیا سامان ہو؟"

چچا اپنے بال بچوں کے ساتھ ایک مدت سے لاہور میں رہ رہا تھا اُس نے بڑی بیٹی کی شادی بھی لاہور میں ہی کی تھی۔ اس مکان میں گھس آنے سے پہلے چچا کا کنبہ شہر سے باہر دریا کے کنارے والی آبادی میں رہتا تھا۔ یہ جگہ ایک تو ویران بہت تھی۔ اور پھر مکان کا کرایہ بھی زیادہ تھا۔ چنانچہ جس وقت ہم امرتسر سے ہجرت کر کے چچا کے ہاں پہنچے۔ تو اُس نے فوراً اس مکان پر قبضہ جما لیا شہر کے کسی اور علاقے میں جا کر مکان ڈھونڈنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس لئے کہ وہاں ابھی تک مارو ماری ہو رہی تھی۔ اور کہیں کہیں آگ بھی لگ جاتی تھی۔ مکان کی پہلی منزل کی دیواروں میں جگہ جگہ دراڑیں پیدا ہو رہی تھیں۔

گھونڈوں کے پسینے کی بُو آیا کرتی تھی۔ ماتھے اور ہاتھوں کی سبز رگیں پھول گئی
تھیں۔ وہ ہر وقت غصّے میں رہتا تھا اور بولتے وقت اُس کے ہونٹوں کے کونے
جھاگ سے بھر جاتے اور صورت سے وحشت برسنے لگتی۔ وہ عموماً رات گئے گھر آتا
اور گلی میں کھڑے کھڑے اپنی بیوی کو آوازیں دینے لگتا۔ اُس کی بیوی بس سے
سر کے اُلجھے ہوئے خشک بال، ان میں جیسے چڑیوں نے اپنے گھر بنا رکھے تھے۔
بوسیدہ پلنگڑی کے جھول سے ہڑبڑا کر اٹھتے ہوئے کہتی۔
"آئی ہے ——"
اُس کی بے صبر اور کرخت آواز میرے کانوں پر تھپڑ کی طرح پڑتی۔ اور
وہ دیر تک سنسناتے رہتے۔ وہ جلدی سے، ننگے پاؤں، ننگے سر منڈیر میں
لڑکھڑاتی نیچے اُتر جاتی اور اُس کی بیٹی جمیا پلنگڑی خالی پا کر اُٹھ بیٹھتی۔ وہ بلند آواز
میں رونا شروع کر دیتی۔ اس دبلی پتلی، گوری چٹی لڑکی کا سارا جسم سُرخ سُرخ
پھنسیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اور ناک سدا بہتی رہتی تھی۔ سودا وغیرہ نچلی منزل کے
گھس میں ہی کھانے کے بعد کوچوان اپنی بیوی کے آگے آگے حقّہ ہاتھ میں
لیے دروازے پر نمودار ہوتا اور سوتے جاگتے چچا کو سلام کر کے اپنے کوٹھے
کی طرف چل دیتا۔ یہ کوٹھا ساتھ ہی تھا۔ درمیان میں صرف چھوٹی سی دو گز اونچی
دیوار حائل تھی۔ اُس کا حقّہ دیر تک گڑگڑاتا رہتا۔ وہ اپنی بیوی سے دھیمے دھیمے
باتیں بھی کرتا رہتا۔ کبھی کبھی اُس کا لہجہ تلخ ہو جاتا۔ آواز ایک دم اونچی ہو کر ڈوب
سی جاتی۔ پھر اُس کی بیوی کی دبی دبی سسکیاں سنائی دینے لگتیں۔ یا حقّہ
اُلٹنے یا گلاس کے دیوار سے ٹکرانے کی آواز آتی۔ اور پھر پہلے ایسی خاموشی
چھا جاتی۔
ایسے لمحات میں چچا جی —— اتنا کہہ کر کروٹ بدل لیتا۔
"یہ آئے دن کا ناٹک بھی خوب رہا"
کوچوان کی بیوی کو کھانسی کا مرض تھا۔ وہ دن بھر کچھ نہ کچھ چرتی رہتی
اور پاخانے میں دیر تک بیٹھی رہتی تھی۔ کسی وقت تندور کی روٹیوں سے بھری
ہوئی چنگیر لیکر ماں کے پاس بیٹھ جاتی اور آہ بھر کر کہتی۔
"مجھے تو یہاں کا پانی بالکل راس نہیں آیا۔ گورداسپور کا پانی تو جھٹ
کھانا ہضم کر دیتا تھا۔ اور یہاں تو بھوک ہی نہیں لگتی"
مجھے [illegible] کی بھی تو بڑی لت تھی۔ اماں، اچار، کھٹی امیاں
کہہ آئے [illegible] ہونے کی جگہ تھے۔ اور ماں کا

کہتا تھا۔ کہ وہ چھپ چھپ کر کچا گوشت کھایا کرتی ہے۔ اتنا سننے کے بعد میں
اُس سے ڈرنے لگا تھا۔ ایک روز اُس کا خاوند بڑے چاؤ سے گائے کا
خاص قسم کا گوشت لایا۔ ساتھ ساتھ یاد بھی دلایا تھا۔ بی صاحبہ نے کیا کیا
گوشت کو تو ہاتھ نہ لگایا مگر چربی تمام کی تمام چٹ کر گئیں۔ اور سارا بھید
کھل گیا۔ کوچوان نے اُس کی خوب مرمت کی۔ جب وہ غصّے میں ہانپتا کانپتا
باہر نکل گیا تو اُس نے کنوئیں والی کوٹھڑی میں گھس کر دروازہ اندر سے بند کر
لیا اور کونے کے گرد چکر لگانے لگی اور بکری کی طرح میا میا کرنے لگی۔
"میں تو پھانسی لگاؤں گی۔ میں ڈوب مروں گی۔ مجھے کوئی نہ روکے
بس اب میرا کھانا پینا چھوٹ گیا۔"
ماں اور بھی کو بڑی فکر دامن گیر ہوئی۔ مگر چچا نے ناک سکیڑ کر کہا۔
"اس میں بھی کوئی نہ کوئی سائنس ہوگی"
دوسرے ہی لمحے کوٹھڑی کا دروازہ اپنے آپ کھل گیا اور کوچوان کی بیوی
اندر سے نکل کر پلنگڑی پر اوندھی لیٹ گئی اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ تھوڑی
دیر بعد جب میں راشن لینے کے لئے باہر جانے لگا۔ تو وہ زمین پر بیٹھی
دال والی ہانڈی آگے رکھے روٹی کھا رہی تھی۔ قریب ہی اُس کی بچی گندگی
میں لتھڑی رو رہی تھی۔ اُس کے بال بڑے چھوٹے تھے۔ جب کبھی وہ انہیں
گوندھتی تو چھوٹی چھوٹی سی چوٹی اُس کی گردن پر مرغی کی دُم کی طرح اٹھی
رہتی اور مجھے بے اختیار ہنسی آ جاتی۔
ہمارے پاس چارپائیاں صرف چار تھیں۔ ایک پر چچا اور اُس کا
بیٹا دوسری پر چچی اور زینی —— تیسری پر جو ذرا بڑی تھی ماں، باجی رضیہ
اور چھوٹی سگی بہن اور چوتھی پر دادا جان سوتے تھے۔ میں ابا جان اور
آرٹسٹ بھائی درمیانی منزل پر گلی والی سدا کھلی کھڑکی کے پاس ہی
پر سوتے تھے۔ کھڑکی میں سے خوب ہوا اور محلے کی بدبو اندر آیا کرتی۔ کبھی دو دن
ہوا بند ہوتی تو مچھر رات بھر نہ سونے دیتے۔ آرٹسٹ بھائی پنکھا ہاتھ
میں لئے بیٹھا رہتا اور مچھر مارتا رہتا۔ ابا جان پتلی سی دھوتی تانے جھٹ جلد
خراٹے لینے لگتے اور میں کھڑکی کی چوکھٹ سے سر لگائے سوگ بھری آنکھوں
سے سٹیشن کی سرخ ہری لال لال روشنیوں کا تماشہ کرتا رہتا۔
آرٹسٹ بھائی کو یہاں سب سے زیادہ تکلیف یہ تھی کہ سیر سپاٹے کے
لئے لمبے لمبے کھیتوں کی کھلی فضا، پھلدار درختوں سے مالا مال ٹھنڈی

چھاؤں والے باغ اور سرسبز کناروں والی نہریں نہ تھیں۔ کنوئیں کا پانی
بھی شیر گرم اور کسیلا تھا اور سمجھ دریا کے غسل خانے بھی بے حد گندے تھے
اور گلیوں میں جگہ جگہ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر لگے تھے۔ پھر بھی وہ عادت سے
مجبور، پو پھٹتے ہی اٹھ بیٹھتا اور چپ چاپ باہر گھومنے پھرنے نکل جاتا۔ دن
چڑھے واپس آتا تو اسے جیسے پر تھکی اور بڑھاپے کے آثار نمایاں ہوتے
جیسے مہینوں کا سفر دنوں میں طے کر کے آ رہا ہو۔ پمپ کے نیچے بیٹھ کر وہ کھارے
پانی سے نہاتا۔ امرتسر میں وہ حمام سوپ استعمال کرتا تھا۔ لیکن یہاں نہانے
اور کپڑے دھونے کا صابن ایک ہی تھا — ویسی صابن — جس کا تیز سوڈا
بدن کو چھیلے ڈالتا تھا۔

نمکین اور تیلی چائے کا ایک پیالہ پی کر وہ سارا دن کام کی تلاش میں
سرگرداں رہتا اور شام کو تھک ہار کر پسینے میں شرابور گھر لوٹ آتا۔ اچھر
اساڑھ کی تیز دھوپ میں اس کا رنگ کالا ہو گیا تھا اور خوراک ایک دم گھٹ
جانے کے باعث چہرہ پیلا پڑنے لگا تھا، رات کو کھجوری پنکھا ہاتھ میں لئے وہ
بجھا بجھا سا زمین پر بیٹھ جاتا اور کھڑکی میں سے باہر سگنلوں کی سرخ سرخ اور سبز
سبز بتیوں کو گھورتے ہوئے کسی وقت دھیمی آواز میں کہتا

"اس شہر میں میرا دم گھٹتا ہے بلنے! وہ کمپنی باغ کے ٹھنڈی
چھاؤں والے درخت، وہ ٹھنڈے کنوئیں کا سرد و شیریں پانی اور شریف
پورہ کے عقب میں ناشپاتیوں، آلوچوں کے گنجان باغ اور چھاؤنی سینما کو
جانے والی یوکلپٹس اور املتاس کے درختوں میں گھری ہوئی نیلی سی سڑک —
کاش ہم امرتسر نہ چھوڑتے۔ کیا پتہ اب کبھی یہ باغات دیکھنے نصیب نہ ہوں گے ہم
کبھی ان درختوں کی چھاؤں میں نہ بیٹھ سکیں۔ کبھی ان کنوؤں کا پانی نہ پی
سکیں۔"

اس کے لہجے میں ایکا ایکی غم اور درد جھلکنے لگتا اور افسردہ آنکھوں
میں پرانے دنوں کی سہانی یادیں امڈ آتیں۔ پنکھا جھلتے ہوئے اس کا ہاتھ آپ
ہی آپ رک جاتا۔ جیسے وہ خیال ہی خیال میں شریف پورہ کے پچھواڑے
ناشپاتی، آلوچے اور امرودوں کے باغوں میں گھوم رہا ہو۔ چھاؤنی کی طرف
جانے والی یوکلپٹس اور املتاس کے درختوں میں گھری ہوئی سڑک پر نکل گیا
ہو اور کمپنی باغ کی سایہ دار روشوں پر سے گزر رہا ہو۔ اگہت کے نیلے آسمان
تلے تختوں میں کھلے ہوئے رنگ برنگ پھولوں اور گھاس پتیوں کا سبزہ
خواب دیکھ رہا ہو۔ اس وقت اس پر ایک ایسے پودے کا گمان ہوتا جو پانی
نہ ملنے کی وجہ سے مرجھا گیا ہو۔

رات کو بارش ہونے لگتی۔ تو دونوں کنبے دوسری منزل میں گھس
آتے اور وہاں اصطبل ایسا ماحول پیدا ہو جاتا۔ کھلی کھڑکی میں سے سٹیشن کی
روشنیاں بارش کی تیلی اور گیلی چادر کے عقب میں دھندلا جاتیں۔ اور ہوا
کے جھونکے مینہ کی پھوار، دن کو اٹھا اٹھا کر سب پر پھینک جاتے
رات بھر چھتوں میں جھینگر اور پپیہے بولتے رہتے اور زمین پر سونے والوں کی ٹانگوں
پر چیونٹیاں اور تل چٹے رینگتے رہتے۔ احاطے میں پرساتھوں تلے بندھے بھینے
گدھے ڈھیچوں ڈھیچوں کرنے لگتے اور محلے کی گندی نالیوں میں سے اٹھتی ہوئی
بدبو گھر بھر میں پھیل جاتی۔ کہیں نہ کہیں سے چھت زور زور سے ٹپکنے لگتی۔ اس وقت
چچا دھوتی باندھے ہوئے اٹھتا اور اندھیرے میں ادھر ادھر گھوم پھر کر کسی نہ
کسی چارپائی یا صندوق سے ٹکراتا، کوئی نہ کوئی برتن ڈھونڈ نکالتا۔ اور
اسے میں ٹپکنے والی جگہ کے نیچے فرش پر رکھ دیتا۔

پانی کی بوندیں — ٹن ٹنک ... ٹن ٹنک ... ٹن ٹنک ...
کی راگنی الاپتیں برتن میں گرتی رہتیں۔ اور باہر بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک
میں بارش کا شور تیز ہو جاتا۔ علی الصبح آنکھ کھلتی تو کیچڑ سے بھری ہوئی
گلیوں میں لوگ شڑاپ شڑاپ قدم اٹھائے چل رہے ہوتے سٹیشن کی
قلعہ نما عمارت بارش میں دھل کر نکھر گئی ہوتی۔ کوارٹروں والے کھلے درخت
کی شاخوں میں چڑیوں کی چہکاریں گونج رہی ہوتیں۔ ریل کی پٹڑیاں مینہ میں
نہانے کے بعد چمکنے لگتیں۔ انجنوں سے نکلتی ہوئی دودھیا بھاپ کے مرغولے
زیادہ شفاف دکھائی دیتے اور پرنم فضا میں کانٹا بدلنے والوں کی لمبی آوازیں
بہت جلد ہم تک پہنچ جاتیں۔ ارشد بھائی کا چہرہ ان جانی مسرت سے چمک
اٹھتا اور وہ کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر لمبے لمبے سانس لینے لگتا۔ جیسے فضا
کی ساری طراوت اور تازگی پی ڈالنا چاہتا ہو۔

ابا جان سارا دن دکان کی تلاش میں گھومتے رہتے اور بھائی
کام کی تلاش میں اجنبی شہر کی سڑکوں پر مارا مارا پھرتا رہتا۔ [illegible]
اندھیرے والی پچھلی کوٹھڑی میں زمین پر لیٹی رہتیں اور دیواروں کو گھورتی
چھت کو گھورتی رہتیں۔ شاید وہ دن رات روتی رہتیں۔ لیکن اس کے اندر
رونے کی قوت نہ تھی۔ لاہور آنے کے بعد وہ بالکل سوکھ کر [illegible]

جو پیاسی بنجر رہ گئی تھی۔ دادا جان کلرک کے پاس آتے یا تھکے ہارے مزے سے بیٹھے رہتے اور کسی وقت موج میں آ جاتے تو ایک آدھ تان ہی اڑا دیتے۔

'کیوں تن مانجھتا ہے جوگی ......'

دادا جان کی آواز اگرچہ کمزور تھی۔ مگر اس میں بلا کا گداز رہ گیا تھا۔ گھر میں اپنے پچے سے راشن منگوانے کی کوئی سبیل نہ تھی۔ محلے کی لیگ کمیٹی مفت راشن دیتی تھی۔ میں وہاں سے شروع شروع میں راشن لاتا رہا۔ وہ دن کا آٹا، دال، ہلدی، نمک، مرچ اور کسی روز چاول بھی مل جاتے اور ہانڈی میں ڈالنے کے لئے تیل بھی — ایک تو وہاں مجھ جیسے چھوٹے بچوں کی کوئی شنوائی نہ تھی گھنٹوں بھیڑ میں کھڑے رہنا پڑتا۔ پھر راشن دینے والے لوگ ہمیں اس طرح گھورا کرتے۔ گویا ہم ذلیل بھکاری ہوں اور ان کے در پر آن گرے ہوں۔ ووکسٹر بنتے ہی انہوں نے کہہ دیا۔

'لڑکے اب راشن نہیں ملیگا۔ اپنے بھائی سے کہو کوئی کام کرے یہاں اب چندہ ختم ہو گیا ہے'

اُن کا چندہ ختم ہو گیا اور گھر میں آٹے کا کنستر کھڑکھڑانے لگا۔ اور پہلی بار ہی دو روز کا فاقہ آ گیا۔ چچا کی حالت پناہ گزینوں سے بھی بدتر تھی۔ وہ اپنی سائیکلوں کی دوکان پہ سے شام کو یوں مضمحل لوٹتا۔ جیسے اپنا سب کچھ گنوا کر آ رہا ہو۔ وہ ہر رات ابا جان کے پاس اپنا دکھڑا لیکر بیٹھ جاتا۔

'کیا کروں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کام کا بے حد مندا ہے ایک بھی سائیکل پنکچر نہیں ہوتا۔ دوکان کا کرایہ مفت میں پڑ رہا ہے۔ کیا کام — کاروبار میں تو ایسی بریک لگی ہے کہ دماغ بچھڑ گیا ہے'

اور میرا جی چاہتا کہ ابا جان اُسے کہیں۔

'اس میں بھی کوئی نہ کوئی سائنس ہو گی'

اُسے خواہ مخواہ آٹھوں پہر رونے کی علت تھی۔ حالانکہ اُس کی بیٹی زینی ہر وقت بنی ٹھنی رہتی۔ اُسکے سر پر ہر دوسرے تیسرے روز نیا ربن بندھا ہوا ہوتا اور اس کا بیٹا اس سے الجھ کر سینما دیکھنے کے لئے روپیہ ڈیڑھ روپیہ اینٹھ لیتا تھا اور چچی کو تو رات کے سمے چپ چپ کر دودھ پیتے اور گلاس میں انگلی ڈال کر اُس کی ملائی کھاتے میں نے دو ایک مرتبہ دیکھ بھی لیا تھا۔ کبھی دو ناگوں کی پڑی پوڑی چچی سسرال سے آتی۔ تو رخصتی کے وقت چچا اُسے ٹوکری بھر کر پھل خرید دیتا۔ اور تھوڑا بہت نقد بھی دے دیتا تھا۔ اس کے باوجود اس کینے پہ ہر وقت آسٹے نون کا ذکر مسلط رہتا۔ وہ پھر گھر کا پالی کر یوں بات بات پر آہیں بھرنے لگتے۔ گویا شام کے کھانے کے لئے کچھ بھی نہ بچا ہو جیسے۔ وہ چچا رفیق کیمپوں کی طرف سے ہو کر واپس آتا۔ تو گھر بھر میں خوف و ہراس پھیلا دیتا۔ وہ سہمی ہوئی آواز میں کہتا۔

'لوگ دھڑا دھڑ بھاگے چلے آ رہے ہیں۔ سنا ہے ہندوستان کی وجہ سے وہ لگے یہ تیغ ہو رہی ہیں۔ میں کل ہی مشتعال خان کو پشاور خط لکھتا ہوں۔ یہاں سے بھاگتے ہی بنے گی'

چچی سہم کر کہتی۔

'مگر وہاں بھی تو لوگ آ جائیں گے'

اور چچا جھلا کر کہتا۔

'تیری تو عقل ماری گئی ہے۔ ہم پشاور میں تھوڑے ہی رہیں گے۔ ہم تو آزاد علاقے میں جا بسیں گے۔ تمہیں کیا معلوم بچپن میں میں کہاں کہاں گھوما کیا ہوں۔ بس اب بقیہ زندگی تو آزاد علاقے میں ہی بسر ہو گی۔'

ماں کا چہرہ ایک دم اتر جاتا۔ اُس کی آنکھوں میں کمزور اور بیمار سائے منڈلانے لگتے۔ وہ خشک اور بے جان آواز میں آرٹسٹ بھائی سے پوچھتی۔

'چلو ہم بھی کسی طرف نکل چلیں'

اور آرٹسٹ بھائی بڑے یقین سے کہتا۔

'یہ بکواس ہے ماں۔ ہم کہیں اور نہ جائیں گے۔ اب یہی ہمارا وطن ہے۔ اس کی خاطر ہم نے گھر بار لٹوایا ہے، بہن بھائیوں، بیوی بچوں کو چھوڑ دیا ہے۔ یہاں سے اٹھ کر کہیں اور نہ جائیں گے۔ بلکہ اگر ضرورت پڑی تو اپنا خون بھی اس پہ نچھاور کر دیں گے!'

ماں کا حوصلہ بندھ جاتا۔ وہ اپنا بوڑھا سر جھکا لیتی۔ امرتسر سے آنے کے بعد اُس کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ اور اکثر بال سفید ہونے لگے تھے وہ مریضوں کی طرح نقاہت سے ادھر اُدھر چلا پھرا کرتی۔ اور باتیں کرتے وقت اُس کی آواز کئی بار بیٹھ جاتی اور نچلا ہونٹ اپنے آپ پھڑکنے لگتا۔

ابا جان کا لہسہ جھریوں سے اور زیادہ مرجھا گیا تھا۔ اور وہ باقاعدہ نماز پڑھنے لگے تھے۔ باجی رضیہ کے دوپٹے اور شلوار میں بھی دو ایک پیوند آ لگے تھے۔ اور آرٹسٹ بھائی کی زندگی جیسے سسک سسک کر پاؤں تک کھنچ سی گئی تھی، جیسے انکے چہرے سے جل اُٹھنے کا گمان کوئی نہ ہو۔ وہ ہر ایک سے کچا کچا سا چھٹکا تھا اور پہلے سے زیادہ ضدی بن گیا تھا۔ اب اُسے شہر میں کام ملتا تھا۔ اور وہ کوئی نہ کوئی بورڈ لا کر صحن میں ایک طرف چپ چاپ کام میں مگن رہتا۔

بیرنگ دن بھری اکتا دینے والی یک رنگی اور اداسی سے گزر رہے تھے کہ اچانک ماموں علی کے آ جانے سے گھر میں چہل پہل سی نظر آنے لگی۔ ماموں علی امرتسر میں بھی اکثر ہمارے ہاں آیا کرتا تھا۔ وہ ابا جان کا پرانا یار باش تھا اُسے قصے کہانیاں سنانے میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ وہ خود اگرچہ ان پڑھ تھا مگر پنجابی زبان میں بڑے لمبے لمبے شعر سنایا کرتا تھا۔ اور کہانی بیان کرتے ہوئے درمیان میں کسی نہ کسی جگہ اپنے شعر بڑی چابک دستی سے جوڑ دیتا تھا۔ گھر کی جو کھٹ میں نمودار ہوتے ہی اُس نے اپنی سیاہ رنگ کی پرانی کھال کی ٹوپی جس کے پھوندنے سے نکل آئے تھے سر سے اتار کر ہنستے ہوئے ابا جان اور دادا جان سے سلام دعا کی اور حقہ لیکر دری پر بیٹھ گیا۔

اُسی شام قصہ خوانی کی محفل گرم ہوئی۔

دُبلا پتلا سیاہ جسم، منڈی ہوئی ٹھوڈی، پیازی آنکھیں، مونگ پھلی کے دانوں ایسے زرد زرد دانت، پاٹ دار آواز، ماموں علی نے حقے کا کش لیکر دھواں چھوڑا اور مونچھوں کو سہلاتے ہوئے بولا۔

"قصہ بنانے والا، اللہ کا نام لیکر اس داستان کا یوں آغاز کرتا ہے کہ آج سے ہزاروں سال پہلے ملک چین میں ایک شہزادی رہتی تھی۔ . . . "

ماموں علی کی تقریباً ہر کہانی اس طرح شروع ہوتی اور کئی کئی دن جاری رہتی۔ کہانی کہتے کہتے درمیان میں وہ کسی وقت رُک جاتا اور یوں ایک طرف تکنے لگتا۔ جیسے وہ کوئی لکھی ہوئی عبارت پڑھ رہا ہو۔ میں فوراً تاڑ جاتا کہ وہ کہانی کا باقی حصہ گھڑ رہا ہے۔ کسی وقت وہ جوڑ توڑ میں ناکام رہتا۔ تو بڑی آسانی سے اپنا ایک آدھ شعر جوڑ دیتا۔

"تو جناب، اس موقع پر اس عاجز بندے نے بھی ایک خیال باندھا ہے کہ

ـــ

اسی دوران میں اُسے کچھ نہ کچھ سوجھ جاتا۔ اور وہ جلدی سے کہانی کا سلسلہ جوڑ دیتا۔

"اس وقت کے قصے اور اس وقت کی باتیں، شمی طوطی کیا کہتا ہے۔ بادشاہ سلامت سے کہ اے بھولے بادشاہ حکم دیا جائے کہ میرے لئے ایک من گھی کی چوری کوٹ کر لائی جائے اور پھولوں کی سجی ہوئی سیج تیار کی جائے۔ پھر جب میں ساری چوری چٹ کر جاؤں اور غنودگی کے عالم میں نرم نرم سیج پر لوٹنے لگوں۔ جب وہ راز تم پر ظاہر کروں گا جس پر تیری بادشاہت کا دارومدار ہے . . . . "

وہ اس قدر انہماک سے کہانی سنانے میں مگن ہوتا جیسے اپنی آپ بیتی بیان کر رہا ہو۔ اُسکے منہ سے تھوک اڑ اڑ کر ہم پر گرا کرتی مگر ہم کو احساس تک نہ ہوتا۔ اُس کی کہانیاں ہم پر جادو کر دیا کرتی تھیں۔ شام کو جب وہ چلنے لگتا تو ماں اُسے کھانے کی دعوت دے دیتی جسے ماموں علی فوراً قبول کر لیتا کھانا کھاتے دیکھ کر اُس پر خواہ مخواہ رحم آنے لگتا۔ اگر رات زیادہ ہو جاتی۔ یا کبھی برسات کی جھڑی لگ جاتی۔ تو ماموں علی وہیں پڑ رہتا۔

اُس کی اُٹھتے بیٹھتے، ہائے ہائے کرنے کی عادت مجھے دل سے بُری لگتی۔ جیسے کسی نے اُس کی کمر توڑ دی ہو۔ یا اُسکے جوڑوں میں درد ہو۔ حالانکہ وہ ٹھوٹا ایسا تھا۔ یہ اُس کی پرانی عادت تھی۔ امرتسر میں بھی وہ ہمارے ہاں جب کبھی آتا۔ تو اُس کی ہائے ہائے کی پکار سیڑھیوں میں ہی گونجنے لگتی تھی۔

سامنے اماں طلی کی ٹھلیاں دیکھتے دیکھتے آباد ہو گئیں۔ صحنی اینٹیں جوڑ کر چولہے بن گئے اور میلے کچیلے کپڑوں والی عورتیں ادھر ادھر چہل قدمی کرتے یا جھاڑو پھیرتے دکھائی دینے لگیں تیسرے پہر جب دھوپ ڈھل جاتی لمبی مچھوں پر بھرے ڈیل ڈول والے کسان بیٹھ جاتے۔ درمیان چنگیر میں چوڑی چوڑی روٹیاں اور پیاز رکھ دیئے جاتے اور یہ لوگ جبڑے ہلا ہلا کر کھانے لگتے۔ اور پھر لقے کے بعد پانی کا گھونٹ پیتے جاتے۔ پتہ چلا یہ لوگ ضلع گورداسپور کے کسان ہیں جو اپنے زمینیں، پیاز کی کھیتیاں گندم کے کھیت، دودھ دینے والی بھینسیں، جانور بیٹیاں اور معصوم

جنہیں وہیں چھوڑ آئے ہیں —— دن چڑھے جب میں کھڑکی سے سر
نکال کر چھتوں پر اُنہیں سویا ہوا دیکھتا۔ تو مجھے اُن پر بے حد ترس آتا اور دل
اُن کی کسی نہ کسی طرح مدد کرنے کو بیتاب ہو جاتا۔ وہ پردیسی لوگ چارپائیوں
اور بوسیدہ بوریوں پر کھلے آسمان تلے نیم عریاں پڑے ہوتے۔ صبح کی پھیکی
روشنی میں اُن کے زرد پچکے اور بے رنگ دکھائی دیتے۔

چولہوں میں پہلے پہر ہی آگ جل اٹھتی اور بڑی بڑی روٹیاں تیار ہو
جاتیں۔ کبھی پیاز اور کبھی گڑ اور کبھی محض پانی کے ساتھ روٹی کھا پی کر بچے
مرد اور رفیوجی کیمپوں کی خاک چھاننے نکل جاتے اور عورتیں گھر میں
دن بھر لڑتی جھگڑتی رہتیں یا اپنے بچھڑے ہوئے بیٹوں، بہنوں، بیٹیوں
کو یاد کر کے آہیں بھرتی رہتیں۔

احاطے کے شمال مشرقی حصے میں، پشت کی جانب ایک جہازی مکان
کھڑا تھا۔ اس کا مالک کوئی مسلمان ٹھیکیدار تھا۔ مکان کی کھڑکیوں پر رنگین
اور ریشمی پردے جھولتے رہتے اور اندر سے ریڈیو کی تانیں باہر آیا کرتیں۔
کسی وقت کھڑکی میں ایک مردہ سی عورت کا زرد چہرہ اداس نگاہوں سے
گلی میں پل بھر کے لئے جھانک کر پیچھے ہٹ جاتا۔ شام پڑنے پر دو لڑکیاں کوٹھے
کی لمبی چھت پر ایک دوسرے کی مخالف سمت میں ٹہلا کرتیں۔ جیسے وہ جاپانی
گڑیاں ہوں اور ان میں کسی نے کوک بھر دی ہو۔

گلی میں دن بھر شور مچا رہتا۔ دن ڈوبتے ہی جب دھوپ پھیکی پڑ جاتی
تو لوگ اپنی اپنی چارپائیاں اندر سے گھسیٹ کر دوکانوں کے آگے ڈال دیتے۔
بچے کھیلتے، فحش مذاق کرنے اور مہاجرین کی پھیلائی ہوئی گندگی پر
زور شور سے گفتگو شروع ہو جاتی۔ مکانوں کی کھڑکیاں کھول دی جاتیں اور
گھروں سے دھوئیں کے زرد زرد مرغولے اٹھنے لگتے۔ بڑے بازار میں قہوہ
خانوں کے سامنے چھڑکاؤ ہوتا۔ کرسیاں ڈال دی جاتیں۔ ریڈیو شروع ہو
جاتے اور قہوہ اور چائے پیتے ہوئے لوگوں کے درمیان باتوں کا ایک سلسلہ
چھڑ جاتا۔ مشرقی پنجاب سے مسلمان دھڑا دھڑ آ رہے تھے۔ اور رفیوجی
کیمپوں میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ گلی گلی مہاجرین کے سلسلے حکومت کی
تنقید ہوتی تھی۔

ایک رات میں چچا کے ساتھ ٹھیکیدار والے مکان میں خبریں سننے چلا گیا۔
تنگ و تاریک زینوں اور لمبے لمبے برآمدوں اور سنسان آنگنوں سے
گزر کر ہم ایک لمبے چوڑے کمرے میں پہنچے۔ یہ کمرہ اگرچہ سادگی سے سجا ہوا
تھا۔ مگر بڑا پُراسرار معلوم ہوتا تھا۔ دیواروں پر ٹنگی ہوئی بڑی بڑی
تصویروں کے شیشے اور فریم گرد سے اٹے ہوئے تھے۔ دروازے
پر گرا ہوا پردہ دھیرے دھیرے جھول رہا تھا۔ چھت کے عین بیچ
میں سبز بلب روشن تھا۔ جس کی روشنی کمرے کی ہر چیز پر کائی کی طرح جم رہی
تھی۔ ایک طرف بڑے بڑے گدّوں والے صوفے پڑے تھے درمیان
میں گہرے سرخ رنگ کا قالین بچھا تھا۔ پلنگ پر ایک آدمی بیٹھا اپنی
گود میں کالی بلی بٹھائے اُسے پیار کر رہا تھا۔ بلی زرد زرد چمکیلی آنکھوں
سے ہمیں گھورنے لگی۔ تپائی پر ریڈیو مدھم سروں میں بول رہا تھا۔ ہمیں
اندر آتے دیکھ کر اس آدمی کی پھولی ہوئی پکوڑا سی ناک سکڑ گئی۔ اُس نے
بھویں اٹھا کر ہمیں دیکھا اور سر کی خفیف سی جنبش سے خالی کرسیوں
کی طرف اشارہ کیا۔ مجھے وہاں کی ہر شے سے ڈر معلوم ہونے لگا
چچا بڑے ٹھسے سے کرسی پر ڈٹ گیا۔ فضا میں کسی تیز اور عجیب قسم کی بو
والے عطر کی لہریں تیر رہی تھیں۔ مجھے اپنے گھر کی کنوئیں والی کوٹھڑی کا
خیال آگیا اور اُس آدمی کو دیکھ کر شریف پورے والا یتیم دیوانہ بیوپاری
یاد آگیا۔ ہم جتنی دیر وہاں بیٹھے رہے۔ میرے دل پر اداسی اور خوف
کے ہلکے ہلکے بادل چھائے رہے۔ خبریں سننے کے بعد ہم لوگ واپس اپنی
اندھیری کوٹھڑیوں اور غلیظ آنگنوں والے مکان میں آگئے۔ جہاں ان
کو چوہے دوڑا کرتے تھے۔ اور رات کو سانپ کی آواز آیا کرتی تھی۔

چچا کو کسی نہ کسی طرح پتہ لگا کہ ساتھ والے خالی مکان میں ابھی کچھ
مال باقی ہے۔ پھر کیا تھا۔ ایک رات اُس نے آرٹسٹ بھائی کو ساتھ لیا
اور اوپر سے مکان میں کود گیا۔ اُس مکان کی چھت پر بڑا سا گھر تھا جس کی
سلاخیں ٹوٹ کر ایک طرف کو مڑ گئی تھیں۔ میں اپنے کوٹھے کی منڈیر سے
لگا اس گھر میں سے نیچے جھانکنے لگا۔ رات تاریک تھی اور مٹیالے ستارے
جابجا بکھرے ہوئے تھے۔ گھر کے نیچے کسی نے دیا سلائی جلائی۔ اور پھر
لیمپ کی روشنی پھیل گئی۔ اب نیچے سے چیزوں کو الٹنے پلٹنے کی آوازیں
آنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد آرٹسٹ بھائی ایک کنستر، پیتل کا مٹکا اور
پلنگ کی نوار کا پورا چکر اٹھائے اوپر نمودار ہوا۔ ادھر ادھر دیکھ کر اس
نے تمام چیزیں مجھے پکڑا دیں۔ اور بلی کی چال پھر نیچے اتر گیا۔ میرا دل

میں بھی نیچے جاکر تماشہ دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اور میں دبے دبے زینہ طے کرکے اُس خالی مکان کی درمیانی منزل میں آگیا۔ وہاں ایک عجیب منظر نظر آیا۔ زمین پر ٹوٹے پھوٹے کنستر، ٹرنک، لوٹے، اور ٹین کے ڈبے اُلٹے سیدھے پڑے تھے۔ کہیں ہلدی الٹ گئی تھی تو کہیں دالیں بکھری ہوئی تھیں۔ گندے چیتھڑوں کا انبار لگا تھا۔ آرٹسٹ بڑے صندوق پر لیمپ لئے کھڑا تھا۔ اور چچا چھتی میں گھسا دنیا جہان کا کباڑخانہ جمع کر رہا تھا۔ ایک ٹین کا ڈھکنا کھول کر اُس نے چٹکی بھر سفید سی شے منہ میں ڈال لی اور جلدی سے تھوک کر ٹین آرٹسٹ کو تھما دیا۔

"سالے ہر ڈبے میں نمک بھر گئے ہیں"

پھر وہ ایک پوٹلی میں سے سونف نکال کر چبانے لگا۔ وہ چالاک گلہری کی طرح ہر شے کو منہ میں ڈال کر اُسے چکھتا اور پھر نگل جاتا۔ یا تھوک دیتا۔ کوٹھری میں گندے چیتھڑوں کی بو میں میرا دم گھٹا جا رہا تھا کسی لمحے محسوس ہوتا کہ گلے سڑے پانی سے لبریز جوہڑ کے کنارے کھڑے ہیں۔ یا کسی کباڑیے کی پچھلی کوٹھڑی میں گھس آئے ہیں۔ میرے قریب ہی دیوار پر کوئلے سے بھدے ٹیڑھے حروف میں لکھا تھا "پاکستان زندہ باد"، "ہندوستان زندہ باد"، [illegible]

چچا ایک ٹانگ پر چھتی اور دوسری ٹانگ صندوق پر ٹکا کر اترا تو گھوڑے کی طرح ہانپ رہا تھا۔ اُس نے بغل میں سے ایک سیاہ رنگ کا کوٹ جھاڑ کر اُسی وقت پہن لیا۔ اور [illegible] کھینچتے ہوئے گھوم کر بولا۔

"نمبر ون کوٹ ہے۔ میرا کوٹ تو بالکل پھٹ چکا تھا"

یہ سیاہ کوٹ پہنے، سر پر کالی ٹوپی رکھے، بڑھی ہوئی داڑھی اور پھولے ہوئے نتھنوں کے ساتھ، وہ واقعی کالا چور دکھائی دے رہا تھا میں اوپر چڑھنے لگا۔ تو چچا نے پرانے چیتھڑوں کا ایک گٹھر میرے سر پر رکھ دیا اور سیڑھیوں پر میرے قدم کئی بار لڑکھڑا گئے۔

دوسرے دن رات کو چچا لالٹین اور دیا سلائی لیکر پھر اُسی مکان میں گھس گیا۔

(زیرِ تصنیف ناول "ڈوریے" کا ایک باب)

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

# شیخ ناصر علی

یوں تو افتخار علی کی آمد اور صبح کے وقت شیخ صاحب کی خاموشی اب کچھ اس حد تک مستلق تھیں کہ ایک کے معلوم ہونے پر دوسری کے متعلق پہلے سے پیشگوئی کی جا سکتی تھی، لیکن جب دن چڑھے تک نہ شیخ صاحب کی آواز سنائی دی نہ گلی محلے میں ان کا دیدار ہوا۔ تو لوگوں کی حیرانی شک و شبہ میں تبدیل ہو گئی۔ پہلے پہل جب ایک آدھ بار شیخ صاحب کے وظیفے کی آواز صبح کے وقت سنائی نہ دی۔ تو لوگوں کو خیال گزرا شاید شیخ صاحب کی طبیعت نصیب دشمناں ناساز ہو گی۔ مگر اب یہ بات ان پر کھل چکی تھی۔ کہ واقعہ یوں نہ تھا۔ بلکہ اس دن ان کا لڑکا افتخار علی آیا تھا۔ ——— خدانخواستہ یہ بات نہیں تھی کہ افتخار کو شیخ ناصر علی کے وظیفوں سے بیر تھا۔ یا ان کی صبح خیزی کی عادت پر اعتراض تھا، صبح خیزی! اس نے کبھی اعتراض کیا بھی تو محض اس لئے کہ اس سے ان کی صحت پر برا اثر پڑنے کا احتمال تھا، کئی بار ان سے یہ عرض کی اور بڑے ادب سے کہ قبلہ! آپ اتنی صبح نہ اٹھا کریں، نصیب دشمناں اگر سردی لگ جائے، یا پھر اگر اس نے کبھی ان سے کچھ کہا تو اس طرح کہ آپ صبح ٹھنڈے پانی سے وضو نہ کیا کریں۔ بلکہ نوکر کا تھوڑا انتظار کر لیا کریں۔ کہ وہ آگ جلا کر پانی گرم کر سکے۔

نماز، روزے اور دوسری مذہبی باتوں کا تو وہ خود بھی بہت دلدادہ تھا، اچھا خاصا تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود وہ بہت سادگی پسند تھا، ابھی تک کوٹ پتلون تک استعمال نہ کرتا تھا۔ ہمیشہ شلوار اور اچکن ہی پہنتا تھا ——— ہوسٹل کے ساتھی کہا کرتے۔ کہ اس نے کبھی نماز قضا بھی نہ ہونے دی تھی، ہوسٹل میں اس کا نام محاورہ بن چکا تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے مولوی صاحب کا گھوڑا یا پنڈت جی کی بہلی۔ اور کالج کے اکثر ساتھی اسے مولوی افتخار علی کہا کرتے تھے

خود شیخ صاحب کو بھی اس بات کا اعتراف تھا بلکہ بڑا فخر تھا کہ ان کا بیٹا اتنا سادہ، نیک اور فرمانبردار ہے اور وہ اسے ساتھیوں کی محفل میں حقے کے کش لگاتے ہوئے اکثر اس کا ذکر کیا کرتے تھے اور کبھی گلی محلے میں کسی لڑکے بارے کی شکایت ان تک پہنچتی یا لوگ کسی کو ان کے پاس نصیحت کے لئے لے آتے۔ کیونکہ وہ محلے کے سربرآوردہ اور بارسوخ آدمیوں میں سے تھے تو وہ اسے سمجھاتے ہوئے افتخار کی مثال دیا کرتے تھے،

"بیٹا اپنے بھائی افتخار کو دیکھو، اس کے متعلق کبھی ایسی شکایت سننے میں آئی، وہ بھی آخر تمہاری عمر کا ہے، ہمیں پتا ہے —" اور ان کے ساتھی اگر شکایت ان کے اپنے لڑکے کی نہ ہوتی کہتے' ——

"ہاں شیخ صاحب ماں باپ ہی کی پہچان ہے اولاد، وہ آخر آپ کا بیٹا ہے، آپ نے تربیت دی ہے اسے" اور شیخ صاحب کا سر فخر سے بلند ہو جاتا اور وہ مسرور دل سے کہتے "اللہ اسے سلامت رکھے"

شیخ صاحب کا خاندان کچھ عجیب تھا، ایک طرف تو مذہبی تعلیم بہت ضروری تھی، لڑکے اگر مسجد جا سکتے تو وہاں جاتے ورنہ ان کے لئے تو مولوی صاحب قرآن حدیث پڑھانے کے لئے گھر آتے اور لڑکیوں کے لئے الگ بیبیاں مقرر تھیں' یہ حال تو بچوں کا تھا اور دوسری طرف جوانوں کا یہ حال کہ کہیں بٹیروں کی لڑائیاں ہیں تو کہیں مرغوں کی جنگ اور کہیں پتنگوں کے پیچ، یہ تو شیخ صاحب کی آنکھوں دیکھی باتیں تھیں۔ مگر چند کانوں سنی باتیں تھیں وہ ان سے بھی کہیں بڑھ کر تھیں، شیخ صاحب نے ان خاندانی روایات کو یکسر توڑ دیا تھا، پڑھ لکھ کر دفتر میں ملازمت کی بزرگوں نے احتجاج کیا، بڑی بوڑھیوں نے ناک بھوں چڑھائے کہ اس نے خاندان کو بٹہ لگایا، لاج گنوائی، کبھی کسی نے خاندان میں نوکری نہ کی تھی۔ مگر

شیخ صاحب اپنے ادارے کے پکے تھے۔ انہوں نے اپنی من مانی کی، نوکری کی اور اپنے ڈھنگ پر کی، ایسی جگہ کی جہاں سے لوگوں نے جھولیاں بھر بھر کر دولت سمیٹی تھی، دونوں ہاتھوں سے گھر بھرے تھے۔ مگر اللہ کے اس بندے نے گویا قسم کھا رکھی تھی۔ کہ تنخواہ کے علاوہ کسی سے ایک پیسہ لینا بھی حرام ہوگا، یہی نہیں اپنے آدمیوں کے کام تک سے اجتناب کیا کہ اسے سفارش اور رشوت سمجھا جائے گا ـــــ کسی نے کہا بھی انہوں نے جواب دیا،

"کروں گا کیا، ایک بیوی ہے، ایک میں ہوں، ہمارے لئے کافی ہے میں کیا قبر میں ساتھ لیکر جاؤنگا۔"

"اور اسی لئے شاید خدا تمہیں اولاد نہیں دیتا ـــــ"

شادی کے کئی سال بعد تک شیخ صاحب کے کوئی اولاد نہ ہوئی تھی لوگوں نے لاکھ کہا کہ دوسری شادی کر لو، انہوں نے خاندان کے کئی ایسے واقعات بتائے جہاں لوگوں نے ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دو، دو، تین، تین شادیاں کیں اور اچھی بھلی اولاد کے ہوتے ہوئے ـــــ ان کے ماموں کی تین بیویاں تھیں اور ان کی پھوپھی بھی تو تیسری جگہ تھیں اور ان سب نے خود آکر ان سے کہا مگر شیخ صاحب کو اپنے خدا پر بھروسہ تھا، انہوں نے ان کی بات نہ مانی اور کہا کہ اگر اللہ نے چاہا۔ تو اسی بیوی سے اولاد ہوگی ـــــ

اور جب اللہ نے چاہا تو اسی بیوی سے اولاد ہوئی ـــــ یہی لڑکا افتخار علی، شیخ صاحب نے خدا کا شکر کیا اور ان سب لوگوں کو خوب آڑے ہاتھوں لیا، مگر چند ہی دن بعد اس کی ماں کی صحت بگڑنی شروع ہو گئی بہتیرا علاج معالجہ کیا مگر موت کا علاج کس کے پاس ہے؟ بیچاری چند روز کے بعد چل بسی۔

شیخ صاحب یہ کہانی کئی بار سنا چکے تھے۔ کبھی یہاں سے، کبھی وہاں سے، مگر وہ اس کہانی کو کچھ اس طرح سناتے کہ ہر بار نئی معلوم ہوتی اور ان ٹکڑوں میں بار بار دہرائی ہوئی یہ کہانی گراں گزرنے کی بجائے اچھی خاصی دلچسپ معلوم ہوتی ـــــ اس میں کچھ شیخ صاحب کے طرزِ بیان کا بھی اثر تھا، ان کی آواز میں متانت اور گہرائی تھی اور وہ حقے کی نے ہاتھ میں تھامے کش لگانے کے درمیان باتیں کئے جاتے اور ساتھ والے حقے کی باری بھی بھول جاتے اور کبھی کبھی دھری کی دھری چلم بھسم ہو جاتی۔ اور نے



شیخ صاحب کے ہاتھ میں ہی رہتی اور جب بات ختم کر کے شیخ صاحب دم کھینچتے تو چلم میں تمباکو جل چکا ہوتا اور آگ سرد ہو چکی ہوتی

"کیا عورت تھی افتخار کی ماں" شیخ صاحب ایک لمبی آہ بھرتے ہوئے کہتے۔ "مرتے وقت مجھ سے کہنے لگی 'ہمارا بچہ تمہارے حوالے ہے زندگی یونہی ضائع نہ کرنا، شادی کر لینا' ـــــ اس کی زندگی میں بھی جب لوگوں نے مجھ سے دوسری شادی کے لئے زور دیا تو ایک دن اس نے بھی مجھ سے کہا کہ 'اگر آپ بھی یہی چاہتے ہیں تو بھلے' ـــــ اور اس کے بعد وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی مگر اس کی آنکھوں میں وہ بے چارگی تھی، وہ بے بسی تھی کہ میرے جی میں آیا اسے بات مکمل نہ کرنے دوں، اپنے کانوں میں انگلی ڈال لوں یا اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دوں، کہنے لگی۔ اگر خدا کو یہی منظور ہے کہ میرے ہاں اولاد نہ ہو ـــــ اور ـــــ"

"مگر" شیخ صاحب کہتے "میرے مولا کو یہ منظور نہ تھا، اولاد ہوئی"

"ہاں جی مولا کے رنگ نیارے ہیں، جسے جو چاہے دے ڈالے اور جس سے جو چاہے چھین لے۔" ان کے ساتھی حکیم صاحب کہتے اور اپنی بات شروع کر دیتے اور بات ان دنوں سے شروع کرتے۔ جب ان کی دکان میں چند شیشیاں تھیں اور ہوتے ہوتے بات پیروں فقیروں اور درویشوں تک پہنچ جاتی، حکیم صاحب کو بھی درویشوں سے ملنے کا شوق تھا اور شیخ صاحب کو تو پیروں فقیروں سے خاص عقیدت تھی

"واہ حکیم صاحب" وہ اپنے سر کے کھچڑی سے بالوں یا کھونٹے دار گالوں کو کھجاتے ہوئے کہتے، "اتنے فقیر دیکھے ہیں مگر جو بات ہم نے فقیرا میں دیکھی وہ نہیں پائی کہیں اور، کسی سے دھیلہ نہیں لیا کبھی اور نہ کسی شخص کے گھر گئے مگر میں حیران ہوں کہ ان کے پاس پیسہ آتا کہاں سے تھا، کئی بار دیکھا کسی نے آکر فریاد کی، کوئی آکر رویا، گڑگڑایا، آپ نے دائیں تکیے کے نیچے ہاتھ پھیرا اور کچھ نوٹ اس شخص کے ہاتھ میں تھما دیئے اور کہا کہ جا میاں کام کر، نیک کام میں لگا، اللہ بہتر کرے گا۔"

"ایک بار کیا ہوا، کہ وہ حقے کا کش لگاتے، وہ ایک بار کش لگاتے اور دھواں چھوڑتے ہوئے کہتے۔ "ایک بار کیا ہوا کہ آپ باتیں کرتے کرتے دفعتہ خاموش ہو گئے اور جب پہنچے ہوئے آدمی، یوں خاموش ہو جائیں تو سمجھ لو کہ اس کے بعد کی بات بڑے کام کی ہوگی ـــــ اور جب انہوں نے

درمیان سے آنکھیں کھولیں تو مجھے اشارے سے قریب بلایا۔

"ناصر!"

"جی!" میں نے عرض کیا۔

"تمہارے لئے ایک خوشخبری ہے" فرمایا "تمہاری ترقی کا حکم آیا ہے،
اب تم صاحب کے ساتھ میز پر بیٹھو گے"

میں حیران تھا کہ "یہ کیسے ہو سکتا ہے بابا جی، مجھ سے کتنے آدمی اوپر بیٹھے ہیں، میرا نمبر کہاں"

"ہو گیا بس، حکم آیا ہے ——" میں نے پھر عرض کیا۔ "سائیں جی صاحب میرے خلاف ہیں۔ اور پھر مجھ سے ——" سائیں جی مسکرا دیئے، بولے "ناصر! تجھے یقین نہیں آتا مگر دیکھ لینا، مولا کیا کرتا ہے، دیکھنا تم اسکے رنگ، حیران کس بات پر ہو، اسکے گھر کس چیز کی کمی ہے" ——

اور خود ہی شیخ صاحب ان باتوں کا یقین دلانے کے لئے کہنا شروع کر دیتے، "یہ آجکل کے لڑکے مذاق کرتے ہیں مگر بخشی حکیم پر ٹھیک ہے، حکم تو اوپر ہی سے آتے ہیں، یہ دنیاوی افسر کیا چیز ہیں، بڑی سرکار کی اجازت ہو تب قلم حرکت میں آتا ہے ان کا" —— اب اس واقعے ہی کو لو، افسر میرے خلاف، مجھ سے سینئر آدمی بیٹھے ہوئے اور میری ترقی ہو گئی، ہوا یوں کہ افسر کی اچانک تبدیلی ہو گئی، ایک آدمی معطل ہو گیا اور نئے صاحب کو میرا کام کچھ اسقدر پسند آیا کہ اس نے میری سفارش کر دی۔

—— اور انہی پیر صاحب نے مجھے اولاد کی خوشخبری سنائی تھی ایسے ہی مدبا بیٹھا تھا، مریدوں کی مجلس تھی بیٹھے بیٹھے خاموش ہو گئے، آنکھیں بند کر لیں اور پھر آنکھیں کھولتے ہوئے مجھے لڑکے کی خوشخبری دی۔ اور ساتھ ہی کہا،

"ذرا محبت سے پرورش کرنا اسکی!"

—— اور خدا کی قدرت، شیخ صاحب نے چھوٹی انگلی اور انگوٹھے سے دستہ قینچی بناتے درمیان کی انگلیوں کو اٹھاتے ہوئے بولے کہ اس کی پرورش کا سلسلہ چند ہی دن بعد میرے سر پر پڑا ——

"یہ رشتے ہمارے بھی کیا ہوتے ہیں" شیخ صاحب بات ختم ہوتے ہی ایک اور موضوع چھیڑ دیتے۔ "ابھی بے چاری کی آنکھیں بند کئے سال بھر بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ جیسے سر ہو گئے، پھر سے شادی کر لو

اور وہ بھی اسی بچے کے لئے

"ناصر بچے کا خیال کرو"

"یہ کام عورت ہی کر سکتی ہے" بزرگوں نے کہا۔

"جی ہاں" میں نے اکثر انہیں ایسا جواب دیا "اگر وہ خود بھی اس کی ماں ہو"

"اور تمہیں معلوم ہی ہے، تم سب کی آنکھوں دیکھی بات ہے کہ کس طرح پرورش کی ہے اس کی، کیا کیا مصیبت نہ اٹھائی ہے، دن کا چین گنوایا ہے، راتوں کو جاگا ہوں، یہ ذرا روتا تو میری جان آدھی رہ جاتی، اسے ذرا سی تکلیف ہوتی تو مجھے دنیا کا اہم سے اہم کام کرنا بھی دوبھر ہو جاتا، صبح، شام حکیموں ڈاکٹروں کے ہاں چکر لگاتا ——"

جیسے جیسے یہ لڑکا بڑا ہوتا گیا۔ شیخ صاحب کی باتوں کی عمر بڑھتی گئی اب لوگ اسکے بچپن کی باتیں سنایا کرتے، اس کی شرارتوں کا ذکر کرتے کی توتلی باتیں دہراتے اور ہنستے۔

پھر شیخ صاحب کی باتوں میں اس کی سکول کی باتیں بھی شامل ہوتی گئیں —— "اس بار افتخار جماعت میں اوّل آیا ہے" "اس بار افتخار نے وظیفہ لیا ہے" —— اور شیخ صاحب اس کی کامیابی پر شہر کے بہترین حلوائی سے لڈو منگواتے اور خود محلے میں سب کو بانٹتے پھرتے اور اگر کوئی پوچھتا کہ کس تقریب پر ہے۔ شیخ صاحب چلتے ہوئے انہیں بتاتے "آپ کو معلوم ہی نہیں، میرے افتخار نے ماشاء اللہ وظیفہ لیا ہے"

اور پھر افتخار نے بہت اچھے نمبروں پر میٹرک کیا، اس بات کا چرچا بھی کئی دن رہا، بہت سے لوگوں نے شیخ صاحب کو مشورہ دیا کہ لڑکے اب نوکر کروا دیا جائے مگر شیخ صاحب کو منظور نہ تھا، وہ اپنے لڑکے کو پڑھانا چاہتے تھے، یہی رائے اسکے سکول کے ہیڈ ماسٹر کی تھی کہ لڑکا بڑا ہونہار ہے، اسے کالج کی تعلیم دلانی چاہیئے، ہر چند شیخ صاحب کو معلوم تھا۔ کہ کالج کے اخراجات بہت زیادہ ہوتے ہیں مگر انہوں نے نہ ہمت ہاری اور نہ ارادہ ترک کیا، انہیں یقین تھا۔ کہ ان کا بیٹا حالات کو جانتے ہوئے کفایت سے خرچ کرے گا، شیخ صاحب نے اسے کالج میں داخل کرا دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے کالج کے دن گزار دیئے، پھر شیخ صاحب نے اسے دوسرے شہر کے ڈگری کالج میں بھیج دیا ——

"کیسے شیخ صاحب، افتخار کا کیا حال ہے،" حکیم صاحب یا کوئی اور ہمسایہ شیخ صاحب کو آتا جاتا دیکھ کر سوال کرتا، "کوئی خط آیا اس کا؟" — اور شیخ صاحب اگر کسی ضروری کام کیلئے بھی جا رہے ہوتے تو کام کاج بھول کر وہیں کھڑے ہو جاتے۔ "ہاں بھائی خوب اچھی طرح سے ہے، اللہ کا شکر ہے، میری محنت ٹھکانے لگ رہی ہے، بڑا ہونہار لڑکا ہے —"

اور ہمسایہ گویا شیخ صاحب کے منہ سے بات چھین لیتا۔ "اللہ اسے سلامت رکھے"

یا پھر شیخ صاحب کہتے "نہیں بھئی خط نہیں آیا، خیر ہو، فرصت ہی نہیں ملتی ہو گی، کالج میں پڑھتا ہے نہ آخر، بڑی پڑھائی ہوتی ہے حکیم صاحب سنتے ہیں یہ موٹی موٹی کتابیں پڑھنی پڑتی ہیں —" شیخ صاحب دونوں ہاتھوں کے اشارے سے کتاب کی ضخامت بتانے کی کوشش کرتے،

پھر افتخار کے خطوں میں کمی واقع ہو گئی، شیخ صاحب کبھی کام کی زیادتی سمجھتے، کبھی فرصت کی کمی اور کبھی یہ سمجھ کر مطمئن ہو جاتے۔ کہ اب اسکا دل وہاں لگ گیا ہے اور وہ اسے کچھ نصیحتیں کرتے، نماز روزے کی پابندی کی ہدایت کرتے —— اور افتخار ان خطوں کو پا کر ایک عجیب سی ذہنی الجھن میں مبتلا ہو جاتا، وہ ان باتوں کا کیا جواب لکھتا، ان باتوں کا خیال تو اسے ہمیشہ سے تھا، اس کی گھٹی ہی میں یہ چیزیں تھیں، وہ ان سے کیسے غفلت کر سکتا تھا پھر ان باتوں کے لکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی، کیا اعتماد کی کمی تھی؟ اس کا ذہن خود ہی اس سے انکار کر دیتا، شاید پیار کی زیادتی تھی وہ پیار جو بچوں سے کیا جاتا ہے —— وہ ان خطوں کا کوئی جواب نہ دیتا اور شیخ صاحب خود ہی اس کی توجیہہ کرتے، شاید یہ وجہ ہو، شاید —— اور اگر کبھی افتخار خط لکھتا تو کبھی موٹی موٹی کتابوں کا ذکر کرتا اور کبھی بڑی بڑی ضروریات کا جو ان روپوں میں جو شیخ صاحب اسے بھیجتے تھے۔ پوری نہ ہو سکتی تھیں ——

ادھر شیخ صاحب کو پنشن مل رہی تھی، انہوں نے نوکری کی مدت بڑھانے کی درخواست دے دی،

"شیخ صاحب کیا کریں گے نوکری کی میعاد بڑھا کر، اب آپ آرام کیجئے —"

"بھئی ذرا افتخار کی تعلیم مکمل ہو لے، پھر مجھے آرام ہی آرام ہے"

شیخ صاحب جانتے تھے کہ افتخار کبھی فضول خرچ نہ ہو سکتا ہو اس کی ضروریات واقعی زیادہ ہونگی۔ جو وہ ان کا تذکرہ کرتا ہے۔ انہیں امید تھی کہ نوکری بڑھانے کی درخواست منظور ہو جائے گی۔ اور واپسی پہ انہوں نے اسے بارہا تسلی دی کہ اسے گھبرانا نہ چاہئے تھا، ابھی جیسے کیسے بھی ہو گا اسے پڑھنا چاہئے —— اور افتخار نے واقعی خرچ کم کرنے کی کوشش کی، ہوسٹل چھوڑا، ہوسٹل سے وہ تی کھانی چھوڑ دی۔ مگر اس کے باوجود وہ مطمئن نہ ہو سکا، اس نے ضرورتاً نہ گھبرانے کی کوشش کی۔ مگر شاید وہ سچ مچ گھبرا گیا تھا۔ کیونکہ زندگی میں پہلی بار وہ ایک امتحان میں کامیاب نہ ہو سکا، اس بات سے شیخ صاحب کو بڑا صدمہ ہوا، انہیں یقین نہ آتا تھا کہ یہ بھی ہو سکتا تھا کئی دن تک شیخ صاحب گھر سے نکلنے سے رہے، اور یہ بھی مشکل تھی کہ اس کا اظہار وہ کسی سے نہ کر سکتے تھے، ان کی طبیعت یہ گوارا نہ کرتی تھی کہ وہ کسی سے کہیں افتخار کامیاب نہ ہو سکا تھا

اور اس بار افتخار گھر آیا تو نہ اُسے شیخ صاحب نے جھلائی۔ اور نہ شیخ صاحب ہی کھل کر بات کہہ سکے، نہ باپ نے پوچھا کہ وہ کیوں پاس نہ ہو سکا تھا اور نہ ہی بیٹے نے کوئی وجہ بتانا مناسب سمجھی۔ مگر اپنی اپنی جگہ دونوں بیٹھے تھے۔ کہ کیسے دوسرے کو سمجھائے، کہ یہ کوئی بہت بڑا واقعہ نہ تھا۔ اور وہ اسے برداشت کر سکتا تھا۔ مگر کسی نے بھی کچھ نہ کہا، رشتہ تیز تر ہو گیا اور دونوں گھٹے گھٹے سے رہے ——

افتخار کو اس بار گھر بڑا سنسان سا نظر آیا، اپنی گھسی چند چارپائیاں جو معہ ایک لکڑی کے پرانے تخت تھے اور یہ سب گویا ایک دوسرے سے منہ لپیٹے پڑے تھے، یہ عجیب سی خاموشی اور اداسی اسے بڑی عجیب سی محسوس ہوئی جیسے ویرانے میں چلا آیا تھا، کئی بار اسے خیال آیا کہ گھر میں کوئی ایسا شخص ہونا چاہئے تھا۔ جس سے وہ کچھ کہہ سکتا۔ جو باتیں اسے شیخ صاحب سے کہنا تھیں اسے کہہ دیتا تاکہ وہ شیخ صاحب تک پہنچ جاتیں مگر وہاں تو وہی اداس سی چارپائیاں تھیں، جیسے وہ کسی اجنبی سرائے میں آگیا تھا ——

شیخ صاحب سے اگر کسی نے گھر کی ویرانی کا ذکر بھی کیا تو انہوں نے ٹال دی، اسے کوئی اہمیت ہی نہیں دی۔ اور اگر کچھ کہا بھی تو یہی کہ بھئی یہ کام، گھر سجانا، چیزوں کو ٹھکانے سے رکھنا اور یہ سب عورتوں کے کام

دو تین لڑکے کرشنگ کے ہوتے ہیں۔ میں اکیلی جان کیا کیا کروں، افتخار تعلیم سے
فارغ ہو جائے گا تو اس کی شادی کر دوں گا، گھر میں بہو آ جائے گی۔ تو گھر خود بخود
ہی سنور جائے گا۔

"اور پھر شیخ صاحب کہتے "میری آمدنی بھی تو کوئی ایسی زیادہ
نہیں، مہنگائی کے زمانے میں یہ تھوڑی سی تنخواہ بھی غنیمت ہے۔ کہ عزت سے
گزر بسر ہو رہی ہے، لڑکے کی تعلیم پر خرچ ہو رہا ہے —— "اور یہ بات
حقیقت سے بعید بھی نہ تھی، باپ دادا نے تو ساری کمائی اور جائداد اپنے
کھیل تماشے میں ضائع کر دی تھی۔ اور شیخ صاحب نے جاننا و بنانے والے
کسی وسیلے کو اپنایا ہی نہ تھا، ورنہ اس نوکری سے بھی تو وہ بہت کچھ بنا سکتے
تھے۔ اور ہر بات کو وہ "اللہ کا دیا بہت کچھ ہے" کہکر ٹال دیتے،

اور اگر یہی بات افتخار کہہ دیتا اور ایسی بات اکثر ہو ہی جاتی تھی۔ جب
وہ کالج سے واپس آ کر یہ کہتا کیا برے سے معلوم ہوتے ہیں، کوئی میز
ہی ہوتی، دو ایک کرسیاں ہی ہوتیں، کوئی دو دوستوں کو بٹھا ہی سکتا —— تو
شیخ صاحب ناراض ہو جاتے،

"تمہارا خیال ہے میں تمام عمر گلچھرے اڑاتا رہا ہوں، میاں خود کماؤ گے
تو پوچھیں گے کیا حال ہوتا ہے۔ اگر کسی نواب کے یہاں تو پیدا نہیں ہوئے تھے
تم، یہی کافی ہے کہ تم پڑھ رہے ہو ورنہ میری تنخواہ کیا ہے؟ کبھی سوچا
بھی ہے؟" اور افتخار کے پاس سوائے خاموشی کے اور کیا تھا کہ جواب دیتا
اسے معلوم تھا کہ اس سے کم تنخواہ والے شخص بھی اپنے بچوں کو ویسی ہی تعلیم
دلوا رہے تھے۔ گو اپنے والد کا فقرہ بھی اسے معلوم تھا کہ "عزت سنبھالے
رہو، ایمان قائم رہے، تنگی سہی، یہی بہتر ہے ——"

افتخار کئی دن گھر میں رہنے کے بعد واپس چلا گیا، وہ شیخ صاحب سے
بہت کچھ کہنا چاہتا تھا، کئی بار اس نے پیرایہ بھی سوچا مگر والد کو یوں دیکھ کر
اسے ہمت نہ ہو سکی —— اور جس بات نے اس کی زبان پکڑلی تھی۔ اسی نے
قلم بھی تھام لیا، اسی لئے واپس جانے کے بہت دیر بعد تک اس نے گھر
خط تک نہ لکھا،

اور اب شیخ صاحب ہمسایوں سے اس کے خطوں کی کمی کی شکایت بھی
نہ کر سکتے تھے، انہیں معلوم تھا کہ اس کی ناکامیابی کی بات ان کے نہ بتانے
کے باوجود انہیں معلوم تھی اور وہ کہنے لگے تھے کہ اس نے وہاں جا کر طور

بدل لی ہو گی، عیش کرنا شروع کر دیا ہوگا — اور انہیں اس بات سے بہت دکھ
ہوتا تھا، وہ یہ نہیں کہہ سکتے تھے، پھر بھی ہوا افتخار ایسا نہیں ہو سکتا،
"ورنہ وہ فیل کیسے ہو گیا؟" وہ کہتے
- سو باتیں ہو سکتی ہیں، صحت کی خرابی ہو سکتی ہے، بیچارا خدا
جانے کہاں سے روٹی کھاتا ہے، کیسا گھی ہوتا ہے، کیسا دودھ، آجکل
شہروں میں الا بلا سی چیزیں ملتی ہیں ہوٹلوں میں —— اور جب تک انسان
کی صحت ٹھیک نہ ہو وہ کام کیا خاک کر سکتا ہے —— .

اور ایسی ہی باتیں شیخ صاحب اپنے خطوں میں اسے لکھ دیتے کہ
یہ کیا کرو، وہ نہ کیا کرو، صحت کا خیال رکھو —— اور افتخار جھنجھلا اٹھتا
کہ آخر اسے ابھی تک بچہ کیوں سمجھا جا رہا تھا، اسے خود سوچنے کا حق کیوں
نہیں دیا جاتا تھا، اسے بھی اپنی ضروریات کا احساس تھا، اس کی اپنی
بھی کوئی رائے تھی، جب کبھی اس نے اپنی رائے ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی،
اسے دبا دیا گیا تھا، اگر اس نے گھر کی کسی بے قاعدگی کا ذکر کیا تھا۔ تو اسے
کہا گیا "شہر میں جا کر اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے جب خود گھر بسائیگا
تو دیکھیگا" "لیجئے، اس گھر میں تو یہی کچھ ہے، یہی کچھ تھا، بڑی بات ہے، وہ
یہاں چھٹیوں میں بھی نہ آیا کرے ——

اور جب وہ چھٹیوں میں بھی گھر نہ آتا تو اسے تمام پرانی باتیں یاد
دلائی جاتیں اور اس کی سرد مہری کا گلہ کیا جاتا اور وہ بےبس ہو کر چلا آتا
گھر آ جاتا تو وہی بات، وہ کچھ نہ کچھ کہہ بیٹھتا اور شیخ صاحب اسے پھر وہی
جواب دیتے ——

"خود کماؤ گے تو پوچھیں گے،"

بُرا ہو یا بھلا وقت رکتا کب ہے، یہ وقت بھی کٹ گیا، افتخار تعلیم
سے فارغ ہو گیا، پھر اسے ملازمت بھی مل گئی وہ روزی کمانے لگا تو اسے معلوم
ہوا کہ یہ کام کس قدر مشکل تھا اور اس میں ایماندار رہنا اس سے بھی کتنا کٹھن،
شیخ صاحب ٹھیک ہی کہتے تھے، اسے ان باتوں کے جواب میں کہی اپنی
باتیں یاد آ جاتیں۔ تو وہ بہت شرمندہ ہوتا۔ مگر اب وہ کر کیا سکتا تھا،
شیخ صاحب کی وہ ہمیشہ سے عزت کرتا تھا، اس میں اضافہ کا سوال ہی تھا.

وہ برسر روزگار ہوا تو شیخ صاحب نے سوچا اس کی شادی کر دیں اس
آخری ذمہ داری سے بھی سبکدوش ہو جائیں۔ افتخار اگر اب بھی کما کر

کے لئے نوکر کا انتظار کرنے کو کہتا تو وہ کہتے، بیچارا تو جیسے سمجھتا ہے جیسے کوئی
مورت سے ہو جائے، اور کیا خاک بٹائے گا —" مگر انتظار اس پر رضامند تھا
تنخواہ کم ہے، یہ خرچ کم ہے، وہ خرچ پورا نہیں ہو سکتا — ابھی نہیں،
ابھی نہیں — شیخ صاحب تنگ آ گئے تھے، "میری تنخواہ کیا تھی، اور اس
تنخواہ میں کیا کچھ نہیں کیا، آخر پورا اتنا کما تو نہیں، میں تمہارا باپ ہوں،
— مگر بیٹے کو اس حق پر کوئی اعتراض نہ تھا، اسے تو اپنی ضروریات کا
گلہ تھا —

"تمہیں خدا پر پورا بھروسہ نہیں، وہ بیٹے رانا قور ہے۔ اور پھر جو
بچہ آتا ہے، اپنی قسمت ساتھ لاتا ہے — کیا خبر اس کے آتے ہی ترے دن
پھر جائیں —"

"یہ پرانی باتیں ہیں قبلہ!"

"اسی لئے پڑھایا تھا تجھے —"

"آپ تو خواہ مخواہ ناراض ہوتے ہیں —"

"خواہ مخواہ، مجھے جیسے سودا ہے، جنون ہے، تمہارا خیال ہے
میں فضول بول رہا ہوں، میں خبطی ہو گیا ہوں —"

اب شیخ صاحب دراصل تھک چکے تھے، ان کی ہمت جواب دے
رہی تھی۔ وہ چاہتے تھے، کہ تکرار کم ہو، سنبھالتے، ادھر اپنی یاد خدا کو
سکیں۔ مگر ہوتا یہ کہ جب انتظار آتا تو اس کا سچ کا تلخیہ بھی غائب ہو جاتا
رات کو نہ کوئی ایسی بات ہو جاتی۔ جس کے بعد وہ منہ سر لپیٹے پڑے
رہتے اور صبح دیر تک سوئے رہتے —

— اور صبح اگر کوئی ہمسایہ اس کی وجہ پوچھ بیٹھتا تو شیخ صاحب
کھوئے کھوئے کو کھجاتے ہوئے سرہلا کر کہتے —

"میں نے اس لڑکے سے اتنی محبت کی ہے کہ اس کے خلاف کچھ کہتے
ہوئے مجھے خود ہی شرم آتی ہے، اب میری ہر بات اسے کھٹکتی ہے، میں
فضول بولتا ہوں، اس کے خیال میں شاید میں خبطی ہو گیا ہوں —" اور بات
کرتے کرتے شیخ صاحب اکثر آبدیدہ ہو جاتے، "خدا جانے مجھے کن سے
گناہوں کی سزا مل رہی ہے۔ اللہ سب کے گناہ معاف کرے —"

مگر اس رات تو باپ بیٹوں کی باتیں خاصے طویل جھگڑے کی شکل اختیار کر
چکی تھیں اور گئی رات تک وہ زور زور سے بولتے رہے تھے —

اور صبح جب دیر تک شیخ صاحب کی آواز سنائی نہ دی، اور دن چڑھے تک
شیخ صاحب کی شرمندہ شرمندہ صورت نظر آئی تو حکیم صاحب نے شک کی نظروں
سے ساتھ والے ہمسائے سے پوچھا، وہ ہمسائے نے بھی نظریں اپنے ساتھ والے
کی طرف پھیر دیں —

بہت دیر کے بعد جب وہ ان کے یہاں گئے تو انہیں معلوم ہوا
کہ شیخ صاحب رات ہی رات میں وہاں سے جا چکے تھے، کہاں؟ یہ کسی کو بھی
معلوم نہ تھا، شاید اپنے نا کردہ گناہوں کا کفارہ ادا کرنے گئے تھے!

(بقیہ صفحہ ۷۷)

وہ میرا بچہ ہے۔ جو میری گود میں ہمکنے کے لئے ترس گیا ہے، وہ میرا
گھر ہے۔ جس پر تاریکیاں چھائی ہوئی ہیں —— " لیکن وہ
کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ چپ چاپ وہ اپنے ہی جیسے اُن بے شمار لوگوں
کے متعلق سوچتا رہا۔ جو سرحد کے آر پار دونوں طرف اس سنگین دیوار
سے سر پھوڑ رہے تھے، اُن بے شمار مظلوموں کے متعلق سوچتا
رہا۔ جن کی آنکھیں منجمد ہو گئی تھیں —— اُن گھروں کے متعلق
سوچتا رہا جن پر تاریکیاں چھائی ہوئی تھیں —— !!

وہ سوچ رہا تھا۔ اور اُس کی حسرت بھری نگاہیں، اُس
کے اوپر پھیلے ہوئے وسیع آسمان کے نیلے سینے میں گڑی ہوئی تھیں
—— جہاں پاکستان کے کوے ہندوستان جا رہے تھے
—— ہندوستان کے کوے پاکستان آ رہے تھے —— !!
کوئی سنتری اُن کی راہ روکے نہیں کھڑا تھا —— اُن کے
درمیان کوئی دیوار حائل نہیں تھی —— !!

صبح صادق چھیڈ

# دیوار

" میں پناہ گزین ہوں بابو! "

بابو خاموش رہا۔

" بابو! میں پناہ گزیں ہوں بابو! " وہ پھر گڑگڑایا

" تو میرے کپڑے اتار لو نہ پھر۔ " بابو نے نہایت کٹیلی پنجابی میں اُسے کہا۔

اور اُس کا جی چاہا۔ کہ وہ اس کے کپڑے تو کیا اُس کی چمڑی بھی اُتار لے ــــ لیکن اُسے پرمٹ لینا تھا۔ ہندوستان جانے کا پرمٹ۔ اپنے گھر جانے کا پرمٹ! ـــــ وہ ہاتھ پھیلائے کھڑا رہا۔

" دیکھئے کیا ہو؟ لے لو نا، لو یہ لو " بابو نے اپنا کوٹ اتار دیا ــ " دیکھوں پسینہ نہیں آیا یہ؟ ـــــ یار تم ہی اسے اپنی اچکن اتار دو " وہ اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا۔ " پناہ گیر ہے نا! " ـــــ

اور اُسے دفتر سے باہر دھکیل دیا گیا ـــ اپنے بے نیاز خدا کا شکر ادا کرتا ہوا وہ باہر نکل آیا، کہیں انہیں ایسی آزادی نہیں مل گئی جس میں کھانے کے لئے بھی پرمٹ کی ضرورت ہوتی ـــ جس میں سانس لینے کے لئے بھی پرمٹ لینا پڑتا ـــ! اور اُسے اپنے رب عظیم کی ہستی عظیم تر محسوس ہونے لگی۔ جو دیتا ہے تو بغیر پرمٹ کے چھپر پھاڑ کے دیتا ہے۔ اور نہیں دیتا تو نہیں دیتا ـــ اندھے بادل ـــ جو سمندروں پر برستے ہیں۔ مگر ویران اور مرجھائی ہوئی کھیتوں پر سے چپ چاپ گزر جاتے ہیں!!

یہی امید لے کر وہ ہر روز اس دفتر میں آتا تھا کہ اندھے بادل شاید کبھی بھولے سے اُس پر بھی جھک جائیں ـــ ایک مہینے سے اس نئی بنائی تین میل لمبی سڑک پر وہ جوتیاں چٹخاتا پھر رہا تھا کہ شاید اُسے اپنے گھر جانے کا پرمٹ مل جائے۔ لیکن اُسے اب تک دھکوں کے سوا کچھ نہیں ملا تھا۔

۱۵ اگست سے پہلے دفتر کے دوسرے چپڑاسیوں کے ساتھ اُس نے بھی لکھ کے دے دیا تھا کہ وہ پاکستان جائیگا، نئی نئی جگہیں دیکھنے اور اپنے ملک کی خدمت کرنے کی تمنا نے کہ اُس نے یہ فیصلہ کیا تھا اور اس نئی دہلی کی چمکتی ہوئی ہموار سڑکوں کی بجائے وہ منٹگمری کے ایک دور افتادہ گاؤں میں، مرکزی حکومت کے ایک ملازم کا چپڑاسی تھا جہاں سب اجنبی تھے، جہاں ہر وقت لوگ تھکتا چلنے سکتے، جہاں ہر طرف ریت ہی ریت تھی!

وہ گوبند پور کا رہنے والا تھا: وہ دہلی میں ملازم تھا۔ جب اُس نے گھر خط لکھا کہ اُس نے پاکستان جانے کے لئے لکھ دیا ہے تو اس کا باپ اُسے منع کرنے کے لئے آیا، اُس کی بیوی نے اُسے منت بھری چٹھیاں لکھیں، لیکن اُس نے اُن کی باتیں ہنسی میں ہی اُڑا دیں۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ حالات کبھی اتنے بھی بگڑ جائیں گے۔ اور پھر اُسے اپنے نوزائیدہ ملک کی خدمت کا جذبہ بھی بے چین کئے ہوئے رہا تھا ـــ اپنے ضعیف باپ کو تسلی دے کر اُس نے واپس بھیج دیا اور اپنی بیوی کو لکھ بھیجا کہ وہ پاکستان جانے سے پہلے اسے ملنے آئیگا۔

لیکن پھر ایک دم ہر طرف ایک عجیب، ہراس پھیل گیا۔ لوگ گھروں میں ہی مقید ہو کے رہ گئے اور باہر نکلنا تک محال ہو گیا اور آزادی کے روز اپنے گھروں میں ہی بیٹھے اُنہوں نے جشن آزادی کا شور و غل سنا اور اُس جشن کا تصور کرتے رہے۔ جو اُن سے دور، بہت دور ایک نئی دھرتی پر آج ہی کے روز منایا جا رہا تھا ـــــ اور آج اس نیم

برِ اعظم کی طرح دہلی بھی تقسیم ہو کر رہ گئی تھی، —— دہلی جو چراغاں تھی، جہاں
ہر کوئی بدمست تھا، اور دہلی جس پر تاریکیاں چھائی ہوئی تھیں، جہاں لوگ
سہمے ہوئے کونوں میں دبکے پڑے تھے! —— دہلی جس کی مردہ رگوں
میں نئی زندگی کے ٹیکے دئیے جا رہے تھے اور دہلی جس میں سانس لینے
کی اجازت سلب کی جا رہی تھی —— ! دہلی جو پیدا ہو رہی تھی، دہلی جو
مر رہی تھی!!

کتنے ہی روز اُسے گھر میں بند رہنا پڑا، مختلف محلے مورچے بن کر
رہ گئے، شہر میں ہر جگہ دھماکے بڑھتے گئے۔ دھوئیں کے تاریک بادل
گہرے ہوتے گئے۔ اور دہلی جو پیدا ہو رہی تھی جنم لینے سے پہلے مر گئی!

ہر طرف سے لپکتے ہوئے خنجروں کی چھاؤں میں وہ ہمایوں کے
مقبرے تک پہنچا۔ جہاں پناہ گزینوں کا کیمپ تھا —— اُس نے ارادہ کیا
کہ وہ گھوکھرو چلا جائے، لیکن اُس میں اتنی ہمت ہی نہ ہو سکی۔ ایک عجیب
سا نفرت کا احساس ایکدم سے اُس کے دل میں اپنی جنم بھومی کے خلاف پیدا
ہو گیا تھا —— جہاں اُس نے اپنی عمر کے پچیس سال گزارے تھے،
جہاں کی گلیوں میں ابھی تک اُس کا شریر بچپن اُسے چوکڑیاں بھرتا ہوا
محسوس ہوتا تھا۔ جہاں اُس کا ضعیف باپ تھا، جہاں اُس کی بیوی تھی،
اُس کا پیارا سا معصوم بچہ تھا —— اس کے باوجود وہ وہاں نہ جا
سکا۔ وہ جلد از جلد پاکستان پہنچ جانا چاہتا تھا۔ جہاں پہنچ کر وہ اپنے
باپ، اپنی بیوی اور پیارے سے بچے کو بلا لے۔ جہاں وہ ایک نئی
پُر امن زندگی کی بنیاد رکھ سکیں، جہاں سب دوست ہوں، جہاں کوئی دشمن
نہ ہو! —— کئی روز تک وہ اپنے کمرے میں بند پڑا رہا۔ اپنے دروازوں
کی اوٹ میں سے ڈرتے ڈرتے جھانکتے ہوئے اُس نے کئی دفعہ امدادی
لاریوں کو روکنا چاہا۔ لیکن اُس کے حقیر سے مختصر دروازے پر ایک مرتبہ
بھی نہ رک سکیں، یہ لاریاں جو صرف بڑی بڑی کوٹھیوں کے شاندار برآمدوں
سے ہمایوں کے مقبرے تک اور ہمایوں کے مقبرے سے بڑی بڑی کوٹھیوں
کے شاندار برآمدوں تک چلتی تھیں۔ زمین کے ساتھ چمٹے ہوئے گھروندوں
کے پاس ایک دفعہ بھی نہ رک سکیں، ایک دفعہ بھی حقیر مختصر دروازوں کی
زندگی کے ساتھ رشتہ قائم نہ ہو سکی!! —— ہر طرف سے مایوس ہو کر اُس
نے اپنے ماتھے پر ایک تلک لگایا۔ اور دوزخ سے نکھری ہوئی سنسان

سڑکوں پر کانپتا لرزتا ہوا وہ ہمایوں کے مقبرے تک پہنچ گیا —— ماتھے
پر صرف ایک تلک لگا کر وہ جیسے انسان بن گیا! پندرہ اگست کے
بعد کا انسان!!

اور جمنا کے کنارے وہ اُن بے شمار لوگوں میں آ ملا جو سلطنت کی بو
سے مایوس ہو کر شاید اپنے پرانے شاہوں کو جگانے چلے آئے تھے
نئے شاہ جنہیں اپنی موت یاد نہیں تھی۔ پرانے شاہ جو جاگ اُٹھنے سے
معذور تھے ——! اور اُن کے درمیان وہ بے شمار انسان بھٹک
رہے تھے۔ جنہیں بھیڑوں کی طرح وہاں دھکیل دیا گیا تھا۔ جو اگر چاہتے
تو نئے شاہوں کو موت بھی آ جاتی، پرانے شاہ جاگ بھی اُٹھتے
——!

وہیں اُسے ننگی دھرتی پر سونے کے لئے ایک بوسیدہ سے
خیمے میں جگہ مل گئی۔ وہیں اُسے دو مہینے گزارنے پڑے۔ اُن کے
سامنے ہی مقبرے کی اوپر کی منزل میں وہ لوگ بستے تھے۔ جو بڑی بڑی
کوٹھیوں کے شاندار برآمدوں سے امدادی لاریوں پر یہاں تک پہنچے
تھے۔ جہاں سے وہ سخت زمین پر لیٹے ہوئے اب بھی نغموں کی آوازیں
سنتے تھے۔ جہاں اب بھی ریڈیو بجتے تھے۔ جہاں سے اب بھی گھنگروؤں
کی چھنا چھن کی صدائیں آتی تھیں —— ! اور وہ اپنے ساتھ لایا ہوا کھانا
خود ہی پکا کر روکھا سوکھا کھاتا رہا اور اُس کے آس پاس پھیلے بے شمار
لوگ پاکستان کے لدے ہوئے کھیتوں کی طرف آس لگائے بیٹھے
رہے۔ اور پاکستان سے آنے والا خوراک کا ہر جہاز مقبرے کی
اوپر کی منزل میں خالی ہوتا رہا —— ! آتا رہا، خالی ہوتا رہا، واپس
جاتا رہا —— ان گنت لوگوں کی آس ٹوٹنے نہ پائی ——!!

دو مہینے تک اُسے وہیں رہنا پڑا۔ اور جب پناہ گزینوں کی گاڑیاں
پاکستان جانا شروع ہوئیں۔ تو وہ بھی تیار ہو بیٹھا۔ لیکن جب دہلی سے
اگلے ہی اسٹیشن پر پناہ گزینوں کی ایک سالم گاڑی قتل کر دی گئی۔ تو اُس
کی ہمت ٹوٹ گئی اور وہ وہیں کیمپ میں پڑا رہا۔ جیسے اُس کے
پاؤں تلے سے آخری تختہ کھینچ لیا گیا ہو —— اور وہ یہیں پڑا
پڑا سوچتا رہا کہ کاش وہ ہندوستان میں آنکھیں بند کرے اور
جب آنکھیں کھولے تو پاکستان پہنچ چکا ہو، کاش وہ ایک

سی حسرت، ایک ہی اُٹھان میں اپنی منزل تک پہنچ جانے کی خواہش ـــ
لیکن کچھ بھی تو نہ ہو سکا۔ ایک پناہ گزینوں کی گاڑی ہی میں اُسے
روانہ ہونا پڑا۔

راستے میں اُسے ہر اسٹیشن پر ان گنت لوگ ملے جو اپنے گھر چھوڑ کر چلے آئے تھے۔ اور ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ ڈیرے ڈالے ہوئے تھے، جو پاکستان جانا چاہتے تھے ـــ راستے میں اُسے لاتعداد ہندو اور سکھ پناہ گزینوں کی گاڑیاں ملیں جن میں بیٹھے ہوئے بچے تھے، ذلیل کی گئی ہوئی حقیر۔ کٹے ہوئے، زرد تھے، ـــ جن کی آنکھوں میں شکست کھائے ہوئے زخم خوردہ پندار کی جھلک تھی، جن کے چہروں پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ اور جو اپنی ہی طرح اپنا وطن چھوڑ آئے تھے ـــ! اور اُسے شدید احساس ہوا۔ جیسے اُن کے ساتھ بہت بڑا دھوکا کیا گیا ہو۔ اور اُس کا جی چاہا کہ وہ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر بھاگنے والی گاڑیوں کو روک کر کھڑا ہو جائے اور چیخ چیخ کر تمام لوگوں کو بتا دے کہ ـــ "ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے، آزادی کے بعد بھی ہم ایک دوسرے سے محبت کر سکتے ہیں ـــ ہم اجنبیوں نے ان گنت صدیوں سے ایک دوسرے سے محبت کی ہے ـــ ہم نے دھوکے میں آ کر ایک دوسرے پر ہاتھ اٹھایا تھا، ہم نے مانگے کے نشے میں آ کر ایک دوسرے کی عزت اُچھالی تھی ـــ اس کا مداوا اب بھی ہو سکتا ہے! ـــ اب بھی کچھ نہیں گیا ہے، اب بھی ایک دوسرے کی نادانیوں پر مسکرا کر ایک دوسرے کو معاف کر دو اور اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ ـــ!" ـــ
لیکن وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ اپنے پاس سے گزرنے والی پناہ گزینوں کی گاڑیوں کو وہ چپ چاپ گزرتا ہوا دیکھتا رہا۔ اور اُس کی اپنی گاڑی پاکستان پہنچ گئی۔

اور جب لاہور کے وسیع اسٹیشن پر گاڑی رکی اور ایک مختصر سی گٹھڑی اور پھٹا ہوا بستر لے کر وہ نیچے اترا۔ تو اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ دوبارہ جنم لے رہا ہو، جیسے اُسے ایک نئی دنیا میں پھینک دیا گیا ہو۔ جہاں اُسے اپنے کٹے ہوئے بازوؤں کے ساتھ پھر سے تگ و دو کرنی تھی۔ اور اُس نے دیکھا۔ کہ اُس کے ساتھ ہی گاڑی سے اترنے والا ایک بوڑھا پاکستان کے جھنڈے کو دیوانوں کی طرح چوم رہا تھا۔ اور اُس کے بہت سے ساتھی رو رہے تھے ـــ اُس کا بھی دل بھر آیا ـــ شاید اس لئے کہ اُسے اپنا دور دراز کا وطن یاد آ رہا تھا، یا شاید اس لئے کہ اُسے اپنے پاس سے گزرنے والی لاتعداد گاڑیوں میں جانے والے بے شمار بدنصیب لوگ یاد آ رہے تھے جو اس جھنڈے تلے اماں نہ ڈھونڈ سکے ـــ!

اپنی مختصر گٹھڑی اور پھٹا ہوا بستر سنبھالے وہ باہر نکل آیا مسافر خانہ اور اُس کے آس پاس کی جگہ اُس جیسے ہی سینکڑوں لوگوں سے بھری پڑی تھی۔ جو وہاں عرصے سے ڈیرے ڈالے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ تھکاوٹ سے اُس کے جسم کی رگ رگ دکھ رہی تھی۔ کئی راتوں سے وہ جاگ رہا تھا۔ وہیں اپنا قلیل سامان رکھ کے وہ سو گیا۔ اور جب وہ کئی گھنٹوں کی بے سدھ نیند کے بعد جاگا۔ تو اُس کی مختصر گٹھڑی اور پھٹا ہوا بستر جا چکا تھا اور اُس کی جیبیں خالی تھیں ـــ!
اُس کے پیٹ کی آنتیں جیسے ایک دم سے جاگ اٹھیں۔ اُس نے محسوس کیا کہ اُس نے چوبیس گھنٹوں سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اور اب شدت کی بھوک چمک اٹھی تھی اور اُس کی جیبیں خالی تھیں ـــ تب اُس نے زندگی کی پہلی بھیک مانگی! اپنے ساتھ ہی پڑے ہوئے ایک بوڑھے سے اُس نے باسی روٹی کا ایک ٹکڑا مانگ کر کھایا اور پہلے سے زیادہ بے پرواہی کے ساتھ پہلے سے زیادہ بے سدھ ہو کر وہ پھر سو گیا ـــ!

اگلے دن وہ اپنے دفتر پہنچا اور اُسے دس روپے کا ایک نوٹ اور منٹگمری پہنچ جانے کا حکم مل گیا۔ اور وہ دس روپے کا نوٹ اپنی مٹھی میں دبائے یوں خوش خوش باہر نکل آیا جیسے اس نئی دھرتی پر اُس کے شاندار مستقبل کی پہلی اینٹ رکھ دی گئی ہو ـــ! نئی زندگی کے نئے ارادوں کے ساتھ جھومتا ہوا وہ منٹگمری کے ریتلے اور دور دراز کونے میں پہنچ گیا۔

دو تین مہینوں تک اُسے اپنے گھر بار والوں کا کچھ پتہ نہ مل سکا۔ اُس نے کئی خطوط گورکھپور لکھے۔ اپنے باپ کو اور اپنی بیوی کو۔ لیکن اُسے کوئی جواب نہ ملا۔ اُسے خبریں ملتی رہیں کہ

ہندوستان میں حالات بہت ابتر ہیں۔ اور اس کی تشویش بڑھتی گئی ۔۔۔ نہ جانے کیا ہوگا اُس کا باپ، اُس کا بچہ شاید اب اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا اور فاطمہ ۔۔۔۔ کیسے گزرتے ہوں گے اس کے دن۔ فاطمہ جس کے ساتھ تھوڑا سا عرصہ پہلے اُس کی شادی ہوئی تھی ۔۔۔ ریتیلے اداس ویرانوں پر ابھرتا ہوا وہ فاطمہ کے متعلق سوچتا رہتا اور اسے خوشگوار ماضی کے وہ تذکرے میں اسے ایک تابندہ شعل ابھرتی ہوئی محسوس ہوتی۔ وہ تابندہ شعاعیں نے اُس کی بھٹکتی ہوئی حیات کو راہ دکھائی وہ فاطمہ جس کے ساتھ اُس نے بچپن کھیل کے گزارا اور جس کے شانوں پر سر رکھ کر اُس نے ایک مختصر عرصے کیلئے ایک چمکتے ہوئے مستقبل کے خواب بُنے ۔۔۔ اُس کی ایک ایک شرارت اُسے یاد تھی۔ اس کی ہر شرارت کا الزام وہ اپنے اوپر لے لیتا۔ وہ اُسے جلانے کے لئے ہمیشہ دوسرے لڑکوں سے کھیلتی۔ لیکن جب ایک مرتبہ گاؤں کے باغ سے آم چرانے پر اُس نے اپنے آپ کو پٹنے کے لئے پیش کر دیا۔ تو گویا وہ عمر بھر کے لئے اُسکے ہاتھوں بک گئی۔ اور شام کو جب وہ اپنے گھر کے سامنے بیٹھا تھا وہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اُس پر جھکی، گئی اور اُس کے خلوص بھرے گرم گرم آنسو دیر تک اُس کی چوٹوں کو سہلاتے رہے ۔۔۔! تب وہ بالکل بچے تھے۔ لیکن پھر بچپن کا یہی بےنام سا کھیل اُن کی زندگی کا کھیل بن گیا ۔۔۔ اور زندگی کی طویل اور کٹھن ڈگر پہ وہ ایک دوسرے کا سہارا لئے پوری ثابت قدمی کے ساتھ چل دیئے۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد اُن کے ساتھ ایک نیا ہم سفر آن ملا اور اُن کے قدم پہلے سے زیادہ یقین کے ساتھ اٹھنے لگے اور انہیں اپنی منزل پہلے سے زیادہ قریب نظر آنے لگی ۔۔۔

اور اب وہ راہی منتشر ہو گئے تھے۔ اُن کے اردگرد ظلمتیں اور گہری ہو گئیں تھیں اور زندگی کی کٹھن ڈگر اور زیادہ کٹھن ہو گئی تھی۔

بہت عرصے تک وہ اُن کے متعلق سوچتا رہا۔ انہیں خط لکھتا رہا۔ اور پھر ایک دن بالکل اچانک اُسے اپنے ایک خط کے جواب میں فاطمہ کا خط مل گیا۔ اور اُسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے اُس کے اردگرد پھیلی ہوئی ظلمتیں جگمگا اٹھی ہوں۔ جیسے ان اداس ویرانوں میں جان پڑ گئی ہو۔

اُس کی بیوی نے اُسے لکھا تھا۔ کہ وہ انہیں جلد اپنے پاس بلا لے۔ اُس نے لکھا تھا۔ کہ اُسے رات رات بھر نیند نہیں آتی تھا اُسے بہت یاد کرتا رہتا ہے۔ اور اُس نے لکھا تھا۔ کہ اُس کا بوڑھا باپ صرف اُس سے ملنے کی تمنا لئے موت کے دروازے پر کھڑا ہے اس لئے وہ سوچ رہا تھا۔ کہ وہ خود جا کر اُن سب کو پاکستان لے آئے۔ لیکن جب ایک ٹھٹھری ہوئی شام کو اُس نے خبر سنی کہ ہندوستان میں گاندھی جی کو قتل کر دیا گیا۔ تو اُس کا ارادہ لڑکھڑا کر زمین پر آ رہا۔ ایک عرصے تک اُسے ہمت نہ ہو سکی۔ کہ وہ ہندوستان جانے کے متعلق سوچے بھی۔ وہ انہیں جلد پاکستان بلا لینے کے وعدے ہی لکھتا رہا۔

جب کچھ عرصے کے بعد قدرے امن و امان ہو گیا۔ تو اُس نے انہیں لکھ بھیجا کہ وہ آ رہا ہے۔ اور اپنی مختصر تنخواہ سے بچائی ہوئی رقم اپنی جیب میں ڈالے ہوئے وہ کراچی پہنچ گیا۔ اپنے بچے کے لئے کھلونے اور بیوی کے لئے ریشمی کپڑے خرید کر جب وہ بندرگاہ پر پہنچا تو اُسے نہایت نرمی کے ساتھ بتا دیا گیا۔ کہ وہ ہندوستان نہیں جا سکتا۔ اُس کے پاس انکم ٹیکس وغیرہ کے سرٹیفکیٹ نہیں تھے ۔۔۔! اُس کے بچے کے کھلونے اور بیوی کے ریشمی کپڑے اُس کے ہاتھوں سے چھوٹ گئے اور اُسے پہلی بار احساس ہوا۔ کہ اس بہت بڑے شہر اور ایسے معروف کھلے بازاروں میں اُس کا کوئی ایک بھی واقف کار نہیں تھا۔ جو اُسے اس مصیبت سے نجات دلا سکتا۔ جو اُن لوگوں کو بتا سکتا۔ کہ وہ محض ایک چپڑاسی ہے۔ اور اُس سے انکم کے بغیر ٹیکس کس طرح وصول کیا جا سکتا تھا ۔۔۔ اُسے کوئی ایسا شخص نہ مل سکا ۔۔۔ اور کلفٹن کے ریتیلے ساحل پہ لیٹا ہوا وہ حسرت بھری نگاہوں سے سمندر کی چڑھتی اترتی ہوئی لہروں کو دیکھتا رہا ۔۔۔ کاش وہ سوچتا رہا ان میں سے کوئی لہر بڑھے اور اُسے اٹھا کر بمبئی کے ساحل پر پھینک دے! ۔۔۔ مگر کوئی لہر اُس تک نہ بڑھ سکی، سمندر بھی اُسے اپنی آغوش میں نہ لے سکا مایوس ہو کر اُس نے اپنے بچے کے کھلونے اور اپنی بیوی کے کپڑے اُن لہروں کو سپرد کر دیئے ۔۔۔! اور چند روز بعد

...سو میل لمبے صحرا کی تمام ریت اپنے چہرے پر جائے اپنی خالی جیبیں
ہے، پھر انہیں بیٹھے اداس ویرانوں میں واپس پہنچ گیا ---

ایک طویل عرصے کے لئے اُسے پھر ان ویرانوں میں رہنا پڑا اس
عرصے میں اُسے گھر سے کئی خط آئے۔ وہ بھی انہیں تسلیاں بھرے
خط لکھتا رہا۔ اپنے افسر کے معصوم سے بچے کو وہ دن دن بھر اپنے
کندھوں پر لئے پھرتا رہتا۔ اور اُس کی آنکھوں میں اپنا گول مٹول سا بچہ
گھومنے لگتا۔ اور پھر اُسے فاطمہ یاد آتی، اُس کی محبت یاد آتی، اپنا وطن
یاد آتا جو صرف اُس سے ملنے کے لئے زندہ تھا اور وہ بے قرار
ہو جاتا۔ اور اُس کا دل چاہتا کہ وہ اڑ کر اُن سب کے درمیان جا پہنچے
--- لیکن دوسرے لمحے اُسے اپنی خالی جیبیں یاد آجاتیں۔ اُسے اپنی
ملازمت کی مجبوریاں یاد آتیں اور اُسے یوں محسوس ہوتا۔ جیسے وہ
ایسا پرکٹا پرندہ ہو جو پنجرے میں رہے تو بھی قید رہے۔ اور اگر چھوڑ
دیا جائے تو بھی اڑ نہ سکے!

ایک طویل عرصے کے بعد جب اُس کی جیب میں چار سکے کھنکنے لگے
اور جب اُسے رخصت ملی تو وہ لاہور پہنچا اور اُسے بتا یا گیا کہ اب
ہندوستان جانے کے لئے پرمٹ لینا پڑتا ہے اور اب مہینہ بھر
سے وہ اس تین میل لمبی سڑک پر اس پرمٹ کیلئے پھر رہا تھا ---

"بابو! میں پناہ گیر ہوں بابو!"

خاموشی ---

"بابو! میرا بچہ، میری بیوی، میرا باپ ---"

اور خاموشی اب تک نہ ٹوٹ سکی تھی --- وہ ہر روز یہاں آتا
تھا۔ ہر روز یہ امید لئے ہوئے کہ شاید اُسے پرمٹ مل جائے، شاید
رحمت کے بادل بھولے سے اُس پر جھک جائیں اور اُس کے دل کی ویرانیوں
پر بھی بہار آجائے۔ دن بھر وہ وہیں گزار دیتا اور ڈوبتے ہوئے سورج
کے ساتھ وہ اس طویل سڑک پر جوتیاں چٹخاتا واپس آجاتا --- اگلے روز
پھر جانے کے لئے، نئی امیدوں کے ساتھ نئی توقعات کا طوفان لئے

آج پہلی مرتبہ بابو نے اُس کی بات کا جواب دیا تھا۔ حقارت سے
اُس نے اُسے اپنے کپڑے اتار لینے کے لئے کہا تھا --- اور اُس
کا دل چاہا تھا کہ وہ اُس بابو کی حقارت بھری آنکھیں نکال لے، وہ بازو
جو اُس کی راہ روکے ہوئے کھڑا تھا، جو ایک دیوار بن گیا تھا! ---
لیکن وہ چپ چاپ اپنے جیسے [illegible] کے باہر نکل
آیا اور اب وہ اپنے رب عظیم کا شکر کرتا ہوا جا رہا تھا اور ایک
طویل ختم نہ ہونے والی سڑک اُس کے سامنے تھی ---!

اگلے روز نہ جانے کیسے وہ سرحد پر پہنچ گیا۔ شاید یہ
سوچ کر وہ یہاں چلا آیا تھا کہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلا کر شاید
وہ اس سنگین دیوار کے اُس پار اتر جائے، شاید کوئی بھٹکا ہوا بادل
اُس کے دل کی ویرانیوں پر برس جائے --- لیکن اُس نے بند
سڑک دیکھی، پہرے پر کھڑے ہوئے کرخت سپاہی کو دیکھا، اُس
کی ہلتی ہوئی خوفناک گھنی مونچھیں دیکھیں، اُس کی بندوق پر لگی ہوئی
چمکتی ہوئی سنگین دیکھی۔ اور اُسے جرأت ہی نہ ہو سکی کہ وہ اُس
سے بات بھی کر سکے ---

اُس کے سامنے سرحد پار کے درخت جھوم رہے تھے۔ اور شریر
ٹہنیاں جیسے لہک لہک کر اُسے بلا رہی تھیں --- "آؤ، ہمارے
پاس آجاؤ، اپنی فاطمہ کے پاس آجاؤ، اپنے بچے کے پاس آجاؤ،
اپنے گھر کی طرف لوٹ آؤ --- تمہارے وطن کی گلیاں اب بھی
تمہاری منتظر ہیں، تمہاری فاطمہ تمہاری راہ تک رہی ہے، تمہارا بچہ
تمہاری گود میں مچلنے کو ترس گیا ہے --- آؤ! کوئی اپنے وطن کو نہیں
بھول جایا کرتا، اپنی جنم بھومی نہیں بھلائی جا سکتی ---"

اُس کے پیچھے سورج چھپ رہا تھا۔ اور وہ سوچ رہا تھا۔
کہ فاطمہ بھی گورداسپور میں اس ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھ رہی ہوگی
نہ جانے کب سے وہ ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھ رہی ہے ---!
نہ جانے کب تک اُسے ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھنا ہوگا
---!!

اُس کا جی چاہا کہ وہ اپنے سامنے بند سڑک پر تنے ہوئے
سپاہی سے پوچھے --- "بھائی میں نے تو تمہارا کچھ نہیں بگاڑا! اسے
تم پھر ہمارے درمیان حائل کیوں ہو گئے ہو؟ میرے اور میرے
گھرانے کے درمیان تم دیوار کیوں بن گئے ہو --- ؟ تمہارے
اُس طرف فاطمہ کھڑی ہے جو میری راہ تکتے تکتے تھک گئی ہے۔

بقیہ صفحہ ۲۷۴ پر

ابوسعید قریشی

# افسانچے

## سوال

میرے دوست نے اپنی سائیکل کو تالا لگاتے ہوئے کہا ۔
دنیا میں کوئی ایسا ملک بھی ہے ۔ جہاں سائیکلوں کو تالے نہیں لگانے پڑتے ؟

## دم دار ستارہ

نگاہیں افق پر تھیں اور ہاتھ دلوں پر
ایک نے کہا :" بادشاہ کے لئے نحس ہے "
دوسرے نے کہا :" نہیں رعیت کے لئے "
جھگڑا ختم ہوا ۔ دونوں حوالات میں تھے

## اپنا اپنا کام

" انہیں دیکھ رہے ہیں نا آپ ؟"
ادھیڑ عمر کا ایک اندھا اور چھ سات سال کی ایک لڑکی بس کے کونے میں دبکے بیٹھے تھے ۔ کنڈکٹر نے اُن کے ٹکٹ کاٹے اور آگے بڑھا
" آج تک انہیں کبھی دیر نہیں ہوئی ۔ ہمیشہ اسی بس سے جاتے ہیں "
" خوب ! "
" شام کے آٹھ بجے تک امپیریل بنک کے سامنے بھیک مانگیں گے ۔ سوا آٹھ کی بس سے واپس —— جمعہ کو چھٹی کرتے ہیں "

## اور کٹھپتلیوں کے دام

شمارہ کا نامہ نگار مقیم سنگاپور رقمطراز ہے ۔ کہ لاشوں کی کمی کی وجہ سے ایڈورڈ ہفتم میڈیکل کالج میں اناٹمی کی تعلیم میں خاصی رکاوٹ پیش آ رہی ہے ۔ کالج کے ایک پروفیسر نے ایک بیان دیتے ہوئے کہا کہ سنگاپور کے لوگوں نے ٹیلیفون پر دریافت کیا تھا ۔ کہ اُن کی اپنی یا اُن کے رشتہ داروں کی لاشوں کی اُنہیں کیا قیمت دی جائے گی ۔ لیکن جب اُنہیں بتایا گیا کہ لاشوں کی کوئی قیمت نہیں دی جاتی ۔ تو اُنہوں نے لاشوں کا چندہ دینے سے انکار کر دیا ۔

میرزا ادیب

# محبوبہ

## کردار

لڑکی ——————
شہزادہ ——————
شہنشاہ ——————
بیگم ——————
رانی ——————

منظر:- (ایک باغ جو اس قدر شاندار ہے۔ جس قدر ایک شہنشاہ کے باغ کو ہونا چاہیئے۔ یہ باغ چونکہ شہنشاہ اور اس کے خاندان کی خاص تفریح گاہ ہے اسلئے شاہی خاندان کے افراد کے علاوہ کوئی اور شخص یہاں آنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اس وقت صبح کا وقت ہے۔ سورج ابھی ابھی طلوع ہوا ہے اور ادھر ادھر شبنم آلود پھولوں اور پتیوں کے اردگرد ہلکی ہلکی روشنی کا ایک غبار سا چھا رہا ہے۔ اتنے میں ایک لڑکی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی گلاب کے کنج کے پاس آتی ہے، پھولوں پر نظر ڈالتی ہے اور ایک دو لمحے رکنے کے بعد جانے لگتی ہے۔ یہ لڑکی بہت خوبصورت ہے۔ خدوخال ایرانی ہیں جن سے معصومیت ٹپک رہی ہے۔ عمر سولہ سال کے لگ بھگ ہوگی۔ لڑکی نے ابھی قدم اٹھائے ہی ہونگے کہ دوسری طرف سے شہزادہ آتا ہے۔ شہزادہ نہایت قیمتی اور بیش بہا لباس میں ملبوس ہے۔ گلے میں ایک نہایت اعلیٰ ہار پہنے ہوئے ہے جس کے ہیرے اُسکے سینے پر تاروں کی طرح چمک رہے ہیں۔ شہزادے نے دونوں ہاتھوں میں کبوتر پکڑ رکھے ہیں — شہزادے کو آتے دیکھ کر لڑکی نظریں جھکا لیتی ہے اور تیزی سے قدم اٹھانے لگتی ہے۔ شہزادہ اُسے دیکھتا ہے۔ اور یہ سمجھ کر کہ مالی کی بیٹی ہے اُسے بالکل نظر انداز کر دیتا ہے۔ کنج کے پاس شہزادے کی نظر ایک خوبصورت گلاب کے پھول پر پڑتی ہے۔ اُسکے قدم رک جاتے ہیں اور وہ لڑکی کی جانب دیکھ کر آواز دیتا ہے۔ اُس کی آواز میں شاہی وقار اور رعونت ہے)

شہزادہ:- اے لڑکی!
ادھر آؤ۔ (لڑکی وہیں رک جاتی ہے)
(لڑکی ایک دو لمحوں کے لئے کچھ سوچتی ہے پھر شہزادے کی طرف قدم اٹھانے لگتی ہے)

لڑکی:- جی!

شہزادہ:- میں پھول توڑتا ہوں۔ یہ کبوتر پکڑ رکھو۔
(لڑکی کبوتر پکڑ لیتی ہے۔ شہزادہ پھول کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔ لڑکی کے ایک ہاتھ سے کبوتر نکل کر فضا میں اڑ جاتا ہے۔ شہزادہ مڑ کے دیکھتا ہے)

لڑکی:- اوہ۔ کبوتر اڑ گیا۔

شہزادہ۔ تم نے مضبوطی سے نہیں پکڑ رکھا تھا کیا؟ —— بے تمیز کہیں کی۔

لڑکی: مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

شہزادہ:- پھر کیونکر اڑ گیا۔

لڑکی :۔ (دوسرا کبوتر چھوڑتے ہوئے معصومانہ انداز میں) یوں ——
(شہزادہ اس کی جانب دیکھتا ہے۔ اس کی آنکھوں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل جاتی ہے۔ لڑکی کی طرف آتا ہے)

شہزادہ :۔ بہت خوب —— کتنی دلآویز ادا ہے تمہاری

لڑکی :۔ آپ خفا ہوگئے ہیں —— میں کبوتروں کی قیمت ادا کردوں گی۔

شہزادہ :۔ تمہارا یہ جرم معاف نہیں کیا جاسکتا۔ تمہیں ہر حال میں ہمارے کبوتروں کی قیمت ادا کرنا ہوگی

لڑکی :۔ تو بتائیے قیمت۔

شہزادہ :۔ (لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر) یہ ہے کبوتروں کی قیمت

لڑکی :۔ (پریشان ہوکر) یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ بھلا میں اپنا ہاتھ کیونکر دے سکتی ہیں۔ یہ تو میرا ہاتھ ہے۔

شہزادہ :۔ اور وہ ہمارے کبوتر تھے۔

لڑکی :۔ انہیں اڑنا ہی چاہئیے تھا۔ آزاد پرندوں کو گرفتار کرنے سے فائدہ؟

شہزادہ :۔ شوخی سے۔ ہم تو تمہیں بھی گرفتار کرلیں گے۔

لڑکی :۔ اونہہ —— مجھے آپ گرفتار کریں گے۔

شہزادہ :۔ ہم تمہیں ضرور گرفتار کرلیں گے۔ اور تمہارے پر بھی نہیں ہیں۔ اڑ کیونکر سکو گی —— ؟

لڑکی :۔ مجھے کون گرفتار کرسکتا ہے بھلا۔

شہزادہ :۔ (متاثر ہوکر) کس قدر معصوم اور پیاری ادائیں ہیں تمہاری

لڑکی :۔ معاف کیجئے شہزادہ صاحب! میں محل میں رہنے والی کوئی کنیز نہیں ہوں۔

شہزادہ :۔ تم جو کچھ بھی ہو بڑی دلچسپ چیز ہو۔ افسوس ہم نے تمہیں پہلے کبھی نہ دیکھا۔ کہاں تھیں تم اب تک؟

لڑکی :۔ ہم لوگ ایران سے آئے ہیں

شہزادہ :۔ لڑکی تمہیں اپنی خوش قسمتی پر ناز کرنا چاہئیے۔

لڑکی :۔ وہ کیوں؟

شہزادہ :۔ کس قدر بھولی بھالی ہو۔ اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتیں۔

لڑکی :۔ آپ باتیں ہی عجیب کررہے ہیں، خاک سمجھوں —— ؟

شہزادہ :۔ ہمیں تم سے محبت ہوگئی ہے۔ کیونکہ تم بہت بھولی بھالی اور پیاری لڑکی ہو۔

لڑکی :۔ اور مجھے آپ سے نفرت ہوگئی ہے۔ کیونکہ مجھے اپنی دوسری کنیزوں کی طرح ایک کنیز سمجھ رہے ہیں۔

شہزادہ :۔ لڑکی، ہم شہزادے ہیں۔

لڑکی :۔ جبھی تو آپ مجھے کنیز سمجھ رہے ہیں۔

شہزادہ :۔ ہم تجھے اپنی محبوبہ سمجھتے ہیں۔

لڑکی :۔ شہزادوں کی کنیز اور محبوبہ میں کوئی فرق نہیں ہوتا شہزادہ صاحب!

شہزادہ :۔ تم بہت گستاخ ہو۔

لڑکی :۔ آپ مجھ پر رعب کیوں جما رہے ہیں۔ کیا بگاڑا ہے میں نے آپ کا۔ دو کبوتر اڑ گئے ہیں۔ ان کی قیمت لے لیجئے —— مہربانی کرکے اب میرا ہاتھ نہ پکڑئیے۔ یہ شاہی محل کے اندر بہتر معلوم ہوتا ہے۔

شہزادہ :۔ تم بار بار ہماری توہین کررہی ہو۔ مگر تمہاری ادائیں ہمیں اس قدر پسند ہیں کہ سزا دینے کو جی نہیں چاہتا! —— آخر تمہیں بادشاہوں سے نفرت کیوں ہے۔؟

لڑکی :۔ بادشاہوں کے پاس دولت کے سوا اور ہوتا کیا ہے۔ لوگوں کو لوٹ لوٹ کر ساری دولت اپنے گھر میں جمع کرلیتے ہیں — اور پھر اسی دولت کے بل بوتے پر لوگوں پر حکومت کرتے ہیں شاندار محلات بناتے ہیں۔ باغات لگواتے ہیں۔ لڑائیاں کرتے ہیں اور لڑکیوں کو کنیزیں بنالیتے ہیں۔

شہزادہ :۔ تمہاری پرورش کہاں ہوئی ہے لڑکی!

لڑکی :۔ کہہ تو دیا ایران میں۔

شہزادہ :۔ نہ جانے کیوں ہمیں تمہاری ہر ادا دلفریب معلوم ہوتی ہے، ایسی حسین، معصوم اور گستاخ لڑکی ہم نے ساری زندگی میں نہیں دیکھی تھی۔ آؤ یہاں بیٹھ کر باتیں کریں!

لڑکی :۔ جی نہیں میں بیٹھ نہیں سکتی۔ گھر جانا ہے اماں انتظار کررہی ہوں گی

شہزادہ: میں تمہاری ماں سے کہہ کر تمہیں محل میں لے جاؤں گا۔ جب تمہاری ماں سمجھے گی کہ ہم تمہیں چاہتے ہیں۔ تو وہ خوشی سے جانے دیں پھر بھی نہیں جائے گی۔

لڑکی: کیونکہ آپ ایک شہنشاہ کے بیٹے ہیں — لاکھوں لوگوں کے بسنے والے گھر اجاڑے ہیں —؟

شہزادہ: تم نہیں جانتیں سیکڑوں لڑکیاں ہماری چشمِ التفات کو حاصلِ حیات سمجھتی ہیں۔

لڑکی: میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں!

شہزادہ: بے وقوف۔ بدتمیز۔

لڑکی: (مسکرا کر) بس!

شہزادہ: عجیب لڑکی ہے۔

لڑکی: آپ کو اب تک ان عورتوں سے واسطہ پڑا ہے جو کنیزیں پہلے ہوتی ہیں اور محبوبائیں بعد میں۔

شہزادہ: اور تم —؟

لڑکی: میں صرف ایک خوددار لڑکی ہوں — پہلے بھی اور آخر میں بھی!

شہزادہ: لڑکی۔ ہم ساری دنیا کی دولت تم پر نچھاور کر دیں گے۔ ہمارے پہلو میں تمہیں ہر وہ نعمت حاصل ہوگی۔ جس کا تم تصور کر سکتی ہو!

لڑکی: معاف کیجئے میں نعمتوں کا تصور کیا ہی نہیں کرتی!

شہزادہ: تو پھر کیا کرتی ہو۔

لڑکی: آپ کو میرے معاملات میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے؟

شہزادہ: لڑکی! تو ہمیں پسند کیوں نہیں کرتی۔ ہمیں تم سے محبت ہے

لڑکی: اگر آپ شہزادے نہ ہوتے تو ضرور پسند کرتی — آپ نے اب تک اپنے ارد گرد دولت ہی دولت دیکھی ہے۔ انسانیت نہیں دیکھی۔ آپ اپنے باوا کی طرح دولت کے انبار پر بیٹھ کر حکومت کرنا چاہتے ہیں لیکن محبت پر حکومت نہیں کر سکتے۔ محبت صرف انسانوں میں پیدا ہوتی ہے۔ انسانوں میں پلتی پھولتی ہے۔ شہنشاہوں، شہزادوں میں نہیں —!

شہزادہ: آج ہم شہزادے نہیں ہیں۔

لڑکی: آپ کا اب و لہجہ، آپ کا لباس، آپ کا یہ ہار — سب چیزیں ظاہر کرتی ہیں کہ آپ شہنشاہ کے بیٹے ہیں — آپ شہزادے ہیں۔

شہزادہ: (گلے سے ہار اتار کر پرے پھینکتے ہوئے) یہ تو ہم نے ہار پھینک دیا۔ محبت کے معاملے میں ہم شہزادے نہیں ہیں۔

لڑکی: ٹھیک! — مگر آپ کا دل کیونکر بدل سکتا ہے۔

شہزادہ: میں بدل چکا ہوں لڑکی! — تم مجھے جس طرح چاہو آزما سکتی ہو۔ میں ہر آزمائش کے لئے تیار ہوں!

لڑکی: کہیں آپ خواب تو نہیں دیکھ رہے؟

شہزادہ: نہیں — آج میں صرف انسان ہوں — شہزادہ نہیں ہوں!

لڑکی: تو اب میں تمہارے پہلو میں بیٹھ سکتی ہوں — تم سے باتیں کر سکتی ہوں۔ کیونکہ اب تم تخت پر بیٹھ کر میرا ہاتھ پکڑنے کی کوشش نہیں کر رہے۔ بلکہ اپنے آپ کو صرف انسان سمجھ کر میرے پاس کھڑے ہو۔

شہزادہ: کیا ہم ہر روز یہاں ملا کریں گے؟

لڑکی: ہر روز تو نہیں — کبھی کبھی — ٹھیک ہے نا!

شہزادہ: نہیں ہر روز — تم ملو گی نہیں تو مجھے تمہاری فرقت میں تڑپنا پڑے گا — ہم تمہیں ایک محل بنا دیں گے۔ جہاں تم اپنی ماں کے ساتھ رہا کرو گی۔

لڑکی: تم پھر شہزادوں کی سی باتیں کرنے لگے۔

شہزادہ: او معاف کرنا۔

لڑکی: میں معاف نہیں کر سکتی۔

شہزادہ: آئندہ ایسے الفاظ زبان سے نہیں نکالوں گا!

لڑکی: اچھا معاف کر دیا۔

شہزادہ: (دور کسی کو آتے دیکھ کر) اوہ — تم یہیں ٹھہرو۔ میں ابھی آتا ہوں — ابھی آتا ہوں۔

لڑکی: کہاں چلے؟

شہزادہ: بس — ابھی آتا ہوں۔

(شہزادہ تیزی سے چلا جاتا ہے۔ لڑکی وہیں کھڑی

رہتی ہے۔ شہنشاہ اپنی دو بیگمات کے ساتھ آتے ہیں
لڑکی انہیں دیکھ کر گلاب کے کنج میں چلی جاتی ہے۔ شہنشاہ
آتے ہیں۔ ان کی داہنی طرف بیگم ہے۔ اور بائیں جانب
رانی۔ بیگم عمر میں رانی سے کچھ بڑی ہے۔ دونوں حسین ہیں
مگر جو شادابی اور بشاشت رانی کے چہرے پر نظر آتی ہے
وہ بیگم کے چہرے سے مفقود ہے۔ شہنشاہ کنج گلاب کے
قریب آ کر ٹھٹک جاتے ہیں۔ ان کی نظر گلاب کے پھول پر
پڑتی ہے)

شہنشاہ :۔ گلاب کا پھول بھی کیا پھول ہے۔ دنیا کا کوئی پھول خوشبو میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا!

رانی اور بیگم :۔ (بیک آواز) جی حضور!

(شہنشاہ آگے بڑھ کر پھول توڑنے لگتے ہیں۔ ان کی انگلی میں کانٹا چبھ جاتا ہے)

شہنشاہ :۔ ہماری انگلی زخمی ہو گئی ہے۔

رانی اور بیگم (بیک آواز) ہائے۔ (دونوں بھاگ کر ادھر جاتی ہیں)

بیگم :۔ دکھائیے تو۔

رانی :۔ ہائے کتنا ظالم کانٹا ہے ۔۔ حضور کی انگلی زخمی ہو گئی۔ طبیب کو بلاؤں جہاں پناہ!

شہنشاہ :۔ نہیں۔ بڑا زخم نہیں ہے۔

رانی :۔ میں قربان جاؤں کوئی تکلیف تو نہیں ہے حضور کو!

شہنشاہ :۔ رانی! ہم دلت تمہاری محبت سے بہت خوش ہوئے ہیں تمہیں ہمارا بہت خیال ہے!

رانی :۔ حضور کی ذرہ نوازی ہے۔

(رانی بیگم کو تیکھے انداز سے دیکھتی ہے۔ بیگم کا چہرہ فق ہے)

شہنشاہ (ہار کو دیکھ کر) ارے ۔۔۔ یہ ہار کیسا ہے۔

(رانی بھاگ کر ہار اٹھا لیتی ہے)

رانی :۔ میں جانوں یہ ہار شہزادہ والا اقتدار کا معلوم ہوتا ہے

بیگم :۔ دیکھوں ۔۔۔

رانی :۔ تم دیکھ کر کیا کرو گی ۔۔ انہیں کا ہے۔

شہنشاہ :۔ شہزادے کا ہار یہاں کیونکر آ گیا۔

بیگم :۔ ہو سکتا ہے۔ شہزادہ صاحب یہاں آئے ہوں۔ غالباً انہوں نے استراحت فرمانے کی خاطر گلے سے ہار اتار کر ایک طرف رکھ دیا ہو۔

شہنشاہ :۔ ہو سکتا ہے!

رانی :۔ میرا خیال ہے شہزادہ ذی اقتدار سورج کی روشنی میں ہیروں کی چمک کا نظارہ کر رہے ہوں گے ۔۔ اسی اثنا میں انہوں نے ہار گھاس پر رکھ دیا ہوگا۔ اور پھر اٹھانا بھول گئے ہوں گے ۔۔ شاعر ہیں نا!

شہنشاہ :۔ ہو سکتا ہے۔

بیگم :۔ ایک اور بات بھی ہے جہاں پناہ! ممکن ہے کوئی کنیز چرا کر لے آئی ہو۔

رانی :۔ ہرگز نہیں۔ یہ جہاں پناہ کی توہین ہے ۔۔ کیا حضور عالی کی کنیزیں چور ہو سکتی ہیں۔

شہنشاہ :۔ ہماری کوئی کنیز ایسی لغو حرکت نہیں کر سکتی!

بیگم :۔ حضور! (شرمندہ ہو کر) میں کیا کہہ سکتی ہوں!

شہنشاہ :۔ شہزادہ ہے کہاں؟

رانی :۔ صبح سیر کی غرض سے ادھر آئے تھے یہیں ہوں گے یا محل میں جا چکے ہوں گے۔

شہنشاہ :۔ آؤ رانی اسے تلاش کریں۔ بیگم تم اسے یہاں ڈھونڈو!

(رانی بیگم کی طرف فاتحانہ انداز میں دیکھتی ہے۔ اور شہنشاہ کے ساتھ چلی جاتی ہے۔ بیگم وہیں کھڑی رہتی ہے۔ اس کے چہرے پر شکست خوردگی کے آثار نمایاں ہیں اسی اثنا میں لڑکی کنج گلاب سے باہر آ جاتی ہے)

بیگم :۔ کون ہے تو؟

لڑکی :۔ ایک لڑکی!

بیگم :۔ یہاں کیا کر رہی ہے۔ تجھے معلوم نہیں۔ یہ باغ شاہی خاندان

سکے افراد کی تفریح گاہ ہے۔

**لڑکی** :- جانتی ہوں۔

**بیگم** :- پھر یہاں آنے کی جرأت کیوں کی تم نے؟

**لڑکی** :- بس آ گئی۔ پھول بڑے پیارے معلوم ہوتے ہیں نا

**بیگم** :- گستاخ! یہ باغ صرف ہمارے لئے ہے۔

**لڑکی** :- آپ کی طرح پھولوں کو دیکھنے ان کی رنگت سے لطف اٹھانے، ان کی خوشبو سونگھنے کی مجھ میں بھی صلاحیت ہے۔

**بیگم** :- اگر شہنشاہ نے تمہیں دیکھ لیا تو ——

**لڑکی** :- (الفاظ کاٹ کر) آپ مطمئن رہیں —— آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

**بیگم** :- بھاگ جاؤ یہاں سے!

**لڑکی** :- حضورِ خفا نہ ہوں چلی جاتی ہوں —— جا رہی تھی۔ آپ کے مغموم چہرے کو دیکھا تو رک گئی؟

**بیگم** :- میرا چہرہ مغموم نہیں ہے۔

**لڑکی** :- میں مسرور اور مغموم چہروں میں تمیز کر سکتی ہوں بیگم صاحبہ۔

**بیگم** :- (آہ بھر کر) جھوٹ بول رہی ہو۔

**لڑکی** :- اب تو آپ نے آہ بھی بھری ہے —— سینے میں جلتی ہوئی آگ سے دھواں باہر نکل آیا ہے۔

**بیگم** :- یہ بھی تمہاری غلط فہمی ہے۔

**لڑکی** :- کس قدر مظلوم زندگی ہے آپ کی۔ مغموم ہیں مگر اپنے آپ کو دھوکا دینے کی بھی کوشش کر رہی ہیں۔

**بیگم** :- چپ گستاخ تمہیں گفتگو کرنے کا طریقہ بھی معلوم نہیں!

**لڑکی** :- مجھے تصنع نہیں آتا۔ آپ کی حالت دیکھ کر میرے دل کو دکھ ہوا میں نے سچی بات کہہ دی۔ اگر میں یہ بات اپنی ذات تک محدود رکھتی۔ اور جھوٹ موٹ آپ کی تعریف کر دیتی۔ تو آپ خوش ہو کر مجھے ضرور انعام دیتیں۔ لیکن میں جھوٹ بولنا پسند نہیں کرتی۔ کتنی دردناک زندگی ہے آپ کی۔ آپ کی ذاتی مسرت ہے اور نہ ذاتی دکھ شہنشاہ کی نگاہِ التفات آپ کو مسرور کر سکتی ہے۔ اور شہنشاہ کے ہونٹوں سے نکلا ہوا غصے کا ایک لفظ آپ کی ساری مسرتوں کو جلا کر خاک کر سکتا ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ آپ نے اپنے آپ کو پنجرہ نما قفس میں بند کر رکھا ہے۔ جہاں آپ ہر وقت پھڑپھڑاتی رہتی ہیں۔ —— لیکن قفس سے باہر نکلنا پسند نہیں کرتیں!

**بیگم** :- بے خیالی میں آج مجھے داسی نے شکست دی ہے۔ شہنشاہ اسے چاہنے لگا ہے وہ سارے دربار پر چھا جائے گی۔ اس کے عزیز وزیر بن جائیں گے۔ اور میں ایک کونے میں جا پڑوں گی ——

**لڑکی** :- یہ سمجھنا آپ کی کمزوری ہے۔

**بیگم** :- (سنبھل کر) خاموش —— بدتمیز

**لڑکی** :- آپ نے اپنی ذات کو شہنشاہ کی شخصیت میں مدغم کر دیا ہے۔ آپ نے حقیقی مسرت، محبت، نفرت، ہر چیز کا احساس کھو دیا ہے۔ آپ ایک کٹ پتلی کی طرح شہنشاہ کے اشاروں پر ناچ رہی ہیں —— آپ شہنشاہ کی ایک ادنےٰ کنیز ہیں۔

**بیگم** :- خاموش! تمہارے لفظوں میں زہر بھرا ہے

**لڑکی** :- آپ کو میری باتیں زہریلی معلوم ہوتی ہیں۔ کیونکہ ان باتوں کے آئینے میں آپ اپنی مجروح، اپاہج، لنگڑی لولی شخصیت کے خد و خال دیکھ رہی ہیں۔

**بیگم** :- تو پاگل ہو گئی ہے لڑکی

**لڑکی** :- آپ کی سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ کسی طرح شہنشاہ کی چہیتی بن جائیں —— شہنشاہ آپ سے اس طرح دل بہلائیں۔ جس طرح کبوتر کے پر کاٹ کر اس سے دل خوش کیا جاتا ہے۔ ایک زنجیر پا کبوتر اور آپ میں کیا فرق ہے ——؟ کبوتر کو موقع ملے تو وہ پھر سے اڑ جاتا ہے۔ لیکن آپ —— آپ کو ان زنجیروں سے محبت ہے، جنہوں نے آپ کو جکڑ رکھا ہے۔ آپ کو اس قفس سے محبت ہے۔ جس میں آپ قید ہیں!

**بیگم** :- تو میری توہین کر رہی ہے —— بدبخت!

**لڑکی** :- تو مجھے سزا دیجئے۔ مگر ایک قیدی آزاد انسان کو کیا سزا دے سکتا ہے۔

**بیگم** :- اب سمجھی تم تو چور ہو۔ لیکن ایسی باتوں سے تم اپنے جرم پر پردہ نہیں ڈال سکتیں!

**لڑکی** :- (مسکرا کر) اب آپ مجھ کو ایک نیا فریب دینے لگی ہیں آپ؟

(رانی اور شہنشاہ آتے ہیں)

**شہنشاہ:** بیگم! شہزادہ مرتو نہیں ہے۔

**بیگم:** حضور! شہزادہ صاحب کو تو میں نے نہیں دیکھا۔ البتہ ہار کا چور پکڑ لیا ہے۔

**شہنشاہ:** ہار کا چور۔ کون ہے۔

**بیگم:** (لڑکی کی طرف اشارہ کرکے) جہاں پناہ یہ ہے۔

**رانی:** جہاں پناہ! یہ محل کی کنیز نہیں ہے۔

**شہنشاہ:** لڑکی! تو ہماری کنیز ہے؟

**لڑکی:** خدا محفوظ رکھے۔

**شہنشاہ:** (غصے سے) کیا مطلب؟

**لڑکی:** میں کنیز نہیں ہوں اور نہ ہو سکتی ہوں!

**رانی:** حضور! کس قدر بدتمیز اور گستاخ ہے۔ اسی وقت پھانسی پر لٹکا دیا جانا چاہیئے اسے۔

**شہنشاہ:** کون ہے تو لڑکی؟

**لڑکی:** ایک لڑکی جو ایران سے آئی ہے — اور ایک سوداگر کی بیٹی ہے!

**شہنشاہ:** ما بدولت پوچھتے ہیں تو نے شہزادے کا ہار کیوں چرایا۔ تجھے معلوم ہے اس جرم کی سزا کیا ہے؟

**لڑکی:** مجھے سزا معلوم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ میں نے ہار چرایا ہی نہیں۔

**بیگم:** حضور! یہی چور ہے ہار چرا کر دوسری طرف جا رہی تھی۔ ہم کو آتے دیکھا تو گھبراہٹ میں ہار پھینک کر گلاب میں جا چھپی۔

**شہنشاہ:** ما بدولت سننا چاہتے ہیں کہ مجرم اس جرم کے متعلق کیا کہتا ہے۔ تو نے گستاخی کی ہے۔ مگر ما بدولت انصاف کے ترازو کے کسی پلڑے کو بھی جھکنے نہیں دیں گے۔ بول کیا کہتی ہے تو

**لڑکی:** میں نے یہ ہار قطعاً نہیں چرایا۔

**شہنشاہ:** حالات بانگِ دہل تمہارے خلاف گواہی دے رہے ہیں — تم مجرم ہو۔

**لڑکی:** مجھے صرف یہی کہنا ہے کہ میں نے ہار نہیں چرایا۔

**رانی:** لڑکی! تجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ ظلِ الٰہی کی نگاہوں سے کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔

**لڑکی:** تو ظلِ الٰہی کو معلوم ہوگا کہ ہار یہاں کس طرح پہنچا۔

**رانی:** جہاں پناہ! یہ تو کوئی گنوار لڑکی ہے۔

**شہنشاہ:** (گرج کر) لڑکی! تجھے اصل معاملہ بتانا پڑے گا۔

**لڑکی:** یہ ہار یہاں شہزادے نے پھینک دیا تھا۔

**رانی:** بالکل جھوٹ جہاں پناہ شہزادہ والا تبار پر الزام لگانا چاہتی ہے۔

**شہنشاہ:** کیا کہا شہزادے نے ہار پھینکا تھا۔

**لڑکی:** جی ہاں!

**شہنشاہ:** کیوں؟

**لڑکی:** میں نے کہا تھا محبت صرف داستانوں میں ہو سکتی ہے شہزادے اور سوداگر کی بیٹی میں نہیں ہو سکتی۔ شہزادے نے ہار پھینک دیا کیونکہ محبت نے انہیں انسان بنا دیا تھا!

**رانی:** کتنی بے حیا لڑکی ہے۔

**شہنشاہ:** لڑکی! یاد رکھو ہمارے غصے کی آگ کے آتشیں شعلے ہم کی دیواروں کو جلا کر راکھ کر دیں گے۔ اور تو ان شعلوں میں خاکستر ہو کر رہ جائے گی۔

**لڑکی:** آپ سچی بات سننا پسند نہیں کرتے

**شہنشاہ:** ہم سچی بات سننا چاہتے ہیں۔

**لڑکی:** تو یقین کیجئے یہ بالکل سچی بات ہے۔

**رانی:** جہاں پناہ! یہ بے حیا شہزادے پر خطرناک الزام لگا رہی ہے۔

(شہزادہ آتا ہے)

**شہنشاہ:** شہزادے! یہ گستاخ چھوکری کیا کہہ رہی ہے۔

**رانی:** میرے محترم شہزادے! یہ بدتمیز چھوکری آپ پر الزام لگا رہی ہے۔

**لڑکی:** (مطمئن انداز میں) شہزادہ صاحب! اس وقت آپ کی آزمائش ہے۔ آپ نے کہا تھا۔ تم مجھے آزما سکتی ہو۔ آپ

محبت کے معاملے میں شہزادہ ہیں یا صرف انسان ---

شہزادہ :- میں ---

شہنشاہ :- شہزادہ! اپنا رتبہ پہچانو، ہم کہو

شہزادہ :- ہم --- نے کہا تھا --- ہم سمجھتے ہیں --- میں --- ہم --- میں محبت میں انسان ہیں --- میں۔

لڑکی :- سن لیا آپ نے شہنشاہ!

رانی :- جہاں پناہ! یہ لڑکی کوئی جادوگرنی ہے۔ اس نے شہزادے پر جادو کر دیا ہے۔ شہزادہ کبھی ایسے بُرے لفظ زبان سے نہیں نکال سکتا

شہنشاہ :- کیا اس بدذات کی آنکھوں کے سامنے ہمارا لختِ جگر --- ہماری امیدوں کا سہارا۔ لاکھوں انسانوں کے دلوں کا مالک ایسے الفاظ کہہ سکتا ہے --- نہیں ہمارے کان دھوکا تو نہیں دے رہے۔

لڑکی :- نہیں جناب!

رانی :- (ذرا آگے بڑھ کر) حضور! یہ لڑکی جادوگرنی ہے۔ یہ اس کے جادو کا اثر ہے کہ شہزادہ یہ الفاظ زبان سے نکال رہا ہے۔ اسے سزا ملنا چاہیئے۔ شہزادہ بالکل بے گناہ ہیں (لجاجت آمیز لہجہ میں ہاتھ جوڑ کر) میں اپنی زندگی کے سب سے قیمتی آنسوؤں کو الفاظ کے دامن میں لیکر عرض کرتی ہوں کہ شہزادے کی گستاخی کو پیمانۂ رحم سے کام لیکر معاف کر دیں

شہنشاہ :- رانی! تیری آنسوؤں سے بھری آنکھوں نے ہمارے غصے کی بھڑکتی ہوئی آگ کو بجھا دیا ہے۔ تیری ممتا ایک دیوار بن کر ہمارے اور ہمارے گستاخ شہزادے کے درمیان کھڑی ہو گئی تھی --- ہمیں یہ کرنا ہی ہوگا!

رانی :- عالم پناہ! کنیز لاکھوں کا شکریہ ادا کرتی ہے کہ حضور نے اپنی باندی کے آنسوؤں کے ... ان میں رحم کی بھیک ڈال دی

شہنشاہ :- ہمارے چاروں طرف رنج کا آسمان گردش کر رہا ہے ہمیں تخلیئے کی ضرورت ہے۔ رانی ہمارے ساتھ چلو ہمیں تم سے مشورہ کرنا ہے

رانی :- جہاں پناہ! باندی کو اپنی خوش قسمتی پر ناز ہے۔

شہنشاہ :- شہزادے تم بھی محل میں چلو --- چلو

(شہزادہ قدم اٹھانے لگتا ہے)

لڑکی :- (بیگم سے) مجھے آپ سے گہری ہمدردی ہے اب بھی میدان رانی کے ہاتھ رہا --- دستور رانی شہنشاہ کی چپقلش میں آپ اب بھی شکست کھا گئیں باقی رہ گئی میں --- میں (مسکرا کر) میں تو اسے صرف ایک کھیل سمجھتی تھی صرف ایک کھیل --- شہزادے اور سوداگر کی بیٹی میں محبت . . اوہ --- ایک کھیل --- صرف ایک کھیل۔

(لڑکی تیزی سے چلی جاتی ہے۔ شہنشاہ رانی کے ساتھ قدم اٹھانے لگتا ہے۔ بیگم تنہا رہ جاتی ہے وہ بھی گھبرا کر آہستہ آہستہ جا رہی ہے) (پردہ)

# امن زندہ رہے گا!

۲۰ اپریل ۱۹۴۹ء کو پیرس میں عالمگیر امن کانفرنس ہوئی۔ اس کانفرنس میں تقریباً ۱۷۰۰ مندوب شریک ہوئے۔ جن کو بے شمار امن پسند ممالک کی انجمنوں اور لاکھوں افراد کی نمائندگی کا شرف حاصل تھا۔ ہال کی دیواروں پر تمام ملکوں کے قومی جھنڈے لہرا رہے تھے اور جا بجا مختلف زبانوں میں بڑے بڑے پوسٹر آویزاں تھے۔ جن میں اس قسم کی تحریریں امن پسند عوام کی ترجمانی کرتی تھیں

"امن کی حفاظت کرنا تمام قوتوں کا فرض ہے"

"امن کیلئے متحد ہونا ہمارا مقدس فریضہ ہے۔"

اس کانفرنس میں جو مندوب شریک ہوئے ان میں فریڈرک جولیو کیوری، لوئی آراگوں (فرانسیسی مصنف)، مارٹن اینڈرسن نکسو (ڈنمارک کا مصنف) پروفیسر جے، ڈی برنل (برطانوی پارلیمنٹ کا ممبر)، مادام یوجینی کاٹن (عورتوں کی بین الاقوامی جمہوری جماعت کی صدر)، الیگزینڈر فدائیف (روسی مصنف)، ونیدا دیسی بیریسکا (پولینڈ کی شہرہ آفاق مصنفہ)، الیا اہرن برگ (روس کا مشہور مصنف) پروفیسر کو مو جو (چینی تاریخ دان)، جوز گیرال (سابق سپینی وزیراعظم)

"تمام دنیا کی امن پسند طاقتو! متحد ہو جاؤ
اپنے مستحکم اتحاد اور مسلسل جدوجہد سے
جنگ کا خاتمہ کر دو۔
عوامی جمہوریت کی فتح زندہ باد!

(چینی نمائندہ)

ان ملکوں کے نمائندے شامل ہوئے:-

فرانس، امریکہ، برطانیہ عظمیٰ، سوویٹ روس، چین، اٹلی، افریقہ، البانیہ، جرمنی، افغانستان، آسٹریلیا، بلجیم، برازیل، بلگیریا، کینیڈا، چلی، کوریا، کیوبا، ڈنمارک، سپین، فنلینڈ، یونان، ہنگری، ہالینڈ، ہندوستان، انڈونیشیا، عراق، ایران، آئرستان، لبنان، لکسمبرگ، مڈغاسکر، میکسیکو، منگولیا، ناروے، پولینڈ، رومانیا، سویڈن، سوئٹزرلینڈ، چیکوسلوویکیہ، ٹرانسوال، ٹرائسٹ، طرابلس، ویت نام، یوگوسلاویہ

ایوب احمد کرمانی

۴ اپریل کو واشنگٹن کی ایک سرفلک عمارت کے آراستہ و پیراستہ کمرے میں مغربی یورپ کی بارہ حکومتوں کے نمائندے اکٹھا ہوئے تھے۔ وہ پہلے اپنی اپنی نشستوں پر خاموش بیٹھ گئے، پھر یکے بعد دیگرے اُٹھے اور لائن لگا کر ایک دستاویز پر دستخط کرنے لگے۔ امریکہ کے وزیر خارجہ ڈین ایچیسن (Dean Acheson) کی باری سب سے آخر میں آئی، موصوف نے دستخط کئے اور دستاویز اپنی تجوری میں مقفل کر دی۔ چشم زدن میں دنیا کی جنتر نشر گاہوں سے اٹلانٹک پیکٹ کی دفعات کا اعلان ہونے لگا۔ امریکی وزیر خارجہ نے دنیا کو مژدہ سنایا کہ

"اگر جرمنی کے روسی علاقے پر ہمارے طیاروں نے پرواز کی اور روسی ہوائیہ نے کوئی مداخلت کی تو یورپ کی بارہ حکومتیں اعلانِ جنگ کر سکتی ہیں"

مسٹر بیون نے فرمایا:-

"اب کامن ویلتھ کے ممالک کا دفاع بھی مضبوط ہو گیا ہے۔ اٹلانٹک پیکٹ سے کامن ویلتھ ملکوں کا بھی بالواسطہ تعلق ہے"

مسٹر چرچل نے اطمینان کا سانس لیا کہ اب "مغربی جمہوریت" محفوظ ہو گئی، یورپ کے جس اتحاد کا وہ خواب دیکھ رہے تھے۔ امریکہ کی زیر قیادت حقیقت بنتا جا رہا ہے۔

اسپین کے فرینکو، جنوبی افریقہ کے مالن اور انٹس فرانس کے دی گول اور شومین، جرمنی کے شاخت، پرتگال کے سالازار، سب نے بڑی گرمجوشی سے اس معاہدہ کا خیر مقدم کیا۔ معاہدہ نام کو تو "اٹلانٹک پیکٹ" تھا در اصل یہ جغرافیائی قیود سے بالکل آزاد تھا۔ چین کے مارشل چیانگ، جاپان کے وزیر اعظم، ویت نام کے باؤ دائی، انڈونیشیا کے ولندیزی گورنر اور جانے کیا کیا! تو سب نے اس سے اسی قدر تعلق خاطر ظاہر کیا جیسا کہ خود دائرے ساحل اٹلانٹک کے حکمرانوں بیون اور ایچیسن نے یہ چارے سب "مغربی جمہوریت" کو محفوظ رکھنے کے لئے بے قرار ہیں مغرب سے لیکر مشرق تک مغربی جمہوریت کے وکیلوں کا خاندان پھیلا ہوا ہے، وہ ایک ہی طرح سوچتے ہیں۔ ایک ہی قسم کے مسائل سے دوچار ہیں۔ پھر بھلا ایک ہی طرح عمل اور اظہار خیال کیوں نہ کریں — ؟

آج سے کوئی چودہ پندرہ سال قبل بھی "مغربی تہذیب" کے علمبردار اکٹھا ہوئے تھے، انہوں نے بھی "اینٹی کمنٹرن پیکٹ" (Anti Comm inTern pact) نام کے ایک معاہدے پر دستخط کئے تھے، جرمنی سے لیکر جاپان تک ہٹلر، ٹوجو اور مسولینی کی زیر قیادت "کلچر" کے علمبرداروں کا ایک محاذ منظم ہوا تھا، لیکن وہ بے چارے اپنی کوششوں کے باوجود ناکام ہوئے، اب یہ نامکمل کام ان کے رفقا نے پایۂ تکمیل کو پہنچانے کا بیڑا اٹھایا ہے، ان رفقا کو دعویٰ ہے کہ ہمارے پاس ایٹم بم ہے اور ہٹلر اور مسولینی جو کچھ نہیں کر سکے، ہم کر دکھائیں گے — !

وال اسٹریٹ کے اجارہ دار، اسلحہ ساز کارخانوں کے مالک بڑے بڑے کثیر الاشاعت اخبار، ریڈیو اسٹیشن، فلم کمپنیاں، نشر و اشاعت

کے سارے ذرائع۔ "مغربی تہذیب" کے "جہاد" کے لئے از سرِ نو مجتمع کئے جا رہے ہیں۔ صرف یہی نہیں "تہذیب" کی حفاظت اور "امن" کی بحالی کے لئے طاعون
پھیلانے اور گردن توڑ بخار کے جراثیم پالے جا رہے ہیں۔ بعض اہلِ قلم اپنی ستم ظریفی اور منظر کشی کی صلاحیت یہ واضح کرنے کے لئے وقف کئے ہوئے ہیں کہ
ایک ایٹم بم دنیا کی ہزاروں آبادیوں کی صورت کو کیا سے کیا بنا سکتا ہے۔ زہریلی گیس کی ہلاکت آفرینیاں کیسی ہیں اور ان سب کا استعمال کیوں
ضروری ہے — !

لیکن معلوم سا ایسا ہوتا ہے کہ یہ بیچارے ہٹلر، ٹوجو اور مسولینی سے زیادہ بدقسمت ہیں۔ ان لوگوں نے کم از کم اپنے منصوبے بڑی آسانی سے مان
لئے اور اپنی "تہذیب" کو نافذ کرنے کے لئے ایک بار ہی مارنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اینٹی کمنٹرن پیکٹ کے بعد دنیا دم بخود اور ساکت ہو گئی۔
کسی طرف سے موثر مخالفت نہیں ہوئی چند "تہذیب کے دشمنوں" نے دو ایک جگہ آوازیں اٹھائیں۔ لیکن "مغربی دنیا" نے ان پر کان نہیں دھرا۔ سپین
میں فرینکو صاحب نے "مغربی تہذیب" نافذ کر دی، دوسری جنگ چھڑ گئی، یہ اور بات ہے کہ اس جنگ میں ناکامی ہوئی۔ ورنہ ہٹلر صاحب کامیابی کے
دروازے تک پہنچ کر لوٹ آئے تھے!

"اٹلانٹک پیکٹ" کے بعد تو دنیا بھر میں تہذیب کے ان علمبرداروں کے خلاف عوام کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ واشنگٹن میں صرف بارہ حکومتوں
کے نمائندے جمع ہوتے تھے، پیرس میں ۷۲ قوموں کے نمائندے اکٹھا ہوئے، واشنگٹن میں جمع ہونے والے نمائندے سفید فام سازش مکمل کر کے چپ چاپ
بھاگ گئے۔ پیرس کے نمائندوں کا لاکھوں عوام نے خیر مقدم کیا، دنیا کے کونے کونے سے آوازیں بلند ہوئیں، اب ۱۹۱۴ء والی غلطی نہیں دہرائی جائے گی
اب جنگ نہیں ہوگی۔ فرانس کو اٹلانٹک پیکٹ میں شامل تصور کیا گیا۔ لیکن فرانس کے لاکھوں منظم مزدوروں، کروڑوں عوام اور ممتاز اہلِ علم، ادیبوں
سائنسدانوں اور فنکاروں نے اعلان کیا کہ ہم اٹلانٹک پیکٹ کے پابند نہیں، برطانیہ کی کوئلے کی کانوں کے محنت کشوں نے مسٹر بیون کو پیغام بھیجا "آپ
"دفاع" کی جتنی جی چاہے باتیں کیجئے، لیکن اگر آپ نے جنگ چھیڑنے کی کوشش کی تو آپ کو کوئلہ نہیں ملے گا۔ برطانوی کلیسا کے سب سے بڑے اسقف نے
اعلان کیا کہ یہ امن کے نام پر جنگ کی تیاریاں نہیں، تہذیب کے نام پر بربریت کے منصوبے ہیں، برطانوی اہلِ علم بیون اور ایٹلی کے ساتھ نہیں ہیں۔
سائنسدان شیلڈن اور ہالڈین نے لیبر پارٹی کو آگاہ کر دیا کہ برطانوی سائنسدان اپنی صلاحیتوں کو تخریب کے لئے استعمال نہ ہونے دیں گے۔

اٹلی میں ہر دیہات، ہر قصبے اور ہر شہر میں اٹلانٹک پیکٹ کے خلاف اور امن کی حمایت میں جلسے ہوئے۔ اطالوی پارلیمنٹ میں اطالوی عوام
کے ترجمان پیترو نینی نے صاف صاف کہہ دیا اطالیہ اب فاشزم کا شکار نہیں ہوگا۔ ہم کسی استعماری جنگ میں نہیں لڑیں گے۔ ہم جنگ کی آگ بھڑکانے
والوں کا منہ بند کر دیں گے۔ اور خود امریکہ میں یونیورسٹیوں کے معلم، کلیساؤں کے راہب، ہالی وڈ کے فنکار، ادبی انجمنوں کے ترجمان، ایک زبان ہو
کر چلا اٹھے "یہ اٹلانٹک پیکٹ" نہیں ہے یہ تیسری جنگ کا پیش خیمہ ہے۔ امریکہ جرمنی کی جگہ لینا چاہتا ہے، امریکی تاجر ایٹم بم کے سہارے ساری دنیا کو
مسخر کرنا چاہتے ہیں، امریکی عوام ان جنگ پرستوں کے ساتھ نہیں ہیں۔ مختصر یہ کہ دنیا کے طول و عرض میں امن، امن، امن کی صدائیں گونج اٹھیں،

جب بارہ وزراء خارجہ ۴ اپریل کو اٹلانٹک پیکٹ پر دستخط کر کے اطمینان سے یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ اب دنیا مشرق و مغرب میں تقسیم ہو گئی، اس طوفان
کو دیکھ کر بوکھلا گئے، انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ دنیا کی جو حد بندی انہوں نے کی ہے وہ مصنوعی اور بے بنیاد ہے، دنیا تو کچھ اور ہی انداز میں
تقسیم ہے۔ تقسیم کی لکیر مشرقی یورپ اور مغربی یورپ کے درمیان نہیں۔ بلکہ یہ تو فرانس، برطانیہ اور خود امریکہ کے قلب سے گزرتی ہے۔ دنیا کا
تہذیب، سلامتی، اچھی زندگی، تعمیر اور ترقی کے حامیوں اور منافع خوروں، اسلحہ سازوں، جنگ بازوں اور لٹیروں کے پجاریوں کے مابین تقسیم ہے۔ ایک
طرف زندگی کی طاقتیں ہیں جو نسلی تقسیم، جغرافیائی قیود اور قومیت سے بالاتر محض انسانی قدروں کی بقا و تحفظ میں ہیں، دوسری طرف ہلاکت، موت
بھوک، فاقے اور وباؤں کے وکیل ہیں، یہ بھی بھانت بھانت کی نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا بھی مختلف ملکوں اور مختلف قوموں سے تعلق ہے
لیکن یہ بین الاقوامی اتحاد نہیں۔ بلکہ لٹیروں کا گٹھ جوڑ اور ڈاکوؤں کا میل ہے۔ ان کے ساتھ کوئی قوم نہیں جہاں کے اتحاد کو بین الاقوامی اتحاد

کیا جا سکے! دنیا اس تقسیم کو سمجھتی ہے۔ خود اٹلانٹک پیکٹ والے اس سے واقف ہیں۔ مگر بے چارے کیا کریں۔ ان کے لئے کوئی راستہ نہیں۔ سوائے طبعی موت یا خودکشی کے!

اٹلانٹک پیکٹ کے ایک حامی چیانگ کائی شیک صاحب کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ مسٹر باؤ داؤ صاحب کا عنقریب ہونے والا ہے۔ انڈونیشیا کی زمین ولندیزیوں کے پیروں تلے سے سرکتی جا رہی ہے۔ برما میں کانی زمین سرک چکی ہے۔ کوریا ہاتھ سے نکل رہا ہے۔ جاپان کے نکلنے کے آثار نمودار ہو رہے ہیں۔ اگر وہ مغربی جرمنی سے فوجیں ہٹا کر لایا، ہانگ کانگ یا کوریا بھیجتے ہیں تو فرانس میں انقلاب کا خطرہ ہے۔ اگر نہیں بھیجتے ہیں تو مشرق ہاتھ سے نکلا جاتا ہے۔ اگر وہ یونان سے فوجیں ہٹاتے ہیں تو اٹلی کی خیر نظر نہیں آتی، اگر نہیں ہٹاتے ہیں تو اٹلی جاتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اور پیہم تمام معاشی بحران سے ہو آن دبوچا ہے۔ کل فرانک کی قیمت گر گئی، آج اسٹرلنگ کی باری ہے۔ کل پھر ڈالر کی باری بھی آ جائے گی۔ جنگ ہوتی تو شاید یہ بحران نہ آتے لیکن جنگ کیسے ہو۔ امن کی طاقتیں جو سر پر مسلط ہیں۔

**دولتِ مشترکہ اور پاکستان** مسٹر بیون نے بڑی آسانی کے ساتھ فرما دیا تھا کہ کامن ویلتھ ملک بھی بالواسطہ اٹلانٹک پیکٹ کے حامی ہیں۔ غالباً کامن ویلتھ سے ان کی مراد وہ تاجر اور وہ ناماں کارخانہ دار ہیں جو ۲ فیصدی یا ۳ فیصدی کمیشن کے معاوضے میں اپنے ملکوں کو مکمل آزادی سے محروم اور سامراجی دریچہ پر قائم دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ کامن ویلتھ کے کسی ملک کے عوام خواہ وہ گورے ہوں یا کالے، اب ڈالر کی جنگ کا ایندھن بننے کے لئے آمادہ نہیں۔ آج آسٹریلیا کی گودیوں اور بمبئی، کراچی کی بندرگاہوں کے مزدور ایک ہی طرح سوچتے ہیں، اس لئے کہ وہ ایک ہی عالمی استعماری جنگوں کا ایندھن بنائے جا چکے ہیں۔ جب اٹلانٹک پیکٹ کی حلیف ولندیزی حکومت کے جہاز انڈونیشیا کی آزادی کو کچلنے کے لئے روانہ ہوتے ہیں، تو آسٹریلیا، ہندوستان اور پاکستان کے مزدور بے ساختہ ان جہازوں کے لئے اپنی بندرگاہوں کے دروازے بند کر دیتے ہیں۔ جب مغربی افریقہ میں نسلی تفوق کا مظاہرہ ہوتا ہے تو کامن ویلتھ کی وزرائے اعظم کانفرنس اس پر خاموش ہوتی ہے۔ لیکن کامن ویلتھ کے عوام اس پر بے ساختہ چیخ پکار مچاتے ہیں۔ مسٹر بیون اپنی جگہ جس کو چاہیں اٹلانٹک پیکٹ کا حامی تصور کریں۔ لیکن یہ حقیقت بہرحال حقیقت ہے کہ تاج برطانیہ کے تحت کامن ویلتھ کا مصنوعی گٹھ جوڑ چند ہی دنوں کا مہمان ہے۔

خصوصاً ہندوستان اور پاکستان کے عوام نے تو ان مقاصد کو حاصل کرنے کا عزم کر لیا ہے جس کے لئے صدیوں سے انگنت قربانیاں دیتی آئی ہیں۔ پاکستان کے باشندے بنگال کے قحط کو کیوں کر بھول سکتے ہیں۔ وہ کیسے فراموش کر دیں گے کہ جنگ کے معنی ان کے لئے بھوک، فاقے اور موت کے سوا کچھ نہیں۔ بنگال کے ۳۰ لاکھ شہیدوں کی مائیں، بہنیں اور بیٹیاں ان زخموں کی ٹیس اب تک محسوس کر رہی ہیں۔ اس ملک کے کروڑوں عوام جانتے ہیں کہ کس طرح "جمہوریت" اور "تہذیب" کے نام پر ان کے عزیزوں کو انہیں استعماری جنگوں کا ایندھن بنائے آئے ہیں۔ ان کی فصلوں کو دن دہاڑے لوٹتے رہے ہیں۔ ان کی دنیاں چھینتے رہے ہیں۔ انہیں وہ لاسے دن دیے کہ موت کی نیند سلا دئے گئے ہیں۔ پنجاب کا کوئی دیہات ایسا نہیں جس کا کوئی نہ کوئی کڑیل جوان، امریکہ اور چرچل کی توسیع الارض کی بھینٹ نہ چڑھا ہو۔ دوسری جنگ کا افراطِ زر، مہنگائی اور معاشی بحران ابھی تک پاکستانی عوام کی زندگی حرام کئے ہوئے ہے۔ اب وہ چرچل اور اس کے جانشینوں، ٹالی اور بیون کے ہتھکنڈے خوب سمجھتے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ یہ سب کس کے "وفاع" کی تیاریاں ہیں اور کس "تہذیب" کی حفاظت کے لئے دہائی دی جا رہی ہے۔

جس استعمار نے تہذیب کو ملیا میٹ کیا ہو، جس کے دور میں علم قید اور جہالت آزاد ہوئی ہو، جس کے سایہ تلے وبائیں منڈلاتی ہوئی گھومتی ہوں، جس کے وجود سے جلیانوالہ باغ، قصہ خوانی بازار جیسی ہزاروں خونچکاں داستانیں وابستہ ہوں، اس کے منہ سے "تہذیب" کا نام سن کر اس ملک کے عوام فریب میں نہیں آ سکتے۔ البتہ چونکے ضرور ہو سکتے ہیں یہ کامن ویلتھ ہی کے سایہ کی برکت ہے کہ آج بھی پاکستان کی قومی آمدنی کا ۷۲ فیصد حصہ فوجی اغراض کیلئے مختص ہے۔ وہ بیماریاں جو ٹالی اور بیون کے پیشروؤں کی مرہونِ منت ہیں آج بھی ہمارے عوام کا کلیجہ کھائے جا رہی ہیں۔ وہ بھلا لیڈروں کو اپنا امین اور منزل کو اپنا رہبر کیوں کر سمجھیں؟ اور پھر جس "مشرقی" خطرے کے خلاف مسٹر بیون "مغربی" محاذ بنا رہے ہیں، وہ ہمارے لئے کیوں کر خطرہ ہو اس

ملک کے ادیبوں نے ٹالسٹائی، دستاوسکی، چیخوف اور گورکی سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ ہمارے سارے نئے ادب میں سوویٹ ادبی کلاسیکی فنکاروں کی جھلک ہے۔ پندرھویں اور سولہویں صدی میں یورپ کی نشاۃ ثانیہ مسلمانوں کے اثر سے شروع ہوئی تھی۔ علم و فضل کی اہریں، یونان و روم سے سپین، فرانس اور انگلستان پہنچیں، مغرب نے مشرق سے سیکھا۔ علم و ادب میں اضافہ کیلئے اب مشرق مغرب سے سیکھ رہا ہے، خواہ وہ پنا شوشاکی اور [illegible] ہوں۔ پاکیوری اور آئن سٹائن کی سائنسی ایجادات، خواہ وہ انقلاب فرانس ہو یا انقلاب روس، ہندوستان اور پاکستان بلا امتیاز ان سے متاثر ہوتے آئے ہیں اور ہوتے رہیں گے، سٹر بیون اور مسٹر ایٹلی اگر اس ذہنی نسبت پر — کہ اٹلانٹک پیکٹ، اور ایٹم بم کے ذریعہ روکنا چاہتے ہیں تو یقیناً ان کی خواہش سے تاریخی تقاضے نہیں رُک جائیں گے۔ ہمیں علم ہے کہ کس طرح زار شاہی کے استبداد کے خاتمہ کے بعد وسط ایشیا کے مسلم علاقوں کا ایک نیا اور درخشاں دور شروع ہوا۔ نئی تہذیب اور علم کی کیوں کر آبیاری ہوئی۔ قومیتوں کا مسئلہ کیوں کر سلجھایا گیا، بھوک، فاقے اور بے روزگاری کو کیوں کر دور کیا گیا، اور ہم اس سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں۔ پاکستان کے عوام ذہنوں کے تمار باندوں، دولت کے پجاریوں، بردہ فروشوں اور قصابیوں کے پابند نہیں ہیں، اب انہوں نے پابندیوں اور حد بندیوں کو ہمیشہ کے لئے اپنے راستے سے ہٹا دینے کی ٹھان لی ہے، اب انہیں بلا امتیاز ساری دنیا کے تہذیبی اور انسانی ورثوں سے استفادہ کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا — !

عالمگیر برادری، اخوت اور بھائی چارے کا جو سیلاب آج جنگ پرستوں کو خس و خاشاک کی طرح بہائے لئے جا رہا ہے، پاکستان کے اہل ثروت اس سے علیحدہ نہیں، وہ اپنے کمیشنوں کے لئے ڈالر اور سٹرلنگ کے مندروں میں پیشانیاں رگڑ رہے ہیں۔ لیکن پاکستان کے عوام اہل فکر اور اہل دانش ان ۲۰۷ قوموں کے ساتھ ہیں۔ جنہوں نے پیرس میں انسانیت کا بول بالا کرنے اور جنگ پرستوں پر امن نافذ کرنے کا عہد کیا ہے۔ قول سے نہیں بلکہ عمل سے!

بعینہٖ اسی طرح جس طرح ہندوستان، برما، ملایا اور مشرق بعید کے دیگر ممالک کے عوام برسرِ عمل ہیں —— ؟
تیسری جنگ چھڑنے سے پہلے جنگ کے شعلے بھڑکانے والے خود مغلوب ہو چکے ہوں گے۔ یہ ۱۹۲۹ء نہیں ہے ۱۹۴۹ء ہے۔!

/ / / /

"ستم یہ ہے کہ نئے جنگ آزماؤں نے جنگی پروپیگنڈا کے مقصد سے، معابد، سینما گھر، ریڈیو اور ادب تک کو استعمال کرنا شروع کر رکھا ہے اور نئی جنگ کو بالکل اسی طرح قومی امتیاز قرار دیا جا رہا ہے۔ جیسا کہ ۱۹۳۹ء سے پہلے جرمنی میں سمجھا گیا
ان حالات میں ہمارا فرض ہے کہ امن کے تحفظ کے لئے پہلے سے بھی زیادہ متحد ہو جائیں۔ ہمیں مطالبہ کرنا چاہیئے کہ اقوام متحدہ نے جنگ پسندوں کی مذمت میں جو قرارداد ابتدا میں پاس کی تھی۔ اس پر عمل کیا جائے۔ ہمیں مطالبہ کرنا چاہیئے کہ ہتھیاروں میں کمی کر دی جائے۔ ایٹمی قوتوں پر بین الاقوامی کنٹرول قائم ہو اور یالٹا اور پوٹسڈم کے فیصلوں کے مطابق تمام مسائل نئے سرے سے حل کئے جائیں ہمیں
مطالبہ کرنا چاہیئے کہ امریکہ اور برطانیہ دوسرے ملکوں کے
اندرونی معاملات میں دخل نہ دیں گے۔
مجموعات چھوڑ دیں

عبداللہ ملک

# پیرس امن کانفرنس

فرانس کے ایک مشہور محبِ وطن سیاستدان جوریز نے کہا تھا۔

"سرمایہ داری اپنے بطن میں جنگ کو اس طرح سے چھپائے ہوئے ہے۔ جیسے بادل بجلی کو اپنے اندر۔"

فرانس کے اس زندہ جاوید محبِ وطن کا مقولہ جتنا آج صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اتنا اس سے پہلے کبھی نہ تھا، ابھی جنگ کو ختم ہوئے چار برس بھی نہیں گزرے کہ دنیا کے عوام ایک نئی جنگ کے خوف سے لرزاں و ترساں ایک دوسرے کا منہ تک رہے ہیں، دنیا کے سرمایہ دار ممالک کے بیزانئے جنگ اور دفاع کے بیزانئے بن رہے ہیں، فوجوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ کارخانوں میں ٹریکٹروں کی بجائے توپیں اور مشین گنیں ڈھل رہی ہیں۔ لوگوں کو غذا مہیا نہیں ہو رہی۔ بلکہ زہریلی گیسیں تیار ہو رہی ہیں، اور یہ عالمِ رنگ و بو پھر ایک بار موت و ہلاکت کے دہانے پہ کھڑا ہے۔

۱۹۳۸ء میں دوسری جنگِ عظیم سے پہلے میونخ کا معاہدہ وجود میں آیا تھا۔ اس وقت یہ معاہدہ موت اور ہلاکت کا معاہدہ تھا۔ اور آج پھر نئی جنگ کے لئے عہد و پیمان ہو رہے ہیں، مغربی یورپ کی یونین وجود میں آ رہی ہے، مغربی یورپ کے ممالک آپس میں جنگی اور فوجی معاہدے کر رہے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر معاہدۂ اوقیانوس وجود میں آ رہا ہے، آخر یہ جنگ کیوں؟ صرف اس لئے کہ امریکہ کے سرمایہ دار اپنی منفعت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں، انہیں پھلوں اور گوشت سے زیادہ اسلحہ سے منافع حاصل ہوتا چاہیئے، اس لئے امریکہ کے کارخانہ دار پھلوں گوشت اور پنیر کی بجائے اسلحہ تیار کر رہے ہیں۔ اور ان ہتھیاروں کو بیچنے کے لئے اور دنیا کو اپنا غلام بنانے کے لئے وہ جنگ چاہتے ہیں، تاکہ ایک طرف دنیا بھر کی جمہوری تحریکوں کو کچل سکیں۔ اور دوسری طرف دنیا کو اپنی غلامی کی سنہری زنجیروں میں جکڑ سکیں، چنانچہ معاہدۂ اوقیانوس کے ذریعے یہ سنہری زنجیریں تیار کی گئی ہیں، چنانچہ امریکی پروگریسو پارٹی کے لیڈر ہنری ویلس نے اس معاہدے کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا تھا،

> اس معاہدے پر دستخط کرنے والے ممالک کے سیاستدان بار بار امن کی دہائی دے رہے ہیں، لیکن یہ معاہدہ تباہی کا پیش خیمہ ہے۔ جو دنیا کے عوام کو جنگ کی بھٹی میں جھونک دے گا۔ اقوامِ متحدہ کے بنیادی منشور کی حمایت میں زبانی جمع خرچ کرنے سے یہ حقیقت نہیں چھپائی جا سکتی، کہ اس معاہدے کا مقصد اقوامِ متحدہ کی انجمن کو ختم کرنا ہے۔ اس معاہدے کی خصوصیت کو ثابت کرنے کے لئے کہا جا رہا ہے کہ یہ محض علاقائی معاہدہ ہے۔ اس لئے بالکل بے ضرر ہے۔ لیکن شاید "علاقہ" کی تشریح ہٹلری سیاست دانوں کی طرح کی جا رہی ہے۔ جو تمام دنیا کو اپنا علاقہ سمجھتے تھے۔

چنانچہ اپریل کے مہینے میں ہی واشنگٹن میں بارہ ممالک نے اس معاہدے پر دستخط کر دیئے، یہ دستخط تھے لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کی موت کے پروانے پر، یہ دستخط تھے جنگ کے اعلان نامے پر، یہ دستخط تھے۔ دنیا بھر کی جمہوری تحریکوں کی تباہی کے خاتمہ پر، لیکن آج دنیا کے کروڑوں انسانوں

کو جنگ کی یادیں بھول نہیں ہیں، انہیں موت اور ہلاکت کی داستانیں ابھی تک بچی کھچی یاد ہیں، ان بیواؤں کو اپنے ماتھے کا سندور ابھی تک یاد ہے۔ جن کے شوہر یورپ، ایشیا اور افریقہ کے میدانوں میں نازیوں کے خلاف لڑتے ہوئے مارے گئے، اب یورپ کو، ایشیا کو، افریقہ کو اس دنیا کے کروڑوں انسانوں کو پھر سے جنگ کی بھٹی میں جھونکا جا رہا ہے، لیکن آج وہ اس موت اور ہلاکت کی بھٹی میں جانے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ وہ امن چاہتے ہیں تاکہ وہ اپنے گھر منڈل کر سکیں، وہ امن چاہتے ہیں، تاکہ وہ ان خوبصورت شہروں کو پھر سے تعمیر کر سکیں۔ جنکو نازیوں نے تہس نہس کر دیا ہے۔

اسی لئے جب واشنگٹن میں بارہ ممالک کے مٹھی بھر حکمران عوام کو جنگ، موت اور ہلاکت کے سمندر میں غرقاب کرنے کے لئے سازش کر رہے تھے۔ تو عین اسی وقت پیرس میں امن کانفرنس کی تیاریاں ہو رہی تھیں، یہ کانفرنس اسی پیرس میں ہو رہی تھی، جس کے بیچوں بیچ دریائے سین گزرتا ہے۔ یہ وہی پیرس ہے۔ جسے فرانس والے شہروں کی ملکہ کہتے ہیں، جس میں نوترے ڈیم کا گرجا ہے اور یونانی دیوی دیوتاؤں کے مجسمے ہیں، یہ وہی پیرس ہے جس کے گلی کوچوں میں اخوت و مساوات کے نعرے گونجے تھے، انہی گلی کوچوں نے دنیا کے علم و ادب کو روسو، والٹیر، وکٹر ہیوگو، فلابیر اور بالزاک دیا تھا، یہ وہی پیرس ہے جہاں سے پہلی بار مزدور انقلاب کا نعرہ بلند ہوا تھا، یہ وہی پیرس ہے۔ جہاں کے مزدوروں نے بیرونی حملہ آوروں اور اپنے سرمایہ داروں کے خلاف پہلی بار ہتھیار اٹھائے تھے، آج پھر اسی پیرس میں اس شہروں کی ملکہ کے گلی کوچوں میں، اسی یونانی دیوی دیوتاؤں کے مجسموں والے شہر میں، انسان نعرے بلند کر رہے تھے کہ

"ہم جنگ نہیں چاہتے۔ ہم امن کے خواہاں ہیں، ہم اگر نازیوں کو شکست دے سکتے ہیں تو امریکہ و برطانیہ کے جنگ کے حامیوں کو بھی ہرا سکتے ہیں۔"

# پیرس کانفرنس

۲۰ سے ۲۵ اپریل تک پیرس کے گلی کوچوں میں، ریسٹورانوں اور ہوٹلوں میں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں، لائبریریوں اور لیبارٹریوں میں امن کے چرچے ہوتے رہے، پیرس نے ۱۴ برس پہلے بھی ایک امن کانفرنس دیکھی تھی، اس وقت صرف یورپ کے دانشور اور اہل قلم اس شہر میں جمع ہوئے تھے، انہوں نے نہایت نحیف و نزار آواز میں دنیا کے دانشوروں کو مخاطب کیا تھا۔ اور انہوں نے کہا تھا موت کے بادل امڈ رہے ہیں۔ اور زندگی کی ننھی ننھی کونپلوں کو ختم کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اس لئے اٹھو اور موت کے خلاف زندگی کی ہمنوائی کرو۔ لیکن اس آواز پر بہت کم لوگوں نے کان دھرا، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری دنیا چھ برس تک موت کی دہلیز پر دم توڑتی رہی۔ لیکن آج اس کانفرنس میں امن چاہنے والوں، جنگ کے مخالفوں کی آواز نحیف و نزار نہیں تھی اس آواز میں خود اعتمادی تھی، اپنی طاقت پر بھروسہ تھا۔ اور عزم تھا چنانچہ اسی لئے جب پیرس کے پیرل ہال میں کانفرنس شروع ہوئی تو فرانس کے مشہور سائنسدان جولیو کیوری نے کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے زوردار الفاظ میں کہا۔

"ہمیں اپنی مشکلات کا پوری طرح احساس ہے، لیکن یہ پہلا موقعہ نہیں ہے کہ عام انسان امن کی جنگ شروع کر رہا ہے، ہم نے اس سے پہلے بھی جنگ کے خلاف لڑائیاں لڑی ہیں اور آج بھی اس امن کی لڑائی میں ہم پورے عزم اور یقین کے ساتھ شامل ہو رہے ہیں۔ کیونکہ ہمیں اپنی فتح کا پورا یقین ہے، ہمیں اپنی طاقت کا اچھی طرح علم ہے اس لئے ہم صرف امن کی لڑائی میں جنگ چاہنے والوں کے کارناموں کی مذمت ہی نہیں کریں گے،

ہم یہاں پر جنگ کے پجاریوں سے امن کی بھیک مانگنے نہیں آئے۔ بلکہ ہم امن کو ان پر مسلط کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔

اس کانفرنس میں دنیا کے کونے کونے سے مختلف سیاسی، سماجی، تہذیبی اور مذہبی اداروں نے شرکت کی۔ چنانچہ یہ امن کانفرنس باضابطہ طور پر کروڑ ہا انسانوں کی نمائندگی کر رہی تھی، اس کے باوجود بہت سے ملکوں کے حکمرانوں نے اپنے ہاں کے نمائندوں کو اس امن کانفرنس میں شریک ہونے سے روک دیا، جیسے پنڈت جواہر لال نہرو کی حکومت نے ایک نمائندے سردار جعفری کو پکڑ کر جیل میں ڈال دیا، دوسرے نمائندے ملک راج آنند سے پاسپورٹ چھین لیا تیسرے نمائندے کرشن چندر کو پاسپورٹ دینے ہی سے انکار کر دیا، اسی طرح کئی اور ملکوں کے حاکموں نے امن کانفرنس کے نام سے ناک بھوں چڑھائے۔ چنانچہ خود فرانس کی حکومت نے اعلان کر دیا کہ کسی ملک سے بیس سے زیادہ نمائندے شریک نہیں ہو سکتے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے مندوبین کو فرانس کی سرحدوں پر ہی رک جانا پڑا۔ بالآخر پیرس کانفرنس کے دوش بدوش پراگ میں ایک کانفرنس منعقد کی گئی جس میں باقی مندوبین نے حصہ لیا۔

پیرس کے اس حسین و جمیل شہر میں ۷۲ ملکوں کے نمائندے جمع ہوئے۔ اور تیرہ کے قریب بین الاقوامی اداروں نے اس کانفرنس کے ساتھ اپنے کو ملحق کیا، ورلڈ کانفرنس کی دعوت دینے والوں میں شریک ہوئے، چنانچہ ان میں عالمگیر ٹریڈ یونین فیڈریشن بھی، اسکے ممبروں کی تعداد سات کروڑ تھی، نوجوانان عالم کی جماعت تھی جس کی تعداد ۵ کروڑ میں لاکھ تھی، سیاسی قیدیوں کا ادارہ بھی اس میں شامل تھا اس کی تعداد ایک کروڑ تھی، ۲۰ لاکھ طلباء اور ۲۰ لاکھ اساتذہ کی جماعتیں بھی دعوت دہندگان میں شریک تھیں

# وراشلوڈ سے پیرس تک

گذشتہ سال بھی ایک کانفرنس منعقد ہوئی تھی، یہ کانفرنس پولینڈ کے ایک شہر وراشلوڈ میں منعقد ہوئی تھی، اس شہر میں امن کے حامی جمع ہوئے تھے انہوں نے بھی جنگ چاہنے والوں کی مذمت کی تھی، لیکن اس کانفرنس میں ادیب، صحافی، سائنس داں اور دانشور جمع ہوئے تھے، انہوں نے امن کی لڑائی کے تمام کوشوں پر نگاہ نہیں ڈالی تھی، انہوں نے اس عظیم لڑائی کے لئے کوئی ادارہ بھی قائم نہیں کیا تھا، ان تمام خامیوں کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ یہ کانفرنس امن کی اپیل تو کر سکی۔ لیکن امن کے لئے عوام کو منظم کرکے جدوجہد کی راہ پر چلنے میں ناکام رہی۔

پیرس کانفرنس نے وراشلوڈ کی تمام خامیوں کو دور کر دیا، چنانچہ یہی وجہ تھی کہ پیرس میں تمام اضلاع اور دیہات سے لاکھوں انسان اس کانفرنس اور اسکے مندوبین کو دیکھنے کے لئے جوق در جوق پہنچے، عام انسانوں کی دلچسپی کے بارے میں طاس کے نامہ نگار نے بہت خوبصورتی سے لکھا ہے۔ وہ لکھتا ہے،

> صبح تڑکے ہی سے پیرس کے گوشے گوشے سے لوگ پورٹ دارمان کی طرف چل پڑے تھے یہیں پر بفیلو سٹیڈیم واقع ہے، پیرس کے بسنے والے اور فرانس کے دوسرے شہروں سے امن کے پجاری تانتا باندھے اسی جگہ چلے آ رہے تھے
>
> پچھلے چند ہفتوں سے فرانسیسی اس دن کی ایسے تیاریاں کر رہے تھے جیسے کوئی بہت بڑا تہوار منایا جانے والا ہے۔
>
> امن کے پجاری شہر شہر، قریہ قریہ اور گاؤں گاؤں سے ہوتے ہوئے آ رہے تھے۔ کوئی موٹر اور لاری پر تھا تو کوئی سائیکل پر اور کوئی پیدل حتیٰ کہ تو کوئی کشتی پر۔ یہ لوگ پیرس کے جس قدر قریب ہوتے جاتے تھے اسی قدر تعداد میں بڑھتے جاتے تھے، ان کا قافلہ پھیلتا جاتا تھا اور بڑھتا جاتا تھا، ان قافلوں میں سینٹ ایٹین کے کان کن تھے، ان میں نارمنڈی کے کسان تھے۔ موسیلے کے فولاد کے کارخانوں کے مزدور تھے، لیانس کے طالب علم تھے، فرانس کے جنوبی ساحل کے گودی والے تھے اور برگنڈی کے شراب کشید کرنے والے مزدور تھے۔

یہ لوگ ان بچوں کے ولی تھے۔ راستے میں فرانس کی جنگ آزادی میں شہید ہونے والے [illegible] کی یادگار پر پھول چڑھاتے، ترانے گاتے، مشعلیں، جھنڈے اور امن کے نعرے لگاتے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔

یہ کانفرنس پانچ دن تک ہوتی رہی اور فرانس کے شہروں میں سے ہر روز عوام لوگ اس میں شریک ہونے کے لئے پہنچ رہے تھے۔ انگلستان، بلجیم، اور دیگر شہروں میں بھی عام مزدور، کسان، طالب علم، استاد اور پروفیسر معاہدہ اوقیانوس کے خلاف مظاہرے کر رہے تھے، وہ امن کانفرنس زندہ باد کے نعرے بلند کر رہے تھے، چنانچہ ان دنوں تمام یورپ اور ایشیا کے ممالک کے عوام امن کیلئے گلی کوچوں، فیکٹریوں اور کھیتوں، سکولوں اور کالجوں، مسجدوں اور کلیساؤں، دفتروں اور لیبارٹریوں میں ہر جگہ عوام نے جنگ کے خلاف آواز بلند کی۔ ان ملکوں میں بھی کہ حکام معاہدہ اوقیانوس پر دستخط کر کے اپنے عوام سے غداری کر رہے تھے۔ زبردست مظاہرے ہوئے، اٹلی کے تمام شہروں میں ان مظاہرین اور پولیس کے درمیان کئی بار تصادم ہوا۔ اطالوی کسانوں نے اعلان کیا۔

"اطالوی کسان برطانوی اور امریکی شہنشاہیوں کے لئے ایک قطرہ خون بھی بہانے کیلئے تیار نہیں ہیں"

یہی وجہ تھی کہ جب کانفرنس شروع ہوئی تو مندوبین نے صرف امن کے نئے لفظی اعلان ہی نہیں کئے۔ بلکہ اس کانفرنس نے ثابت کر دکھایا کہ امن کا حصول صرف تحریکوں اور تقریروں سے نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے بنیادی کام سرمایہ دار ممالک کے حکمرانوں کے جنگی منصوبوں کی قلعی کھولنا اور ان کو شکست دینا ہے چونکہ جب تک یہ حکمران قائم و دائم رہتے ہیں۔ اس وقت تک امن کا خواب ایک خواب ہی رہے گا، یہی وجہ تھی کہ جب چین کا وفد سپاہیوں کی وردی پہنے بندوقیں ہاتھ میں سنبھالے کانفرنس میں شریک ہوا تو پوری کانفرنس تالیوں سے گونج اٹھی۔ اور عوام کی آنکھیں کھل گئیں، کیوں کہ انہیں اب محسوس ہو رہا تھا کہ امن کی حفاظت بہت دفعہ کانفرنسوں سے باہر میدان جنگ میں بھی کرنی پڑتی ہے۔ چنانچہ چین کے مجاہد، ویت نام کے دلیر، انڈونیشیا کے بہادر اور یونان کے چھاپہ مار اور [illegible] کے مجاہد کانفرنسوں میں نہیں بلکہ میدان جنگ میں بھی اپنے خون سے امن کی حفاظت کر رہے ہیں اور جنگ چاہنے والوں پر عرصہ حیات تنگ کر رہے ہیں، اسی لئے ان ممالک کے نمائندوں نے پوری کانفرنس کا رنگ بدل دیا، اور لوگ سمجھ گئے۔ کہ کس طرح سے امن کی حفاظت اور ملکی آزادی اور سچی جمہوریت کی لڑائی ایک ہی لڑائی ہے، جو اپنے ملک میں سچی جمہوریت کے لئے نہیں لڑ سکتا۔ وہ امن عالم کیلئے بھی نہیں لڑ سکتا، چنانچہ جب اطالوی سوشلسٹ لیڈر رینی نے کہا۔

ہم اس پلیٹ فارم سے تمام ان لوگوں کی طرف جو جنگ روکنا چاہتے ہیں۔ بھائی چارے کا ہاتھ بڑھاتے ہیں، لیکن انہیں یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ اگر یہ ہاتھ جھٹک دیا گیا تو بالکل یہ ہاتھ گھونسہ بھی ہو سکتا ہے، اگر ہماری امن کی اپیلوں پر کان نہ دھرے گئے اور اطلانتک پیکٹ کے مصنفوں نے تیسری جنگ کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لے لی تو پھر ہمارا جواب بغاوت کی صورت میں ہوگا۔ تمام دنیا میں علم بغاوت بلند کریں گے"
تو جنگ چاہنے والوں کے خلاف ان الفاظ کی گونج اور تالیوں کا شور کئی منٹ تک تھمنے نہ پایا۔

# اعلان نامہ

اس کانفرنس نے متفقہ طور پر مندرجہ ذیل اعلان نامہ پاس کیا۔

ہم عوام کے نمائندے جو دنیا کے ۷۲ ممالک سے آ کر یہاں جمع ہوئے ہیں، ہم مختلف اقوام کے لوگ ہیں، مختلف مذاہب اور اعتقادات کے مرد اور عورتیں ہیں، ہم سب نے اس عظیم خطرے کو محسوس کیا ہے۔ جو آج پوری دنیا پر منڈلا رہا ہے، یہ عظیم خطرہ — جنگ کا خطرہ ہے
عالمگیر جنگ کو ختم ہوئے ابھی چار سال گزرے ہیں کہ اب مختلف ممالک کے عوام کو پھر ہتھیار تیز کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے، سائنس کو جنگ کا

بلا اور مادی وسائل ذریعہ انسان کیلئے خوشحالی پیدا کرتا ہے، اپنے صحیح عناصر سے شاکر جنگی منصوبوں کا آلہ کار بنایا جا رہا ہے، مختلف ممالک میں جنگ کے بھڑکتے شعلے دہک رہے ہیں، وہ صرف اس لئے روشن ہیں کہ بیرونی ملک اور اُن کی فوجیں ان ممالک کی زندگی میں مداخلت کر رہی ہیں۔

ہم — جو اس عظیم الشان عالمگیر امن کانگرس میں جمع ہوئے ہیں صاف صاف الفاظ میں اعلان کرتے ہیں، کہ ہم نے اپنی قوت فیصلہ میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی یا کمزوری نہیں آنے دی اور نہ ہی ہمارے دماغ جنگ بازوں کے پراپیگنڈے سے متاثر ہوئے ہیں۔

ہم — جانتے ہیں کہ عظیم مملکتوں کے مابین جو معاہدے ہوئے تھے۔ اور جن کی رو سے یہ امکانات پیدا ہوئے تھے۔ کہ مختلف معاشرتی نظام ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو زندگی گزار سکیں ان معاہدوں کو کس نے توڑا ہے

ہم — جانتے ہیں کہ آج اقوام متحدہ کے منشور کو کون پرزے پرزے کر رہا ہے

ہم — جانتے ہیں کہ کون قومیں امن و آشتی کے معاہدوں کو ردی کاغذ کے پرزوں سے زیادہ وقعت نہیں دیتیں، کون مسائل کو گفت و شنید سے حل نہیں کرتیں، جو تخفیف اسلحہ کی تمام تجاویز کو مسترد کر دیتی ہیں کون قوموں کو اب چوٹی تک مسلح کر رہی ہیں — یہی ہیں جو جنگ چاہتی ہیں اور انہوں نے اپنے اعمال سے اپنے کو بے نقاب کر دیا ہے۔

ایٹم بم دفاع اور حفاظت کا ہتھیار نہیں ہے،

ہم — ان شعبدہ بازوں کا کھیل نہیں کھیلنا چاہتے۔ جو ممالک کے ایک گروہ کو دوسرے کے خلاف صف آرا کرنا چاہتے ہیں۔

ہم — فوجی گروہ بندیوں کے خلاف ہیں کیوں کہ ان گروہ بندیوں کے تلخ نتائج کی یادیں ہمارے دماغ سے محو نہیں ہوئیں،

ہم — نوآبادیاتی نظام کے مخالف ہیں، کیوں کہ اس نظام میں مسلسل مسلح چپقلش ہوتی رہتی ہے اور یہی عالمگیر جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے

ہم — مغربی جرمنی اور جاپان کو مسلح کرنے کے خلاف احتجاج کرتے ہیں، کیونکہ اس کا مطلب جرائم کے تاجروں کے ہاتھ میں ایک بار پھر ہتھیار دینا ہے

مختلف ممالک کے گروہوں کے خلاف اقتصادی ناکہ بندی کی جا رہی ہے ان کے ساتھ اقتصادی تعلقات کے قیام میں جان بوجھ کر رخنہ اندازی کی جا رہی ہے، اور اس اقتصادی ناکہ بندی نے جنگی ناکہ بندی کا روپ اختیار کر لیا ہے۔

اعصابی جنگ کے حامیوں نے اب دھمکیوں سے بڑھ کر باقاعدہ جنگی کارروائیاں شروع کر دی ہیں، لیکن یہ عالمگیر امن کانگرس عوام کی زبردست اور شدید خواہش کا اظہار کرتی ہے، کہ اب دنیا کے عوام مجبور تماشائی نہیں ہیں۔ بلکہ وہ اپنے مستقبل کو اپنی خواہش کے مطابق ڈھالنے کا پختہ عزم کر چکے ہیں۔ اور اس کے لئے وہ سرگرم عمل ہیں۔

## یہ عالمگیر امن کانگرس اعلان کرتی ہے

— ہم مجلس متحدہ اقوام کے منشور کا احترام کرتے ہیں اور ان تمام فوجی معاہدوں کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔ جو اس منشور کو بیکار کر دیتے ہیں اور جنگ کا موجب بنتے ہیں،

ہم فوجی اخراجات میں ناقابل برداشت اضافے کے زبردست مخالف ہیں۔ کیونکہ اس سے عوام کی غربت میں اضافہ ہوتا ہے،

ہم ایٹم بم اور دوسرے ہلاکت آفریں ہتھیاروں کے استعمال پر پابندی کا زبردست مطالبہ کرتے ہیں۔ ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ تمام طاقتیں اپنی فوجوں میں کمی کریں اور ایٹمی طاقت پر مؤثر بین الاقوامی کنٹرول نافذ کیا جائے تاکہ اس طاقت کو انسانی بہبودی اور خوشحالی ہی کے لئے صرف استعمال کیا جائے۔

ہم قومی آزادی اور مختلف ملکوں اور قوموں کے تعاون اور اشتراکِ عمل کے زبردست حامی ہیں۔ اور ہم تمام قوموں کے حقِ خود اختیاری کا مطالبہ کرتے ہیں، کیوں کہ قومی آزادی، حقِ خود اختیاری کے بغیر امن اور آزادی حاصل نہیں ہو سکتی۔

ہم ان تمام پالیسیوں کے خلاف زبردست احتجاج کرتے ہیں، جن کی رو سے جمہوری حقوق کو کچلا جاتا ہے اور پھر بالکل دبا دیا جاتا ہے تاکہ جنگ کے لئے فضا کو سازگار بنایا جا سکے۔

ہم سچائی اور استدلال کی حفاظت کیلئے دنیا بھر کے عوام کا ایک جمہوری محاذ ہیں، جس کا مقصد جنگ خواہوں کے پراپیگنڈے کو شکست دینا ہے۔

ہم جنگی صعنوں، نسلی امتیاز اور اقوام کی باہمی دشمنی کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور نئی جنگ کا پراپیگنڈہ کرنے والے اخبارات، رسالوں اور فلموں کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔ اور ان کے بائیکاٹ کئے جانے کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

ہم جمہوروں نے تمام دنیا کے عوام کا ایک فولادی اور ناقابلِ تسخیر محاذ قائم کیا ہے۔ اپنی تمام کوششیں امن کے لئے صرف کرنے کا حلف اٹھاتے ہیں۔ ہم امن کی حفاظت اور جنگ کے خلاف ہوشیار رہنے کے فیصلہ کی وادی کو عملی جامہ پہنانے کے لئے عالمگیر امن کانگریس کی ایک قومی کمیٹی کے قیام کا اعلان کرتے ہیں۔ اس کمیٹی میں تمام تہذیبی کارکن اور جمہوری ادارے شامل ہو سکیں گے۔ یہ جمہوری محاذ جنگ بازوں کو قدم قدم پر روکے گا اور عوام کی بڑھتی ہوئی طاقت کے بل پر امن نافذ کرے گا۔

عورتوں اور ماؤں کو جو دنیا کی مستقبل امیدیں وہ دعوت کرتی ہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ ہم ان کے بچوں کی سلامتی اور ان کے گھروں کی حفاظت کو ایک اہم فریضہ تصور کرتے ہیں۔ نوجوانوں کو چاہیئے کہ وہ ہماری بات سنیں اور بلا لحاظ مذہب اور عقیدے کے متحد ہو جائیں۔ تاکہ ان کی نوجوان زندگیاں موت اور ہلاکت کی منحوس پرچھائیوں سے محفوظ رہیں۔

عالمگیر امن کانگریس خلوصِ دل سے اعلان کرتی ہے کہ امن کی حفاظت دنیا کے تمام لوگوں کا مقدس فرض ہے،

ساٹھ کروڑ مردوں اور عورتوں کی نمائندہ عالمگیر امن کانگریس، دنیا بھر کے عوام کو پکار پکار کر کہتی ہے،

امن کی جد و جہد میں ہمت اور محنت سے کام کرو!
ہم یہاں یکجا ہوئے ہیں، ہم نے ایک دوسرے کو سمجھا ہے
ہم امن کی جنگ جیتنے کا حلف اٹھاتے ہیں۔
امن کی جد و جہد زندگی کی جد و جہد ہے۔

• • • • • •

"عوام کے لئے جنگ کے معنی ہیں خون اور آنسو، بیوائیں اور یتیم، ویران گھرانے پامال جوانیاں اور گھٹتے ہوئے بڑھاپے۔ لیکن مٹھی بھر امریکی قصائیوں کے لئے جنگ کچھ اور ہی معنی رکھتی ہے ——
ان کے نزدیک جنگ کے معنی ہیں ٹھیکے، اسلحہ اور گولہ بارود کے آرڈر
بہی کھاتے اور منافعے

دایلیا اہرن برگ

# فریڈرک جولیو کیوری کا خطاب

خواتین، حضرات اور پیارے رفیقو! اس مؤتمر امن کی مجلس منتظمہ کی طرف سے دلی مسرت کے ساتھ آپ لوگوں کا خیر مقدم کرتا ہوں جس نے مجھ کو اپنا صدر منتخب کر کے میری عزت افزائی کی۔ مجھے یقین ہے کہ میں آپ کا خیر مقدم صرف کمیٹی کی طرف سے نہیں کر رہا۔ بلکہ فرانس کے ان لاکھوں باشندوں کی طرف سے بھی جنہیں اس بات پر فخر ہے کہ ان کا دارالحکومت ایسے لوگوں کے اجتماع کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ جو عوام کی تاریخ امن کو موثر طور پر محفوظ رکھنے کیلئے متحد ہیں۔"

مؤتمر امن کی فرانسیسی کمیٹی کا شکریہ ادا کرنے کے بعد پروفیسر کیوری نے کہا کہ حکومت فرانس نے اپنے وعدوں کے باوجود، مؤتمر کے بہت سے مندوبین کو اجازت نامے مہیا کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اسلئے وہ اس اجتماع میں شریک نہیں ہو سکے۔ حکومت فرانس کے اس غیر منصفانہ فیصلے کے خلاف دنیا بھر کے لاکھوں امن پسند عوام میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آپ لوگ اس قابل مذمت فیصلے کو بہت زیادہ اہمیت نہ دینگے۔ کیونکہ حکومت نے اس طرز عمل سے دراصل اپنی کمزوری اور خوف ـــ سچائی سے خوف ـــ کا اظہار کیا ہے۔ لیکن یاد رکھئے سچائی کو پھیلنے کیلئے اجازت ناموں کی ضرورت نہیں ہوتی!

اس اجتماع میں آپ جس سچائی کا اظہار کریں گے وہ تمام مشکلات اور دشواریوں کے باوجود بالکل طول و عرض میں پھیل کر رہے گی اور اس سے اُن لوگوں کی آنکھیں بھی کھل جائیں گی۔ جو اس خطرے کو دیکھنے سے قاصر ہیں جو امن عالم کو پیش آنے والا ہے۔

ہمیں اپنی مشکلات کا پورا پورا احساس ہے۔ کیونکہ خوش قسمتی سے انسداد جنگ کے لئے امن پسندوں کا یہ پہلا اجتماع نہیں ہے اور ہم پورے وثوق کے ساتھ جدوجہد کے میدان میں کود سکتے ہیں، کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ انجام کار فتح ہماری ہوگی۔ ہمارے پاس کافی قوت ہے، اور ہمیں اپنے طریق کار پر بھروسہ ہے۔ ہم محض شرارت پسندوں کی مذمت کرنے پر ہی اکتفا نہ کریں گے۔ ہم جنگ کے خداؤں سے امن کی بھیک مانگنے کے لئے جمع نہیں ہوئے۔ بلکہ ہم یہ مطالبہ ان سے زبردستی منوا کر رہیں گے!

ابھی چند سال ہی گزرے ہیں کہ ہم نے متحدہ طور پر فاشزم کے خلاف کامیاب جنگ کی ہے ہم میں سے بعض کھلے آسمان کے نیچے لڑے اور بعض نے محکومی کی تاریکی میں اپنا فرض ادا کیا۔ آپ کو اُس زمانہ کی تمنائیں اور آرزوئیں یاد ہیں اگر نہیں تو اپنے ذہن میں ذرا منشور اطلانتک اور یالٹا اور پوٹسڈم کے معاہدوں کی یاد تازہ کیجئے۔ جن کو ادارۂ اقوام متحدہ کا بنیادی پتھر ثابت ہونا تھا۔

جنگ کے زمانہ میں مختلف الخیال اتحادیوں نے ان معاہدوں پر محض اس امید میں دستخط کئے تھے کہ مشترک فتح کے بعد دائمی امن کا قیام یقینی ہو جائیگا جنگ کے زمانہ میں جن قوموں کو تکالیف و مصائب کا سامنا کرنا پڑا اُن کی دلی خواہش تھی کہ دنیا میں امن قائم ہو جائے اور رفتہ رفتہ طمانیت و فارغ البالی کی زندگی بسر کریں۔ وہ اپنے اپنے ملک کی تعمیر نو کی متمنی تھیں۔ اُن میں کافی جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے اُس وقت خصوصاً کاروباری حلقوں میں ایسے کمینے اور چالاک لوگوں کی کمی نہ تھی۔ جن کو اُن ممالک کی طرف سے خطرہ درپیش تھا جو آزادی حاصل کرنے کے بعد تہذیب انسانیت کی شاہراہ پر گامزن تھے۔ یہ لوگ ایک ایسے موقع کی تلاش میں تھے۔ جب وہ پھوٹ ڈال سکیں اور کھلم کھلا رجعت پسندانہ پالیسی اختیار کر سکیں۔ اُن کا مقصد محض روپیہ کمانا تھا۔ خواہ اس اقدام سے ایک اور جنگ ہی کیوں نہ چھڑ جائے

دراصل سرمایہ دارانہ ذہنیت میں تبدیلی نہیں ہوئی۔ اور نہ ہو سکتی ہے!

چنانچہ ان لوگوں نے پروپیگنڈے کی مہم شروع کر دی۔ اور شروع میں تو وہ خاموشی اور سکون سے کام کرتے رہے۔ لیکن بعد میں اُس کی مہم میں تیزی اور ہنگامہ پیدا ہو گیا۔ اور انہوں نے روزن برگ اور گوئبلز کی اصطلاحات بھی استعمال کرنے سے گریز نہ کیا۔ انہوں نے روس کو دنیا کے سامنے ایک ہوا بنا کر پیش کیا۔ ان پروپیگنڈا کرنے والوں میں زیادہ تر سٹہ باز، بدمعاش اور مقبوضہ علاقوں کے غدار شامل تھے۔ وہ پریس کے اکثر حصوں

اور بعض سیاسی پارٹیوں کی قیادت پر تسلط جمانے میں کامیاب ہو گئے۔ اور اتفاق ایسا ہوا کہ بعض ممالک میں جو حکومتیں برسرِ اقتدار آئیں وہ بھی ہتھکنڈے استعمال کر کے سیاسی، معاشی اور فوجی محاذوں پر پے در پے حملے کرنے میں کامیاب ہوتی رہیں۔ مثال کے طور پر یونان کے فاسسٹوں کی امداد، ترکی پر تسلط، ویت نام اور انڈونیشیا کے اندر جنگ اور فرانکو کی حمایت!

ہمیں معلوم ہے کہ اقوام متحدہ میں بھی ایسے ممالک کی اکثریت ہے جو اقتصادی دباؤ اور فوری پروپیگنڈے کے زیر اثر امریکی سامراجیوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح کھیل رہے ہیں۔ اور اب یہ راز کی بات نہیں رہی۔

پھر غیر مسلح ہونے کی تمام تجاویز مسترد کی جا چکی ہیں۔ اور ایٹمی ہتھیاروں پر پابندی لگانے کی تجویز کا جو حشر ہوا ہے۔ وہ بھی سب کے سامنے ہے!

اگر ہم ان حقائق پر فوجی چوکیوں کے قیام کی روشنی میں غور کریں، اگر ہم یہ دیکھیں کہ فوجی چوکیاں کہاں کہاں قائم کی گئی ہیں، اگر ہم ان فوجی معاہدوں کا مطالعہ کریں۔ جن پر حال ہی میں دستخط کئے گئے ہیں۔ مثلاً عہد نامہ برسلز اور معاہدہ شمالی اوقیانوس تو ہم یہ اندازہ لگائے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ابھی جنگ کے غار میں ہمیں دھکیلا جا رہا ہے وہ سوویٹ یونین کے خلاف ہے۔ اور یہ وہی جنگ ہے جس میں رجعت پسند قوتیں اعلانیہ اور خفیہ طور پر ۱۹۱۷ء سے مصروف ہیں۔ بوڑھی جنگ کے بڑھتے ہوئے اندیشوں کے پیش نظر اب وقت آگیا ہے کہ ترقی اور امن کی خواہشمند جماعتیں اتحاد اور تنظیم کے علاوہ ہیں۔ بلکہ میرے نزدیک ابھی تک جنگ کی قوتوں کے خلاف ہمیں امن کیلئے ایک زبردست مہم کا آغاز کر دینا چاہیئے تھا۔

آج سرمایہ دار اقتصادی بحران سے جتنا خوفزدہ ہے اتنا ۳۴ سال پہلے نہیں تھا۔ کیونکہ حقیقی یا اعصابی جنگوں کے باوجود اشتراکی نظام قوی سے قوی تر ہوتا جا رہا ہے اور اس کے ماتحت اقتصادی بحران کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

سرمایہ دار مقابلہ و مسابقت سے متنفر ہے۔ اگر اسے اپنے نصب العین پر اعتماد ہوتا تو وہ اس نصب العین کو تباہ کرنے کی کوشش کیوں کرتا جو اس کے دل میں احساس کمتری پیدا کرنے کا موجب بن رہا ہے!

اگر یہ محض ایماندارانہ خیالات کی جنگ ہوتی یا تجربات کے درمیان دیانتدارانہ تقابل کی کوشش ہوتی تو فوجی قوت کی نمائش اور ایٹم بم کے استعمال کی دھمکیوں کی ضرورت ہی باقی نہ رہتی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ محض اقتصادی کساد بازاری کو ٹالنے کے لئے ہے۔ علاوہ اس کے اثرات پوری طرح نمایاں ہو چکے ہیں۔ اس غرض کیلئے سرمایہ دار ممالک مغربی یورپ میں اپنے پاؤں پھیلانا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک ترقی پسند قوتوں کو دبا نہ دیا جائے۔ سرمایہ داروں کا پروگرام واضح ہے۔ اب تمام ملکوں کے عوام ہی کی متحدہ طاقت ان کے ارادوں کو ناکام بنا سکتی ہے جنگی تیاریوں کے تباہ کن نتائج کا اندازہ کسی حد تک ہمارے اپنے ملک میں بھی ہو سکتا ہے۔ جو اقتصادی "امداد" اقوام کو مسلح کرنے کی ہنگامی مہم اور روس کے خلاف پروپیگنڈہ کی مہم کی صورت میں ظاہر ہو رہے ہیں۔

اقتصادی احتیاج اور سیاسی بالادستی دو طریقے ہیں جن کو بہت سے ممالک پر (جن میں فرانس بھی شامل ہے) مسلط کیا گیا ہے۔ مارشل پلان کے ذریعہ امداد حاصل کرنے والے ممالک جن میں معاہدہ اوقیانوس سے متعلقہ ممالک بھی شامل ہیں، مشرقی یورپ کے ممالک کے ساتھ آزادانہ طور پر تجارت نہیں کر سکتے۔ متحدہ امریکہ کے مطالبہ اور مشورہ پر ایسی اشیاء کی نیم خفیہ فہرستیں تیار کر لی گئی ہیں جنہیں اشیائے برآمد میں شامل نہیں کیا جائیگا

اس طریق کار کے ناگزیر نتائج صنعتی بحران اور بیروزگاری کی صورت میں ظاہر ہونگے۔ کسی ملک کو بیرونی غلامی کے جال میں پھنسانے کے لئے یہ تدبیر ایک مہیب خطرہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ جہاں تک فرانس کا تعلق ہے۔ مسٹر رفیق گلسن نے صحیح کہا ہے "یہ واضح ہو گیا ہے کہ وہ ہمارے خون کو اپنے ڈالروں سے خریدنا چاہتے ہیں!" موسیو گلسن نے جن خدشات کا اظہار کیا ہے۔ ان کی مسٹر کینن کے اس بیان سے پوری تصدیق ہوتی ہے جو انہوں نے ایک ہفتہ قبل ایوانِ نمائندگان میں دیا تھا۔

مجھے یقین ہے کہ کروڑوں امریکی نہایت گرمجوشی کے ساتھ امن کے خواہشمند ہیں۔ اور وہ مسٹر کینن کے بیان کی مذمت کرتے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل

پیرس میں حال ہی میں جو امن کانگرس منعقد ہوئی تھی۔ اُس کی یاد ہمارے دلوں میں ابھی تک تازہ ہے۔ ان معزز اور حوصلہ مند لوگوں کو ایک مشکل کام انجام دینا ہے۔ کیونکہ تمام پریس اور ریڈیو وغیرہ اُن اشخاص کے ہاتھوں میں ہیں۔ جو دوسروں کو بھی جنگ میں گھسیٹنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں انہیں اس پروپیگنڈا کا لازمی طور پر مقابلہ کرنا ہے۔ جو اُن کے متعلق یہ خیال پیدا کر سکتا ہے کہ مغربی یورپ کے لوگ اس پالیسی سے متفق ہیں۔ جو جنگ کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ ہمیں اپنے کلام اور قراردادوں کے ذریعہ سے یہ ثابت کرنا ہے کہ مغربی یورپ کے عوام جنگ کے خلاف ہیں۔ امن کے ان حامیوں کی ہمت کو آسان بنانے کیلئے ہمارا فرض ہے کہ ہم اُن کے ہموطنوں کو یہ یقین دلانے میں مدد دیں کہ اُن کی غلط رہنمائی کی جا سکتی ہے۔ نیز یہ کہ اُن کی وسیع القلبی کی روایات، اخوت اور آزادی کے نعروں سے فائدہ اٹھا کر اب ایسا حملہ کیلئے یہ آمادہ کیا جا رہا ہے جو کسی طرح ایک استعماری مہم سے کم نہیں۔ ہم یہ اعلان کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ جو ممالک ایٹم بم کے بل بوتے پر احساس برتری میں مبتلا ہیں۔ اُن پر یہ واضح ہونا چاہیئے۔ کہ جنگ سب کے لئے خوفناک خونریزی ثابت ہوگی۔

پروفیسر کیوری نے اُن ممالک کے بجٹ کا تجزیہ کیا جو قومی دفاع کے بہانے سے جنگ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ تعلیم ریسرچ اور علمی تحقیقات، صحت عامہ اور تعمیر وغیرہ جو انسانیت کے ارتقا کے لئے لازمی ہیں۔ ان ممالک کے بجٹ کے اخراجات میں غیر اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ سب سے زیادہ مضرت رساں چیز یہ ہے کہ سائنس کو جنگی مقاصد کیلئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس کی ایک واضح مثال ایٹم بم ہے جسے عام قتل و غارتگری کے مقصد کے پیش نظر بنایا گیا ہے یہ امر واضح ہے کہ ایٹمی ہتھیار کو جنگ عالم میں فیصلہ کن درجہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کے برعکس ہمیں یقین ہے کہ اگر ایٹمی قوت کو پُرامن مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے۔ تو یہ انسانیت کیلئے نہایت سود مند ثابت ہو سکتا ہے۔

ہمارا فرض ہے کہ ہم ایٹمی قوت کو تباہی کے لئے استعمال نہ ہونے دیں۔ اور اُن لوگوں کی حمایت کریں۔ جو ایٹمی ہتھیار کے استعمال کو غیر قانونی قرار دینا چاہتے ہیں۔ انسانیت کی اس عظیم ذمہ داری کے پیش نظر سائنسدان بھی اس مسئلہ سے بے تعلق نہیں رہ سکتے۔!

کسی ایک قوم کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ خود کو جنگ سے محفوظ رکھ سکے۔ بلکہ تمام دنیا کی قوموں کے مشترکہ اقدام کے ذریعہ ہی سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ ہر مرد اور عورت کو اس بات کی پوری طرح محسوس کرنا چاہیئے۔ کہ امن و جنگ کے سوال کا ان سے گہرا تعلق ہے۔ افراد کے لئے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ کیونکہ تمام دنیا میں لوگ اسی مسئلہ کو حل کرنے اور امن کیلئے جدوجہد جاری رکھنے میں مصروف ہیں۔ ہم میں سے بہتوں نے جو جنگ کے مخالف ہیں۔ امن کیلئے متعدد تحریکیں بھی منظم کی ہیں۔ اُن کے خلوص پر شبہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں۔ کہ قیام امن کے لئے ہماری خواہش میں انفعالیت پیدا ہو جائے۔

ہم اُن لوگوں کو بھی جنگ کے خطرات سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔ جن کو ابھی نقصان کا احساس تک نہیں ہے۔ جو لوگ ہمارے ساتھ مل کر امن کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کو ہر طرح کی سہولت دی جائے گی۔ لیکن جو لوگ جنگ کے خواہش مند ہیں اُن سے مخاطب ہو کر ہم کہتے ہیں: "تم کو ہم سے نبٹنا پڑے گا" ہم تمام ایماندار لوگوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ جنگ کی خطرناکیوں سے بچنے کی کوشش کریں۔ ہمیں اپنی طاقت کا علم ہے اور ہم متحد ہو کر اس اُمید کے ساتھ اپنی جدوجہد جاری رکھیں گے کہ:۔

## انجام کار فتح ہماری ہے

* * * *

"امن خطرے میں ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے۔ زندگی کی عزیز ترین قدریں خطرے میں ہیں۔ اگر ہم خاموش رہے۔ تو بعد میں دست تاسف ملنا پڑے گا"

اِقبال احمد

# چینی نمائندے نے کہا

مجھے چوالیس چینی مندوبین کی جانب سے یہ کہنا ہے کہ ہم عالمگیر امن کانگرس کے اس تاریخی اجلاس میں، جس کے انعقاد کا شرف عوامی جمہوریت چیکوسلاویہ کے صدر مقام پراگ کو حاصل ہے، شمولیت پر مسرور و شاداں ہیں اور چین کے ساڑھے سینتالیس کروڑ شہریوں کی طرف سے میں عوامی جمہوریت چیکوسلاویہ کی حکومت اور لوگوں کو مبارکباد دیتا ہوں۔ ہم پوری قوت اور طاقت سے فرانس کی رجعت پسند حکومت کے خلاف احتجاج کرتے ہیں جس نے فرانسیسی عوام کی خواہش کے برعکس، چینی وفد کو فرانس میں داخلے کی اجازت نہیں دی۔ امریکی سامراجیوں کے دباؤ کے زیر اثر حکومت فرانس، عالمگیر امن کی بقا کے مقدس نصب العین کو نقصان پہنچانے کی اس کوشش سے تمام دنیا کی آنکھوں میں ایک عظیم جرم کی مرتکب ہوئی ہے دنیا کے تمام لوگ، جن میں فرانس کے عوام بھی شامل ہیں، اسے کبھی بھی فراموش نہیں کریں گے۔ حکومت فرانس نے امن کے خلاف امریکی سامراج کی حمایت حاصل کرنے کی امید میں سخت فضول اور بے معنی اقدام کیا ہے۔ اس کے لئے بہتر ہے۔ کہ وہ چیانگ کائی شیک کو یاد رکھے۔ جس نے اس حقیقت کے باوجود کہ اُسے امریکی سامراج کی مکمل حمایت حاصل تھی، چینی عوام نے اقتدار چھین لیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ امریکی سامراجیوں کے تمام کاسہ لیسوں اور کٹھ پتلیوں کا جلد یا بدیر وہی حشر ہوگا۔ جو اس کا ہوا ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ عظیم میں جرمنی کو یورپ میں، اور ایشیا میں جاپان کو دنیا کی نمایاں جمہوری طاقتوں کی مضبوط اور مستحکم کوششوں کے باعث شکست فاش ہوئی۔ اور ان کوششوں میں سوویٹ یونین کے عوام کی سرفروشانہ جدوجہد کو مخصوص حیثیت کی حامل ہے۔ اس بات کو چار سال سے کم عرصہ بھی نہیں گزرا اور ابھی تو صلح کے عہد ناموں پر دستخط بھی نہیں ہونے پائے یہی نہیں بلکہ دنیا بھر میں لوگوں کو آزادی سے سانس لینا بھی نصیب نہیں ہوا۔ کہ جنگی عزائم رکھنے والے سامراجیوں نے تیسری عالمگیر جنگ کا شور و غل مچانا شروع کر دیا ہے آج دنیا دو واضح اور نمایاں کیمپوں میں منقسم ہے۔ ایک طرف تشدد پسند کیمپ ہے۔ جس کا راہنما امریکی سامراج ہے۔ اور دوسرا امن اور جمہوریت کے علمبرداروں کا کیمپ ہے۔ جس کی قیادت اشتراکی ریاست سوویٹ یونین کر رہی ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ سے امریکی سرمایہ دار مالا مال ہو گئے تھے اور اب وہ اپنی منفعت کو قائم رکھنے کے لئے دنیا پر چھا جانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اور ڈالروں کا سبز باغ اور ایٹم بموں کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔ اُن کا وسیع شیطانی دامِ تزویر کرہ ارض کے تمام گوشوں پر پھیل رہا ہے وہ فوجی اڈوں کا جال بچھانے کے علاوہ ان ممالک کام کرتے ہیں۔ اور مختلف ممالک میں رجعت پسند طاقتوں کو ہر ممکن امداد دے رہے ہیں۔ امریکی سامراج ان رجعت پسند طاقتوں کو مدد دے رہا ہے جو عوام کو دباتے اور نوآبادیاتی یا نیم نوآبادیاتی ممالک میں قومی آزادی کی قوی تحریکوں کو ختم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ وہی ہیں جو قوموں اور ملکوں کی آزادی اور خود مختاری کو غصب کرنے کے لئے ہر قسم کے ہلاکت آفریں اور مذموم معاہدے کر رہے ہیں۔ یہ امن پسند قوموں کی دنیا میں امن قائم رکھنے کی کوششوں کو تباہ و برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ یہ وہی ہیں جنہوں نے اقوام متحدہ کے منشور کو پاؤں تلے روندا ہے۔ جنگ کا خطرہ حقیقی ہے۔ امریکی سامراجی دنیا کو دھوکہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن بیچارے، اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ابھی اصطلاحیں بھی تو نہیں گھڑ سکے۔ وہ اپنی بدنامی کو سوویٹ یونین پر مطلق العنان ریاست کا لیبل چپکا کر تھوپ رہے ہیں۔ جو فی الواقعی امن کی محافظ ہے۔

ہمارے زمانے میں لفظ "امداد" کے پاکیزہ مفہوم کو امریکی سامراج کے انتہائی جارحانہ عزائم کے رنگ میں پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن ہم چینی اچھی طرح جانتے ہیں کہ صرف سوویٹ یونین ہی نے چین کے ساتھ ناجائز اور غیر مناسب بنائے ہوئے معاہدوں کی تنسیخ میں ہماری مدد کی ہے ۱۹۲۴ء میں سوویٹ یونین نے سامراج کے چنگل سے آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد میں ہماری مدد کی۔ جب جاپانی لٹیروں اور تباہ کاروں نے چین پر حملہ کیا۔ تو سوویٹ یونین نے چین کی جنگ آزادی میں غیر مشروط طور پر مدد دی۔ لیکن ریاستہائے متحدہ امریکہ کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے؟ امریکی عوام قدرتی طور پر چینی عوام کے دوست ہیں لیکن امریکہ کی سامراجی حکومت نے تمدنی اور معاشرت کے میدان میں جارحانہ پالیسی کو عمل میں لانے کیلئے ہمیشہ چینی رجعت پسندوں، جنگی راہنماؤں اور سرمایہ داروں سے گٹھ جوڑ کیا ہے۔ جاپانی سامراج کے خلاف ہماری جدوجہد کے ابتدائی ایام میں امریکی سرمایہ داروں نے جاپان کو کپاس خام، لوہا، تیل، اسلحہ اور مشینری کثیر تعداد میں مہیا کر کے جارحانہ جنگ میں اس کی مدد کی۔ یہ بھی سچ ہے کہ پرل ہاربر کے حادثے کے بعد ریاستہائے متحدہ امریکہ نے جاپان کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا تھا۔ لیکن امریکہ چین کے بارے میں ہمیشہ چینی اور امریکی عوام کی خواہشات کی برعکس پالیسی پر کاربند رہا ہے۔ امریکہ نے کومنتانگ پارٹی کی حمایت کی ہے اور اس کے مقابلے میں چین کی عوامی فوج کی کبھی مدد نہیں کی جو جنگ آزادی لڑ رہی تھی۔ مشرق میں جاپان کے سقوط پر جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔ حکومت امریکہ نے کومنتانگ کے رجعت پسندوں کو مدد دینی برابر جاری رکھی اور چین میں ان کی افواج کو پہنچایا۔ بند کیا اور وہاں جنگی اڈے بھی تعمیر کئے۔ دوسری جنگ ختم ہونے کے بعد کومنتانگ حکومت کی امداد اور امریکی مقیم فوجوں کے اخراجات کے متعلق معتبر حلقوں نے جو اندازے لگائے ہیں۔ ان کے مطابق امریکہ کو چین میں چھ ارب امریکی ڈالروں کا خرچ برداشت کرنا پڑا ہے۔ امریکی سامراج نے چینی رجعت پسندوں کی مدد اسلئے کی تھی۔ تاکہ چین کو نوآبادی میں تبدیل کیا جا سکے اور روس کے خلاف ایک اڈہ بنایا جا سکے۔ لیکن چین میں امریکہ کی مداخلت کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہاں خانہ جنگی کی آگ بھڑک اٹھی۔ اور اس نے ایسی تباہی پھیلائی جس کی مثال تاریخ انسانی پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اب چین کے عوام ان گنت مصائب سہنے کے بعد امریکی سامراج کے جارحانہ عزائم کا مطلب اچھی طرح سمجھ چکے ہیں۔ آج ہر کوئی جانتا ہے کہ چین میں امریکی سامراج کا پروردہ رجعت پسند چیانگ کائی شیک چینی عوام کی مسلح افواج کے ہاتھوں قطعی اور واضح شکست کھا چکا ہے۔ لیکن امریکی سامراجیوں نے کسی تک بھی اپنے مزاج کو نئے سانچوں میں نہیں ڈھالا۔ وہ جاپانی فاشیوں کے پسماندگان کی برابر امداد کر رہے ہیں۔ اور سوویٹ یونین اور یورپ کے عوام کے خلاف مذموم اور ہلاکت آفرین پلاٹ تیار کر رہے ہیں۔ امریکی سامراج دنیا کی بقا کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ اور بین الاقوامی عہدناموں کی صریحاً خلاف ورزی کر رہا ہے۔ جبکہ انتہائی بے شرمی کے ساتھ اقوام متحدہ کے مقاصد اور اصولوں کی پیروی کی قسم بھی اٹھائی جاتی ہے۔ ایسا کرنے میں وہ لوگوں کو دھوکہ دینے کیلئے پرانے فاشی طریقے استعمال کر رہا ہے۔ امریکی سامراج یورپ کے عوام اور تمام انسانیت کیلئے خطرہ ہے۔ اور اسی ڈھنگ پر چل رہا ہے۔ جو اس نے چینی عوام کے وجود کو سرے ہی سے خطرے میں ڈالنے کیلئے اختیار کیا تھا۔ ہم چینی ان بین الاقوامی جنگ کو ہوا دینے والوں کو انسانیت کا بدترین دشمن سمجھتے ہیں۔ ہمیں ایک نئے جنگی بحران کو پیدا ہونے کی کبھی بھی اجازت نہیں دینی چاہیئے۔ دنیا بھر کی امن پسند طاقتوں کو ابھی ایک دوسرے کے اور قریب آنا چاہیئے تاکہ اس خطرے کو منظم اور باقاعدہ طور پر ختم کیا جا سکے۔ ہمیں یقین ہے کہ امریکی عوام دوسرے ممالک کے عوام کی طرح جنگ کے خواہشمند نہیں۔ صرف وال سٹریٹ کے رندے اور جنگ کا شور مچانے والے مجرم صفت لوگ، جنگ چاہتے ہیں کیونکہ جنگ ان کیلئے فائدہ مند ہے، ان کی تجوریوں کے منہ بھر دے گی۔ لیکن اس سے وہ اپنے آپ اپنی قبریں کھود رہے ہیں۔ جنگ کے بعد تمام ممالک کے عوام صعوبتوں کی ایک طویل راہ طے کر چکے ہیں، سوویٹ یونین کو جنگ کے بعد اپنے پنجسالہ منصوبے میں کامیابی حاصل ہو رہی ہے، اور مشرقی یورپ کی عوامی جمہوریت روز بروز زیادہ مستحکم ہوتی جا رہی ہے۔ اور مشرق میں قومی آزادی کی تحریکیں ایک جگہ کے بعد دوسری جگہ پر پوری قوت اور گھن گرج کے ساتھ ابھرتی آ رہی ہیں۔ اور اسی طرح سرمایہ دار ممالک کے عوام بیدار اور متحد ہوتے جا رہے ہیں، اگر جمہوریت اور امن کا علمبردار کیمپ جس کی قیادت روس کر رہا ہے، مضبوطی کے ساتھ قدم آگے بڑھاتا رہا تو امن یقیناً قائم ہو کر رہے گا۔ یہ کیمپ تو جنگ کی تیاری کرنے والوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کی استطاعت بھی رکھتا ہے، ہم چین کے عوام سو سال سے بھی زائد عرصے سے طاغوتی طاقتوں کے خلاف

برسرِ پیکار ہیں۔ اور جب سے ہماری یہ جدوجہد شروع ہوئی ہے۔ متعدد قربانیاں دے چکے ہیں اور ابھی ہم پورے عزم کے ساتھ برابر لڑ رہے ہیں۔ پہلے چینی عوام کو کبھی ہمت والے بہادر نہیں، زیادہ سے زیادہ مددگار نہیں جانا جاتا تھا۔ لیکن میں پچھلے دس برس کی کئی مثالیں پیش کر سکتا ہوں۔ چینی عوام نے جاپانی سامراج پر آٹھ سالہ شدید لڑائیوں کے بعد فتح حاصل کی۔ ہم نے جاپانی کے سقوط کے بعد رجعت پسند کومنتانگ حکومت کو جسے امریکی سامراج کی پوری حمایت حاصل تھی ختم کرنے کے لئے اسی عزم کا مظاہرہ کیا۔ اور اس کا صفایا بھی اسی طرح بیان کیا گیا۔ جس طرح ہم نے جاپانیوں کا صفایا کیا تھا۔ تقریباً تین سالہ پیہم جدوجہد میں عوام کی جنگ آزادی لڑنے والی فوج نے ساڑھے اکیاون لاکھ کومنتانگ فوجیوں کا صفایا کیا اور چین کے آدھے سے زیادہ علاقے کو جس کی آبادی بیس کروڑ ہے آزاد کرایا۔ عملی طور پر تمام امریکی اسلحہ جو دشمنوں کی ملکیت تھا۔ عوامی فوج کے ہاتھ لگا۔ اس سلسلے میں کچھ اعداد و شمار پیش کرتا ہوں۔ ہم نے تین ہزار ٹینکوں، بارہ ہزار چھبیس فوجی لاریوں، دو لاکھ سولہ ہزار سات سو چھیاسٹھ مشین گنوں، سینتیس ہزار دو سو سنتالیس توپ خانے سے متعلقہ آلات اور چھبیس کروڑ نو لاکھ اٹھانوے ہزار اکتیس گولیوں پر قبضہ کیا۔ اس میں شک نہیں بلکہ یہ حقیقت ہے کہ امریکی سامراج کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے ہوئے چینی، مسلح عوامی فوجوں کو ہتھیار مہیا کرتے رہے اور امریکہ بالفاظ دیگر ہمارے لئے اسلحہ مہیا کرنے کا ڈپو بن گیا۔ وہ دن بہت جلد قریب آ رہا ہے۔ جب ساڑھے سنتالیس کروڑ چینی ہمیشہ کے لئے آزادی حاصل کر لیں گے۔ ہم نے ایک بے مثال فتح حاصل کی ہے۔ ہماری فتوحات ایک دور کی تمت سے کم نہیں۔ جس کی تاریخی حیثیت مسلمہ ہے۔ کیونکہ ہم نے صرف اپنے لئے آزادی حاصل نہیں کی بلکہ امریکی سامراج کی طاقت کو مشرقی محاذ پر درہم برہم کر دیا ہے۔ جس سے امریکہ کے جارحانہ جنگ کے منصوبوں کو فنا کے گھاٹ اتار نے والا دھکا لگا ہے۔

چین کے عوام نے اتنی عظیم الشان فتح کیسے حاصل کر لی؟ یہ فتح اس لئے ممکن ہوئی کہ چین کے عوام چین کی کمیونسٹ پارٹی کی قیادت میں متحد ہو گئے، جس نے عوام کی بے لوث خدمت کی اور ایک لاجواب اور پیہم جدوجہد شروع کر دی گئی۔ فتح اس لئے ممکن ہوئی۔ کہ ہمیں صحیح قیادت میسر ہے، ہم میں مضبوط اتحاد اور پُرجوش عزم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اسلحہ کی کمی کے باوجود فتحیاب ہوئے اور ہم نے تشدد پسند سامراجیوں کو کچل دیا۔ چین کے عوام کا تجربہ اس بات کا یقین مظاہرہ کرتا ہے کہ دشمن کو شکست دی جا سکتی ہے اور باشعور محنت کش جماعت کی راہنمائی میں مضبوط اتحاد اور پُرعزم جدوجہد کے بل بوتے پر سامراجی تباہ کاریوں کی فوجی اور سیاسی چالوں کو ناکام بنایا جا سکتا ہے۔ ہم چینی یقیناً جنگ سے پیار نہیں کرتے، اس جذبے کو ہماری پانچ ہزار سالہ تاریخ نے جنم دیا ہے۔ ہمارا قومی نعرہ "امن قیمتی" ہے۔ لیکن ہم عوامی اور جمہوری امن کے قائل ہیں نہ کہ جھوٹے اور کھوکھلے امن کے،

اس امر کے باوجود کہ ہم نے غیر ملکی تشدد کے ہاتھوں نقصان اٹھایا ہے اور ہمیں بہت بری طرح لوٹا گیا ہے۔ لیکن ہم امن کی راہ میں ہر ایک رکاوٹ کو دور کرنے کے کام میں کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ ہم چینی اب ایک انقلابی جنگ میں مصروف ہیں۔ یہ ایک ایسی جنگ ہے جو گھر میں سچا امن اور دنیا میں پائدار امن کے قیام کی خاطر لڑی جا رہی ہے۔

ہمارے نظریے کے مطابق انسانیت دوستی اور آشتی ہی سے برقرار رہ سکتی ہے اور مشترکہ کوششوں سے ہی ترقی کر سکتی ہے۔ چین کے عوام امن آج جو طویل جدوجہد کے بعد حاصل ہوا ہے ایک بہترین انعام ہے جسے ہر ایک قوم کو جیتنا چاہیے۔ اور ہر قیمت پر اس کی حفاظت کرنی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ چین کے عوام رضاکارانہ طور پر اپنی تمام تر کوششوں کو عالمگیر امن کے قیام میں صرف کر رہے ہیں، ہم جانتے ہیں کہ مشرقِ بعید کے عوام جنہیں سامراج نے دبا رکھا ہے۔ ہماری اس خواہش میں برابر شریک ہیں۔ ان میں سے بعض کو امن کانگرس میں نمائندے بھیجنے سے روکا گیا ہے۔ لہٰذا ہم ان کی طرف سے بھی یہ اعلان کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ مشرقِ بعید کے تمام لوگ بالخصوص پائدار عالمگیر امن کے قیام کی خاطر اپنی تمام تر قوتیں صرف کرنے کو تیار ہیں۔ ہمیں متحد ہو کر امن کے لئے مخلص جدوجہد شروع کر دینی چاہیے۔ ہمیں دشمن کی طاقت کا بیجا اندازہ نہ لگانا چاہیے کیونکہ اسی کے باعث ہم نئی جارحانہ جنگ کے خطرے کو ٹال سکتے ہیں۔ اگر تشدد پسندوں نے کسی طرح بھی نئی جنگ شروع کرنے کی جرأت کی تو دنیا بھر کی عوامی طاقتیں انہیں کچل دیں گی۔ اور رائج سامراجی نظام کو تہس نہس کر دیں گی۔ بالآخر ہم تمام انسانیت کو آزاد کروا لیں گے۔

دنیا بھر کی امن پسند طاقتو! متحد ہو جاؤ! اپنے مستحکم اتحاد اور مسلسل جدوجہد سے جنگ کا خاتمہ کر دو! عوامی جمہوریت کی فتح پائندہ باد!

میرزا ادیب

# اگر امن کانفرنس میں پاکستانی نمائندہ ہوتا

محترم ساتھیو!

میں پاکستان کا نمائندہ ہوں۔ پاکستان ایشیا کی ایک نوزائیدہ ریاست ہے۔ جس کی آغوش میں آٹھ کروڑ انسان سانس لے رہے ہیں۔ اور جس کی حدیں ہندوستان کے ساتھ ساتھ بحیرۂ عرب اور خلیج بنگال کے ساحلوں پر دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ افغانستان، چین، روس، اور ایران ہمارے ہمسائے ہیں اور ظاہر ہے کہ ہم لوگوں نے ابھی ابھی انگریزوں کی سو صد سالہ غلامی سے نجات حاصل کی ہے پاکستان — آج سے دو سال پیشتر اس نام کا کوئی ملک دنیا کے نقشے پر موجود نہیں تھا۔ مگر اب ایک نیا ملک — ایک طاقتور اور امن پسند ملک ایک نئی امنگ اور نئے ولولے کے ساتھ آپ کو دیکھ رہا ہے — نہ صرف دیکھ رہا ہے۔ بلکہ آپ کے دوش بدوش امن کی خاطر عملی اقدام میں بھی حصہ لینے کے لئے تیار ہے

ہم فطرتاً امن پسند ہیں۔ امن سے رہنا اور امن پسندوں کا ساتھ دینا ہماری بہت بڑی آرزو رہی ہے۔ اب تک برطانوی شہنشاہیت اپنے ذاتی مفاد کی خاطر ہمارے جیالے اور پامرد جوانوں کو جنگ کا ایندھن بناتی رہی ہے۔ مگر اب ہم اس حقیقت کو پوری طرح سمجھ چکے ہیں۔ ہم جنگ کی آگ کو بھڑکانے کے لئے جنگ نہیں کریں گے۔ بلکہ اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے جنگ کریں گے اور ان سامراجی طاقتوں کے خلاف جنگ کریں گے۔ جو دنیا کا امن تباہ کرنے کا عزم لئے ہوئے، سسکتے ہوئے عوام سے اُن کا سب کچھ چھین لیتی ہیں۔ اور سات سمندر پار جا کر سونا اگلنے والی سرزمین میں بیکاری اور فاقہ کشی کے بیج بو دیتی ہیں! دنیا کی دوسری جنگ عظیم میں ہمارے باہمت جوان آپ کے دوش بدوش فاشی درندوں کا مقابلہ کرتے رہے ہیں۔ اب اگر فاشی درندگی کوئی خاص ملک یا خاص جگہ اختیار کرلے۔ تو یقیناً آپ ہمیں اپنے دوش بدوش پائیں گے ہمارا نعرہ امن ہے جنگ نہیں ہمیں جنگ کے لفظ سے بھی نفرت ہے

پاکستان کے آٹھ کروڑ انسانوں کو امن کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ میرا ملک انتہائی گرمجوشی سے امن قائم کرنے والی تمام انجمنوں کا خیر مقدم کرتا رہا ہے اور اس عظیم الشان کانفرنس کا بھی خیر مقدم کرتا ہے۔ دو دن ہوئے جب میں نے امن کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے پیرس کی سرزمین میں قدم رکھا اور میرا تعارف چند نئے ساتھیوں سے کرایا گیا تو میں نے ہندوستان اور پاکستان کے عوام کے بارے میں عجیب و غریب باتیں سنیں — ایسی عجیب و غریب باتیں جو حقائق سے اس قدر دور ہیں۔ جس قدر ان باتوں کے پھیلانے والوں سے صداقت شعاری اور حقیقت بیانی دور ہے، کہا جاتا ہے کہ جیسے ہی انگریزوں کا سایہ ہمارے سر سے اٹھا ہم لوگ جنگلی درندوں کی طرح آپس میں برسرپیکار ہوگئے۔ اور ہمارے عوام نے انتہائی بے رحمی سے ایک دوسرے کا گلا کاٹ ڈالا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد مسلسل کئی ماہ تک ہمارے ہاں جو کچھ ہوتا رہا۔ اس کے بیان کرنے کے لئے میری زبان میں طاقت نہیں ہے۔ تباہی اور بربادی کا مہیب سے مہیب اور بھیانک سے بھیانک نقشہ اپنی آنکھوں کے سامنے لائیے۔ لیکن یاد رکھیے۔ یہ نقشہ اس درندگی، اس بہیمیت اور اس ظلم کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ جس کی چکی میں مدتوں تک ہمارے عوام پستے رہے۔ سوال یہ ہے کہ ہماری اس خانہ جنگی کے محرکات کیا تھے۔ اور وہ کیا حالات تھے۔ جنہوں نے ہمیں ایک دوسرے کا گلا کاٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔ بحیثیت مصنف کے میرا اعتقاد ہے کہ دنیا کے سب عوام ایک ہیں۔ کوئی جغرافیائی حد بندی، کوئی دیوارِ چین اور کوئی سدِ سکندری عوام کے

درمیان رکاوٹ ہی کر نہیں ٹھہر سکتی۔ عوام کبھی ایک دوسرے کے دشمن نہیں ہو سکتے۔ ایک دوسرے کے دشمن بادشاہ اور حکمران ہو سکتے ہیں، راجہ اور جاگیردار ہوتے ہیں۔ شہنشاہیت کے ایجنٹ اور جنگی ہتھیار بنانے والے کارخانوں کے مالک ہوتے ہیں۔ غریب ملکوں کو منڈیاں بنانے والے دولت مند اور ہائیڈروجن اور ایٹم بم بنانے والے سامراجی نمائندے ہوتے ہیں۔ جب ہمارے نیم براعظم میں برطانوی سامراج کا سفینہ ڈگمگانے لگا تو اس کی سب سے بڑی کوشش یہ تھی۔ کہ اس سرزمین میں بسنے والے مختلف فرقوں کے دماغوں میں فرقہ پرستی کا زہر پھیلاتا رہے، دیسی نوابوں، جاگیرداروں اور خود غرض لیڈروں کا سہارا لے کر یہ سامراج ڈھائی سو سال تک اپنے کام میں مصروف رہا۔ فرقہ پرستی کا زہر پھیلتا رہا، نفرت، اور دشمنی اور عداوت کی مختلف شکلیں اختیار کرتا رہا۔ اور جب انگریز یہاں سے جانے لگے۔ تو انہوں نے انتہائی فریب کاری سے کام لے کر بعض فرقہ پرست لیڈروں سے سمجھوتہ کر لیا۔ ناسمجھ عوام اپنے حقیقی دشمنوں کو نہ پہچان سکے اور اپنے بھائیوں ہی پر پل پڑے۔ برطانوی سامراج اپنے مقصد اور ارادوں میں کامیاب ہو گیا، فرقہ پرست لیڈر عوام کی خونچکاں لاشوں کی سیڑھیاں بنا کر بلندیوں پر چڑھ گئے اور عوام — ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ اگر ہم اپنے حقیقی دشمنوں کو پہچان لیتے تو یہ ٹریجڈی کبھی نہ ہوتی۔ جب عوام اپنے اصلی دشمنوں کو پہچان لیتے ہیں۔ تو انقلاب روس اور چینی عوام کی جد و جہد کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ اور جب صحیح دشمنوں کو نہیں پہچان سکتا۔ تو وہ کچھ ہوتا ہے کچھ ہمارے نیم براعظم میں ہوا — !

مجھے افسوس ہے کہ شروع ہی میں دلخراش باتیں سنانا پڑیں۔ مگر میں ایسا کرنے پر مجبور تھا — اس لئے مجبور تھا کہ آپ کو بتاؤں کہ ہمارے زخم رسیدہ، کچلے ہوئے اور اجڑے ہوئے عوام کو امن کی کس قدر ضرورت ہے۔ دوسری جنگ عظیم اور اس کے بعد خانہ جنگی نے ہمیں تباہ کر دیا ہے۔ ابھی تک ہم اُن زخموں پر پھاہے بھی نہیں رکھ سکے جو دو جنگوں نے ہمارے جسموں پر لگائے ہیں۔ ابھی تک ہم اُن دکھی بہنوں کے آنسو بھی نہیں پونچھ سکے۔ جن کے شوہر اُن سے ہمیشہ کے لئے جدا کر دیئے گئے ہیں۔ ابھی تک ان ماؤں کو سہارا بھی نہیں مل سکا۔ جن کے بچے ان کی آنکھوں کے سامنے خاک و خون میں ملا دیئے گئے ہیں۔ اور ابھی تک ہمیں ان بچوں کو دلاسہ دینے کی بھی فرصت نہیں مل سکی۔ جن کے سروں سے ان کے والدین کا سایہ ہمیشہ کے لئے اٹھ چکا ہے — ابھی ہمیں مجروح جسموں کی مرہم پٹی کرنا ہے۔ ابھی ہمیں اپنے بنیادی حقوق کے لئے تگ و دو کرنا ہے۔ اور ابھی ہمیں اپنی حقیقی آزادی کی جنگ لڑنا ہے۔ کیا ان حالات میں ہم جنگ کی تیاریاں کرنے والے، ایٹم بم بنانے والے، نزدیک و دور فوجی اڈے قائم کرنے والے بلاک میں شامل ہو سکتے ہیں ؟؟؟

یہ خوشی کی بات ہے کہ پورے ایشیا میں اب بیداری کی لہر دوڑ گئی ہے۔ لوگ سامراج کی شاطرانہ چالوں کو سمجھتے جا رہے ہیں۔ ان کی نگاہوں میں سفید فام شہنشاہیت کا دامن، اس قدر سیاہ ہو چکا ہے کہ بحر اوقیانوس جس کے نام سے جنگی معاہدے کر رہا ہے — کا پانی بھی اس سیاہی کو نہیں دھو سکتا۔ میرے ہم وطنوں کو جنگ سے بھی نفرت ہے اور جنگ چاہنے والوں سے بھی۔ پاکستانی جنگ کا لفظ تک سننا پسند نہیں کرتے۔ اور نہ ان لوگوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا سکتے ہیں۔ جو جنگ کے منصوبے باندھ کر دنیا کو ایک بار اور تباہی کے جہنم میں دھکیلنا چاہتے ہیں۔ ہم بدستور آزادی کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ سالہا سال تک ہم جس آزادی کے خواب دیکھتے رہے ہیں، گزشتہ پچاس برس میں ہم نے جس آزادی کے لئے قربانیاں دی ہیں، جس آزادی کے حصول کے لئے ہم عرصہ دراز تک کوشش کرتے رہے ہیں۔ وہ ابھی ہم سے دور ہے۔ آج سے دو سال پہلے جن کرسیوں پر ہمارے سفید فام آقا بیٹھ کر ہمیں لوٹتے کھسوٹتے رہتے تھے۔ آج ان پر سیاہ فام افسر بیٹھ کر ہمارے حقوق پامال کر رہے ہیں۔ آقاؤں کے تبدیل ہو جانے سے آزادی نہیں مل سکتی تو محترم رفیقو! اس صورتِ حال میں یہ کبھی ممکن نہیں ہو سکتا کہ ہم اپنی موجودہ تگ و دو سے کنارہ کشی اختیار کر کے اپنے موجودہ اور پہلے آقاؤں کے مفاد کی خاطر اپنے آپ کو جنگ کے شعلوں میں گرا دیں۔ ہم اپنی جد و جہد میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ سارا ایشیا۔ سارا مشرق اپنی جد و جہد میں کامیاب ہوگا۔ چین، ویت نام، برما اور انڈونیشیا کی سرزمین سے انقلاب و بغاوت کا جو طوفان اٹھ رہا ہے۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے [illegible]

سامراج کو تنکوں کی طرح اپنی لہروں میں بہا کر لے جائے گا!

پیارے رفیقو! میں امن کانفرنس کی سٹیج سے جس ملک کی نمائندگی کا فرض ادا کر رہا ہوں۔ وہ آپ کے ملکوں سے بڑی حد تک مختلف ہے۔ تعلیمی اقتصادی اور معاشرتی لحاظ سے ہم بہت پیچھے ہیں۔ ہمارے ہاں تعلیم پانچ فیصد سے بھی کم ہے۔ ہمارے ہاں بستیوں کی انتہائی کثرت ہے۔ ہمارے ہاں صنعتی کا مسئلہ زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ ہمارے عوام بھوکے ننگے ہیں۔ بیکار اور بیمار ہیں۔ بے گھر بے آسرا ہیں۔ انھوں اور غیروں نے انھیں بری طرح لوٹ لیا ہے۔ ہمارے سامنے قدم قدم پر رکاوٹ ہے۔ قدم قدم پر مصیبت کا پہاڑ ہے — مگر میں سامراج اور سامراج کے ایجنٹوں کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ان کچلے ہوئے جسموں، ان بھوکے ننگے انسانوں اور ان تباہ حال عوام کے سینوں میں انقلاب کی آگ کے وہ شعلے بھڑکنے لگے ہیں جن کے سامنے سامراج کی بنائی ہوئی مضبوط سے مضبوط آہنی دیوار بھی برف کی دیوار بن کر رہ جاتی ہے! سب سے پہلے تو ہمیں فرسودہ نظام کو بدلنا ہے۔ رجعت پرستوں کا مقابلہ کر کے انہیں پیچھے ہٹانا ہے۔ بیکاری اور غربت کی لعنتیں دور کرنا ہیں۔ تعلیمی ادارے قائم کرنا ہیں۔ صنعت و حرفت کو ترقی دینا ہے۔ ہسپتال قائم کرنا ہیں۔ اس قسم کے ہزاروں کام ہمارے سامنے ہیں۔ ہمیں ان کی ضرورت ہے۔ رجعت پسند جنگ کی آگ بھڑکا کر ہماری توجہ ان مسائل سے ہٹا نہیں سکتے

جنگ کون چاہتا ہے؟

جنگ وہ لوگ چاہتے ہیں جو بے گناہ انسانوں کو کٹوا کر، خوفناک جنگی ہتھیار بنا کر اپنے ڈالروں کے انبار میں اضافہ چاہتے ہیں!

جنگ کی تیاریاں وہ لوگ کر رہے ہیں۔ جو دوسرے ملکوں کے مادی وسایل پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں!

اور جنگ کی خواہش انہی لوگوں کو ہے جو اپنے باغی عوام کی توجہ کو اپنی طرف سے ہٹانا چاہتے ہیں!

امریکہ کے لئے بہتر چیز یہ ہے کہ وہ وال سٹریٹ کے سرمایہ داروں کی خوشنودی حاصل کرنے کی بجائے تباہ حال اور بیکار امریکنوں کو روزگار مہیا کرے۔ جو اس وقت لاکھوں کی تعداد میں دنیا کے اس دولت مند ترین ملک میں گھوم رہے ہیں۔

اور برطانیہ کی خدمت میں میری یہ عرض ہے کہ وہ "بلاک سازی" کی بجائے اپنے ننگے بھوکے مزدوروں کے جائز مطالبات پورا کرے جو مجبور ہو کر ہر روز ہڑتال کر رہے ہیں۔

محترم رفیقو! میں آخری بار پھر آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ پاکستان کے عوام آپ کے ساتھ ہیں — امن قائم ہو گا — امن زندہ رہے گا!

دنیا کا امن پائندہ باد!

* * * * * * * * * *

"آج دنیا دو گروہوں میں بٹ چکی ہے۔ ایک گروہ سرمایہ داروں کا ہے۔ جو عوام کو جنگ کے جہنم میں دھکیل کر اپنے سرمائے میں اضافہ کرنا چاہتا ہے اور دوسرا گروہ جمہور کا ہے۔ جو جنگ نہیں چاہتا اس کشمکش میں فتح جمہور کو ہو گی۔

سامراجی نظام ختم ہو رہا ہے اور بہت جلد ختم ہو جائے گا"

* * * *

جائزے

# میرے بھی صنم خانے

مصنفہ ۔ قرۃ العین حیدر ضخامت ۴۰۴ صفحات قیمت ۴ روپے پبلشر مکتبہ جدید لاہور

"میرے بھی صنم خانے" قرۃ العین حیدر کا پہلا ناول ہے لیکن اسماج کی کامیاب عکاسی، انکے افسانوں کی ایک امتیازی خصوصیت ہے اس ناول میں انہوں نے خصوصیت سے عکاسی ہی نہیں بلکہ اس طبقہ پر بڑے لطیف اور مہذب انداز میں چوٹیں بھی کی ہیں۔ ناول کے کردار خوشحال گھرانوں کے افراد ہیں ان میں کالجوں کے طلباء بیٹیوں کے نا تجربہ کار اور رنگین نوجوان بھی ہیں اور اودھ کے تعلقدار بھی، جو جاڑوں میں رنگ رلیاں مناتے ہیں، کلبوں اور ہوٹلوں کے متوالے ہیں، جن کی ضیافتیں ہی تفریح ہے اور نفرت بھی بناوٹ۔ ناول کے پلاٹ میں یہ کردار اس چابکدستی سے موئے گئے ہیں اور ان کا بیان اس کے ساتھ ان کا نفسیاتی تجزیہ کیا گیا ہے کہ قاری کے ذہن میں بورژوا طبقہ کے بے مصرف صبح و شام، اور کھوکھلی اور مصنوعی سوسائٹی کا پورا نقشہ آجاتا ہے۔ اور وہ بے ساختہ نتیجہ نکالتا ہے کہ اس طبقہ کے دن اب پورے ہو گئے اور وہ نزع کے عالم میں آخری سانس لے رہا ہے۔

سنہ ۴۷ء کے وقفے میں اس برصغیر کی سیاسی اور سماجی زندگی میں فرقہ وارانہ منافرت کا زہر بری طرح سرایت کر چکا تھا۔ کانگریس اور مسلم لیگ کی کشمکش ہند مسلم آویزش پر منتج ہو چکی تھی، دنیا کے سب سے گھناؤنے اور بھیانک قتل عام سے ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے دامن ملوث ہو چکے تھے زندگی کی وہ ساری قدریں جو ایک سچے فنکار کو عزیز ہوتی ہیں، بری طرح روندی گئیں، تہذیب پامال اور تہذیبی زندگی مسخ ہو گئی۔ "میرے بھی صنم خانے" کے کردار بھی اس طوفان سے دوچار ہوتے ہیں۔ گو فسادات کا تذکرہ ناول کے آخری حصے میں آتا ہے۔ اور ان کا تعلق پلاٹ سے ایسا زیادہ گہرا نہیں لیکن یہ حصہ ایک اعتبار سے بہت زیادہ اہم ہے۔

ہمارے بعض فنکاروں نے، ان میں بعض ایسے لوگ بھی شامل ہیں، جو کبھی ترقی پسند تحریک میں آگے آگے ہونے کا دعویٰ کرتے تھے، فسادات کو ایک انسان کی نظر سے نہیں دیکھا، بلکہ فرقہ پرستی کی عینک لگا کر اس کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی اور گزشتہ ڈیڑھ دو سال سے یہ اچھی خاصی خوشگوار بحث بن گئی ہے۔ ایک حلقہ ایسا ہے کہ سارا الزام ہندوؤں اور سکھوں کے سر تھوپتا ہے اور مسلمانوں کو بالکل معصوم و مظلوم ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسرا مسلمانوں کو جابر و ظالم گردانتے ہیں سارا زور تسلیم صرف کر دیتا ہے۔ یہ دونوں رجحان اسی قدر افسوسناک اور باعث شرم ہیں جس قدر کہ خود فسادات۔ خوشی کی بات ہے کہ قرۃ العین حیدر نہ صرف یہ کہ ان رجحانات کا شکار نہیں ہوئیں۔ بلکہ انہوں نے نہایت ہی متوازن اور حد درجہ موثر انداز میں بلا امتیاز قتل و غارتگری لوٹ کھسوٹ اور نفرت و حقارت کی مذمت کی ہے۔ یہ استقلال اور بھی زیادہ قابل تعریف ہے کہ مصنفہ ادب کی افادیت کے بارے میں کسی مخصوص سماجی نظریے کی پابند نہیں ہیں یا کم از کم پابند نہ ہونے کی دعویدار ہیں۔ ایک ایسے زمانہ میں جب ترقی پسند نظریے کے بعض حامی افراد موقع پرستی اور جاہ طلبی کے جذبے سے مغلوب ہو کر اپنے قلم کو فرقہ وارانہ منافرت کو ہوا دینے اور سماج کے دشمنوں کی پردہ پوشی کرنے کے لئے وقف کر رہے ہیں، قرۃ العین حیدر کا ان کی صفوں سے علیحدہ رہنا انکے فن کی سچائی کی دلیل ہے۔ تقسیم ہند کے موقع پر جو فسادات ہوئے، فرقہ پرست لیڈروں نے عوام کو جس طرح استعمال کیا اور دھکا دیا، جو تہذیب اور قدریں پامال ہوئیں، قرۃ العین حیدر نے بڑے خلوص اور حد درجہ دردناک انداز میں اس کا نقشہ کھینچا ہے۔

ناول میں یوں بھی جگہ جگہ بڑا موثر تیز و تند سیاسی طنز موجود ہے۔ جو ایک طرف کانگریسی حکومت کی ریاکاری کو اجاگر کرتا ہے تو دوسری طرف ان نام نہاد مسلم لیگی لیڈروں کو بھی بے نقاب کرتا ہے۔ جو مذہب کے نام پر مسلمانوں کے جذبات سے کھیلے اور بروقت آنے والی قربانیوں کو مصیبتوں میں مبتلا چھوڑ کر فرار ہو گئے۔

بحیثیت مجموعی "میرے بھی صنم خانے" ایک دلچسپ اور موثر ناول ہے، گو اس میں قرۃ العین حیدر کا مخصوص رومانی انداز بدرجہ اتم موجود ہے۔ جو اگر متوازن ہوتا۔ تو ناول زیادہ کامیاب ہوتا۔ لیکن پھر بھی اس کی افادیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ یہ بلاشبہ ہمارے ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

"عارف"

دو ماہی

# سنگِ میل

صوبہ سرحد کا واحد ترقی پسند صحیفہ ہے
جو عوام کے دکھ درد میں برابر کا شریک ہے
اور جسے وقت کے نئے تقاضوں کا صحیح
ترجمان تسلیم کیا جاتا ہے

## صوبہ سرحد

پاکستان کا وہ خطۂ زمیں جہاں
غیور افغانوں نے خون کے
قطرے بوئے اور کچھ نہ پایا
افلاس، بھوک اور بیکاری سے
بلکتے ہوئے سرحد کی خونچکاں داستان

## سنگِ میل کا سرحد نمبر

بہت جلد پیش کر رہا ہے
تفصیلات کیلئے پہلی فرصت میں لکھئے
منیجر "سنگِ میل" پشاور

ماہنامہ

# جاوید

پنجاب کی ادب پرور سرزمین کا نیا مرقع
جو ہر مہینے ہندوستان اور پاکستان
کے فنکاروں کو ادب کے ایک
ہی پلیٹ فارم پر جمع کرنے کا ذمہ دار ہے!

## صوبہ پنجاب

ہمارا وہ صوبہ جسے پاکستان کا
بازوئے شمشیر زن کہا جاتا ہے۔ اس
کے بھوکے ننگے عوام اور گلے سڑے
دیہات اور جھلسے ہوئے کھیت ہمیں
جاوید کی زبانی اپنا حال سناتے ہیں

## "جاوید" کا سالنامہ

عنقریب آپکے ہاتھوں میں پہنچ رہا ہے
ایک کارڈ لکھ کر تفصیلات دریافت کیجئے
منیجر ماہنامہ "جاوید" لاہور

فلمساز
سید محمد امین شاہ

ہدایت کار
سید حیدر شاہ

مصنف
انور بٹالوی

نغمہ نگار
قتیل شفائی
سیف الدین سیف

{ دو نئے چہرے گلشن آرا اور عشرت کے علاوہ ایم اسماعیل، اجمل، مایا دیوی، نذر، زرینہ شمشاد، علاؤالدین، غلام قادر، آغا میر جان مرزا (ریڈیو) اور شاکر کی اداکاری کا مرقع }

# امانت

{ جسے ہدایت کار حیدر شاہ بام عروج تک پہنچانے کیلئے شب و روز محنت کر رہے ہیں
امانت ایک اصلاحی تصویر ہے جسے تمام طبقے یکساں پسند کریں گے }

نغمہ ساز
نذیر جعفری

رقص
عاشق حسین

معاون ہدایت کار
ایم حنیف

پروڈکشن انچارج
افتخار ملک

تفصیلات کیلئے لکھئے
امین پروڈکشنز
نسبت روڈ لاہور

نئی راہیں ہموار کرتی ہیں

اور

زمانہ کے ساتھ چلنا
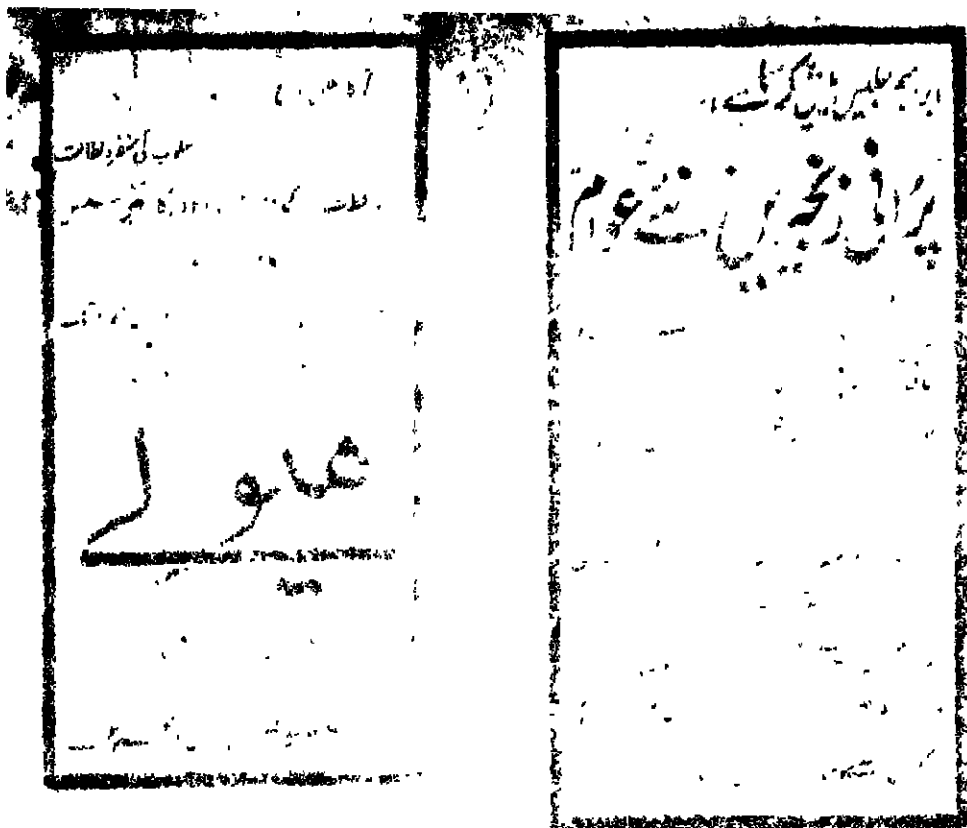
حسن ——— ادب ——— زندگی

یہ وہ خصوصیات ہیں جو ہماری اور صرف ہماری ہیں

مکتبہ ——— ادب ——— لاہور

دسمبر ۴۹ء
قیمت -/۱۰/-

ترتیب دینے والے

چودھری برکت علی ★ میرزا ادیب ★ قتیل شفائی

ترتیب



★

مکتبہ اردو لاہور

فارغ بخاری

عشرت رحمانی

سلام مچھلی شہری

ادارہ

# حرفِ اوّل

## کل پاکستان ترقی پسند مصنفین کانفرنس ــــــــــــ!

کل پاکستان ترقی پسند مصنفین کی لاہور کانفرنس پاکستان کی تاریخ ادب کا ایک نہایت واضح اور نمایاں باب ہے۔ یہ کانفرنس کئی اعتبار سے نہایت اہم ہے اور آنے والے مورخ جب اس زمانے کی ذہنی اور سماجی تحریکوں کا غیر جانبدارانہ جائزہ لیں گے تو وہ اس ہنگامہ خیز کانفرنس کو کسی طرح بھی نظرانداز نہیں کر سکیں گے باشعور ترقی پسند مصنفین کی جماعت شروع ہی سے استقامت طبع، مستقل مزاجی، اور خلوص کے ساتھ کام کرنے کی عادی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس تحریک کا جو چراغ آج سے پندرہ سال پہلے وقت کے طاق پر روشن کیا گیا تھا۔ وہ بادِ مخالف کے تند و تیز شدید حملے کے باوجود اب تک روشن رہا ہے روشن ہے اور ہمیشہ روشن رہے گا۔ اس کی حیات افروز روشنی صرف گرد و پیش کی فضاؤں ہی تک محدود نہیں بلکہ بعید سے بعید افق کو بھی چھو رہی ہے اور حال کے دامن میں سے گذرتی ہوئی مستقبل کی پیشانی کو بھی تابناک بنا رہی ہے۔ ترقی پسندی ادب کے ذریعے ایک صالح، صحت مند اور خوشگوار سماجی انقلاب کے تصور کو عوامی ذہن سے قریب تر لانے میں منہمک ہے۔ اور اس سلسلے میں اس نے جتنی کوشش کی ہے اس کا بیشتر حصہ قابل غور، قابل قدر اور قابل وقعت ہے۔ ادب لطیف کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ وہ ہر ممکن طریقے سے اس تحریک کی ہمنوائی کرے۔ چنانچہ ماضی کے ہر مرحلے میں وہ ترقی پسندانہ رجحانات کو سینے سے لگائے اس تحریک کے ساتھ ساتھ قدم اٹھاتا رہا ہے اور اس وقت کہ ۴۹ کا سال دم توڑ رہا ہے اور ایک نیا سال افق سے جھانکنے لگا ہے۔ ادارہ ادب لطیف اس بات کا اعلان کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے کہ وہ جس طرح اب تک اس تحریک کا علمبردار رہا ہے آئندہ بھی رہے گا۔ مگر اس اعلان کے ساتھ ساتھ دو تین اور چیزوں کے متعلق اشارہ کر دینا بھی ضروری ہے۔ ترقی پسندی کی تحریک بنیادی طور پر ایک ادبی تحریک ہے۔ ادب کی شاہراہ سے الگ ہو کر سیاست کے خارزاروں میں قدم رکھنا اس کا مسلک نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر ذہنی تحریک پر وقت کی سیاست ضرور اثر انداز ہوتی ہے ــــ مگر ایک حد تک ــــ کوئی ادبی تحریک ادب کے بنیادی تقاضوں سے منہ موڑ کر اس حد تک سیاسی رنگ میں نہیں رنگی جا سکتی کہ اُسے ادبی تحریک کی بجائے ایک سیاسی تحریک کہنا زیادہ مناسب ہو۔ ادب کے اپنے تقاضے ہیں اور ان تقاضوں کو فراموش کر کے کسی ادبی تحریک کو سیاست کی سطح پر لے آنا ادب کشی کے مرادف ہے۔ ہمارے ادارہ ادب لطیف کے نقطہ نظر سے ترقی پسندی کی تحریک اپنی نوعیت کے لحاظ سے وقت کے ہر ایک ترقی پسند سماجی، عمرانی اور سیاسی تقاضے سے ہم آہنگ ہونے کے باوجود ایک ادبی تحریک ہے۔ کسی سیاسی "ازم" کی جولانگاہ نہیں ہے۔ اور کسی خاص سیاسی مسلک کے رنگ والے اسے محض اپنے فکر تک محدود نہیں کر سکتے۔ اور نہ انہیں ایسا کرنا چاہیئے۔

زبان کے بارے میں ہماری جو رائے ہے اسے ہم بارہا واضح کرنے کی کوشش کر چکے ہیں۔ اردو کو ہم پاکستان کی قومی زبان سمجھتے ہیں۔ یہی وہ زبان ہے جسے لنگوا فرینکا کی حیثیت حاصل ہونی چاہیئے۔ پاکستان کے مختلف صوبوں میں بکھرے ہوئے عوام کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے لئے اور مختلف صوبائی مسائل کو سمجھنے کے لئے لسانی اشتراک از حد ضروری ہے۔ ہمیں حکومت سے یہی شکوہ رہا ہے۔ اور اب تک کہ وہ اردو کو قومی زبان بنانے کا بارہا اعلان کرتی ہے۔ مگر جہاں تک عملی اقدامات کا تعلق ہے اس کا رویہ سخت قابلِ اعتراض ہے۔ پاکستان کے ہر باشندے کا اردو سیکھنا ضروری ہے۔ اب رہ گیا صوبائی زبانوں کا مسئلہ۔ اس معاملے میں ہم یہ عرض کریں گے۔ کہ ایک صوبائی زبان جو صوبائی ثقافت کی
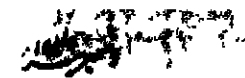
سب سے بڑی مظہر ہوتی ہے۔ ملک میں ایک مشترک زبان ہونے کی وجہ سے نقصان نہیں اُٹھا سکتی۔ صوبائی زبانوں کو نشو و نما کا موقع ہر جائز موقعہ ملنا چاہیئے۔ لیکن انہیں اس سطح پر نہیں لانا چاہیئے جس سطح پر ملک کی ایک مشترک زبان ہوتی ہے۔ ایک صوبائی زبان کو کس جماعت تک ذریعۂ تعلیم بننا چاہیئے۔ اور بچے کی ذہنی نشو و نما میں اس کا کیا حصّہ ہونا چاہیئے۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا تعلق براہِ راست ماہرینِ تعلیم سے ہے اور وہی اس مسئلے کو سائنٹیفک طور پر حل کر سکتے ہیں۔

ترقی پسندوں کے ایک حلقے میں اس بات پر بھی زور دیا جا رہا ہے۔ کہ وہ رسائل و جرائد جو ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہیں ان لوگوں سے نشر و اشاعت میں انقطاعِ تعلق کر لیں جو ترقی پسند نہیں کہلاتے۔ ادبِ لطیف کے پیشِ نظر افکار رہے ہیں افراد نہیں۔ فرق ترقی پسند افکار اور رجعت پسند افکار میں ہونا چاہیئے۔ اس باب میں بعض افراد کو اہمیت دینی زیادہ موزوں نہیں ہے۔ پھر اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ ایک مسلّمہ ترقی پسند ادیب جب آئندہ لکھنے کے لئے قلم اُٹھائے گا۔ تو غیر شعوری طور پر رجعت پسندانہ افکار کا حامل نہیں ہو جائے گا یا ایک رجعت پسند ادیب زندگی سے متعلق صالح اور صحت مند نقطۂ نظر کو اپنے ادب میں جگہ نہیں دیگا ترقی پسند ساتھیوں کو ترقی پسند افکار کیلئے وقف ہونا چاہیئے۔ افراد کے معاملے میں تفریق و تمیز خواہ مخواہ ایک ذہنی اُلجھن پیدا کر دیتی ہے۔

ان چیزوں کی طرف اشارہ کر دینا ہم نے اس لئے ضروری سمجھا ہے کہ کانفرنس کے بعد اکثر ادبی اور غیر ادبی حلقوں میں ان کے متعلق غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ اور مصلحتاً پیدا کر دی گئی ہیں۔ اس لئے ادبِ لطیف کی پالیسی کو غیر مبہم انداز میں بیان کر دینا لازمی تھا۔

• • •

## ایک المناک حادثہ ——— !

پچھلے دنوں ایک ایسا حادثہ رونما ہوا ہے۔ جو المناک ہے۔ اور جس کا ہمیں بہت افسوس ہے۔

یہ حادثہ اُردو کے مشہور شاعر "میراجی" کی حسرت ناک موت ہے۔ میراجی کے نقطۂ نظر سے لاکھ اختلاف سہی مگر اس امر سے انکار ممکن نہیں کہ وہ ایک وسیع المطالعہ شخص تھے۔ اُردو کے کلاسیکی ادبیات کا اُنہوں نے نہایت گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ صرف اُردو ہی نہیں دوسری زبانوں کے ذخیرۂ ادب کا بھی کافی حصہ ان کی نظروں سے گذر چکا تھا۔ فرانسیسی اور ہندِ قدیم کے ادب سے وہ خاص طور پر متاثر تھے ——— چنانچہ ان کی شاعری میں جہاں فرانس کے زوال پسند ادبا کی فکری ژولیدگی کے آثار ملتے ہیں۔ وہاں ہندی شاعری کے جنسیاتی اشارات بھی بکثرت نظر آ جاتے ہیں۔ میراجی نے اُردو شاعری کی ہیئت میں کافی تجربات کئے ہیں! اور ان میں سے اکثر ایسے ہیں جنہوں نے موجودہ پود کے بعض ذہین نوجوانوں پر کافی گہرا اثر ڈالا ہے۔ مگر میراجی کا اصل مقام تنقید ہے۔ اُردو ادب کی یہ ایک ٹریجڈی ہے کہ میراجی نے تنقید کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی۔ ان میں تنقیدی صلاحیتیں بافراط موجود تھیں اور اگر وہ ان صلاحیتوں کو نشو و نما کا موقعہ دیتے تو اُردو ادب کے تنقیدی ذخیرے میں نمایاں اضافہ کر سکتے تھے۔ فرانسیسی اور ہندی شعراء کا انہوں نے جس انداز سے جائزہ لیا ہے وہ اُردو ادب میں بالکل نیا ہے اور یہ مضامین اُردو ادب کا نہایت قیمتی اثاثہ ہیں۔ میراجی ایک نہایت مذہبی انسان اور بیحد دلچسپ شخصیت تھے۔ جن لوگوں کو ان کی گفتگو سننے کا موقعہ ملا ہے وہ انہیں کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

مرحوم نے زمانہ علالت کا بیشتر حصّہ اپنے عزیز دوست اُردو کے ممتاز ترقی پسند شاعر اختر الایمان کے مکان پر گزارا جہاں اُن کا باقاعدگی سے علاج ہوتا رہا۔ جب علالت نے نازک صورت اختیار کی۔ تو احباب انہیں کنگ ایڈورڈ میموریل ہسپتال لے گئے۔ اسی ہسپتال میں انہوں نے زندگی کے آخری دن گذارے۔ وفات کے وقت مرحوم کی عمر چھتیس سال پانچ ماہ تھی۔

ممتاز حسین

# روسی ادیبوں سے ملاقات

ممتاز حسین

کل پاکستان ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کے لئے ہماری انجمن کی دعوت کو قبول کرتے ہوئے روسی ادیبوں کا ایک وفد آیا تھا۔ یہ ہماری بدقسمتی تھی کہ وہ لاہور میں کانفرنس ختم ہونے کے بعد پہنچا۔ لیکن اس سے لوگوں کے جوش و خروش اور خود ان کے انہماک میں کوئی کمی نہیں آئی۔ روسی ادیب جہاں بھی گئے۔ ان کا خیر مقدم بڑے تپاک سے کیا گیا۔ ان کی یہ مقبولیت یہاں کے ترقی دشمن حلقوں کے لئے اس قدر ناگوار گزری کہ ایک اخبار نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ یہ روسی نہیں ہیں بلکہ سرحدی انگریز ہیں۔ آپ اس ایک جملے سے اس جھوٹ اور بہتان کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ جو یہاں کے اخباروں نے کانفرنس کے موقعے پر گھڑا ہے۔ شاید انہیں یہ نہیں معلوم کہ جھوٹ کی زندگی چند روزہ ہوتی ہے اور سچ کا جادو سر پر چڑھ کر بولتا ہے۔

دیکھنے میں تو یہاں تک آیا کہ میرزا ترسون زادہ کی نظمیں اور تقریریں سن کر لمبی لمبی داڑھیاں بھی جھوم گئیں۔ لاہور کے زیادہ تر مولویوں کو یہی بتلایا گیا تھا کہ روس میں اسلام نہیں ہے۔ تاشقند، سمرقند اور بخارا کی مسجدیں منہدم کر دی گئی ہیں۔ لیکن جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ روس میں دو کروڑ مسلمان بستے ہیں جو اپنے دینی فرائض بھی انجام دیتے ہیں تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی اور جب پاکستانی حکام کے کانوں تک یہ خبر پہنچی کہ روس میں سرکاری بجٹ کا ستر فیصدی حصہ تعلیم اور کلچر کے کاموں پر صرف کیا جاتا ہے۔ تو وہ فوراً یہ سوچنے لگے۔ کہ پھر تو سوویٹ روس میں ایٹم بم کا بننا ناممکن ہے۔ ان کا خیال صحیح بھی ہے۔ روس کا سب سے بڑا ہتھیار وہاں کا نظام، کلچر اور تمدن ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا تو پاکستان کی خفیہ پولیس روسی وفد کا محاصرہ کیوں کرتی۔ یہ محاصرہ اس لئے ہوا کہ کہیں یہ عوامی ذہن پر چھینٹ نہ پڑیں۔ چنانچہ اس محاصرے کا احساس کرتے ہوئے میرزا ترسون زادہ نے مجھ سے کہا بھی ہے۔ کہ یہاں کی حکومت ہم لوگوں سے اس طرح ڈر رہی ہے گویا ہمارے سروں میں سینگ ہے۔ اس سے زیادہ شرمناک بات یہ ہوئی کہ لاہور کی پولیس نے ان تحائف کو ہم سے چھین لیا۔ جو وہ ہمارے لئے لائے تھے۔ یہ تحائف کیا تھے۔ چند کلاسیکی کتابیں، پشکن، گوگول، ترگنیف، لرمنتوف کی تصانیف، چند تصاویر، صنعت و حرفت اور اشتراکی کھیتی باڑی کا پر رومان داستان، کپاس کے رنگین پھول، کلچر پر عوامی تصرف، ماں کی خوشی، بچوں کے کھیل، بوڑھوں کی بحالی ہستی۔ جب یہ خبر روسی ادیبوں تک پہنچی کہ پشکن کی تصویر اور پشکن کا نغمہ ایک تھانیدار کی ملکیت بن گیا ہے۔ تو آقائے تخونوف کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اور وہ کمرے میں ٹہلنے لگے۔ جب ان کے جذبات میں کچھ ٹھہراؤ پیدا ہوا۔ تو کہنے لگے کہ پشکن تو انقلاب سے بہت پہلے کا شاعر ہے۔ اس کے جواب میں میں نے یہ کہا۔ کہ یہاں کی حکومت کو پشکن سے زیادہ ان بچوں کی تندرستی اور خوشی سے خطرہ ہے۔ جن کی تصویریں آپ لائے تھے۔ کپاس کے ان رنگین پھولوں سے خطرہ ہے۔ جو صرف سائنس ہی کی مدد سے اگائے جا سکتے ہیں۔ اس انسانی علم و حکمت سے خطرہ ہے جو ربیع کی فصل کو خزینے میں بدل دیتا ہے۔ جو برف زاروں پر گوبھی کے پھول اگاتا ہے۔ جو دریاؤں کے رخ کو بدل دیتا ہے۔ جو ریگستانوں کو سبزہ زاروں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ نہ آپ یہ ایٹم بم لائے ہوتے اور نہ یہ دن دیکھنا پڑتا۔ اس شرمناک حادثے کے بعد وہ یہ بار بار پوچھتے رہے کہ کیا وہ چیزیں واپس کی گئیں۔ لیکن آخر وقت تک ہمیں یہی کہنا پڑا کہ نہیں۔

لیکن روس کا تمدنی ہم یہاں کے عوامی ذہن پر پھٹ کے رہا۔ بیگم شاہ نواز کو کہنا پڑا کہ روس کے متعلق ہمیں زیادہ تر انگریزوں کے تعصب آمیز ذرائع سے ملا کرتی تھیں۔ آج پاکستان اس عینک کو اتار پھینکنے کے لئے تیار ہے۔ ہماری یہ تمنا ہے کہ آپ ہمیں بلا واسطہ اپنے ملک کے بارے میں بتائیں۔ یہ مطالبہ صرف بیگم شاہ نواز ہی کا نہ تھا۔ یہ مطالبہ پاکستان کے ان اخباروں کا بھی تھا جو ترقی پسند مصنفین کو گالیاں دینے میں مشغول تھے۔ یہ مطالبہ عوام کی دُکھی زندگی کا تھا۔ عوام کی غلامانہ زندگی کا تھا۔ چنانچہ اس مطالبے پر حکومت کوئی پابندی عائد نہ کر سکی۔ اور کپاس کے پھولوں کا وہ ایٹم بم جو تھانے میں بند ہے عوامی ذہن کو جھنجھوڑتا رہا۔ زندگی کی جستجو کے لئے اکساتا رہا۔ اور باوجود تمام محاصروں کے زندگی کی ایک نئی کروٹ کے اضطراب کو چھوڑ گیا ہے۔

اب میں جستہ جستہ وہ تمام چیزیں بتانا چاہتا ہوں جو ان لوگوں نے یہاں کی ملاقاتوں میں، یہاں کی ادبی مجلسوں میں اور اپنی تقریروں میں کہی ہیں۔ قبل اس کے کہ میں اس باب کا آغاز کروں، میں یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ ہمیں آقائے ترسون زادہ سے زیادہ استفادہ ہوا۔ کیونکہ آقائے ترسون زادہ بڑی ڈھلی ہوئی اور سلیس فارسی بولتے تھے۔ ان سے سوالات کرنے میں زیادہ آسانی تھی۔

آقائے ترسون زادہ کا نام ہمارے لئے نیا نہیں ہے۔ کیونکہ وہ دہلی میں ۱۹۴۷ء میں ایشیائی تعلقات کی کانفرنس میں شرکت کر چکے تھے۔ پھر یہ کہ ہندوستان سے متعلق انہوں نے ایک طویل نظم بھی لکھی تھی۔ جس پر انہیں استالین انعام ملا تھا۔ یہ نظم فارسی میں تھی لیکن اس کا ترجمہ اندرِ سوویٹ جرمنی میں، انگریزی میں بھی شائع ہوا تھا۔ جب وہ ہندوستان سے لوٹ کر اپنے وطن میں پہنچے۔ تو ایک دوسری مختصر نظم بازگشت کے عنوان سے لکھی۔ اسی نظم کو انہوں نے سب سے پہلے پاکستان میں سنایا۔ اس نظم کے چند اشعار یہ ہیں:۔

| | |
|---|---|
| شادم۔ اما ہی خودم ہمراہِ خلقِ دیگرے | در نظر می آمدم تا ما نہ گشتہ کشورے |
| خلقِ ہندِ شئے کشمکش را رسان از من سلام | اے سرودِ من اگر داری تو ہم بال و پرے |
| من ہمیشہ می رسد ہر یک صدائے ما بہ او | ہر یک آواز زیباز ہر دو فائے ما بہ او |
| کو ہساراں ہیچ نتوانند سید رہ شوند | می زرد بوئے معطر را ہوائے ما بہ او |

آقائے ترسون زادہ کی نہ صرف یہ نظم بلکہ اس کی تمام نظمیں فارسی شاعری کے کلاسکی انداز میں رچی ہوئی ہیں۔ اس کا سبب صرف یہی نہیں ہے کہ انہوں نے فارسی شاعری کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔ بلکہ یہ بھی ہے کہ شاعری کے بارے میں ان کا نظریہ بالکل صاف ہے۔ انہوں نے گورنمنٹ کالج کے طلبا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ کہ ادب کے بارے میں ہمارا یہ نظریہ ہے کہ اس کی ہیئت کو قومی ہونا چاہیئے اور مواد اشتراکی اور بر زمینِ دوستی ڈالتے ہوئے انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ہمارے شعر و ادب کے تین سرچشمے ہیں۔ ایک سرچشمہ تو لوک گیت کا ہے۔ دوسرا سرچشمہ ماضی کی انسان دوست اور جمہوری روایات کا ہے اور تیسرا سرچشمہ اشتراکی حقیقت نگاری کا ہے۔ ہم جب شعر لکھتے ہیں۔ تو ہمارے سامنے محنت کش انسان ہوتے ہیں۔ ادب کا کام زندگی کو آگے بڑھانے اور خلق کی خدمت کرنے کا ہے۔ لیکن اس خدمت کو انجام دینے کے لئے اسے پُرتاثیر ہونا چاہیئے۔ اسے اس عوام سے قریب ہونا چاہیئے۔ جو خلق کے دل و دماغ پر فدا کندی کرتے رہے ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں۔ کہ ہم بین الاقوامی ادب کو نظر انداز کرتے ہیں دُنیا کا تمام انسان دوست اور جمہوری ادب ہماری میراث ہے۔ اس وراثت میں رودکی، فردوسی، نظامی، سعدی، حافظ، امیر خسرو کے علاوہ پشکن بالزک، گوئٹے۔ بائرن شیلی اور شیکسپیئر سب شامل ہیں۔ اسی سلسلے میں انہوں نے ایک واقعہ بھی بتایا۔ کہنے لگے کہ ابھی حال ہی میں جب میں پیرس میں گیا تو میں نے ایک انگریز مصنف سے پوچھا کہ کیا لندن میں شیکسپیئر کے ڈراموں کے کھیلنے کا کوئی مخصوص انتظام ہے۔ تو اس نے جواب دیا۔ کہ نہیں کیونکہ شیکسپیئر اب بہت پُرانا ہو گیا ہے۔۔ اس پر آقائے ترسون زادہ نے ہنس کر کہا۔ کہ لیکن ہمارے یہاں تو شیکسپیئر ابھی تک زندہ ہے وہ تو کبھی بھی پُرانا نہیں ہو سکتا ہے۔ اس کے کردار نا مردنی ہیں۔ شیکسپیئر پوری انسانیت کی جائیداد ہے۔

آقائے ترسون زادہ کا ذہن شعر و ادب کے بارے میں کتنا صاف ہے۔ اس کا دوسرا ثبوت مجھے ان کی نظم تاج محل میں ملا۔ انہوں نے اپنی اس موثر اور دلکش نظم میں تاج محل کو انسانی محنت کی شکل بتایا ہے۔ ایک ایسی شکل جو انسانی عظمت اور اس کی حسن کاری کا ثبوت دیتی ہے۔ یہاں ان کی یہ حس سوکھ کر نہیں کہ اس تاج محل کو روضے میں پر نصب کرنے میں کتنے غریبوں کی محبت کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ یا کتنے انسانوں کی محنت کا استحصال کیا گیا ہے۔ کیونکہ جس زمانے کی یہ چیز ہے اس زمانے میں انسانی محنت کے استحصال کو ختم کرنے کا کوئی ٹھیک نظریہ نہ تھا۔ آج وہی تاج محل پوری انسانیت کی ملکیت ہے کیونکہ اس میں انسان کی حسن کاری کا بہترین نمونہ ہے۔ اس تاج محل کا مقابلہ انہوں نے بمبئی کے تاج محل ہوٹل سے بھی کیا ہے۔ لیکن ہوٹل کے بارے میں ان کا شعور مختلف ہے۔ انہوں نے اسے سٹے بازی کا ایک گودام بتایا ہے۔ انسانی محنت کے لئے لین دین کا آماجگاہ بتایا ہے۔

ایک دوسری محفل میں آقائے ترسون زادہ نے اپنا ایک تاجیک گیت سنایا۔ یہ گیت نغموں کی فضاؤں میں ڈوبا ہوا تھا۔ اور جب وہ اس شعر "گل میان ما دا ما لہ شگل آیند" پر پہنچے۔ تو میں نے مومنی ایبک سے پوچھا کہ یہ تو تاثر LYRIC (نغمہ ہے) تو مومنی ایبک نے کہا۔ کہ شاعری بغیر LYRIC کے نہیں ہو سکتی اور LYRIC دل کی گہرائیوں سے پیدا ہوتی ہے۔ ہر چند مومنی ایبک کا یہ جملہ ایک وقتی تاثر کے تحت تھا۔ لیکن یہ حقیقت ہے۔ کہ شاعری بالخصوص ایک ایسی زبان میں جس کے پاس LYRIC کا گراں بہا سرمایہ ہو بغیر نغمے کے پھیکی سی معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ آج روس میں پشکن کی مقبولیت کا بھی یہی سبب ہے۔ اور یہ کچھ بے معنی نہیں ہے کہ اب کے سال پشکن کی نظموں کا مجموعہ گیارہ ملین یعنی ایک کروڑ دس لاکھ نسخہ فروخت ہوا ہے۔ چنانچہ آقائے تخوتاف نے اپنی تقریر میں یہ بات کہی تھی۔ کہ باوجود اس بات کے کہ پشکن کو مرے ہوئے ڈیڑھ سو سال گزر گئے ہیں۔ لیکن پشکن آج بھی اتنا ہی نیا ہے جتنا کہ اپنے وقت میں تھا۔ پشکن کی اس مقبولیت کا بنیادی سبب یہ ہے۔ کہ اس نے عوامی گیت کے خزانے کو بھرپور طریقے سے استعمال کیا ہے۔ اس نے شاعری کو عام انسانوں کی شاعری بنایا ہے۔ اس نے روسی زبان کے شعری ادب میں ایک بنیادی اضافہ کیا ہے۔ جس محفل کی یہ بات ہے، اسی محفل میں آقائے تخوتاف نے اپنی ایک انقلابی نظم بھی سنائی۔ یہ نظم روسی زبان میں تھی۔ اس کے مفہوم کو تو ہم سمجھ نہ پائے۔ لیکن آواز کی گھن گرج، لہجے کے اتار چڑھاؤ میں کچھ ایسی دلکشی تھی کہ سارا مجمع جھوم رہا تھا۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ نظم ہمہ تن جوش اور انقلابی جذبے کا ایک شاہکار ہے۔ جس کی نغمگیت اور پیغام دونوں ہی نامونی ہے۔

ایک روز ہم لوگ شالیمار باغ کی سیر کے لئے جا رہے تھے آقائے ترسون زادہ نے خیام کی رباعیاں پڑھنی شروع کیں۔ یہ رباعیاں نئی نہیں تھیں وہی تھیں جو ہم آپ پڑھ سکتے ہیں لیکن میں نے یہ محسوس کیا۔ کہ ان کا جمالیاتی ذوق کچھ ہے ـــ تیز تر تھا جو ایرانی سے بڑا شگفتہ رہا۔

میں نے سوال کیا آپ کا خیام کی شاعری کے بارے میں کیا رائے ہے؟ آقائے ترسون زادہ نے جواب دیا کہ "خیام در زبان فارسی فلسفہ مادی و حسی آوردہ" اس نے مادی زندگی کی لذتوں کو سراہا ہے۔ اور مرنے کے بعد انسان کو جزو خاک بتایا ہے۔ پھر میں نے سوال کیا۔ سعدی اور حافظ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ انہوں نے بتایا کہ سعدی اور حافظ کا کلام انسان دوستی کا ادب ہے۔ پھر اس کے بعد انہوں نے سعدی کی وہ نظم پڑھی جس کا پہلا مصرعہ یہ ہے ع بنی آدم اعضائے یک دیگر اند۔

میں سوچنے لگا۔ کہ سعدی کا یہ فلسفہ آج کیونکر زندہ رہ سکتا ہے جبکہ ہمیں اپنے بہت سے دشمنوں کو ختم کرنا ہے۔ بہت سے ناپاک اعضا کو جدا کرنا ہے۔ تو میرے شعور نے جواب دیا۔ کہ یہ فلسفہ ناپاک اعضا کے جدا کرنے میں حارج نہیں ہو سکتا ہے۔ بلکہ تمام انسانوں کو ایک اشتراکی نظام میں منضبط کرنے میں مددگار ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد ایک دن میں نے آقائے ترسون زادہ سے یہ پوچھا۔ کہ فارسی کے کلاسکی شعرا میں سے کن کا ترجمہ روسی زبان میں ہوا ہے تو انہوں نے جواب دیا۔ کہ رودکی، فردوسی۔ نظامی گنجوی، عمر خیام۔ سعدی۔ حافظ کے ـــ ترجمے ہو چکے ہیں۔ اور ابھی بہت باقی ہیں

صرف آغا صاحب کو یہ شعر دہراتے ہی نہیں سنا بلکہ اس کے ثبوت میں کسی کھیاتے ناز پہ حشر کا سر نیا نیکا ہوا اپنی آنکھوں سے دیکھا بھی جب عشق کے آنسو حشر کو ہی بیتاب نہیں کئے ہوئے تھے بلکہ دیکھنے والے بھی بیقرار تھے یہ کلکتہ کی زندگی کے دور کی ایک جھلک تھی۔ اور وہ یہ کہنے پر مجبور تھے کہ۔

"حُسن مختار حشر در آغوش"

بہر حال محمد "لطیف بود حکایت دراز تر گفتم" کے مصداق یہاں حکایت شروع بھی نہ ہوئی اور تمہید طولانی ہوتی جا رہی ہے۔

مقصد اس تفصیل سے یہ تھا کہ جن نامنصف مضمون نگاروں نے آغا حشر مرحوم پر قلم اٹھایا اور سینکڑوں غلط بیانیوں کے طومار سے انصاف کا خون بہایا۔ انہوں نے کبھی یہ کوشش بھی نہ کی کہ آغا صاحب مرحوم کے کسی واقف کار دوست یا عزیز سے ہی استصواب کر لیں۔ اور ان کے حالات کی اشاعت سے پہلے اپنے رطب و یابس کی صحت مناسب سمجھیں۔ چنانچہ کچھ عرصہ ہوا کوئی جمیل صاحب ہیں۔ انہوں نے حیات حشر پر ایک کتاب مرتب کر ڈالی۔ اس کی اشاعت ابھی ہو رہی ہے اور حسب معمول کتاب کے مضامین غلطیوں سے بھرے ہوئے ہیں، اسی طرح دہلی کے مشہور رسالہ "آجکل" کی اشاعت ۱۵ مئی ۱۹۴۵ء میں ایک مضمون جگیشور ناتھ بیتاب بریلوی کا اس دعوے کے ساتھ شائع ہوا تھا کہ اس میں سراسر ذاتی معلومات درج ہیں۔ لیکن ذاتی معلومات نگار نے اس میں حشر کو جاہل اور ایک ادنے درجہ کا ایکٹر ثابت کیا ہے۔ اس مضمون میں بیتاب صاحب نے لکھا ہے کہ حشر مرحوم سرزمین پنجاب میں پیدا ہوئے، حالانکہ اصلیت یہ ہے کہ آغا محمد شاہ (حشر کاشمیری) کی پیدائش شہر بنارس میں یکم اپریل ۱۸۷۹ء کو جمعہ کے دن ہوئی۔ اور جس آبائی مکان میں ہوئی وہ محلہ دال منڈی کے قریب اب بھی موجود ہے۔ میں نے اس مکان کو بچشم خود دیکھا ہے اور بنارس کی میونسپلٹی کے دفتر میں جو ۱۸۷۹ء کا پیدائشی ریکارڈ موجود ہے۔ اس نے بیان کی تصدیق کی ہے۔ ان کے والد کا نام آغا محمد غنی شاہ تھا۔ اور ان کا مکمل شجرہ نسب ان کے اہل خاندان کے پاس محفوظ ہے جو میں پڑھ چکا ہوں:۔

خاندانی روایات کے مطابق آغا حشر کو قرآن شریف کا درس ختم کر کے فارسی عربی کی تعلیم دلائی گئی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ بنارس کے "جے نرائن ہائی اسکول" میں انگریزی کی درسی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ انہوں نے اپنی فطری ذہانت سے عربی فارسی میں قلیل عرصہ میں مہارت حاصل کر لی۔ لیکن انگریزی کی درسی تعلیم باقاعدہ آٹھویں جماعت تک حاصل کر سکے۔ اگرچہ انگریزی زبان کی مہارت حاصل نہ ہو سکی۔ تاہم جاننے والے سمجھ سکتے ہیں کہ اس دور کی آٹھویں جماعت کا معیار آج کل کے مقابلہ میں کتنا بلند تھا۔ اور اس معلومات کی ہمہ گیری نے اس راہ میں کوئی دشواری محسوس نہ کی۔

چنانچہ جب وہ اسکول چھوڑ کر درس و تدریس کے جھگڑوں سے آزاد ہو کر اپنے ذاتی مطالعہ میں مصروف ہوئے۔ تو ملکی اور غیر ملکی زبانوں کو سمجھنے اور ان کے علم و ادب تک دسترس حاصل کرنے میں اردو تراجم کا سہارا لینا پڑا۔ بیّن دلیلیں موجود ہیں کہ غیر ملکی لغات کے مطالعہ سے غیر ملکی ادب پر بھی براہ راست دسترس حاصل کی۔ یہ مان لینے میں کوئی عذر نہیں کہ آغا صاحب مرحوم کبھی یونیورسٹی کے سند یافتہ یا نامدار نہیں تھے۔ اردو زبان پر انہیں پوری قدرت تھی اور اس کے ساتھ ہندی پر بھی، اور ان دونوں کو وہ شیر و شکر بنا کر بول چال اور تصانیف میں استعمال کرنا خوب جانتے تھے۔ فطری ذہانت اور فطری قابلیت ہی ان کی مابہ الامتیاز خصوصیت تھی۔ ان کے مطالعہ کی وسعت اور ہمہ گیری کا ثبوت ان کا وہ کتب خانہ تھا جس کا ایک بڑا حصہ بمبئی سے کلکتہ اور کلکتہ سے لاہور منتقل ہونے میں ضائع ہو گیا اور بہت کچھ احباب کی نذر ہوا۔ تاہم باقیات الصالحات کے طور پر اب بھی کچھ حصہ بنارس کے مکان میں محفوظ ہے، جس میں ملکی اور غیر ملکی زبان کے لٹریچر کی کافی کتابیں مختلف فنون (تاریخ۔ ادب۔ اسٹیج آرٹ وغیرہ) پر پائی جاتی ہیں۔ اور ان کے حاشیوں پر ان کے قلم کے بے شمار نشان اور نوٹ بار بار کے غائر مطالعہ کا ثبوت ہیں"۔

جناب بیتاب نے لکھا ہے کہ آغا صاحب مرحوم ابھی مکتب ہی میں تھے کہ ناٹک دیکھنے کی چاٹ لگ گئی، اور گھر والوں سے چھپ چھپ کر تماشے دیکھنے لگے۔ ایک روز موقع پا کر ایک شخص کی معیت میں گھر بار چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے۔ کہنے کو تو انہوں نے اداکاری کا پیشہ اختیار کیا لیکن ڈائرکٹروں کی سخت گیری سے انہیں ایسی ہمت شکن ناکامی و ملامت ہوئی کہ انہوں نے تہیہ کر لیا [illegible] کا خیال کر کے قلم کو گنگا کے [illegible] میں چھپانا چاہا لیکن قسام ازل کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ چنانچہ گنگا نے

بیٹھا کر گنگا میں پھینک دیا ——— یہ بیان پڑھنے اور سننے کے لئے
ان موثر ہو سکتا ہے اور حشر جیسے باکمال ڈراما نویس کی زندگی کے کسی حصہ
اس طرح کا افسانوی رنگ دے دینا شاید کچھ بے جا نہ معلوم ہوتا ہو لیکن
بندہ فاضل مقالہ نویس نے حشر کو باکمال ہستی ماننے کے باوجود یہ تہیہ کر لیا ہو
اتہامات انہیں ایک کم حیثیت، کم سواد، اَن پڑھے نہ لکھے
اور محض اتفاقیہ کے یا اہل علم کے زمرے میں شامل کر دکھائیں اور یہ ثابت
کریں کہ حشر ذاتی طور پر کسی خوبی یا لیاقت کے مالک نہ تھے۔ شہرت خداداد تھی
ہے۔ خدا نے انہیں بڑا آدمی بنا دیا دوسروں کے سہارے اور وسیلے سے
صاحب یا ملازمین کی خوشہ چینی یا امداد سے ناٹک کی دُنیا میں ایک حشر پیدا
کیا۔ یہی وہ کارنامے تھے جن کی بدولت وہ بڑے آدمی بنے۔"

بہرحال حقیقت یہ ہے کہ ——— آغا صاحب مرحوم نے
آٹھویں جماعت سے تعلیم کو خیرباد کہا۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً ۱۷
سال کی ہو گی۔ انہوں نے ۱۸۹۷ء میں سب سے پہلا ناٹک "آفتاب
محبت" لکھا۔ جو اس عہد کے عام ناٹکوں کے انداز سے ملتا جلتا ہے۔
یہی مقفیٰ نثر اور ملی جلی نثر و نظم کے مکالمے۔ اشعار اور گانوں کی بہتات
—— اس ناٹک کے لکھنے کی وجہ یہ تھی کہ بنارس میں ایک تھیٹریکل کمپنی آئی
ہوئی تھی۔ منشی احسن لکھنوی کا ناٹک "چتر بکاولی" اس کمپنی کا مایۂ ناز
کھیل تھا۔ آغا صاحب مرحوم نے وہ ناٹک دیکھا اور اس سے متاثر ہو کر اسی
انداز پہ "آفتاب محبت" لکھ ڈالا۔ جس کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ
ناٹک "چتر بکاولی" کا جواب ہے۔ اس تھیٹریکل کمپنی سے آغا صاحب
کا کوئی واسطہ یا تعلق نہ تھا۔ نہ انہوں نے اس میں اداکاری کی حیثیت سے
کوئی حصہ لیا۔"

تھیٹریکل کمپنی چلی گئی۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ ناٹک کا مسودہ آغا صاحب
مرحوم کے پاس محفوظ رہا۔ انہوں نے یہ ناٹک اپنے احباب کو سنایا
اور وادی ساز میں مرزا عباس بیگ اب بھی اسی محلہ دال منڈی میں مرحوم
کے خاندانی مکان سے متصل سکونت پذیر ہیں۔ اس حقیقت سے باخبر ہیں۔ آغا
صاحب کو جاننے والے بخوبی واقف ہیں کہ ان کی طبیعت کی افتاد کچھ
ابھی سے کچھ ایسی واقع ہوئی تھی۔

مرحوم خود اس کی تصدیق کرتے تھے اور ان کی زندگی کا ہر دور عشق و
محبت کی ایک دلکش اور پُرسوز حکایت دُہراتا رہا ہے۔ چنانچہ اسی عرصہ
میں ایک دلکش واقعہ ایسا پیش آیا جس کی تفصیل کا نہ یہاں موقع ہے
اور نہ گنجائش کہ مرحوم نے والدین کی لاعلمی میں وطن کو خیرباد کہا۔ لیکن انہوں
نے باہر جا کر کہیں اداکاری کا پیشہ اختیار کیا اور نہ انہیں ڈائرکٹروں کی سخت
گیری برداشت کرنے کا موقع ملا اور نہ ہمت شکن حالات کا منہ دیکھ کر
گنگا جمنا یا کسی اور دریا کے دامن میں پناہ لینے کی کوشش کی۔

بنارس کے ایک پبلشر عبدالکریم خاں عرف بسم اللہ خان کو ناٹک
آفتاب محبت کا مسودہ سونپا جا چکا تھا۔ اردو پریس کی جو کس مپرسی
اور اردو مصنفین کے حق میں حربہ وہ پبلشر کی حق تناسی جواب ہے
اس وقت اس سے کہیں زیادہ تھی۔ اس کے علاوہ ایک نو خیز مصنف
کی پہلی تصنیف پبلشر نے حاتم وقت بن کر مبلغ پندرہ روپیہ میں لے لی۔
آفتاب محبت شائع ہو گیا۔ آغا صاحب مرحوم جب بنارس کو خیرباد کہہ کر
بمبئی روانہ ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر ۲۲ سال کی تھی۔ اور یہ ۱۹۰۱ء کا
زمانہ تھا۔ اس زمانہ تک انہوں نے کسی تھیٹریکل کمپنی میں کسی حیثیت سے
ملازمت نہیں کی۔ ۱۹۰۱ء میں پہلی بار پارسی الفریڈ تھیٹریکل کمپنی
کے مالک کاؤس جی نے انہیں ڈرامہ نویس کی حیثیت سے انتخاب کیا۔
آغا صاحب ملازم ہو گئے۔ اس سے پہلے ۱۹۰۱ء میں بمبئی کے قیام کے
دوران میں انہوں نے ایک ناٹک "مرید شک" لکھا۔ یہ گویا "آفتاب محبت"
سے شروع ہو کر اسی پر ختم سمجھنا چاہیے۔ دوسرے دور کے ناٹکوں میں
مرید شک۔ اسیر حرص۔ صید ہوس۔ خوبصورت بلا اور سفید خون
ہیں۔ جناب بیتاب نے آغا صاحب مرحوم کے ذاتی حوالہ سے یہ بھی لکھا
ہے۔ کہ وہ (حشر) بڑے فخر کے ساتھ اس امر کا اعتراف کرتے تھے۔ کہ
انہوں نے ناٹک نویسی کا درس "ادبی چترا بکاولی" کے مصنف سے لیا ہے
مرحوم ان کا بھلا سا نام بتلاتے تھے۔ جو اس وقت یاد نہیں آیا۔ اور یہ بھی
فرماتے تھے کہ وہ بریلی کے ساکن تھے۔ کرشن مان رائے بریلی کسی جگہ ان کا مکان
تھا۔ اپنے ابتدائی زمانہ میں وہ رائے روشن لال مرحوم رئیس اعظم کی کمپنی
کے روح رواں تھے۔"

اس سے انکار نہیں کہ حشر مرحوم کے دوسرے دور تک کے ناٹکوں
میں بیشتر فنی خامیاں پائی جاتی ہیں۔ مرحوم کو خود اس کا اعتراف تھا اور

یہ بھی واقعہ ہے کہ ان میں بیشتر گزریاں مالکانِ کمپنی کی فرمائشوں، وقت
کی ضرورت اور اسٹیج کی مانگ کے سبب سے تھیں لیکن بہت کم حضرات
کو اس کا علم ہے کہ حشر مرحوم کے اصل مسودات کچھ اور ہوتے تھے اور اسٹیج
پر وہ کسی اور ہی رنگ میں پیش کئے جاتے تھے۔ ناٹک لکھتے وقت مرحوم
کا قلم مطلقاً آزاد ہوتا تھا۔ اس وقت ان کے سامنے نہ کسی مالکِ کمپنی کی
فرمائش ہوتی تھی اور نہ عام تماشائیوں کے ذوقِ طلب کا لحاظ انہیں کسی طرح
مجبور کرتا تھا۔ البتہ لکھے جانے کے بعد جب وہ نظرِ ثانی کرتے تھے اس وقت
ہنگامی ضرورت کو سامنے رکھ کر مالکانِ کمپنی کے تقاضوں پر بے شمار تبدیلیاں
کی جاتیں۔ اس لئے اسٹیج کا مسودہ اصل ناٹک سے بالکل مختلف ہوتا۔ یہی
سبب ہے کہ آج ہمارے سامنے حشر کے مطبوعہ ناٹکوں میں سے جتنے بھی
موجود ہیں سب کے سب مسخ شدہ صورت میں ہیں۔ پھر ناشرین نے بھی
کافی سے زیادہ دست درازی کی ہے اور ایکٹروں کی یادداشت پر پورے
پورے ناٹک چھاپ کر حشر کو رسوا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ہے۔
بعض مطبوعہ ناٹکوں میں سے تو اکثر ایسے ہیں جن میں افراد کے نام، اور
کہیں کہیں چند بے ربط جملے آغا صاحب کی اصل تصنیف کے ہیں اور
باقی، حشر کے نام سے منسوب کر کے تجارتی اغراض کو پورا کیا جا رہا ہے۔

اس کا ثبوت مرحوم کے ان غیر مطبوعہ مسودات سے مل چکا ہے جو ان کے
منشیوں کے قلم کے لکھے ہوئے ہیں۔ اور ان میں حشر کے اپنے قلم کی اصلاحیں
موجود ہیں۔ جو نظرِ ثانی کے دوران میں کی گئیں۔ اور چند مسودات ان کے اپنے
قلم کے بھی ہیں۔ عموماً آغا صاحب تصنیف کے وقت والہانہ انداز میں
ٹہل ٹہل کر ڈرامہ بولتے جاتے اور ان کے منشی لکھتے رہتے۔

مرحوم کے تیسرے دور کے ناٹکوں میں جن میں سب سے پہلا "بلوا منگل"
(سورداس) ہے۔ بہت کچھ اصلاحیں نظر آتی ہیں۔ اور اس کے بعد ناٹک
بن دیوی۔ گنگا اوترن۔ یہودی کی لڑکی۔ آنکھ کا نشہ۔ رستم و سہراب
ترکی حور۔ دھرمی بالک۔ دل کی پیاس۔ سیتا بن باس۔ پہلا پیار
ہندوستان وغیرہ اصلاحی دور کی اعلیٰ مثالیں ہیں۔

آغا صاحب مرحوم نے جب اردو ڈرامہ کی دنیا میں قدم رکھا تو اس کا
باوا آدم ہی نرالا تھا۔ تھیٹریکل کمپنیوں کے مالک دولت مند سیٹھ تھے۔ علم
دوستی کی جگہ تجوری دوستی ان کا شعار تھا۔ ادب سے انہیں دور کا بھی واسطہ
نہ تھا۔ وہ پبلک کی مانگ کو پورا کرنا اور دولت سمیٹنا پیشہ تھا۔ یہی
ہمارا اسٹیج تھا۔ حشر نے ہوش سنبھالا تو یہ عجیب اسٹیج ان کے سامنے تھا۔
کچھ دن وہ بھی اسی رنگ میں رنگے رہے۔ لیکن پھر ان کی فطری جدت پسندی
نے گوارا تقلید پسند نہ کی۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے تھیٹریکل اسٹیج کو خیر باد
کہا اور تبلیغی اسٹیج کی طرف متوجہ ہوئے۔ یعنی خواجہ حسن نظامی اور مولانا ابوالکلام
آزاد کے ساتھ اسلامی تبلیغ کے مشن میں شریکِ کار ہو گئے۔ آریہ اور
مسیحی تبلیغ کے خلاف اسلام کی حفاظت و احیاء کے لئے ملک کے گوشہ
گوشہ میں دورے کر کے تقریریں کرتے رہے اور اپنی فصاحت و بلاغت کے
جوہر نظم و نثر میں دکھاتے رہے۔ اس طرح مدتوں خدمتِ اسلام انجام دی۔
لیکن قدرت نے انہیں جس کام کے لئے بھیجا تھا۔ وہ اسٹیج دوسرا ہی تھا جبکہ
ناٹک کی دنیا نے انہیں پھر اپنی طرف کھینچ لیا۔ اور پارسی اسٹیج پر پہنچ گئے
اب انہوں نے جدت آفرینیوں کے دریا بہانا شروع کئے۔ اسٹیج کی اصلاح کا
بیڑا اٹھایا۔ اور چند برس میں حشر کی تجلیات نے ہندوستانی اسٹیج کو جگمگا
دیا۔ مگر ان کے ابتدائی کارناموں کو ان کے طبعی رنگ میں اس دور کے اسٹیج
نے من و عن قبول نہ کیا۔ اور زمانہ کا انداز انہیں بھی اختیار کرنا پڑا۔ عرصہ دراز
تک پارسی سیٹھوں کے لئے روپیوں کی جھنکار کی خاطر ان کے ڈرامے وقت کی
آواز بن کر ہمارے قدیم اسٹیج پر گونجتے رہے۔ لیکن رفتہ رفتہ ان کی فطری
صلاحیت نے پھر بغاوت کی اور پہلے تو کمپنیوں کی ملازمت میں بامعاوضہ
پر ڈرامے لکھتے تھے۔ مگر اس اصلاحی پروگرام کے ماتحت اپنی کمپنی قائم
کر گئے انہوں نے نیا دور شروع کیا۔ ریاست حیدرآباد۔ ریاست چرکھاری
اور ریاست بنارس وغیرہ سے گرانقدر امداد ملی۔ اس زمانہ میں حشر نے
قدیم اسٹیج کی بہت کچھ اصلاح کی اور نئے نئے ڈرامے لکھے اور پیش کئے۔ مگر
زمانہ با تو نہ سازد کے مصداق دستبردِ زمانہ نے ان کی جدتوں کو نہ چھوڑا۔ نانی
کمپنی ٹوٹ گئی اور پھر وہ دوسرے سرمایہ داروں کی جاگیر بن کر رہ گئے۔ نہ اب ان
ناٹک میں بعض پرانے ڈرامہ نگاروں نے ہندی کا رواج شروع کیا مقصد
حشر کو نیچا دکھانا اور ساتھ ہی اردو کو زک پہنچانا تھا لیکن حشر کے سامنے
ان کا جادو نہ چل سکا اور آغا صاحب نے ہندی میں فصاحت و بلاغت
اور شیریں بیانی کے وہ جوہر دکھائے کہ مخالف بھی لوہا مان گئے۔
بلوا منگل سے لے کر آنکھ کا نشہ۔ بن دیوی۔ مدھر مرلی۔ دھرمی

بانٹ۔ شیوں کی سہاری پانک۔ سیتا بن باس بعد عشقیہ پرتگیا ناٹک حشر
جیسا جاگتا مجسمہ ہندوستان میں نظر آتا ہے۔ جن میں صرف ہندی زبان کی خوبیاں
ہی نہیں بلکہ ہندو تہذیب و تمدن کی وہ معلومات اور عظمتیں بھی تابندہ ہیں
جن سے حشر کی ہمہ گیری اور غیر معمولی لیاقت کے کمالات نمایاں ہوتے ہیں۔
مختصر یہ کہ حشر نے بڑی حد تک ہمارے اسٹیج کی اصلاح کی پھر بھی ان کو قابل
طیبان دور نہ ملا کہ ناٹک کو حسب منشا سنجیدگی کے ساتھ ترقی یافتہ شکل میں
پیش کر سکتے۔ مستقل باقاعدہ زمانے سے بہتر طور پر بچا لیتے۔ تہذیب و تمدن اور
علم و ادب کے عروج کا زمانہ آیا تو پہلے ہمارا اسٹیج ختم ہو چکا تھا۔ اس کی جگہ
سکرین نے لینا شروع کر دی تھی اور جب حشر نے سکرین کی طرف توجہ کی تو ظالم
موت نے حیات حشر پر خاتمہ کا پردہ گرا دیا۔ اس لئے آغا صاحب کے کمالات
فن کے پورے جوہر پوری طرح واضح نہ ہونے پائے۔

آغا صاحب کی زندگی نے وفا نہ کی اور جب نئے ترقی یافتہ دور۔ نئی فنی
تدبیریں نمودار ہوئیں تو وہ پردۂ قضا میں روپوش ہو گئے۔ وہ نہ فلمی دنیا اور ہمارا فنیا
اسٹیج (اگر آج کوئی ہوتا) ضرور ان کے فنی کمالات کی تجلیوں سے جگمگا جاتا۔

آغا صاحب مرحوم نے متکلم فلموں کے اس دور عظیم میں جلوہ گر ہوتے ہی
اسٹیج کی کس مپرسی کو بھانپ لیا تھا۔ اور اسکرین کے لئے پہلے شیریں فرہاد
پھر عورت کا پیار اور کچھ عرصہ بعد یہودی کی لڑکی۔ مشرقی حور۔ قسمت
کا شکار۔ چندی داس۔ دل کی آگ۔ بھگت کبیر۔ فلمی ڈرامے لکھے جن میں
اکثر کامیاب ہوئے۔ عورت کا پیار خصوصیت سے ان کی جدت طرازیوں
کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ جس میں انہوں نے خود ہدایت کاری کے جوہر بھی دکھائے اور فنی تکنیک
کو ایک نئے روپ میں پیش کیا۔ بھگت کبیر۔ چندی داس۔ اور یہودی کی لڑکی
نے بھی پردۂ سیمیں کو خاص انداز میں جگمگا دیا۔ ۱۹۲۹ء میں آغا صاحب کی
صحت بہت زیادہ خراب ہونا شروع ہوئی۔ دراصل ان کی صحت ۱۹۱۶ء
ہی میں اعتدال سے گرنا شروع ہو گئی تھی۔ جب کہ انہوں نے اپنی اہلیہ کی وفات
کا صدمۂ عظیم اٹھایا تھا۔

اس حادثہ کی یاد میں ایک نظم لکھی تھی جس کا اثر نثر و نظم میں تھا افسوس
کہ یہ نظم ان کے قلبی دوست حضرت تپش مرحوم کے ساتھ دفن ہو گئی اور شائع
ہو کر منظر عام پر نہ آسکی۔ آغا صاحب اس صدمے سے بے حد متاثر ہوئے
اور کئی سال تک تصنیف و تالیف کی طرف پوری توجہ نہ کر سکے۔ مگر
احباب کے اصرار و تقاضے نے انہیں ابھارا اور ۱۹۳۴ء تک حشر کا دیوان
کمال اور بہت سے نوحے منصۂ شہود پر آ گئے۔

۱۹۳۴ء میں جبکہ اپنے مشہور و معروف غیر فانی شاہکار "رستم و
سہراب" کو فلمانے کا انتظام کر رہے تھے اور "بھیشم پرتگیا" کی فلمبندیوں میں بھی مصروف
تھے گری ہوئی صحت نے روز بروز خرابی کے آثار دکھائے۔ ان دنوں آغا صاحب
مرحوم شب و روز کی محنت، جسمانی و دماغی مشقت کے باعث ایسے علیل
ہوئے کہ سنبھلنے کی امید نہ رہی۔ آخر اپنے محب رفیق شفاء الملک حکیم فقیر محمد
چشتی مرحوم کے علاج کی غرض سے لاہور آ گئے۔ وہ عرصے سے شراب نوشی سے
تائب تھے۔ اس زمانہ میں بعض احباب نے اصرار کیا کہ صحت و سلامتی کے
لئے دوا کے طور پر مے نوشی شروع کر دیں مگر ان کی غیور طبیعت نے توبہ
پر قائم رہنا ہی گوارا کیا۔ اور آخر رفتہ رفتہ بستر مرگ پر پڑ گئے۔ "لاہور کے
قیام میں ۲۸ اپریل ۱۹۳۵ء کو ساڑھے چھ بجے شام کے وقت آفتاب
غروب ہو گیا۔ اور اس طرح اس صاحب کمال کی زندگی کے ناٹک کا آخری
باب ختم ہوا۔"

آغا صاحب مرحوم صدر جہ غیور طبع، دوست نواز۔ با مروت
اور ملنسار انسان تھے۔ ان کی تحریر و تقریر دونوں میں یکسانیت تھی۔ اسی
طرح طبیعت بھی ہموار پائی تھی۔ جو دل میں تھا وہی زبان پر۔ زمانہ سازی سے
ہمیشہ نفرت رہی۔

شعر و ادب کے عاشق زار اور علمی مذاکرات کے شیدائی تھے۔
جس موضوع پر کسی محفل یا صحبت میں گفتگو چھڑ جاتی آغا صاحب کی شگفتہ
بیانی معلومات کے دریا بہا دیتی۔ عام گفتگو کے دوران میں ان کی بذلہ سنجی اور
لطیفہ گوئی لطف و کیف کا محشر بپا کر دیتی تھی۔

آغا صاحب مرحوم کی شعر گوئی کا انداز بھی ڈرامہ نگاری کی طرح
بڑی حد تک جداگانہ تھا۔ غزل اور نظم دونوں پر یکساں قدرت تھی اور
ہندی گانوں کا تو جواب ہی نہیں۔ شاعری کا موضوع خاص فلسفۂ جمالیات
ہے جو ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے۔ انداز بیان سلیس شستہ اور دلکش
ہے۔ جو ناٹک کی غزلیات کے علاوہ عام طور پر ان کی غزلیات اور نظم
دونوں میں یکساں رہا ہے۔

آغا صاحب مرحوم حاضر جوابی اور بدیہہ گوئی کے بادشاہ تھے۔

بات بات میں برجستہ لطائف و ظرائف بیان کرتے اور فلسفیانہ طبیعت کے مطابق ہر موقع محل پر فلسفہ کے نکات حل کرتے نظر آتے۔ یہ خاصہ نہ صرف تحریر میں ہی پایا جاتا ہے بلکہ تقریر اور گفتگو دونوں میں تھا۔ فنِ ڈرامہ کی مہارت اور تبلیغی سرگرمیوں نے خطابت کے فن میں کامل بنا دیا تھا۔ لاہور اور امرتسر میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں کئی بار آغا صاحب نے ہنگامہ خیز تقریریں کیں اور نظمیں پڑھیں۔ "شکریہ یورپ" اور "نوحۂ زمزم" قوم کے مشہور اور غیر فانی شاہکار ہیں۔ ان کے علاوہ ایک بار امرتسر کے اجلاس میں شرکت کا وعدہ کر کے بھول گئے۔ اسی روز شام کو یاد آیا۔ جس دن انہیں امرتسر پہنچ کر نظم پڑھنی تھی۔ شیخ عبداللطیف تپش مرحوم کے اصرار اور ایفائے وعدہ کے خیال سے (کیونکہ مرحوم وعدہ خلافی گناہ سمجھتے تھے) شام کی گاڑی سے روانہ ہوئے۔ راستہ میں تپش مرحوم نے کہا "آغا صاحب نظم کا کیا ہوگا؟" بولے! "لکھو! پڑھ دوں گا" تپش صاحب نے بیاض اور پنسل سنبھالی اور کہا "فرمائیے!" آغا صاحب نے مسکرا کر تپش صاحب سے کہا۔ "آپ ہی فرمائیے"۔ اور پھر سوچ کر گنگنانے لگے۔ اور قدرے بلند آواز سے تپش صاحب کو ایک بند سنایا۔ انہوں نے لکھ ڈالا اب کیا تھا بند پر بند ہونے لگے۔ تپش صاحب کو لکھنا دوبھر ہو گیا۔ جب تک گاڑی امرتسر پہنچے خاصی طویل نظم ہو چکی تھی۔ امرتسر کے اسٹیشن پر استقبال کے لئے انجمن کے اراکین موجود تھے۔ وہاں سے سیدھے جلسہ میں پہنچے اور شرکت کی۔ نظم پڑھی اور حسب معمول انتہائی کامیابی کے ساتھ دھوم دھام سے سنی گئی۔ اسی طرح ان کے مخصوص احباب بیٹھے بیٹھے طویل نظمیں اور غزلیں فی البدیہہ کہلا لیتے۔ اور ان کے حافظہ کا یہ عالم تھا۔ کہ ایک بار کہنے کے بعد پوری نظم یا غزل زبانی یاد رہتی۔

مولانا تاجور نجیب آبادی کی موجودگی میں بھی ایک واقعہ اسی قسم کی بدیہہ گوئی کا ہوا۔ ایک دن آغا صاحب مرحوم تاجور صاحب کے مکان پر ان سے ملنے گئے ہوئے تھے۔ شعر و شاعری کے تذکرہ میں مولانا حسرت موہانی کی غزل کا مصرع

قیامِ بلبلِ مجبور رحمِ باغباں تک ہے

زیر بحث آگیا۔ اس مصرع کی آغا صاحب نے بہت تعریف کی اور اس زمین میں غزل کہنے کا ارادہ کیا۔ مولانا نے کہا "بسم اللہ" اور ساتھ ہی ایک شعر بھی کہا ؎

بتائیں کیا تجھے خود رفتگانِ بے خودی ہمدم
خیالِ یار کا دامن کہاں سے ہے کہاں تک ہے

بس آغا صاحب کے لئے فی البدیہہ غزل کہنے کو اشارہ کافی تھا۔ کوئی دس منٹ میں آٹھ دس شعر کی غزل کہہ دی اور غزل بھی وہ غزل جس کا ہر شعر لطف و اثر اور لطیف جذبات میں ڈوبا ہوا ہے ؎

کشاکش زندگی کی ارتباطِ جسم و جاں تک ہے
یہ سب ہنگامۂ محفل ہماری داستاں تک ہے

خبر ہے خشک ہو جائیں نہ آنسو سوزشِ دل سے
تراحم گل بداماں دیدہ ہائے خونچکاں تک ہے

مٹا دے دل کو دل کی لذتِ ایذا نہ مٹنے دے
ہجومِ کاروانِ شوق اس جنسِ گراں تک ہے

لہو ہو جائے دل گھٹ گھٹ کے پر آنسو نہ ٹپکیں گے
کریں گے ضبطِ مجبورِ ستم طاقت جہاں تک ہے

نہ میٹ اس کو یہی ہے درسِ آموزِ وفاداری
تپش آمادہ دنیا اس دلِ آتش بجاں تک ہے

یہی آگر لبِ شاعر پہ شعرِ گرم بنتا ہے
وہ سوزِ زندگی جو شعلہ زن دل سے زباں تک ہے

آغا صاحب کے حسنِ تغزل پر جو تبصرہ جناب چراغ حسن حسرت نے کیا ہے اس کا ایک لفظ صحیح نکلتا ہے۔ یعنی "آغا صاحب کو قدرت نے تغزل کا خاص ذوق عطا کیا تھا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ان کی غزلیں نشاط و سرمستی کا سرمایہ دار ہیں"۔

حشر دراصل ایک فطری شاعر اور فنکار تھے۔ اور ان کی زندگی کا ہر پہلو اور اس کا ہر واقعہ فنی نکات کا حامل تھا۔ وہ خوش طبع، وسیع المطالعہ اور کثیر الاحباب تھے۔ ہمیشہ شگفتہ و فرحاں رہتے۔ اور مصائب کو بھی ہنس کھیل کر گزارنے کے عادی تھے۔

لاہور میں ان کے بے تکلف احباب کی تعداد نسبتاً زیادہ تھی جن میں بعض خاص اور مخلص دوست تھے۔ آغا صاحب پہلی بار جب لاہور آئے تو چند حضرات نے استقبال کا اہتمام کیا۔ اور جلسہ عام منعقد کیا گیا۔ گرمی کا موسم تھا شام کو جس مقام پر جلسہ کا انعقاد تھا پنڈال ...

سے کہا گیا تھا مجمع ہو چکا تھا۔ وقتِ مقررہ پر آغا صاحب کسی خاص سبب سے
نہ آسکے۔ یہاں تک کہ کافی دیر ہو گئی۔ مجمع میں انتظار کے سبب بے چینی شروع
ہوئی اس جلسہ میں علامہ اقبال علیہ الرحمۃ بھی تشریف فرما تھے۔ جو نہایت
خاموشی سے حاضرین کی نشستوں میں ایک جانب گوشہ میں بیٹھے تھے۔ مجمع
مضطرب تھا اور تاخیر کے سبب شور مچانے لگا تھا۔ بہت دیر بعد آغا صاحب
تشریف لائے وہ سبزہ سرخ رنگ کا تہمد باندھے تھے ململ کا کرتہ تھا۔ سر پر ٹوپی
تھی۔ مجمع میں پہلے ہی گرمی تھی کہ سبب ادھ جلسہ کی کاروائی میں تاخیر ہو جانے سے کچھ
برہمی سی پیدا ہو چلی تھی۔ عوام نے آغا صاحب کو پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اب جو اس
لباس میں دیکھا تو چند منچلے لوگوں نے تہمد پر آوازے کسے۔ آغا صاحب
ڈائس پر آگئے۔ جلسہ کی کاروائی شروع ہونے سے پہلے انہوں نے حاضرین کو
مخاطب کر کے تاخیر کی معافی چاہی لیکن شور اور بھی بڑھ گیا۔ اور کسی نے کہا کہ
رستمی۔ علم مجالس میں ہر طبقہ اور خیال کے لوگ ہوتے ہیں چند آوازیں آئیں
"ہم ایسے مسخرے کا استقبال نہیں کرتے" "ہم ایسے حشر کا کیا کریں" صدر اور
منتظمین جلسہ نے ہر چند مجمع کو خاموش کرنے کی کوشش کی اور منت سماجت
سے شور و غل پر قابو پانا چاہا۔ مگر بے سود۔ حضرت علامہ اقبال جو اب تک خاموش
اپنی نشست پر تشریف فرما سب کچھ دیکھ رہے تھے عالمِ اضطراب میں کھڑے
ہو گئے۔ اور ڈائس پر پہنچ کر ہاتھ کے اشارے سے مجمع کو مخاطب کیا۔ پُر شکوہ آواز
گونجی —— ! صاحبو —— ! ے

شعر ایسا ہے کہ قصابوں کی ہو جیسے بات
آئیے لاہور کے لوگوں کی محفل دیکھئے

اس کے بعد جو سکتہ طاری ہوا تو معلوم ہوتا تھا کہ اس ہزاروں کے مجمع میں ایک
شخص بھی سانس نہیں لے رہا ہے۔ اور حضرت علامہ ایک طرف پھر خاموشی سے بیٹھ گئے
جلسہ شروع ہوا صدر نے حشر مرحوم کا تعارف کرایا اور حشر کی تقریر شروع ہوئی۔
انہوں نے حاضرین سے خطاب کیا۔ اس لباس کیلئے معذرت طلب کی۔ ان کے ابتدائی
فقرے تھے "حضرات مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے مجالس کے آداب سے ابھی
اجنبی ہونے کے سبب واقف نہ تھا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ حشر تہمد میں بھی آ
سکتا ہے" اور اس کے بعد جو فصاحت و بلاغت، تشبیہ، استعارہ کے دریا بہائے
ہیں۔ کہ ہر نکتہ پر لوگ عش عش کرنے لگے۔ اور حشر کا ہوتے پوری طرح متاثر و
متکیف ہو کر حشر کی شخصیت سے متعارف ہو گئے۔ یہ لاہور کی پہلی مجلس تھی

جہاں حشر مرحوم کا تعارف ہوا تھا اس کے بعد حشر کو لاہور نے اور لاہور کو حشر نے
ایسا اپنایا کہ مرحوم جب بھی دنیاوی ہنگاموں سے گھبرا کر سکون و اطمینان اور
آرام کی زندگی گزارنا چاہتے تو لاہور آ کر دم لیتے حتی کہ ان کی آخری آرامگاہ
بھی لاہور کی مردم خیز سرزمین ہی بنی۔

حشر کے فنی کمالات پر ان کے واقف حضرات نے بیشمار تبصرے کئے
ہیں لیکن مولانا ظفر علی خاں کے مختصر الفاظ سب پر حاوی ہیں فرماتے ہیں
"خوشا نصیب سرزمین پنجاب کہ تیرے ذروں سے ایک ایسی باکمال
ہستی عالمِ وجود میں آئی کہ جس نے دنیائے علم و ادب میں تلاطم برپا کر دیا۔
زمانہ کی مخالف ہوائیں مکدر فضائیں دنیا کے خود غرض اور حاسدانہ احباب حشر
کی دنیائے شہرت و زندگی کو پامال و برباد کرنے کیلئے ہر چہار طرف منڈلا رہے
تھے۔ مگر حشر کی تخیلات کی جدت طرازیاں حشر کو آسمان پر پہنچا گئیں۔ وہاں لے
گئیں جہاں ہندوستان کا کوئی شاعر کوئی ڈرامہ نویس دورِ ماضی و حال میں
نہ پہنچا تھا اور نہ پہنچا ہے۔ آئندہ کا حال خدا بہتر جانتا ہے۔"

یہ کہنا کہ حشر نے شکسپیئر کے گلشنِ ادب سے خوشہ چینی کی حشر کی علمی
قابلیت پر ایک بدنما داغ لگانا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے۔ کہ حشر نے شکسپیئر
کے نامکمل مقاصد کو کامیاب بنا دیا۔ جس منزل کو شکسپیئر طے نہ کر سکا حشر نے
اس کی دشواریوں کو طے کر کے بعد میں آنے والوں کے لئے ایک عام راستہ بنا دیا۔

حقیقت میں حشر نے غیر فانی شہرت حاصل کی وہ صرف ایک بلند پایہ ڈرامہ
نویس ہی نہ تھے بلکہ ایک فلاسفر، ایک شاعر، ایک مصور جذبات، ایک ادیب
جلیل بھی تھے۔

حشر ایک اعلیٰ فنکار ہونے کے ساتھ اخلاق کا مجسمہ، انسانیت کا پتلا، اور شرافت
کا منبع بھی تھے انکے انہی خصائص اور لطافت کیلئے ایک دفتر چاہیئے۔ نا قدر
شناس ملک میں دولتمند سیٹھوں نے بھی حشر کی جو قدردانی کی اور جو گرانقدر
رقم ان کے کمالِ فن کی نذر کی گئیں کسی دوسرے فنکار کو یہ آج تک تھیٹر کی دنیا
میں نصیب نہ ہوئیں۔ حشر کے تھیٹریکل ڈراموں میں حرفِ آخر
"رستم و سہراب" کو سمجھنا چاہیئے۔ ان کے کئی ڈرامے ابھی تک
غیر مطبوعہ ہیں۔ اور کلام کا بہت سا حصہ ابھی تک شائع نہیں ہوا۔
دیکھنا ہے خدا یہ توفیق کسے اور کب دیتا ہے کہ آغا حشر مرحوم کے مکمل سوانح حیات
اور کلام نثر و نظم کی اشاعت کا اہتمام ہو۔

سلیم چودھری

# جمہوری چین کا ادب

چینی عوام کی تحریک آزادی روز بروز ملک کے وسیع علاقوں میں بڑھتی جا رہی ہے۔ چین میں جو واقعات ظہور پذیر ہو رہے ہیں، وہ ایک تاریخی حیثیت کے حامل ہیں۔ یہ بالکل عیاں ہے کہ کومنتانگ حکومت اب اپنے آپ کو کسی صورت میں بھی بچا نہیں سکتی چاہے وہ کتنی ہی مہلک جنگ کا سہارا لے —— امریکن سرمایہ دار جو زوال آمادہ کومنتانگ حکومت کو آڑ بنا کر مشرق بعید پر غاصبانہ قبضہ جمانا چاہتے ہیں وہ بھی اب اس کی ڈوبتی کشتی کو نہیں بچا سکتے

کروڑوں محنت کش چینی عوام اپنے علاقے میں ایک جمہوری حکومت تشکیل دے رہے ہیں۔ آزاد علاقوں میں جاگیرداری اور استبدادیت کو نیست و نابود کر کے جمہوری گورنمنٹ نے محنت کش طبقہ کے لئے ایک نیا نظام قائم کیا ہے۔ جس کی اساس حق و انصاف پر رکھی گئی ہے۔ کسان جن کے لئے نئی حکومت برسر پیکار ہے۔ عوامی فوج میں دھڑا دھڑ شامل ہو رہے ہیں۔ اور اس فوج کی کامیابیاں اس دن کو قریب سے قریب تر لا رہی ہیں جب تمام چین متحدہ جمہوریہ ہو گا۔

۱۹۴۲ء میں جب ابھی جاپان کے ساتھ جنگ جاری تھی تو چین کے عوامی لیڈر ماؤ زے تنگ نے ایک دفعہ خیال ظاہر کیا تھا کہ تہذیبی محاذ قوم کی جدوجہد آزادی میں اسی قدر اہم ہے جس قدر جنگی محاذ۔ اس مدت میں اس تہذیبی محاذ کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے —— خاص طور پر ادب کی اہمیت۔ آزاد علاقے میں روز افزوں ترقی پر ہے —— یہ ادب عوامی جدوجہد آزادی کی عکاسی کرتا ہے۔

"اکتوبر کا عظیم سوشلسٹ انقلاب" چین کے محنت کش طبقہ میں قومی احساسات کی تخلیق کے لئے ایک تازیانہ کا حکم رکھتا ہے۔ اسی انقلاب نے ان کو دنیا کی استبدادی طاقتوں کے خلاف مجتمع کیا تھا۔

استبداد پرست طاقتوں کے خلاف چینی عوام میں پھیلنے والی تحریک کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ روزمرہ کی زبان کو ایک نئے سانچے میں ڈھال کر اسے "پائی ہوا" کے نام سے پکارا جانے لگا۔ اور اسے ادبی زبان تسلیم کیا گیا۔ یہ تبدیلی جو چینی کلچر کے لئے ایک اہم حیثیت رکھتی ہے۔ ۱۹۲۰ء میں واقع ہوئی۔ لوہسون، "کو مو جو"، "مو تون" جیسے مشہور ادیبوں اور طالب علم ادیبوں نے اسی زبان میں لکھنا شروع کر دیا۔ متعدد رسائل و جرائد اور یورپی زبانوں کے ترجمے "پائی ہوا" میں شائع ہونے لگے۔ اس تبدیلی کو ادبی انقلاب کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس ادبی انقلاب نے ایک ایسے جمہوری ادب کا راستہ کھول دیا جو عوام کے لئے قابل فہم تھا۔

۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۹ء تک غیر ملکی ادب کے ترجمے کثرت سے شائع ہوئے۔ ان تراجم میں روسی ادب کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ چینی قارئین کی بہت بڑی تعداد گورکی، چیخوف، ٹالسٹائی، پشکن، دستوئیفسکی، گوگول اور کورولنکو سے متعارف ہو گئی۔ ملک میں بہت تھوڑی تعداد ایسی تھی جسے روسی زبان پر عبور تھا۔ یہی وجہ تھی کہ تراجم عموماً اصل سے مختلف ہوتے تھے۔ تاہم انہوں نے چینی قارئین کو کلاسیکل اور انسان دوست روسی ادب سے متعارف کیا۔ چین میں کوئی بھی ایسا مصنف نہیں ہے جس نے 'روسی ادب کے ترجمہ کا کام نہ کیا ہو'۔ ۱۹۴۰ء میں کاؤ مو جو نے لکھا کہ اس ملک میں کہانی لکھنے کے فن کو صحیح روپ میں ڈھالنے میں روسی ادب اور روسی آرٹ کا بہت زیادہ ہاتھ ہے۔ روسی

ادیبوں کے بہترین سرمایۂ ادب کو چینی زبان میں منتقل کیا گیا۔ نئے ادب کے مشہور ادیب لوہسون کے متعلق جب کبھی چینیوں میں بحث مباحثہ ہوتا ہے تو وہ اسے فخریہ انداز میں "چینی گورکی" کے نام سے پکارتے ہیں۔ لوہسون نے ایسے مبہم خیالات کے تحت جو چینی عوام کو جاگیرداری ظلم اور سرمایہ داری سے نجات دلا کر آزادی کی راہ پر چلانے والے تھے، لکھنا شروع کیا۔ اس کے ان مبہم اور غیر واضح خیالات کو روس کے سوشلسٹ انقلاب نے صحیح راستہ سمجھایا۔ لوہسون کے ادب میں سوویٹ یونین کے ادب کا عکس نمایاں نظر آتا ہے۔ اس نے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے گورکی کو اپنا بہترین راہ نما تصور کیا ہے۔

کو۔مو۔جو نے ایک دفعہ کہا تھا کہ گورکی کی شخصیت کا ذاتی اثر اس کے ادبی اثر سے زیادہ نمایاں ہے۔ چینی ادیب اس کی عزت کرتے ہیں۔ اس سے محبت کرتے ہیں۔ اور اس کے معتقد ہیں۔ اس کی زندگی سراپا پاکیزگی اور فضیلت ہے۔ اس لئے ہم دل سے اس کی تعریف کرتے ہیں۔ اس کی تصنیفات اور تخلیقات زبان زد خاص و عام ہیں۔ خاص کر وہ تصنیفات اور تخلیقات جو ادب پر لکھی گئی ہیں۔ چین پر گورکی کا اثر ہمہ گیر ہے۔ چینی مصنفوں نے اسے زندگی اور فن کے راہبر کے طور پر اپنایا ہے۔ ہم نے اس سے صرف اتنا ہی نہیں سیکھا کہ کیسے لکھنا چاہیے اور کیا لکھنا چاہیے۔ بلکہ اس نے ہماری اس مقصد کی طرف بھی راہنمائی کی ہے جس کے لئے زندگی بسر کی جانی چاہیے۔ چینی ادب کی طویل تاریخ میں ایسا کوئی چینی ادیب نہیں تھا جس نے چینی ادیبوں کو گورکی جتنا متاثر کیا ہو۔"

روسی ادب کی کوئی بھی اہم کتاب ایسی نہیں کہ جس کا ترجمہ نہ کیا گیا ہو۔ اور جس نے ترقی پسند حلقوں کے تخیلات کو نئے سانچوں میں نہ ڈھالا ہو۔ ماؤ۔تن۔ اپنے ایک مضمون میں لکھتا ہے "سوویٹ ادب آہنی عزم لوگوں کی تصویر کشی کرتا ہے۔ اور ان لوگوں کے متعلق بتاتا ہے جو اپنی قسمت آپ بناتے ہیں۔ اور انسانیت کے لئے زمین پر جنت کی تخلیق کرتے ہیں۔ انسانیت کو فاشستوں سے بچاتے ہیں اور اس طرح تاریخ کو ارتقائی منازل میں سے گذارتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح سچائی ہماری آنکھوں کے سامنے زندہ تصویر کی صورت میں جلوہ نما ہوتی ہے اور ہمارے دلوں میں ہمت بڑھتی ہے۔

جنگ جاپان کے اختتام پذیر ہونے سے کچھ عرصہ پیشتر ماؤ۔تن لکھتا ہے "دن چڑھ آیا۔ لیکن ابھی تک ظلم کے گھناؤنے بدستور ہمارے اردگرد حلقہ کئے ہوئے ہیں۔ ترقی پسند چین ان ظلمات کی طاقتوں کے خلاف جن کا انتظام رجعت پسند کومنتانگ حکومت کے ہاتھوں میں ہے اور جن کی پشت پناہی امریکن سرمایہ دار کر رہے ہیں جدوجہد کر رہا ہے۔ آزادی کی عوامی فوج ملک کی حفاظت کے جذبے سے سرشار ہو کر کومنتانگ فوج پر حملے کر رہی ہے۔ سوویٹ ادب ہمارے خوابوں کو حقیقت کے روپ میں پیش کرتا ہے۔ اور ہماری فتح کے یقین کو محکم تر کرتا ہے۔

لوہسون جس کا سن وفات ۱۹۳۶ء ہے ایک صاحب طرز ادیب اور نئی عوامی زبان "پی ہاؤ" میں لکھے ہوئے نئے ادب کا جنم داتا ہے۔ بہت سی خصوصیات اور بسیط علمیت کا حامل تھا۔ اس نے زندگی کا گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ اور اسے عوام سے انتہائی محبت تھی۔ اس نے دنیا کے سامنے چینیوں کی تصویر پیش کی۔ جو اس سے پہلے چینی ادب میں مفقود تھی۔ اس نے چینی ادب کو ایک نئے ہیرو سے روشناس کرایا ——— اس ہیرو سے جو عوام میں سے تھا ——— وہ انسان جو اس سوشل نظام تلے دبا ہوا تھا اور جسے لوہسون اپنی کہانیوں کے زور سے بدلنا چاہتا تھا۔

لوہسون کی بہترین کتاب جو چینی ترقی پسند ادب کی نشوونما کے لئے بہت بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کتاب میں ایک مزدور کسان کی زندگی کی صحیح تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس مزدور کسان کا نہ کوئی گھر تھا اور نہ کوئی خاندان حتیٰ کہ اس کا اپنا کوئی نام تک نہ تھا۔ یہ شخص بیحد غریب تھا۔ اس کی گاؤں میں کوئی وقعت نہ تھی۔ گاؤں والے اپنا حق سمجھتے تھے کہ اسے حقیر جانیں اور اس پر حکم چلائیں۔ یہ لوگ خود بھی غریب تھے اور طلوع سحر سے غروب آفتاب تک جان توڑ کر محنت کرنے کے باوجود پیٹ بھرنے کا سامان پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ دراصل

یہ تمام لوگ خود اس گاؤں کے فرمانروا چاؤ کی غلامی میں پھنسے ہوئے تھے۔

۱۹۱۱ء کا انقلاب برپا ہے "تیفیو" خاندان کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا گیا ہے اور اس کی جگہ ایک ریپبلک گورنمنٹ قائم ہو گئی ہے جس کا صدر ایک بہت بڑا رجعت پسند فوجی "یان شکائی" ہے۔ گاؤں کے آزاد خیال اور روشن دماغ لوگوں نے انقلاب برپا کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے اور "چلیو" کی غلامی کے جوئے کو اتار پھینکا ہے۔ وہ مزدور کسان ان کا رہبر ہے۔ اس خوف و ہراس کے زمانے میں گاؤں کے معزز "چاؤ سنگ" نے اسے محترم کے خطاب سے نوازا ہے۔ باوجود اتنا کچھ ہونے کے بھی اس انقلاب نے کوئی نمایاں تبدیلی پیدا نہیں کی ہے پرانے افسر ہی ضلعوں کے گورنر بن گئے ہیں! اور تبدیلی ہوئی ہے تو صرف یہ کہ انہوں نے اپنے لقب تبدیل کر لئے ہیں۔۔

ناول کے اختتام پر مزدور کسان ڈاکہ زنی کے شبہ میں پکڑا جاتا ہے حالانکہ اس نے اس میں کوئی حصہ نہ لیا تھا لیکن پھر بھی اسے پھانسی کی سزا دی جاتی ہے۔ وہ فرطِ خوف سے عدالت میں گھبرا گیا ہے اور بوڑھے جج کے سوال کو نہیں سمجھ سکتا جب اسے پھانسی کی طرف لے جاتے ہیں تو وہ محسوس کرتا ہے کہ اب اسے کوئی نہیں بچا سکتا۔ لیکن نہ تو وہ بڑبڑاتا ہے اور نہ برہم ہوتا ہے۔ کیونکہ اسے یہ سب کچھ محسوس کرنے کا حق کبھی بھی نہ تھا۔ اس کے متعلق لوگوں کی رائے بھی یہی تھی جو اس کی سزا سے عیاں تھی ــــــ یعنی وہ مجرم سمجھا گیا۔

ایک ایسے شخص کے بارے میں جسے کوئی شخص بھی منہ لگانا پسند نہ کرتا تھا۔ اس کے بیٹے لوہسون کے ناول میں ہمدردی کی ایک لہر پائی جاتی ہے۔ اس ناول نے چین کے جاگیرداری نظام کی خدمت کی ہے۔ چینی ادب کی پرانی روایات میں ایک انقلاب برپا کیا۔ اس کتاب کے چھپتے ہی رجعت پسندوں نے اس کے خلاف احتجاج کا طوفان برپا کر دیا لیکن خلاف اس کے ترقی پسند حلقوں نے اس کا پرجوش استقبال کیا۔

"ہمیں عوام کے رومانی میلانات میں ایک ہمہ گیر تغیر پیدا کرنا ہے" یہ لوہسون کا عقیدہ تھا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ زندگی کو اصلی روپ میں پیش کیا جائے۔ تاکہ اس کی اصلاح ہو سکے۔ اس کی تمام تصانیف میں ہم ایک خوشگوار مستقبل کی امید نمایاں طور پر محسوس کرتے ہیں۔ اپنی کتاب "میرا وطن" میں وہ ایک جگہ لکھتا ہے کہ "یہ خواب ایسے نہیں جن کی تعبیر آج ہی سامنے آ جائے۔ اور نہ ہی ایسے ہیں کہ جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکیں۔ زمین پر سڑکیں خود بخود نہیں وجود میں آ جاتیں بلکہ جب بہت سے لوگ مل کر کہیں سے گزرتے ہیں تو سڑک اپنے آپ تعمیر ہو جاتی ہے۔"

جس وقت سے لوہسون نے اپنی کتابوں میں ایک عام انسان کو ہیرو کے کردار میں پیش کرنا شروع کیا یہ ہیرو اس وقت سے ادب اور زندگی دونوں میں بتدریج ارتقائی مراحل طے کرنے لگا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا چینی عوام میں قومی شعور ابھرتا گیا۔ ماؤ زے تنگ لکھتا ہے "لوگوں میں جو بیداری پیدا ہوئی اس کی دو وجہیں تھیں ایک تو جاپان کا حملہ اور دوسری کومنتانگ حکومت"

جاپان کی جنگ کے دوران میں ایک بڑی اچھی ادبی تخلیق پاؤ۔سی۔ین کی کہانی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ گوریلا فوجوں نے ایک کسان کو گرفتار کیا جس کے ہاتھ میں جاپانی جھنڈا تھا اور وہ ایک ایسے گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ جو جاپانیوں کے قبضہ میں تھا۔ اس نے جب گوریلا فوجیوں سے جاپانیوں کے ظلم و ستم کے متعلق سنا تو وہ حیران رہ گیا۔ کئی باتیں تو اس کی سمجھ میں بھی نہ آئیں۔ آج تک جاپانیوں کے لئے اس کی زبان پر نفرت کا ایک لفظ تک نہ آیا تھا وہ جاپانیوں اور چینیوں میں سوائے اس کے کہ جاپانی شمالی فوجی اور چینی جنوبی فوجی ہیں اور کوئی فرق نہ سمجھتا تھا۔ لیکن جونہی وہ حالات کو ان کے اصلی رنگ میں دیکھتا ہے تو وہ گوریلوں کے ساتھ مل جاتا ہے اور فخریہ انداز میں پکار اٹھتا ہے۔ "میں چینی ہوں میں غدار نہیں ہو سکتا۔" پاؤ۔سی۔ین کی کہانی کے کسان اور لوہسون کے ناول کے ہیرو سے تعارف ہونے کے بعد ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ چینیوں نے کیسے ترقی کی۔ لوگوں کے انقلابی اقدامات کو ادب میں سمونا چینیوں کے جذبۂ حب الوطنی اور ہمت کے لئے ایک مہمیز ثابت ہوا۔

ان ادیبوں کے علاوہ جنہوں نے انتہائی شہرت پائی۔ آزاد علاقوں کے مختلف رسائل و جرائد میں ابھرتے ہوئے نئے ادیبوں کے مضامین

کہانیاں چینی لوگ چاہے وہ مزدور ہوں، کسان ہوں۔ یا روشن خیال افراد۔ سب کے سب ادب اور آرٹ میں بے انتہا دلچسپی لیتے ہیں۔

مجلہ "نارتھ ایسٹرن لٹریچر" دو سال سے مُکڈن یا کے اُن کے علاقوں سے شایع ہو رہا ہے اس کے ادارۂ تحریر میں بڑے بڑے اہل علم اور ترقی پسند ادیب شامل ہیں۔ وہ قارئین کے سوالات کے جواب اور مختلف مضامین ادب کی اہمیت کی وضاحت کے لیے شائع کرتے رہتے ہیں۔ وہ زندگی کے ساتھ ادب کے تعلق پر روشنی ڈالتے ہیں اور اسے واضح کرتے ہیں۔ اس رسالے میں مختلف نئی نئی کتابوں پر تبصرے بھی شایع کئے جاتے ہیں

مزدور اور کسان جو جاپانیوں کے خلاف جنگ میں حصہ لے چکے ہیں اب آزادی کی عوامی فوج میں شامل ہو کر کومنتانگ حکومت کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ ان سب کرداروں کو ہم ان کہانیوں میں دیکھ سکتے ہیں جو ان دونوں طرز نو پر لکھی گئی ہیں۔ جاپان کی جنگ کے دوران میں ماؤزے تنگ نے کہا تھا ہم چاہتے ہیں کہ ادب انقلابی نظام کا ایک اہم حصہ ہو۔ ہماری خواہش ہے کہ وہ عوام کو زیادہ علم سے آشنا کر سکے ان میں اتحاد پیدا کر سکے اور دشمنوں کے خلاف ایک ایسا ہتھیار ثابت ہو جو ان کو ختم کر سکے۔ جب سے ترقی پسند طاقتیں ان رجعت پسندوں کے خلاف صف آرا ہوئی ہیں جنہوں نے ملک کو امریکن شہنشاہیت کے ہاتھوں بیچ دیا ہے۔ ادب کی اہمیت ہر لمحہ بڑھتی جا رہی ہے۔

"تان لی" کی کہانی "THE VILLAGE ELDER" کا پلاٹ یہ ہے کہ جاپانی جنگ میں عوامی فوج ایک گاؤں سے جاپانیوں کو مار بھگاتی ہے۔ اس گاؤں کا نمبردار جس پر لوگوں کو مکمل اعتماد تھا غدار اور دھوکہ باز ثابت ہوتا ہے۔ عوام اس پر مقدمہ چلاتے ہیں اور جرم ثابت ہو جانے پر اسے گولی سے اڑا دیا جاتا ہے۔ یہ کہانی عوام کو خبردار کرتی ہے کہ وہ ہنگامی حالات میں ان لوگوں سے جن کے ہاتھ میں نظام اقتدار ہے محتاط رہیں اور ان کی نگرانی کریں چاہے وہ رتبے میں ادنیٰ ہوں یا اعلیٰ۔ اس کہانی میں جو منظر سب سے زیادہ متاثر کرتا ہے وہ یہ ہے کہ عام لوگوں کا ایک اجلاس ہوتا ہے۔ اس اجلاس میں وہ لوگ جو کسی قسم کی آواز بلند کرنے کی ہمت اور جرأت نہ رکھتے تھے وہی کسان یہاں فیصلہ کرتے ہیں کہ غدار کو کیا سزا ملنی چاہیئے؟ اس بلند پایہ کہانی میں یہی جدت ہے کہ اس میں عوام ہیرو ہیں اور وہ اپنی قسمت کا فیصلہ آپ کرتے ہیں

چین میں اب بھی یہ مثل مشہور ہے "اچھے لوہے کو کیلوں میں نہیں ڈھالا جاتا اور اچھے آدمیوں کو فوجی نہیں بنایا جاتا"۔ پرانے چین میں ایک فوجی کو مطلق العنان سمجھا جاتا تھا۔ اور وہ ظلم و تعدی اور قتل و غارت بڑی بے دردی سے کیا کرتا تھا۔ لیکن اب چین میں ایک نئے قسم کے فوجی کا عکس جدید جمہوری ادب میں نظر آتا ہے ——— وہ فوجی جو عوام کا آزادی دہندہ بھی ہے اور ان کا محافظ بھی۔

لی پو۔ کی ڈرامائی کہانی "سنہری انگوٹھی" شہریت کے فرض اور فرد کی ذمہ داری کو واضح کرتی ہے۔ آٹھویں فوج کا ایک اسکاؤٹ چانگ۔ ہی۔ اپنی بیوی کی دی ہوئی انگوٹھی کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ اور وہ اسے اس وقت بھی اپنے سے علیحدہ نہیں کرتا جب وہ ایک غریب کسان کے بھیس میں جاسوسی کے لئے جاتا ہے چنانچہ اسی انگوٹھی کی وجہ سے کئی بار اپنے مشن میں ناکام واپس لوٹتا ہے۔ آخر مشکلات کے بعد وہ اپنے جاسوسی کے کام میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ لیکن اس پر یہ محسوس کرتا ہے۔ کہ اسے اپنے فرض کو جو سوسائٹی کی طرف سے اس پر عائد ہوتا اپنی ذاتی عادتوں اور خواہشوں پر ترجیح دینی چاہیئے۔ اور وہ اسی خیال کے پیش نظر اپنی اس انگوٹھی کو چندے کے طور پر فوجی خزانے میں جمع کر دیتا ہے۔

ملو نان کی کہانی "چیچی" کہانی کا ہیرو ایک ایسے خاندان کا فرد ہے جو بیحد غریب ہے۔ اس کے تمام رشتہ دار ختم ہو چکے ہیں ——— اس کا بھائی لاپتہ ہے بہن کو طوائف بننے پر مجبور کیا جاتا ہے ——— اس کی ماں کو کومنتانگ کے سپاہی ہی مار مار کر ختم کر دیتے ہیں اور اس کا باپ ہسپتال میں مر جاتا ہے یہ لڑکا ہی باقی۔ زندہ بچتا ہے اور وہ "آٹھویں" فوج میں شامل ہو جاتا ہے۔ اور نئے چین کے ان نوجوانوں کے لئے ایک نمونہ اور زندہ مثال بن جاتا ہے جو عوام کی خوشیوں کے لئے برسرپیکار ہیں۔
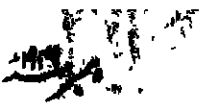
لیو تی رکی کہانی "دولت" آٹھویں فوج کے ایک سپاہی کے متعلق ہے۔ وانگ لی پن۔ پہلے ایک کسان تھا۔ اور جب وہ لوگوں کو مصیبت میں دیکھتا ہے تو سال ہا سال کی محنت سے بچائے ہوئے پیسے عوامی فوج کو دے دیتا ہے گاڑھے پسینے کی کمائی سے بچائے ہوئے پیسے اپنے سے علیحدہ کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ مگر عوامی فوج کے ساتھ گزاری ہوئی زندگی کے تجربوں نے اس پر ثابت کر دیا ہے کہ دنیا میں دولت سے بڑھ کر بھی کئی قیمتی شے ہے جسے دولت خریدنے سے قاصر ہے۔

بڑی بڑی تبدیلیاں جو چینی کسانوں میں آ چکی ہیں وہ ہم پر اُس وقت عیاں ہوتی ہیں جب ہم وانگ لی پن ——— ایک نیا انسان —— کا مقابلہ لو شی کے ناول "CAMLE" کے ہیرو سے کرتے ہیں۔ یہ ناول جاپان کی جنگ سے بہت پہلے لکھی گئی تھی۔ ناول ایک چینی کسان کے متعلق ہے۔ جو شہر میں کام کی تلاش میں آتا ہے۔ اور جہاں آکر رکشا ڈرائیور بن جاتا ہے۔ وہ رکشا ڈرائیور کی دکھ بھری زندگی گزارنے سے اکتا جاتا ہے اور اس کی زندگی کا منتہائے مقصود یہ بن جاتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح اتنے پیسے بچا سکے کہ جن سے وہ اپنی رکشا خرید لے۔ یہ دونوں کہانیاں دو مختلف دنیاؤں کی تصویر کشی کرتی ہیں حالانکہ ان دو کہانیوں میں صرف پندرہ بیس سال کا وقفہ ہے۔ لو تی کی کہانی واضح کرتی ہے کہ لوگ اس آٹھویں فوج سے جس میں سے اور ترقی پسند چین کی تمام خوبیاں شامل ہیں کتنی محبت رکھتے ہیں اور اس سے کس قدر محبت کرتے ہیں۔ فوجیوں کی وردی جو پہلے چینی کسان کو لرزہ براندام کر دیتی تھی اب وہ دوستی کا ایک نشان سمجھی جاتی ہے۔

تاؤ فو کی کہانی "ترقی پسند" کا مرکزی کردار ایک باورچی ہے جو محاذ پر ہے۔ وہ ایک تجربہ کار سپاہی ہے۔ اس کی تمام عادات و اطوار اور خوبیاں عام سپاہیوں سے ہرگز مختلف نہیں۔ اس کے ساتھی اسے ترقی پسند کے نام سے پکارا کرتے ہیں۔ چھوٹی عمر میں ہی وہ اپنے علاقے کے جاگیردار کی خدمت پر مامور ہو گیا تھا اور اسے کبھی خواب میں بھی یہ خیال نہ آسکتا تھا کہ وہ اچھی زندگی گزار سکے گا۔ لیکن جب جنگ کے شعلوں نے اس کے گاؤں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو وہ بھی آٹھویں فوج میں بھرتی ہو گیا۔ جہاں وہ جاپانیوں کے ظلم و تعدی کے خلاف لڑتا ہوا ایک ہیرو کی موت مرا۔ "ہم نے لوگوں کو مرتے متعدد بار اپنی آنکھوں سے دیکھا لیکن ہم بے تعلق سے رہے۔ مگر آپ یقین کریں یا نہ کریں ہم آدھ گھنٹہ تک بغیر لب تک ہلائے نیچی نظریں کئے اس لاش پر غمزدہ کھڑے رہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ ہم میں سے تھا۔ بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک بہادر سپاہی تھا" یہ ہیں وہ الفاظ جن سے اسے خراج تحسین ادا کیا گیا۔

ہم نے چین کے ادب میں ایک نئی چینی عورت سے متعارف ہوئے ہیں۔ کلاسیکل چینی ادب کی ہیروئن عام طور پر امرا کی بیوی یا بادشاہ کی چہیتی ہی ہوا کرتی تھی۔ یہ لوک گیت ہی ہیں جن سے ہم مزدور عورت کے متعلق کچھ جانتے ہیں۔ انہی لوک گیتوں سے لو۔ لان جیسی بلند کردار عورت کا پتہ چلتا ہے جس نے اپنے ملک کو بچایا تھا۔ ایسی اور متعدد مثالیں نئے ادب کو ورثے کے طور پر ملی ہیں۔ چینی ادب میں اس وقت تک کئی ایسی کہانیاں ضابطۂ تحریر میں لائی جا چکی ہیں جن میں عورتوں نے مردوں کے شانہ بشانہ عوامی زندگی میں حصہ لیا۔

کیان چو کی کتاب "ایک نئی عورت کی کہانی" کی ہیروئن کی زندگی کو عام چینی عورت کی طرح پیش کیا گیا ہے۔ وہ ایک غریب کسان کے گھر پیدا ہوتی ہے۔ اسے اناج کے صرف چند دانوں کے لئے بیچ دیا جاتا ہے۔ اور وہ اجنبی لوگوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اسے مارا جاتا ہے۔ بے عزت کیا جاتا ہے۔ اور بعض وقت اسے بھوکا بھی رہنا پڑتا ہے۔ لیکن اس کی زندگی اسی دن بدل جاتی ہے جب اس کے علاقے میں نیا سوشل نظام قائم ہو جاتا ہے۔ وہ آزادی کی لڑائی میں ایک سرگرم ورکن کی حیثیت سے کام کرنے لگتی ہے۔ "ہمارے علاقوں میں بہت ہیروئن ہیں ——— اتنے کہ جن کا کوئی شمار نہیں اور جن کی بہادری کے سینکڑوں قصے مشہور ہیں ———" یہ ہیں الفاظ جو مصنف نے کتاب کے خاتمہ پر لکھے ہیں۔

موجودہ چینیوں کی امریکن امداد کے باوجود رجعت پسند کومنتانگ کے خلاف کامیابیاں اس نتیجے کو جس نے چینی ادب کو متعدد ہیں

بانٹ کے لئے بھاگ رہی ہیں۔ کومنتانگ گروہ گرتے ہوئے اور ختم ہوتے ہوئے سماج کی تصویر کشی کرتا ہے۔ اس گروہ کے دماغ امریکن اور برٹش مصنفوں کے متاثر ہیں۔ ان کی انتہائی کوشش امریکن اور برطانوی جنسی ادب کی نقالی ہے۔ اس گرتے ہوئے اور آہستہ آہستہ مٹتے ہوئے مغربی اور امریکی بورژوا کلچر کا عکس ان کی پیش کی ہوئی ہالی ووڈ کی فلموں میں نمایاں طور پر جھلکتا نظر آتا ہے۔

جمہوریت پسند کومنتانگ لٹریچر کے برعکس کو-مو-جو صحت مند عوامی ادب پیش کرتا ہے۔ اور تمام مصنفوں کو دعوت دیتا ہے کہ "وہ عوام سے مل جائیں ہمیں یہ باتوں میں گھل جانا چاہیئے۔ اور ہمیں عوام سے ایک اٹوٹ رشتہ قائم کرنا چاہیے۔ ان کے زندگی کے مسائل ان کی خواہشات ان کی زبان۔ اور ان کی خوشیوں اور غموں کو سمجھنا چاہیئے۔ اور ہمیں ان لوگوں سے جن کی سب سے بڑی خوبی ان کی اپنی زندگی ہے کچھ سیکھنا چاہیئے تاکہ جب ہم کسی کسان کے بارے میں لکھنے بیٹھیں تو اس کی اصل زندگی کو پیش کر سکیں۔ اور اگر کبھی ہم کسی مزدور کی زندگی کی تصویر کشی کرنا چاہیں تو اس میں کسی قسم کی کمی یا بیشی نہ ہو۔ ہمیں صرف اس فوٹوگرافر کی طرح نہیں ہونا چاہیئے جس کا کام صرف اچھی اور بیہودہ تصویر اتارنا ہی ہوتا ہے۔ ہمیں یہ صاف طور پر اور بلا کسی ہچکچاہٹ کے سمجھ لینا چاہیے۔ کہ ہم اور عوام یک جان و دو قالب ہیں۔ اور ہم کبھی بھی اپنے آپ کو ان سے علیحدہ نہیں کر سکتے۔ ایک سچا ادب اسی وقت ہی پیدا ہو سکتا ہے جب ہمارے خیالات زندگی کے بارے میں اپنے مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں واضح اور صحت مند ہوں۔"

ماؤ-زے-تنگ کہتا ہے "ہم صرف عوام کے نمائندے ہی ان کو کچھ سکھا سکتے ہیں۔ اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب ہم عوام کی زندگی کا مطالعہ کریں اور اس سے کچھ اخذ کریں اور پھر ان کی راہنمائی کریں۔ ماؤ-زے-تنگ کا خیال ہے کہ جب تک ہم لوک گیتوں کا بغور نہیں کرتے اس وقت تک نئے ادب کی صحیح نشو و نما نہیں ہو سکتی

نئے ادب کا پودا پھوٹ نکلا ہے۔ اور آزاد علاقوں میں زندگی کے ایک اہم جزو کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک ایسا جزو جو کہ زندگی کے ساتھ پوری طرح منسلک ہے۔ یہ مستقبل کے وعدوں کا حامل و ضامن ہے۔ اس نئے ادب کا پیڑا صدیوں کی کلچرل روایات کے مطابق اور برابر ہے۔ یہ چین کے عوام کی قدرتی دولت ہے۔ کبھی نہ ختم ہونے والا خزانہ ہے —— ایک عظیم انسان اپنے آپ کو زنجیروں سے آزاد کر رہا ہے۔ جن کو وہ صدیوں سے اٹھائے پھر رہا تھا۔

ناظر بخاری

# سحر سے پہلے

یہ سرمئی سے ہیولے افق کے دامن پر ہر ایک لحظہ نئی ہیئتیں بدلتے ہوئے
کبھی دلوں کی حسیں دھڑکنوں کا روپ لئے کبھی خیال کی پرچھائیوں میں ڈھلتے ہوئے
کبھی نگاہ کو حسن فریب دیتے ہوئے کبھی جنوں کی اڑانوں کے ساتھ چلتے ہوئے

کبھی حکایتِ عہدِ طرب سناتے ہوئے
غمِ حیات کا لاوا کبھی اگلتے ہوئے

یہ سرمئی سے ہیولے افق کے دامن پر تصورات کا عنوان بنتے جاتے ہیں
جو داستان کہ ابھی وقت بننے والا ہے زبانِ حال سے وہ داستاں سناتے ہیں
جو دب چکی ہیں حوادث کی تند لہروں میں ان ادھ جگی ہوئی یادوں کو گدگداتے ہیں

میں سوچتا ہوں مگر سوچتا ہی رہتا ہوں
ہر ایک موڑ پہ یہ آئینہ دکھاتے ہیں

خزاں کا گرچہ تسلط ہے صحنِ گلشن پر مری نگاہوں میں رعنائی بہار بھی ہے
خمارِ گریۂ شب ہی نہیں مآلِ حیات اسے سحر کے تبسم کا انتظار بھی ہے
مدام بے کس و مجبور ہی نہیں انساں کبھی کبھی اسے قسمت پہ اختیار بھی ہے

میں سوچتا ہوں کہ یہ تلخ زندگی میری
ہو تیرا ساتھ میسر تو خوشگوار بھی ہے

مگر نہیں ــ نئی زنجیر میں نہ پہنوں گا ابھی تو مجھ کو پرانا قفس جلانا ہے
ابھی تو توڑنا ہے میں نے یہ فسردہ نظام ابھی تو مجھ کو نئی بستیاں بسانا ہے
ابھی تو نوعِ بشر کے عروج کی خاطر مجھے فضاؤں کی وسعت کا بھید پانا ہے

ابھی تو کرنا ہے خود میں نے اسکا استقبال
نئی حیات کا جو قافلہ روانہ ہے

# نئے اسیر

ابھی تو رنگ نہ آیا تھا لالہ و گل پر
ابھی تو سہمے ہوئے تھے یہ تیرے دیوانے
ابھی تو ہو نہ سکی تھی خرد کی بھی تکمیل
سنائے جاتے ہیں پھر گمرہی کے افسانے

چھپا کے نور کے دامن میں یہ نئے دیوتا
مرے جہان میں ان ظلمتوں کو لائے تھے
غلام قوم بھی کچھ جیسے مسکرائی تھی
سیاہ خانے بھی اک بار جگمگائے تھے

مگر نگاہ اٹھائی جو تیرہ بختوں نے
سیاہ راتوں کا اب تک وہی بسیرا تھا
نئے چراغ جلے بھی تو قصر و ایواں میں
ہماری بزم میں اب تک وہی اندھیرا تھا

فریب دے نہ سکے یہ خزاں کے متوالے
بہار سی نہ سکی ان گلوں کا پیراہن!
وہ اٹھ کے پھر کسی وحشی نے توڑ دی زنجیر
وہ چاک ہو گیا پھر جیسے ظلمتوں کا کفن

طویل راتوں نے پھر ایک بار سوچا تھا
پہنا دیں طوق و سلاسل ان آفتابوں کو
مگر اٹھے ہیں نئی شان سے وطن کے جواں
جلو میں اپنے لئے صبح نو کے خوابوں کو

سیاہ بیڑیاں حیرت سے ہم کو تکتی ہیں
کہ جیسے سوچ میں غلطاں ہوں یہ در و دیوار
کہ اب بھی فاتح کشور یہ نشاں غلامی کے
ابھی تلک ہیں یہاں تیرگی کے یہ آثار

نئے اسیرو نئی زندگی کے راہبرو
اٹھو کہ آج نیا اک قدم اٹھائیں گے
چلو کہ مل کے گرا دیں یہ قصر سرمایہ
ہم آج مل کے نیا اک جہاں بنائیں گے

گنوا چکی ہیں یونہی کتنی اجنبی راتیں
مگر مہیب اندھیروں سے بھی تو لڑنا ہے
ہمارے خون سے مہکیں گے کوچہ و بازار
مگر حیات کے لمحوں کو بھی سنورنا ہے

# مجھ کو برباد نہ کر پاؤ گی

سلام مچھلی شہری

خوب ہے خوب یہ حجاب کی پروردہ نظر
کیا کروں پھر بھی مرے دل پہ نہیں اس کا اثر
ہے مرے سامنے انجامِ مجاز[1] و اختر[2]
مجھ کو برباد نہ کر پاؤ گی ——— !

لبِ گلرنگ میں گمبھیر سی آواز لئے
بر سرِ بزم ادیبوں سا یہ انداز لئے
یوں تو بیٹھی ہو کوئی جذبۂ پرواز لئے
داد ارباب نظر پاؤ گی ——— ؟

"شغل چاہیئے، شاعر کی محبت ہی سہی"
تم یہ کہتی ہو، میں کہتا ہوں، "کہ عورت ہی سہی"
تم کو آئینۂ تخیل سے رغبت ہی سہی
میرے دل میں نہ سنور پاؤ گی ———

اک حماقت ہے کہ دانستہ یہ دھوکا کھاؤں
تم کو چاہوں تمہیں اپنا نہ سکوں مٹ جاؤں
دل میں یہ جذبۂ مجہول بھلا کیوں لاؤں
جاؤ کچھ بھی نہ اِدھر پاؤ گی ———

اُجڑی اُجڑی سی کسی مرمریں صورت کی قسم
ایک ویرانے میں دو کلیوں کی نکہت کی قسم
عالمِ حُسن میں اپنی اسی حالت کی قسم!
مجھ کو بد ذوق نہ کر پاؤ گی ——— !!

[1] اسرار الحق مجاز۔ [2] اختر شیرانی۔

نور بجنوری

# پاک دامن

رات نے کھول دیئے اپنے ملائم گیسو
سیج کی گود میں ہنستے ہوئے پھولوں کی قسم
میرے سرتاج یہ ماتھے پہ شکن کیسی ہے
آج ہر بات میں کانٹوں کی چبھن کیسی ہے

آئیے بربطِ ناہید پہ اک دُھن چھیڑیں
ٹھہریئے چاند کی کرنوں سے حسیں خواب بُنیں
دیکھیے پھر میں کوئی گیت نہیں گاؤں گی
جائیے۔ میں بھی کبھی پاس نہیں آؤں گی

وہی بیتی ہوئی باتیں وہی جھوٹے قصے
ایک شاعر کی غلط گوئی کے رنگیں طومار
ایک سودائی کے بہکے ہوئے افسانے چند
ایک مفلس کے بسائے ہوئے ویرانے چند

میں نے چھپ چھپ کے دریچوں سے کسے جھانکا ہے
میں نے خط لکھے ہیں کس، کس سے ملی ہوں! افسوس
میں نے کب اشک بہائے ہیں بتائے کوئی
کیسے ان بِس بھرے شعلوں کو بجھائے کوئی

آہ بچپن کے وہ رنگین سہانے لمحے
ایک نام اور بھی آتا ہے مرے نام کے ساتھ
وقت کے ناچتے قدموں سے شکایت ہے مجھے
اور اس نام سے۔ اس نام سے نفرت ہے مجھے

آپ کے سر کی قسم آپ کے قدموں کی قسم
میرے ہاتھوں کی حنا، میری کلائی کی کھنک
میری پازیب کی گاتی ہوئی جھنکار ہیں آپ
رنگِ تخئیل ہیں رعنائی افکار ہیں آپ

چھوڑیئے۔ اب میں کبھی پاس نہیں آؤں گی
آپ کے سر کی قسم آج میں مر جاؤں گی

# تشنگی

احمد فراز

**صبح**

دیکھو پگلا پگلا سونا بہہ نکلا کہساروں سے
دیکھو نازک نازک کرنیں ٹوٹ رہی ہیں ٹیلوں پر
دیکھو بھینی بھینی خوشبو آتی ہے گلزاروں سے
دیکھو نیلے نیلے بادل جھول رہے ہیں جھیلوں پر
تم بھی سندر سندر سپنوں کی لہروں پہ بہہ جاؤ
——اور ذرا کچھ لمحے ٹھہرو
——اور ذرا رہ جاؤ

**دوپہر**

سلگا سلگا موسم ہے شعلوں کی برستی حدت سے
چڑھتے سورج کے سائے میں ساری دنیا جلتی ہے
اُبل اُبل اٹھی ہیں سڑکیں تپتی دھوپ کی شدت میں
ابھی نہ جاؤ دیکھو کتنی تیزی سے لُو چلتی ہے
اس کو بھی اک جبرِ مشیت سمجھو اور سہہ جاؤ
——اور ذرا کچھ لمحے ٹھہرو
——اور ذرا رہ جاؤ

**شام**

دیکھو چار طرف ٹھنڈے ٹھنڈے سائے لہراتے ہیں
بکھرے بکھرے سے تارے ہیں مہکا مہکا عالم ہے
خنک خنک پھولوں کے جھونکے خوشبوئیں برساتے ہیں
ٹھیک ہے تم کو جانا ہے پر ایسا بھی کیا لازم ہے
ٹھہرو کچھ باتیں مجھ سے سن لو کچھ تم کہہ جاؤ
——ٹھہرو بس کچھ لمحے ٹھہرو
——آج کی شب رہ جاؤ

جمیل ملک

# ایک ہی راستہ

مدتوں دل میں چھپایا جس کو
مدتوں جس نے مجھے تڑپایا
دیکھ کر تجھ کو فسردہ تنہا
آج وہ راز زباں پر آیا

آج تنہائی ملی تو ہم نے
دل سے اقرارِ محبت تو کیا
لیکن افسوس کہ اس سے پہلے
اک لٹیرے نے ہمیں لوٹ لیا

یوں تو تجھ کو بھی خبر تھی اس کی
ایک ہی غم ہے ہمیں ایک ہی روگ
پھر بھی خاموش رہے ہم دونوں
ڈر یہی تھا کہ ستم ڈھائیں گے لوگ

تجھ کو مہکی ہوئی آغوش ملی
اپنا رومان ادھورا ہی رہا
تو نے بھی چھپ چھپ کے بہائے آنسو
میں بھی چپ چاپ سُلگتا ہی رہا

کتنی تسکین ہوئی ہے ہم کو
آج اظہارِ محبت کر کے
مٹ گئے آج تو جیسے ساری
دل سے آلام زمانے بھر کے

اُف یہ سفّاک لٹیرا یہ سماج
کس قدر ظلم کئے ہیں اس نے
کتنے نوخیز دلوں سے ہنس کر
ولولے چھین لئے ہیں اس نے

ساتھ ہی ساتھ مگر محرمِ راز!
ناگ سا روح پہ کیوں لہرایا!
ڈھل گئے داغ پرانے پھر کیوں
اک نئے درد سے جی بھر آیا!

اب مگر وقت کے تیور ہیں کچھ اور
اس لٹیرے کو کچلنا ہے ہمیں
اپنے اس درد کا درماں بھی
وقت کے ساتھ بدلنا ہے ہمیں

قتیل شفائی

# ایکسٹرا

سینہ ہے کہ بلّور کی شفّاف صراحی　　باہیں ہیں کہ مہکے ہوئے برسات کے جھولے
رفتار ہے یا صبح کا گاتا ہوا جھونکا　　زلفیں ہیں کہ اٹھتے ہوئے پرپیچ بگولے
یہ قد جو کھنک جائے تو کانسی کا کٹورا
یہ آنکھ جو اُٹھے تو ستاروں کو بھی چھولے

اے رقص کے انداز میں جلتی ہوئی دیوی　　آ میں تجھے آنکھوں کے شوالے میں بٹھا لوں
آ وقت کے صحراؤں میں بھٹکی ہوئی جوگن　　آ میں تجھے راہوں کے دھندلکے سے بچا لوں
آ حرص کے شعلوں میں جھلستی ہوئی رانی
آ میں تجھے بھیگی ہوئی پلکوں میں چھپا لوں

یہ رات، یہ حالات، یہ تاریک اُجالے　　ایسے ہیں ترے جسم کو چین آ نہ سکے گا
اے شمع! تری عمر پہ جو بیت رہی ہے　　بے درد زمانہ تجھے سمجھا نہ سکے گا..
اک روز پگھل کر کسی آغوش میں کھو جا
ہر رات کا جلنا تجھے راس آ نہ سکے گا

ممتاز مفتی

# کالے آل

خط اُٹھائے والدہ کمرے میں داخل ہوئی اور زیدی کو مخاطب کر کے کہنے لگی " بہو آئی تو خوشی کی بات ہے۔ سب بات سے ہوتی ہے۔ انہیں تو وہ تاریخ بھی منظور ہے "۔ پھر وہ کنکھیوں سے زیدی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی " میرے بیٹے کو ایسی حسین دُلہن ملی ہے جس کا حسن اب کوئی جواب نہیں۔ اور پھر نام بھی حسینہ! حسینہ! حسینہ کا نام سنتے ہی زیدی کا دل بیٹھ گیا۔ اُس کے ہاتھ سے خط گر گیا۔ حسینہ کا تصور اس کے ذہن پر چھا گیا۔ جو نوسی رنگوں سے جہان کی تخلیق کر رہا تھا۔ اُن کی آنکھوں تلے عمل پر اُن اندھیرا چھائے جا رہا تھا گویا فن اپنے تخلیق کردہ اندھیرے میں ڈوبا جا رہا ہو۔

گھبرا کر اس نے آنکھیں اُٹھائیں — حسینہ — دیوار پر ٹنگی ہوئی سائیکی کے ہونٹوں پر خفیف سی حرکت ہوئی۔ اور اس کے چہرے پر ادلین بیداری کے جملہ نقوش ناپید ہو کر پیچھے گوشت کا لوتھڑا نمایاں کر کے چھوڑ گئے جیسے شبنم خشک ہو کر گلابی پتیوں کو ننگا چھوڑ جاتی ہے۔

زیدی نے نگاہیں پھیر لیں اور مصوّر کے عمل کو دیکھنے لگا۔ " مایوسی " — امید کی آنکھیں ڈھانپ رکھی تھیں۔ اور امید اس کی گرفت سے آزاد ہونے کے لیے مضطرب تھی — آہستہ آہستہ اس کی جدوجہد ماند پڑتی گئی۔ اس کی خاموش چیخ پکار کراہ کی صورت میں بدل گئی۔ اور مایوسی کے سیاہ لانبے بالوں نے اس کا حسین چہرہ چھپا دیا۔

زیدی دیوانہ وار اُٹھ بھاگا

مال روڈ پر کارخانے کی کوک سُن کر اس نے محسوس کیا جیسے کوئی قیامت کا صور پھونک رہا ہو۔ مردے قبروں سے اُٹھ کر دیوانہ وار سڑک پر جاگ رہے تھے زمین لرز رہی تھی۔ عمارتیں ڈگمگا رہی تھیں۔

رضا کے گھر پہنچ کر وہ بے جان جسم کی طرح کرسی پر گر پڑا — " رضا — حسینہ " اس کا جی چاہتا تھا کہ رضا کے شانے پر سر رکھ کر چیخ چیخ کر رو پڑے۔

" حسینہ "، رضا کی آنکھوں میں چمک لہرا گئی۔ وہ اُٹھ بیٹھا اور مضطرب انداز میں ٹہلتے ہوئے بولا۔ " کتنی حسین ہے وہ — اس کے سنہرے بالوں کی لمبی لٹیں اور گہری حنائی آنکھیں — اُف "۔

زیدی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور وہ پھٹی ہوئی آنکھوں سے رضا کی طرف دیکھنے لگا " لیکن رضا سوچو تو، چاہے وہ گلابی ہی ہو، خالی جسم سے کیا ہوتا ہے "

" خالی جسم " رضا چلایا " یہ تم حسینہ کے متعلق کہہ رہے ہو۔ غروبِ آفتاب کی طرح اس کی ہر نگاہ میں ایک عجیب انوکھا سماں ہوتا ہے۔ اور پھر اس دم شام کو دلکشی تو ہوتی ہے مگر اداسی نہیں "۔

زیدی کا دل چاہتا تھا کہ اُٹھ کر بھاگ جائے دور — دور — جہاں اُسے کوئی نہ جانتا ہو۔ جہاں وہ کسی سے واقف نہ ہو — ویرانے میں — اُس نے اُٹھنے کی کوشش بھی کی۔ مگر رضا نے اُسے پکڑ لیا " آخر بات کیا ہے " وہ چلایا۔ لیکن اس سے بات کرنے کا فائدہ ہی کیا تھا۔ آج تک وہ یہ نہیں جان سکا تھا کہ اس کا عزیز ترین دوست رضا بھی اُس کے جذبات سے اس قدر بیگانہ ہے۔ اُسے کبھی یہ خیال پیدا نہ ہوا تھا کہ رضا کا تخیل جسم کے خطوط سے آگے نہیں سکتا۔ مانا کہ حسینہ ویسی ڈی مائلو کے سے متناسب جسم کی مالک تھی اور اس کے رخساروں پر آئرلینڈ کے گلاب کھلتے تھے۔ لیکن اس کا وہ خالی چہرا جس پر جذبات کی مدوجزر سے قطعی بے گانہ تھا۔ اور اس کی ذہنی بے حسی - زیدی کے نقطۂ نظر سے ذہنی اور جذباتی چمک کے بغیر حسن کا وجود ممکن ہی نہ تھا۔

"لیکن سوچو تو سہی" آکر زیدی نے رضا کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"حسینہ بیوا ایک ماڈل ہو سکتی ہے۔ بہترین ماڈل۔ رفیقۂ حیات نہیں۔ جسے آرٹ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ میری بیوی نہیں بن سکتی وہ بیوی کیسے بن سکتی ہے۔ جس نے باورچی خانے سے باہر قدم نہ رکھا ہو وہ بھلا آرٹسٹ کی بیوی کیسے بن سکتی ہے؟"

اُس نے ہر ممکن دلیل سے رضا کو ہم خیال بنانے کی کوشش کی لیکن رضا کو اس کے خیال سے اتفاق نہ تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ آرٹ کی اپیل ہمہ گیر ہے۔ ضروری نہیں کہ صرف پڑھی لکھی لڑکی ہی جمالی حس رکھتی ہو "میں اس بات پر زندگی سے بڑی شرط بدنے کو تیار ہوں" رضا چلایا۔ زیدی نے ایک حیرت بھری نگاہ اُس پر ڈالی اور اُٹھ بیٹھا "اس کی ضرورت نہیں رضا!"

نہ جانے کب تک رضا اُن کچی کچی بھری ہوئی گرد آلود سڑکوں پر دیوانہ وار گھومتا رہا۔ پھر دفعتاً اس کی آنکھوں کے سامنے آن کا وہ ریتلا صحرا پھیل گیا۔ اور دور افق پر گاؤں کی بتیاں گویا اُسے اشارے کرنے لگیں۔ کالے آن۔ کالے آن —— قریب ہی کوئی دھوئیں کا انجن چلا چلا کر اُسے بلا رہا تھا۔ اُس نے ٹکٹ اپنی جیب میں ڈالی اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔

ایک سال پہلے حبیب پہلی مرتبہ اس کی نظر کالے آن کے گاؤں پر پڑی تھی تو ایک ساعت کے لئے وہ مبہوت رہ گیا تھا۔ وہ زرد ریت کا دور تک پھیلاؤ اور اس میں سُرخی مائل عنبر رنگ کے تنکوں کی بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں جیسے بھوری اور دھنیوں میں عورتیں قطار در قطار بیٹھی کانا پھوسی کر رہی ہوں اور ان کے درمیان زرد رنگ کا ایک دو منزلہ مکان جیسے کسی دلہن کے گرد محلے والیوں نے گھیرا ڈال رکھا ہو۔ سیالکوٹ کے سرسبز علاقے میں رہنے والے کے لئے یہ منظر ایک انوکھی شان لئے ہوئے تھا۔ وہ تو محض اتفاق تھا کہ زیدی اُس طرف جا نکلا تھا۔ اگر سیلاب کی وجہ سے گاڑی کا راستہ بند نہ ہو جاتا اور والدہ کی بیماری کی وجہ سے اُسے جلد لاہور پہنچنا نہ ہوتا تو وہ کبھی بیل گاڑی میں بیٹھ کر تیس میل کا وہ ریگستان عبور کرنے کے لئے تیار نہ ہوتا۔

کوٹ سرے سٹیشن پر پہنچ کر اُسے معلوم ہوا تھا کہ آگے جانے کی کوئی صورت نہیں۔ واپس جانا اس کے لئے ممکن نہ تھا۔ اور پڑھے لکھے ہوتا قطعی طور پر بے کار تھا۔ والدہ تک پہنچنے کی صرف ایک صورت تھی کہ بیل گاڑی پر جانگلیوں کا علاقہ عبور کر کے عظمت آباد سے گاڑی میں جا بیٹھے۔

دو راتیں سفر کرنے کے بعد صبح سویرے جب وہ بیدار ہوا تو صبح کی روپہلی روشنی میں اس کے سامنے ماجد پور کے مکان کے گرد جھونپڑے یوں دکھائی دیئے۔ جیسے بہت سے بچے کسی رنگ محل کے گرد آنکھ مچولی کھیل رہے ہوں —— دُور —— دُنیا سے دُور جیسے وہ سب شہر اور زندگی کی الجھنوں سے تنگ آ کر گھروں سے بھاگ آئے تھے۔ اور اُس خاموش کونے میں مسرت بھرا کھیل کھیل رہے تھے۔ اُس وقت اس نے محسوس کیا جیسے وہ بھی کچھ ہو۔ اور اُس مسرت بھرے کھیل میں شامل ہونے کے لئے شہر کی اُلجھنوں سے دُور بھاگ آیا ہو۔

گاؤں کا نام سُن کر وہ خوشی سے اُچھل پڑا۔ ماجد پور کس قدر موزوں نام ہے۔ اس کی حسرت اس قدر نمایاں تھی کہ اس کا کوئی اور نام ہو ہی نہ سکتا تھا۔ انہیں دن بھر وہیں قیام کرنا تھا۔ اور پھر شام کو سفر شروع کر کے اگلے دن عظمت آباد پہنچنا تھا۔

بیل اور گاڑی کو ایک سوکھے ہوئے درخت کے قریب چھوڑ کر وہ آگے بڑھے۔ وہ درخت سوکھا ہونے کے باوجود کس قدر مطمئن اور مسرور دکھائی دیتا تھا۔ اس کے ٹنڈ منڈ تنے پر لکڑی کے ریشے یوں بل کھا رہے تھے جیسے پسلیاں ہنستے وقت اُبھر آتی ہیں۔ سوکھے پن کے باوجود اس پر مسرت بھرا اطمینان چھایا ہوا تھا۔ شہر کے سرسبز درختوں کی طرح نہیں جو سبزے کے بوجھ تلے کسمساتے ہیں۔

ان بھدے جھونپڑوں میں گھومتا ہوا یوں کھو گیا جیسے ایلس کسی ونڈر لینڈ میں جا گھسی ہو۔

سیاہ فام عورتوں کی کمان سی کمر اور انگڑائی نما جسم ان کے اُبھاروں کے گنبد نما بے عیب خطوط، آبنوسی جسموں میں وہ روغنی چمک زندگی بھری چمک جیسے کالی گھٹاؤں میں بجلیاں لہرا رہی ہوں۔

ان کے تنے ہوئے آبنوسی جسم گویا زندگی سے اُبل رہے تھے۔ جن پر معصومیت بھری سادگی اور بے نیازی چھائی ہوئی تھی۔

۔ گذر جائے گا تو بوڑھی عورت نے زیدی کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کہاں سردار کے ڈیرے جائے گا؟" گاڑی والا بولا۔

"بیٹھو جا کہاں زرا سا بولی۔ دودھ کا کٹورہ پیتا جا، سردار کا مہمان ہے تو تو ہمارا بھی مہمان ہے۔" رہی اُٹھ کے وہ چلدی۔ دودھ کا کٹورا لے آ مہمان کے سامنے پھونپڑے کے دروازے میں بیٹھے ہوئے آبنوسی جسم نے انگڑائی لی۔ اور زیدی کے قریب ایک آبنوسی سر داستادہ ہو گیا۔ اور سفید آنکھیں موتی سے سفید دانت اور سفید دودھ کا بھرا پیالہ اس کے لبوں پر چھلکنے لگے۔ "یہ گوام سوتے ہیں۔" اس نے بے تکلفی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "کیوں کہاں؟"

پھر جب وہ سوار کے پختہ مکان کے پچھواڑے والے کمرے میں بیٹھا سردار کے گھر سے آئے ہوئے پراٹھے، لسی، مکھن اور ساگ کھا رہا تھا تو وہ اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ اس کی باتیں کس قدر عجیب تھیں۔ "کہاں تم ریل سے آئے ہو؟ ریل کیسا ہوتا ہے؟ اسے کتنے بیل کھینچتے ہیں؟ شہر کتنا بڑا ہوتا ہے؟ بکتے ہیں وہاں مکھن نہیں ملتا، ساگ ہوتا ہے وہاں؟ تم کیا کام کرتے ہو کہاں؟"

جب زیدی نے کہا کہ وہ تصویریں بناتا ہے۔ تو وہ حیران رہ گئی۔ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "یہ بھی کوئی کام ہے۔ تصویریں تو ہمارا چھوٹا بنا بھی بناتا ہے ریت پر ناٹے سے بناتا ہے۔ کا بلی، طوطا، سبھی تصویریں بناتا ہے۔ تم بھی ریت پر تصویریں بناتے ہو؟ شہر میں ریت ہوتی ہے کیا؟ مجھے بنا کر دکھاؤ کیسے بناتے ہو تم تصویر؟"

جب اُسے معلوم ہوا کہ وہ انسانوں کی تصویریں بناتا ہے تو وہ حیران ہوئی۔ اور اس بات پر ضد کرنے لگی کہ وہ رقصاں کی تصویر بنائے۔ رقصاں اسکی سہیلی تھی۔ اس کی لالہ پشنگ کی ایک رنگیاں آگئیں۔ حتیٰ کہ وہ کمرا انگڑائی نما جسموں سے بھر گیا۔ اور وہاں بیٹھا ہوا وہ یوں محسوس کرنے لگا۔ جیسے آبنوسی مردوں کے درمیان وہ کوئی خاردار جھاڑی ہو۔ وہ اونچے لمبے آبنوسی سر اس کے قریب آتے گئے اور قریب اور ——— حتیٰ کہ وہ اُٹھ بیٹھا۔ اور جھکی پر کھڑے ہو کر دیوار پر کوئلے سے عورت کی تصویر بنانے میں مشغول ہو گیا۔

وہ تصویر بنا رہا تھا ——— وہ سب ہنس رہی تھیں۔ "رجو دیکھو تو کتنی جلدی بناتا ہے۔ تصویر یہ کہاں ——— تو یہ تو بالکل عورت ہے۔ بال بھی ہیں اور چوڑیاں بھی ——— اور آنکھیں تو دیکھو رہی ہیں بالکل ——— رتی۔"

زیدی کی آنکھوں تلے وہ دیوار پھیل گئی اور اس دیوار پر کوئلے سے بنی ہوئی وہ تصویر جس کی تکمیل پر وہ خود حیران تھا۔ سامان کے بغیر محض کوئلے سے ایسی تصویر بنا لینا قرینِ قیاس معلوم نہ ہوتا تھا۔ نہ جانے اُس تصویر کے خطوط اور زندگی ان جانگلی دوشیزاؤں کی موجودگی کی وجہ سے تھی یا اس انوکھے ماحول کی وجہ سے جہاں وہ آج پھر جا رہا تھا۔ عظمت آباد، عظمت آباد سٹیشن پر قلی چلائے وہ چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ انگھے نے اُسے ریل گاڑی سے اُترتے دیکھا اور چلانے لگی "کہاں آیا ہے۔ کہاں تم آ گئے۔ مجھے معلوم تھا تم پھر آؤ گے۔ میرا جی کہتا تھا تم آؤ گے۔ ٹھہرو میں دودھ کا کٹورہ لے آؤں۔" "کہاں آیا ہے۔ ارے کہاں آیا ہے؟ رقصاں کی تصویر والا کہاں؟ کہاں ہے؟" وہ انگھے کے جھونپڑے میں راہ چلتی ہوئی آبنوسی دوشیزائیں ——— انگلیاں اُٹھا اُٹھا کر شور مچانے لگیں۔

سامنے ریتیلے افق پر سورج غروب ہو رہا تھا۔ آسمان پر تیرتے ہوئے خشک بادل گویا دن بھر کی چلچلاتی دھوپ کھا کر سرخ انگارے بنے ہوئے تھے۔ جن کے شنگرفی عکس سے دہکی ہوئی زرد ریت گلابی ہو رہی تھی۔ اور اس گلابی پس منظر پر کمان کی طرح تنے ہوئے آبنوسی جسموں والی اونچی لمبی دوشیزائیں آنکھوں میں دودھ کے کٹورے چھلکا رہی تھیں۔

پختہ مکان کے پچھواڑے کے کمرے میں قدم رکھتے ہی اس کی نگاہ دیوار کی تصویر پر پڑی ——— ہائیں ——— حیرانی سے وہ رُک گیا۔ کوئلے کی وہ تصویر یوں چمک رہی تھی جیسے اس پر کسی نے پالش کر رکھا ہو۔ کھلے بال ہوا میں اُڑ رہے تھے۔ نچلا ہونٹ یوں کھلا سا تھا جیسے زیرِ لب مسکرا رہی ہو آنکھوں میں معصومیت اور حیرانی جھلک رہی تھی اور سینہ کمان کی طرح تن کر گویا ٹوٹ چکا تھا۔ چونکہ اُس نے وہ تصویر صرف سینے تک بنی ہوئی تھی۔ اُس

وہ سوری کا تصویر کو دیکھ کر پہلی مرتبہ اُسے احساس ہوا۔ کہ وہ تشنۂ تکمیل ہے۔ رات کو مٹی کے دیئے کی زرد روشنی میں وہ کمان بالکل ہی ٹوٹی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ زیدی چارپائی پر بیٹھا تصویر کو گھور رہا تھا۔ دور، باہر وہ اونچی تیکھی آوازیں گا رہی تھیں نہ جانے کیا بول تھے۔

اس ہی ہی ہی ۔ قریب ہی ہنستے کی آوازیں سُن کر وہ چونکا۔ دروازے پر کالی سیاہ کانیں کسی کھڑی تھیں۔ ہی ہی ہی ہی ۔ وہ ہنسیں ۔

"کہاں تم نہیں آئے گے؟"

"باہر الاؤ میں سب گیت گا رہے ہیں"

"آدنگے تم کہاں" ایک اونچا لمبا جوان انہیں ایک طرف ہٹا کر اندر داخل ہوتے ہوئے بولا ۔

"سبھی الاؤ پہ اکٹھے ہو رہے ہیں"

اس لمبے تڑنگے جوان کو دیکھ کر زیدی سہم سا گیا "ہاں ہاں وہ بولا۔ آؤں گا ٹھیر کر"

"اچھا تو آجانا" وہ چل پڑا۔ اور وہ سب باری باری باہر نکل گئے۔ دفعتاً آخری آبنوسی شکل مڑی "مت آنا کہاں" وہ بولی "مت آنا"

زیدی نے انگلے کی آواز پہچان لی "کیوں"؟ اس نے پوچھا۔

"رقصاں آئیگی۔ ابھی۔ یہاں" وہ رقصاں" اُس نے دیوار کی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ اور پھر باہر نکل گئی۔

"رقصاں" زیدی حیرانی سے دیوار کی تصویر کی طرف دیکھنے لگا ۔

کہاں نیتونے کمرے میں سر نکالا اور آ کر اس کی چارپائی کے قریب استادہ ہوگئی ۔

"سو نہ جانا کہاں وہ بولی" رقصاں آئے گی۔ رقصاں۔ اُس نے دیوار کی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ اور مُسکرا کر جھینپ کر باہر نکل گئی۔

"کہاں" کچھ دیر کے بعد ایک اور شکل نمودار ہوئی۔

"ہاں مجھے معلوم ہے" وہ بے پروائی سے چلایا "رقصاں آئے گی۔ یہاں"

"ہاں رقصاں" اس نے سر ہلا کر کہا۔

"وہ ـــــ رقصاں" زیدی نے دیوار کی تصویر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"ہاں۔ وہ" اس نے پھر سر ہلایا ۔

"ٹھیک ہے" وہ بولا۔

"ٹھیک ہے"؟ خوشی سے اُس نے اپنے لباس کی طرف دیکھا اور پھر چارپائی پر بیٹھ گئی۔

"تم کہاں ہو"

"ہاں" زیدی نے سر ہلایا ۔

"ہاں" ۔ تم کہاں ہو تو مجھے معلوم ہے"

"مجھے بھی معلوم ہے" وہ اکتا کر بولا ۔

"تم نے وہ تصویر بنائی ہے" ـــــ وہ والی

"ہاں ۔ میں نے بنائی ہے"

"اس ہاتھ سے" اس نے اس کا دایاں ہاتھ بے تکلفی سے پکڑ لیا ۔

"ہیں۔۔۔" اس کے ہاتھ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اُس آبنوسی علاقے میں وہ سُرخ و سپید ہاتھ ۔ زیدی نے ایک کونے سے دیئے کی بتی اونچی کی۔

ہائیں وہ چلایا۔ "تم! تم کون ہو؟"

"میں" وہ گھبرا گئی۔ "میں، میں، میں ہوں۔ وہ" اس نے دیوار کی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ "تم نے مجھے بنایا تھا نا۔ کہان۔ میں تھا
ہوں اور اب تم کہاں ہو۔" وہ اس کی معصومیت پر حیران ہو رہا تھا۔ اور وہ باتیں کئے جا رہی تھی۔

اُس کا قد بہت چھوٹا تھا۔ ان تنے ہوئے کمانوں سے بہت چھوٹا۔ اس کا رنگ سفید تھا۔ جیسے گھی میں میدہ گوندھا ہوا ہو۔ گالوں پر چکنی سُرخی چمک رہی تھی۔ اور بال کھلے تھے۔ جو شانوں پر سُرخ تاگے سے بندھے ہوئے تھے۔ سڈول بانہیں اور چھوٹے چھوٹے ہاتھ۔ گول چہرہ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کس قدر معصومیت سے بھری تھیں۔

"تم بہت اچھے ہو کہان۔ میں جانتی تھی تم آؤ گے۔ تصویر کو پورا کرنے آؤ گے مجھے معلوم تھا۔ تم ایسے ہو۔ ایسے۔"

"ایسے کیسے" وہ بولا۔

"ایسے جیسے تم ہو بالکل ایسے۔ تم میری تصویر پوری کرنے آئے ہو نا؟"

"ہاں" وہ بولا۔

ہائے کہان" وہ بولی۔ "تم نے مجھے دیکھے بغیر میری تصویر کیسے بنا لی۔ تم بن دیکھے دیکھ سکتے ہو کہان؟"

"ہاں" زیدی نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔

"ہائے کہان" وہ بولی "تم نے مجھے ننگا کیوں کر دیا" اُس نے ہونٹوں میں انگلی دبا لی۔ اور تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

"کیوں ننگا ہونے میں کیا ہے۔" زیدی نے اُسے چھیڑنے کے لئے کہا۔

"ہائے کہان وہ بولی" اگر میں بھی ان کی طرح ہوتی۔ نیلی آنکھوں اور۔ بتاں کی طرح۔ تو کیسا اچھا ہوتا پر میں سردار کی بیٹی ہوں۔ اور بابا مجھے اتنی لمبی قمیص پہننے کو کہتا ہے۔" اس نے اپنی ریشم کی ڈھیلی ڈھالی قمیص دکھاتے ہوئے کہا۔

"یہ تو بہت اچھی لگتی ہے" زیدی بولا۔

"ہے نا" وہ بولی۔ "کیسی اچھی ہے یہ جیسی تو میں نے پہنی ہوئی ہے۔ مجھے معلوم ہے۔ یہ اچھی لگتی ہے۔ تمہیں اچھی لگتی ہے۔ مجھے بھی اچھی لگتی ہے۔ پر تم نے تصویر میں اسے نہیں بنایا۔ اور نہ ہی تم نے میرا دھڑ بنایا ہے۔ یہ کیا اچھا نہیں۔" اُس نے بلا تکلف ریشمیں لہنگے سے ٹانگ نکال کر اس کے سامنے پھیلا دی۔ "یہ کیا اچھی نہیں ہے؟"

زیدی حیرانی سے اُس چکنی گلابی ٹانگ کی طرف دیکھنے لگا۔ جس کے سرے پر ایک گندہ مگر چھوٹا سا متوازن پاؤں لگا ہوا تھا۔

"اونہہ ہوں" زیدی نے بہانے بہانے اس کی ٹانگ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "یہ تو بالکل نرم ہے۔"

"بالکل نرم ہے" وہ گھبرا گئی۔ "پھر۔ پھر کیا اس کی تصویر نہ بنے گی؟"

"بنے گی۔ بنے گی" وہ بولا۔

"تو پھر نرم کا کیا ہو گا" وہ پوچھنے لگی۔

پاؤں کی آہٹ سُن کر وہ سرک کر پیچھے ہٹ گیا۔ "کوئی آ رہا ہے۔ کوئی آ رہا ہے" وہ بولا۔ رقصاں نے ٹانگ لہنگے میں کر لی۔ لیکن وہ ویسی معصوم بیٹھی رہی۔

"رقصاں آ گئی" انجمی اندر داخل ہوتے ہوئے بولی۔

"ہاں" رقصاں نے جواب دیا۔ "میں آ گئی۔"

"یہ کہاں ہے" اُس نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں" رقصاں نے جواب دیا۔

"اب تمہاری تصویر پوری ہو جائے گی"

"اونہوں" رقصاں نے سر ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ اور پھر لہنگے سے ٹانگ نکال کر بولی "یہ زخم ہے"

"زخم تو بالکل اچھا ہوتا ہے" انجمے مسکرائی "کیوں کہاں"

"ہاں ہاں" زیدی نے سر ہلا دیا۔

"اچھا ہوتا ہے نا؟" رقصاں کی آنکھ میں چمک لہرائی "تمہیں معلوم ہے اچھا ہوتا ہے" اس نے زیدی کی طرف دیکھ کر سنجیدہ انداز سے کہا "مجھے بھی معلوم ہے" اچھا ہوتا ہے۔ پر کہاں دفعتاً وہ رُک کر بولی "دھرم بناؤ گے تو یہ نہ بنانا۔ اُس نے عجلت سے قمیص اُٹھا کر اپنا پیٹ دکھاتے ہوئے کہا۔ یہ پھوڑا تھا۔ اس کا نشان مجھے اچھا نہیں لگتا"

زیدی نے مسکرا کر اسے اُنگلی سے چھوا "ہونہوں۔ یہ زخم نہیں"

"نہیں نہ" وہ چمک کر بولی "مجھے معلوم ہے"

باہر شور و غل کی آواز سُن کر زیدی گھبرا گیا۔

"ان کا گیت ختم ہو گیا ہے" انجمے بولی۔

"مجھے تو ایسے معلوم ہوتا ہے، جیسے گیت ہو رہا ہے" رقصاں معصوم انداز سے کہنے لگی۔

"کہاں ہو رہا ہے" انجمے نے ایک ساعت غور سے سُننے کے بعد کہا۔

"کہاں ہو رہا ہے" رقصاں نے دہرایا "ٹھیرو۔ اور وہ سُننے لگی ——— ہو رہا ہے۔ جرور ہو رہا ہے ——— کیوں کہاں ہو رہا ہے نا؟"

"ہاں" زیدی نے سر ہلا دیا "یہاں" اور اس نے ہاتھ اپنی چھاتی پر رکھ لیا۔

"ہے نا" رقصاں نے خوشی سے تالی بجائی "تمہیں بھی ہو رہا ہے مجھے بھی ہو رہا ہے۔ اور تمہیں انجمے" وہ چلائی"

انجمے نے کھسیانی مسکراہٹ سے زیدی کی طرف دیکھا۔

"اچھا تو میں چلتی ہوں رقصاں نے کہا۔ شمّاں مجھے دیکھ رہی ہوگی"

"ابھی سے چلدی" زیدی نے بُرا سا منہ بنایا "اور وہ تصویر"

"تصویر؟"

"ہاں اُسے پورا جو کرنا ہے"

"تو کل پوری نہ ہو گئی کیا"

"دن کے وقت؟ زیدی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ اونہوں یہ تو زخم ہے" یہ اس نے رقصاں کے لہنگے کی طرف اشارہ کیا"

"اچھا تو میں رات کو آؤں گی" رقصاں نے سنجیدگی سے کہا۔

"رات کو" انجمے نے منہ میں اُنگلی ڈال لی۔

"کیوں رات کو کیا ہے۔ بابو گھر پر نہیں۔ وہ باہر گیا ہوا ہے"

"اور شمّاں" انجمے نے رقصاں کی طرف دیکھا۔

"جب شمّاں سو جائے گی تو میں پیار جتانے آ جاؤں گی۔ شمّاں روز سو جاتی ہے۔"

"اتنی بڑی دیوار" زیدی نے کہا۔

"اس کا کیا ہے۔ میں نے کئی بار پھاندی ہے۔"

"رات کو؟" بے تحاشہ زیدی کے منہ سے نکل گیا۔

"کیوں۔ رات کو کیا یہ اور بھی اونچی ہو جاتی ہے؟" رقصاں نے پوچھا۔

رات کو ہاتھ پر نرم نرم سا لمس محسوس کر کے وہ جاگ پڑا۔ اس کا دایاں ہاتھ ہاتھوں میں لئے وہ بیٹھی بڑے شوق سے دیوانی تصویر کو دیکھ رہی تھی۔

"تم جاگ پڑے ہو کیا؟" وہ بولی۔ "تم سو جاؤ۔ تم تھکے ہوئے ہو۔"

"نہیں تو" وہ بولا "میں تو خواب میں تمہیں دیکھ رہا تھا۔ یا شاید نہیں تھا۔"

"سچ" وہ تالی مار کر چلائی "خواب میں میں اچھی لگتی ہوں کیا؟"

"ہاں" وہ بولا "بہت اچھی۔"

"تو تم سو جاؤ اور مجھے خواب میں دیکھو اور میں اپنی تصویر کو دیکھوں گی یہاں بیٹھ کر۔ اس ہاتھ سے بنائی تھی نا تم نے۔ کیسا اچھا ہے یہ ہاتھ" وہ اس کے ہاتھ کو تھپک تھپک کر کہنے لگی۔

"اونہوں یوں نہ کرو" وہ بناوٹی انداز سے گھبرا کر بولا۔

"کیوں؟"

"تم میرے ہاتھ چھوتی ہو تو میرا دل یوں یوں ہوتا ہے" زیدی نے شرارت سے انگلیوں کے سرے جوڑتے کھولتے ہوئے کہا۔

"ہے نا" وہ تالی بجا کر بولی "مجھے بھی ہوتا ہے۔"

"کیا ہوتا ہے تمہیں؟"

"وہی جو تمہیں ہوتا ہے۔ پھر۔ پھر" وہ رک گئی ———

"پھر کیا؟" وہ بولا۔

"معلوم نہیں" وہ سوچ میں پڑ گئی "ٹھیرو میں بتاؤں" اس نے ریشمی لہنگے سے اپنی ٹانگ نکال کر اس کی گود میں رکھ دی "تم اس پر ہاتھ رکھو نا ——— ہاں پھر ——— سوئیاں چبھتی ہیں سب جگہ سب جگہ چبھن چبھن ہوتی ہے۔ یہاں" اس نے چھاتی پر ہاتھ رکھ کر کہا "اور اور گلا بند ہوتا ہے۔ بند اور ——— اور ———" گھبرا کر اس نے ٹانگ کھینچ لی "نک نک ہوتی ہے جیسے کوئی چل رہا ہو جس پر مٹی کی وہ بندھی ہوئی ہیں" یہ کہہ کر وہ ادھوری سی چارپائی کے ایک طرف پڑ گئی۔ زیدی اس کے اوپر جھک گیا۔

"نہ نہ" وہ بولی "ہٹ جاؤ۔ مجھے دم لینے دو۔ دم اکھڑ جاتا ہے۔"

"برا لگتا ہے کیا؟" زیدی نے شرارت سے پوچھا۔

"نہیں نہیں۔ تھوڑا تھوڑا ——— اچھا لگتا ہے تھوڑا تھوڑا۔"

رقصاں چارپائی پر لیٹی ہوئی ہانپ رہی تھی۔ اس کی قوس نما بھویں چڑھی ہوئی تھیں۔ آنکھوں میں سرخ شعلے چمک رہے تھے دونوں ہاتھوں سے اس نے اپنی چھاتی کو دبا رکھا تھا۔ اور زیدی حیرانی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے اس کی

تمام تر قوت سلب ہوئی جا رہی تھی۔ جیسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے سوا وہ اور کچھ نہ کر سکتا تھا۔ وہ یوں ہی بیٹھا اس کے بالوں سے کھیلتا رہا۔ اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ دروازے سے اُبھرتا ہوا اندھیرا دھندلا پڑ گیا۔ اور دور افق پر سپیدی کی ایک لکیر دکھائی دینے لگی۔

"میں جاتی ہوں۔" وہ اُٹھ بیٹھی۔ "دن چڑھنے والا ہے۔ میں جاؤں کھاؤں۔" اور زیدی حیرانی سے اس کے مُنہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "کل رات پھر آؤں گی۔ جب تمہاں سو جائے گی۔ تم سو جاؤ کھاؤ تو میرا ہاتھ لگنے پر جاگ نہ پڑنا۔ نہیں جاگ گئے نا!"

"نہیں!" وہ مسکرا دیا۔

"بس پھر ٹھیک ہے۔"

"پھر باقی کیا تصویر۔" زیدی نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"تصویر۔" اس نے دانتوں تلے انگلی دبا لی۔ "وہ تو میں بھول ہی گئی۔ ——— پھر بھی تم جاگنا۔" وہ بولی۔ "تم اتنے کچور ہو تم تھک جاتے ہو۔"

"رقصاں ٹھیرو۔" زیدی نے اسے بازوؤں میں گھیر لیا۔ اور اپنے ہونٹ اس کی طرف بڑھانے لگا۔

"کیوں۔" وہ بولی۔ "یہ کیا ہے؟"

"یہ ہونٹ ہیں۔" وہ کھسیانا ہو کر بولا۔

"پھر کیا ہے۔"

"میں انہیں تمہارے ہونٹوں پہ رکھ دوں گا۔"

"پھر کیا ہوگا۔" وہ بولی۔

"دیکھ لینا۔"

"ہائے نہ۔" وہ چلائی۔ "پھر دم رُک جائے گا میرا۔ اور مجھے دلیا پھانکنی ہے۔" اور وہ اس کے بازوؤں سے پھسل کر باہر نکل گئی۔

رقصاں کے جانے کے بعد وہ دیر تک پہلو بدلتا رہا۔ اُسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ کسی وقت اس کے دل میں جذبات کی بھیڑ لگ جاتی۔ اور اس کے اور جسم شہوانی خیالات سے لرزنے لگتا۔ پھر اُسے رقصاں کی باتیں یاد آ جاتیں۔ اور ان کی معصومیت اور پاکیزگی کی وجہ سے شدید احساسِ گناہ محسوس ہونے لگتا۔ اور ایک لطیف کرن نہ جانے کہاں سے داخل ہو کر اُسے منور کر دیتی اور شہوانیت کی کالی گھٹائیں گم ہو جاتیں۔ اور وہ محسوس کرنے لگتا۔ جیسے وہ ایک بچہ ہو۔ جو شہر کی کثافت سے بھاگ کر گاؤں آ گیا ہو۔ اور زندگی ایک لطیف اور مسرت بھرا کھیل ہو۔ پھر دیوار پہ بنی ہوئی وہ تصویر جو ننگی ہونے کے باوجود ننگی محسوس نہ ہوتی تھی اس کی طرف دیکھ کر مسکراتی۔ نہ جانے ——— پھر سارا دم اُکھڑ جاتے گا۔ اور وہ مسکرا دیتا۔

دوپہر کے وقت جب وہ بیدار ہوا۔ تو منگھے اس کے سرہانے کھڑی تھی۔ اُسے آنکھیں کھولتے ہوئے دیکھ کر وہ ہنس پڑی۔ ہی ہی ہی ہی۔ اور وہ خواہ مخواہ ہنستی ہوئی چلی گئی۔ وہ ان اونچی لمبی بھرپور لڑکیوں پر حیرانی محسوس کر رہا تھا۔ ان کے جسم تنے ہوئے تھے۔ ان کے چہروں پر سنجیدگی طاری تھی ان کی آنکھوں اور باتوں میں بچپن کی جھلک تھی۔ اور یہ تضاد کس قدر جاذبِ توجہ تھا۔

کیا ہے تمہیں وہ منگھے سے کہنے لگا۔ ہی ہی ہی ہی۔ وہ ہنسنے لگی۔ "تصویر پوری ہو گئی۔" ہی ہی ہی ہی ——— نہ جانے کیا کہہ رہی تھی وہ۔ کھانے اس کی توجہ کسی اور طرف مبذول کرنے کی کوشش کی۔ منگھے "جب میں یہاں نہیں تو کیا رقصاں یہاں آیا کرتی تھی۔"

"سارا سارا دن یہیں بیٹھ کر اپنی تصویر دیکھا کرتی تھی۔" وہ بولی۔

"اپنی ہی تصویر دیکھا کرتی تھی کیا۔"

"اونہوں" وہ بولی۔ "کہتی تھی امروبا مجھے کہاں دکھتا ہے!"

"کہاں کو دیکھے بجا ہی" وہ مسکرایا۔

"ہاں وہ بولی "تم نے بھی تو دیکھے بنا ہی اس کی تصویر بنائی تھی!"

اس روز سارا دن وہ تصویر کو مکمل کرنے کے لئے سامان اٹھا کر تا رہا۔ نرم تُوندلے۔ کھریا مٹی۔ گیرو اور ناگ چنی۔ اس نے دن بھر دن کا ایک ڈھیر لا لیا اور پھر رقصاں کے انتظار میں بیٹھ گیا لیکن رقصاں نہ آئی۔ ویسے گاؤں کی لڑکیاں، بوڑھی عورتیں اور مرد سب باری باری اس کے پاس آتے رہے۔ حتیٰ کہ وہ محسوس کرنے لگا کہ رقصاں کو اس نے خواب میں دیکھا تھا۔ اور وہ سب باتیں اس کے جیا کی شوخی تھی۔ لیکن ہر آدھ گھنٹہ کے بعد کوئی نہ کوئی لڑکی لسی کا گلاس، دودھ، مکھن یا پراٹھے اٹھا کر لے آتی۔ اور پھر چپکے سے کہتی: "رقصاں آئے گی کہاں تم نے سونہ جانا"۔۔۔ "رقصاں آئے گی کہاں جب شتماں سو جائے گی تب"۔۔۔ پھر اسے یقین ہونے لگتا کہ واقعی وہ رقصاں سے ملا تھا۔ اور وہ خواب نہیں حقیقت تھی اور پھر اس کی چارپائی پر ایک روغنی مانگ پھیل جاتی۔ یہ کیا رنم ہے کہاں۔ اور اس کے دل میں جذبات کی ایک بھیڑ لگ جاتی۔

"رقصاں دیوار پھاند کر آئے گی کہاں"۔۔۔ رات کو وہ اور وہ حیرانی سے پیتا سر کی طرف دیکھتا۔ اچھی چوری تھی یہ کہ گاؤں کی ہر جوان لڑکی کو معلوم تھا کہ رقصاں آئے گی۔۔۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا اور اس ایک ہنسی سے اس کا ابلتا ہوا جسم ٹھنڈے گوشت کی ایک جھیل بن گیا: "میں آگئی کہاں"۔۔۔ "میں آگئی" کمرے میں داخل ہوتے ہوئے وہ بولی: "دیکھا میں آگئی"۔۔۔ "ہاں" وہ اسے دیکھ کر ٹھٹھکی "تم تو جاگ پڑے ہو کہاں! تم نے تو کہا تھا تم جاگو گے نہیں۔۔۔ تم میرا خواب نہیں دیکھ رہے تھے نا۔"

رقصاں کی باتیں سن کر وہ میٹھی میٹھی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔۔۔ پھر دیوار پر نقش بناتے ہوئے بولا۔ "رقصاں تم میرے ساتھ چلو گی؟"

"کہاں؟" اس نے پوچھا۔

"میرے ساتھ شہر میں!"

"کیوں؟"

"وہاں ہم اکٹھے رہا کریں گے!"

"سچ!" وہ بولی۔

"ہاں"

"تم تصویریں بنایا کرو گے اور میں دیکھا کروں گی ہے نا کہاں!"

"ہاں" وہ بولا۔

"پر یہاں بھی تو تصویر بنا رہے ہو تم اور میں دیکھ رہی ہوں۔ یہاں کیا ہے!"

"یہاں تو۔۔۔" وہ سوچ کر بولا "یہاں تو تمہیں دیواریں پھاند کر آنا پڑتا ہے!"

"تو اس کا کیا ہے!"

"اگر تمہیں چوٹ لگ جائے تو!"

"تو کیا ہے، پھر میں اس پر ہلدی لگا دوں گی اور وہ ٹھیک ہو جائے گی!"

"تمہیں ڈر نہیں آتا!" اس نے پوچھا۔

"ڈر۔۔۔ کیوں ڈر کیوں آئے مجھے، تمہیں آتا ہے ڈر تم کچھ ہوتا کہاں تم یہاں رہ کر دودھ پیو اور مکھن کھاؤ تو تم تگڑے ہو جاؤ گے

پھر تمہیں ڈر نہ آئے گا۔"

"تم دودھ پلانی بھی تو نہیں ہو۔" اس نے اس کے جسم کی طرف اشارہ کر کے شرارت سے کہا۔

"یہ" اس نے حیرانی سے اپنی چھاتی کی طرف دیکھا۔ "تم کیا بچے ہو کہاں۔"

"ہاں ہاں میں بچہ ہوں۔" وہ چلایا۔

"میں کیا تمہاری ماں ہوں۔" وہ بگڑ کر بولی اور زیدی شرمندہ ہو کر خاموش ہو گیا۔ لیکن اس کے بدن میں اک آگ سی لگی ہوئی تھی۔ اس کی نس نس غرک رہی تھی۔ اور سرانگارہ سا شانوں پر دھرا تھا۔ اس کے باوجود وہ پورے دھیان سے تصویر مکمل کرنے کی کوشش میں لگا تھا —— بے بس ہو کر اس نے کھرپا کی ڈبی زور سے زمین پر دے ماری۔

"اوہوں" وہ چلایا "کیا مصیبت ہے۔"

"کیوں" وہ بولی "کیا ہے۔"

وہ نیچے اتر آیا۔ اور اس کے پاس آ کر تصویر کی طرف اشارہ کر کے بولا "یہ نہیں ہو گی۔ پھر اسے سوجھی۔ کیسے ہو سکتی ہے یہ۔"

"کیوں۔ بہت نرم ہے اس لئے۔"

"نہیں نہیں نہیں" وہ چلایا "نرم نہیں۔ یہ سب جو اسے ڈھانپے ہوئے ہیں۔" اس نے اس کی ریشمیں قمیص کو ہاتھ میں پکڑ کر کہا۔

"کیوں" وہ بولی "تم تو کہتے تھے تمہیں یہی دیکھے دکھتا ہے۔"

"دکھتا تو ہے" وہ بولا "لیکن جب تک یہ ہے یہ نہیں بنے گی۔"

"اچھا —— تو تم نے پہلے کیوں نہ بتایا مجھے۔" اس نے ایک ہی جھٹکے میں قمیص اتار کر پھینک دی اور پھر بانہیں چھاتی پر رکھ کر کھڑی ہو گئی زیدی نے لپک کر دیا اٹھا لیا۔ اور اسے قریب تر لے آیا "یہ کیا حماقت ہے۔" وہ بولا۔

"تم اسے ڈھانپ کیوں رہی ہو۔" اس نے اس کی چھاتی کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ" وہ شرما گئی "پتہ نہیں۔ اس طرح اچھا نہیں لگتا۔"

"کیوں نہیں اچھا لگتا۔" وہ چلایا۔ اس کا سر انگارے کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ ہتھیلیوں میں گدگدی ہو رہی تھی۔ اور اور بند بند شانوں سے پھٹا جا رہا تھا۔ ایک عزم کے ساتھ وہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جیسے پی کے آیا ہو۔ "کیوں نہیں اچھا لگتا۔" بولو۔

"ایسے لگتا ہے جیسے تم بچہ ہو اور اور میں میں تمہاری ماں ہوں —— کیوں کہاں میں تمہاری ماں نہیں ہوں نا۔"

"اسے پسینہ آ گیا۔ جیسے دفعتاً اسے کسی نے برفیلے پانی میں دھکا دے دیا ہو —— کچھ دیر تک وہ گم سا کھڑا رہا۔ پھر نہ جانے اسے کیا ہوا۔ اس نے بڑھ کر اس کے بالوں کو چوم لیا۔ "تم ماں ہو۔" وہ گنگنایا۔

"ماں" وہ حیرانی سے بولی۔

"تم نے مجھے جنم دیا ہے۔ تم میڈونا ہو۔" وہ گویا اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔

"یہ سب کیا ہے" وہ بولی "کیا ہے کہاں۔"

"کچھ نہیں" وہ مسکرایا۔ اور اس کے چہرے کو تھپکتے ہوئے بولا "اب تم جاؤ۔"

"کیوں" وہ بولی۔

"اب تو تمہارا دم نہیں لگتا نا۔"

"پھر وہ مسکرا کر بولا "اب نہیں رُکتا"

"تو اب تم جاؤ۔ اب دن ہونے کو ہے"

"بالکل چلی جاؤں" اس نے پوچھا۔

"ہاں"

رقصاں کے جانے کے بعد زیدی کا اضطراب گویا بالکل ختم ہوگیا۔ اس کی طبیعت میں ایک انوکھی لطافت پیدا ہو رہی تھی۔ لطافت اور تازگی وہ باہر نکل گیا۔ ریت کے پھیلاؤ پر صبح صادق کی روپہلی سپیدی یوں جھلک رہی تھی۔ جیسے ایک بڑے کٹورے میں دودھ چھلک رہا ہو۔ وہ وہاں کھڑا دیکھتا رہا۔

وہاں پھر وہ لیلیٰ کی تصویر کو مکمل کرتا رہا۔ اور کمان سے چھوٹی ہوئی آبنوسی جیسی لڑکیاں اس کے پیچھے دروازے میں اُسے گھورتی رہیں، انہیں کچھ بھی نہ جانے کیا سوجھی تھی پھر چوکھٹ پر چڑھ کر اس نے کان میں کوئی پیغام دے دیا تھی۔ پھر دھیمے تال میں مکھن کا کٹورہ رکھتے ہوئے کچھ بول رہی تھی مگر وہ اس تصویر میں کھویا ہوا تھا۔ اور اس کے گرد وہی دودھ کا منور پیالہ چھلک رہا تھا۔ جیسے وہ منظر اس کی روح پر ہمیشہ کے لئے کندہ ہو گیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں ہمیشہ کے لئے قائم ہو چکا ہو۔ اس کی رگ رگ میں ہلکا ہلکا سرور چھائے ہوئے تھا۔ دودھیا سرور۔

اسی رات آتے ہی رقصاں بولی "کہاں ہیں تمہارے ساتھ جاؤں گی"

"کہاں" وہ چلایا۔

"شہر۔ تم نے جو کہا تھا تم تصویر بنایا کرو گے اور میں دیکھا کروں گی" "اور گائیں گے کیا" وہ مسکرایا۔

"لیکن کھانے کو کیا وہاں کچھ نہیں ملتا۔ وہاں گائیں نہیں ہوتیں۔ پھر تو وہاں دودھ بھی نہ ہوگا"

"دودھ تو جتنا چاہو گے گائیں بھی ہوتی ہیں" وہ کھل کھلا کر ہنسا۔

"پھر؟"

"پھر انہیں خریدنے کے لئے پیسے کہاں سے آئیں گے"

"پیسے" وہ بولی "پیسے ہم لے لیں گے۔ میرے پاس بہت سے ہیں۔ اتنا بڑا ہار بنا کر رکھا ہے میں نے پیسوں کا"

"پگلی" وہ ہنسنے لگا "پیسوں سے کیا ہوتا ہے۔ وہاں تو سونا چاہیے"

"سونا" وہ سوچ میں پڑ گئی اور پھر دفعتاً چھلانگ مار کر باہر نکل گئی۔ ہائیں۔ زیدی اس کے جانے پر حیران تھا۔ پھر وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اس ریگستان میں ان آبنوسی کانوں کے درمیان اس سادگی اور پاکیزگی کا وجود۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے وہ تمام واقعہ محض خواب کی حیثیت رکھتا ہو اور پھر اس ناکتخدا تراش لڑکی کا کوئلے سے کھینچی ہوئی تصویر سے اس قدر متاثر ہونا —— دفعتاً گویا اس کا دل بیٹھ گیا۔ رضا اس کی نظروں کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ "میں اس بات پر بڑی سے بڑی شرط لگانے کو تیار ہوں۔" احساس خجالت سے اس کی پیشانی بھیگ گئی۔ ماں۔ نہ جانے اس کی ماں اس کے لئے کس قدر بے قرار تھی اور حسینہ۔ اور وہ ایک گہری سوچ میں پڑ گیا۔ لو میں آ گئی۔ رقصاں کا دم چڑھا ہوا تھا اس کے ہاتھ میں ایک گٹھڑی تھی "یہ لو" اس نے گٹھڑی کو چارپائی پر پھینک دیا۔ اور تمام چارپائی زیورات سے بھر گئی "اس سے ہم گائیں خریدیں گے پھر تو ہمیں دودھ کی کمی نہ ہوگی۔ کیوں کھان" زیدی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس نے کبھی اتنا سونا ایک ساتھ نہ دیکھا تھا۔ رقصاں حیرانی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"نہیں رقصاں" اس نے اسے آغوش میں لے لیا "تم میرے ساتھ نہ جاؤ۔ میں اکیلا شہر جاؤں گا"

"اچھا" وہ بولی "پھر میں کب جاؤں گی وہاں"

"جب تمہارا بیاہ ہو جائے گا تب"

"بیاہ ہو جائے گا" وہ بولی "نہ جانے بیاہ کب ہوگا"

"پھر تم وہاں میرے ساتھ چلنا۔ بھیرو۔ اب نہیں" زیدی اس کے بالوں کو پیار سے تھپکنے لگا۔

"پھر تم مجھے بیتے آؤ گے کہاں"

"ہاں"۔ یہ دیکھو تمہاری تصویر پوری ہو گئی ہے۔

"ہائیں" پہلی مرتبہ تصویر کی طرف دیکھ کر وہ مبہوت رہ گئی ——— اگلے دن شام کے وقت کماں کو وداع کرنے کے لئے وہ سب ناچ اور گا رہے تھے لیکن زیدی کو نہ جانے کیا ہوا تھا۔ اس جھونپڑوں کے جھنڈ سے جدا ہوتے ہوئے گویا اس کے دل میں ایک خلا پھیلتا جا رہا تھا۔ اور اس کی دھندلی نگاہوں تلے الاؤ کی سرخ روشنی میں وہ آبنوسی کماں سے اجسام حرکت کر رہے تھے۔ ان کی کمریں خم کھاتیں ابھار ابھرتے اور غلط ملط ہوتے بگڑتے چلے جاتے وہ آبنوسی جسم انگڑائیاں لیتے۔ دودھ کے کٹوروں سی آنکھیں۔ سرخ روشنی میں اچھلتیں اور سیاہ پنڈلیاں دائرے بناتی چلی جاتیں الاؤ کی روشنی میں دمکتے ہوئے وہ سنجیدہ چہرے تنے ہوئے چہرے اور ان میں وہ سادگی بھری نگاہیں۔ الاؤ کی کھلی ہوئی روشنی میں ان اجسام سے زندگی کی کرنوں کا پھوٹنا، ابلنا اور فطری رقص میں مردوں کا قالیت سے بھرپور انداز قیام اور دوشیزاؤں کا مسحور طرز خرام۔ مردوں کی آنکھوں میں وہ لہراتی ہوئی برقی لہر اور دوشیزاؤں کی وہ سیاہ چھلکتی ہوئی جھیلیں۔ زیدی بیل گاڑی پر کھڑا یوں اس منظر میں کھویا ہوا تھا گویا خواب دیکھ رہا ہو

"کہاں جا رہا ہے" انگھو کی آواز میں نمی سی تھی۔

"نہیں نہیں پاس ہی سے آواز آئی" کہاں جا نہیں رہا۔ وہ پھر آئے گا۔ کیوں کماں؟

اور زیدی کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

لاہور پہنچ کر زیدی سیدھا رضا کے پاس گیا "تم زیدی" رضا اسے دیکھ کر چلایا۔

"تم آ گئے۔ شکر ہے تم آ گئے زیدی"

"ہاں رضا" وہ احساس ندامت سے بول نہ سکتا تھا وہ چاہتا تھا کہ چیخ چیخ کر کہے رضا میں شرط ہار گیا۔ اس ہار میں کتنی بڑی جیت تھی۔ رقصاں ——— لیکن پیشتر اس کے کہ وہ کچھ کہہ سکے رضا اس سے لپٹ گیا "تم سچے تھے زیدی۔ میں نے وہ شرط ہار دی۔ وہ تمہاری بیوی نہیں بن سکتی۔ نہیں بن سکتی"

"رضا" زیدی چلایا "نہیں نہیں مجھے طعنے نہ دو"

"میں سچ کہتا ہوں۔ زیدی" رضا تڑپ کر بولا۔

"نہیں نہیں" زیدی چلایا "میں اپنی غلطی کا اعتراف کرنے آیا ہوں۔

"میں حسینہ سے شادی کروں گا۔ ضرور کروں گا" وہ باہر نکلتے ہوئے بولا۔

"تم۔ تم۔ اس سے شادی کرو گے! پاگل ہو گئے ہو۔ زیدی۔ زیدی"

رضا اس کے پیچھے بھاگا۔ لیکن زیدی باہر جا چکا تھا۔ زیدی کی نگاہ میں سڑک کی بتیاں یوں جل رہی تھیں جیسے الاؤ میں دودھ کے کٹورے چھلک رہے ہوں۔ بتیوں کے پیچھے وہ کماں سے انگڑائی نما جسم جھوم رہے تھے۔

مصنف:- وانگ مین
مترجم:- محمود جالندھری

# پُرانا بھیدی نیا وارث

میں دریا کے کنارے ایک خالی جھونپڑے میں رہتا ہوں۔ میرا تمام سروسامان کھانے پینے کی چیزوں کے تھیلے، دو دراز کے کیس اور کچھ نقشوں پر مشتمل ہے۔ سمجھا یہ گیا تھا کہ میں یہاں رہنی ارضیاتی مہم کا انتظار کروں جس نے دوسرے ضلع میں اپنا کام ختم کر لیا تھا۔ ارضیاتی مہم کی آمد کی مجھے بڑی توقع ہے۔ اسی لئے میں صبح سے شام تک اس جھونپڑے میں موجود رہتا ہوں۔ اگرچہ دریا کے اوپر کے حصّے کو دیکھنے کی دل میں بے پناہ تحریک ہوتی ہے۔ یہ ضلع ابھی تک دریافت نہیں کیا گیا سرسری نظر سے دیکھا جائے تو یہ ضلع ایک بیابان نظر آتا ہے۔ جب ہماری مہم یہاں پہنچ جائے گی تو ہم اسے پڑاؤ بنا کر ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے راستوں کا نقشہ تیار کریں گے اور پیمائشں کا آغاز کر دیں گے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ جس جگہ کا میں نے انتخاب کیا ہے بُری نہیں۔ یہ ایک کھلا سرسبز پہاڑی علاقہ ہے۔ علاوہ اس پہاڑ پر لکڑی کے بہت سے مکان ہیں۔ یہ گرمیوں کیلئے صحت افزا مقام ہے۔ پہاڑی چاروں طرف سے ایک تیز رفتار لیکن پایاب ندی کے حلقۂ آغوش میں کھڑی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ ندی وہ دریا میں گرنے کیلئے بیتاب ہو جس کی طرف یہ دیوانہ وار بڑھ رہی ہے۔ اس ندی کی تہ میں کنکر لڑھکتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ بھاری پتھر جو کائی کی وجہ سے سبز رنگ کے ہو گئے ہیں آگے ہی آگے ریکھتے بہتے ہیں کیونکہ یہ تیز بہاؤ کی مزاحمت نہیں کر سکتے۔ لمبی اونچی گھاس پانی میں تھرتھراتی اور بل کھاتی رہتی ہے جیسے وہ بھی اجتماعی حرکت میں حصّہ گیر ہونے کے لئے بیتاب ہو لیکن گھاس کی جڑیں اُسے سختی سے اپنی جگہ پر جمائے رکھتی ہیں۔ لمبی اُگی ہوئی گھاس تیزی سے بڑھتی ہوئی مچھلیوں اور شہتیروں کو روکنے کی بیسود کوشش کرتی رہتی ہے۔

ندی کے پار ایک ٹیلہ ہے۔

ٹیلے پر بھی ایسی ہی خاموشی ہے جیسی یہاں ہے۔ ہر کوئی مچھلیاں پکڑنے، شکار کھیلنے اور گھاس چھیلنے میں لگا ہوتا ہے۔

جب میں یہاں پہنچا تو میں مقامی باشندوں سے واقفیت پیدا کرنے کے لئے نکلا۔ میرا خیال تھا کہ ان جھونپڑیوں میں کوئی نہیں رہتا لیکن پھر میں نے ندی کے کنارے کچھ لڑکوں کو دیکھا۔ اُن میں سے ایک کے ہاتھ میں تین کانٹوں والا بھالا تھا اور دوسرے کے پاس مچھلیوں سے جھلملاتی ہوئی ٹوکری تھی۔

میں ان کے پاس پہنچا لیکن وہ لڑکے مجھ سے شناسائی بڑھانے کے شائق نظر نہیں آ رہے تھے۔ شاید اس علیحدگی پسندی کی وجہ میری وہ داڑھی تھی جو تین ہفتوں سے بڑھ رہی تھی۔ اس اجنبیت کی شاید یہ ہتھوڑا بھی تھا جو میں ایک ارضیاتی کارکن کی حیثیت میں اپنی پیٹی میں لٹکائے پھرتا تھا۔ ہتھوڑے کو ہر وقت یوں اپنے ساتھ رکھنے کی مجھے عادت سی ہو گئی تھی۔

آخر کار ایک جھونپڑی میں مجھے ایک بڑھیا ملی جس کے بال برف کی طرح سپید تھے اور اس کا چہرہ ایک جلے ہوئے سیب کی طرح سیاہی مائل تھا۔ اُس نے مجھے دلدوز نگاہوں سے دیکھا۔ اس کی نگاہیں مجھے اپنے اندر کھبتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ میں نے

اس سے وہاں کے باشندوں کے بارے میں کچھ پوچھنا شروع کر دیا۔ بوڑھی عورت نے اپنے حلق سے جلی ہوئی لکڑی کا [illegible] اور جب باتیں دھیان سے سننے لگی۔ پھر وہ اٹھی اور مٹی کے برتن میں نیم پنیر اور بالائی لے آئی۔ میں ہنسا اور تیزی کے ساتھ [illegible] پر کچھ پیسے رکھ کر گفتگو جاری رکھنے کی کوشش نہ کرتے ہوئے اپنی جھونپڑی میں واپس چلا آیا ——

میں جس جھونپڑی میں رہتا تھا وہ اس آبادی کی سرحد پر واقع تھی۔ یہ جھونپڑی ایک خیمہ نما گھر تھی۔ فراخ اور کشادہ چھت کے [illegible] چمنی کے قریب ایک شگاف تھا۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ تختے لگے ہوئے تھے۔ اور تختوں پر شیلف تھے۔ جن پر خانہ داری کا سامان پڑا تھا۔

میں اکیلا ہی اس جھونپڑی میں نہیں رہتا تھا۔ میرے ساتھ دس بارہ چڑیوں کے کنبے بھی رہتے تھے جو تختے کی دیواروں کے کنارے گھونسلے بنا کر رہتے تھے۔ جب پہلے پہل میں اس میں داخل ہوا تھا تو سب نے چیخ پکار شروع کر دی تھی اس قدر چیخ پکار کر رہی تھیں پریشانی پیدا ہوتا ہو چلا تھا۔ لیکن بعد میں ہم آپس میں گھل مل گئے۔ اور ایک دفعہ تو مجھے یہ خیال بھی گزرا کہ میں اپنے ان ساتھیوں کے ساتھ کسی ایک بڑے سے قفس میں مساوی طور پر رہنے لگوں۔ جب مجھے کوئی کام نہیں کرنا ہوتا تھا یا میں قصبوں کی نقل کرتے ہوئے تھک جایا کرتا تھا اس وقت میں کوچ پر لیٹ جاتا اور چھت کی طرف دیکھتے دیکھتے بڑی چڑیاں اپنے دیوار کے گھونسلوں میں سے اڑ کر چھت کے شگاف میں سے باہر جاتی اور آتی رہتیں۔ ننھے ننھے بچے گھونسلوں میں سے سر اٹھا کر اور اپنی چونچیں نکال کر چیں چیں کرنے لگتے۔ والدین چڑیاں اور چڑے گھونسلوں کے کنارے پر بیٹھ کر ننھے اپنے بچوں میں بڑی نیک نیتی کے ساتھ بانٹتے رہتے۔ اس کام سے فرصت حاصل کرنے کے بعد وہ اپنے پروں کو جھاڑتے۔ دیواروں کے گرد چکر کاٹتے اور پھر اسی شگاف میں سے گزرتے ہوئے باہر چلے جاتے۔

ایک دن شام کو —— میں اپنے کوچ پر لیٹا ہوا آرام کر رہا تھا اس وقت اٹھ کر اپنے لئے رات کا کھانا تیار کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا کہ باہر سے آتی ہوئی گھوڑے کی ٹاپ کی آواز سنائی دی۔ اور ایک منٹ کے بعد ایک آدمی داخل ہوا۔ میں اچھل کر بیٹھ گیا۔ کیا ہماری مہم کے باقی آدمی آ گئے ہیں۔

"شام بخیر صاحبزادے" وہ شخص بولا —— "اور تمہارے پاس تو کئی ایک صندوق ہیں۔ تم چڑیوں کو بھگا کیوں نہیں دیتے۔ آؤ باہر دھوپ میں آؤ۔ ذرا مجھے دیکھنے تو دو کہ تم کون ہو۔"

میں نے اس عجیب و غریب حکم کی اطاعت کی اور باہر آ گیا۔ جھونپڑی کے دروازے کے سامنے ایک گٹھے جسم کا پستہ قامت بوڑھا کھڑا تھا۔ اس کی سپید داڑھی نچتی نہیں ہوتی تھی۔ لیکن اس کی داڑھی یوں معلوم ہوتی تھی جیسے صابن سے صاف کی گئی ہو۔ وہ پروں والی ٹوپی اور کمبل کا سا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے جوتے پہننے کے قابل نہیں رہے تھے۔ تھوڑی ہی دور ایک بھاری گھوڑی اور ایک سبزہ بچھیرا گھاس چر رہے تھے۔

بہت سے مردوں کی طرح اس بوڑھے کے پاس بھی ایک خمیدہ چاقو اور کپڑے کی ایک تھیلی تھی جو اس کی پیٹی کے ساتھ لٹک رہی تھی۔ اس کی آنکھیں چھوٹی تھیں اور ان کا رنگ عنبریں تھا۔ اس نے میرا جائزہ کچھ اتنی لطف انگیز نگاہوں [illegible] طور پر یہ سوچنے کی کوشش کرنے لگا کہ میں نے اسے پہلے کہاں دیکھا ہے۔ مگر میرے ذہن میں وہ مقام ابھا مگر [illegible] رہا تھا۔

"سنو برخوردار —— تمہیں کسی ہرنی کی ضرورت تو نہیں"

"ہرنی ——" میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ اور یک بیک میں نے جھونپڑی کی کھونٹیوں سے بندھے ہوئے [illegible] تصویر بنا لی۔

[illegible] تھا۔

پسند کیا جاتا ہے — جہاں ہوا خوب چل رہی ہو۔ تم ایک تنگ راستہ چن لو۔ وہاں چھوٹے چھوٹے کچھ گڑھے کھود لو۔ ان میں نمک بھر کے اوپر سے ڈھک دو۔ ان سے تھوڑی دور ہٹ کر ایک جھاڑی کے پاس جھونپڑی بنا لو۔ رات کو شکاری اس جگہ جا بیٹھے — وہاں بیٹھ کر انتظار کرے۔ اس وقت بتی بجھی رہنی چاہئے۔ جتنی چھوٹی ہو زیادہ اچھا ہوگا۔ تاکہ ہرن انسانی قدموں کے نشان نہ دیکھ لے شکاری کو جھونپڑی میں آکر — ہلنا جلنا نہیں چاہئے — بالکل مردہ ہو جانے — البتہ آنکھیں کھلی رہیں اور کان آہٹ پر لگے رہیں۔ ہرن عام طور پر صبح کے وقت آتا ہے — اور وہ ایک منٹ میں ایک قدم اٹھاتا ہے۔ — وہ ایک قدم اٹھائے گا۔ پھر رک جائے گا اور سننے لگے گا۔ وہ سہما ہوا ہوتا ہے۔ شکاری رہ گذر سے دور بیٹھا رہتا ہے۔ پھر میرے دوست ہرن جھاڑیوں میں سے نکل کر اس تنگ رستے پر آجاتا ہے — وہ کھلی فضا میں دیر تک کھڑا رہتا ہے — ہوا کو سونگھتا رہتا ہے اور بہت چوکنا ہوتا ہے لیکن جب وہ نمک کے پاس پہنچتا ہے تو سب کچھ بھول جاتا ہے۔ وہ اپنے کھروں سے زمین کھودنے لگتا ہے۔ نمک کی مٹی کو چاٹنے لگتا ہے۔ اور جب وہ صاف نمک تک پہنچتا ہے تو ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ وہ اپنی کھردری زبان سے نمک چاٹتا رہتا ہے۔ نتھنے پھلاتا ہے۔ خوشی کے مارے سر ہلانے لگتا ہے۔ بس اس وقت تم نشانہ لگاؤ — آہستہ سے لیکن سینگوں کے بیچوں بیچ —"

جب یاغنم اپنی کہانی کے اس حصے تک پہنچا تو یکایک چپ ہو گیا اور خشم آلود لہجے میں بولا۔

"برخوردار مجھ سے اتنے سوالات پوچھنے کا مطلب؟ مجھے بھی تم سے ایک سوال کرنا ہے۔ اگر تم سننا چاہو تو"

میں ہنسا اور بولا — "پوچھو —"

"سب سے پہلا سوال تو یہ کہ تمہاری مہم کیا کرنے نکلی ہے؟ کیا سونا ڈھونڈنے؟ کیوں ٹھیک ہے نا؟" اسے شک سا ہو گیا کہ میں یہ بات چھپاؤں گا وہ مجھے کڑی نگاہوں سے گھورنے لگا۔

میں نے جواب دیا — "ہم اس ضلع کی معدنیات کا کھوج لگانے نکلے ہیں — یہ دیکھنے کے لئے کہ یہاں کیا کچھ پایا جاتا ہے۔ سونا چاندی کوئلہ — ہمیں ہر چیز سے دلچسپی ہے۔ عام پتھروں سے بھی — پتھروں سے بہت کچھ پتہ چل جاتا ہے۔"

"میں نہیں سمجھتا —" یاغنم نے دبی ہوئی ہنسی کے ساتھ کہا "کیا انٹوں سے بھی کچھ پتہ چلتا ہے"

اس نے غیر متوقع طور پر گفتگو کا موضوع بدل دیا۔

"ایک منٹ ٹھہرو — برخوردار — مجھے یہ بتاؤ کہ کیا تمہارا سردار کوئی دانشور انسان ہے — میرا مطلب ہے کہ پڑھا لکھا ہے —؟"

میں نے جواب دیا۔ "ہمارا سردار بہت ہوشیار ہے۔ تجربہ کار ہے اور جوشیلا بھی ہے"

"جوشیلے سے تمہاری کیا مراد ہے" — اس نے پوچھا۔

"میرا مطلب ہے کہ وہ آدمی جو اپنے کام سے محبت کرتا ہے۔ دنیا کی ہر چیز پر اپنے کام کو ترجیح دیتا ہے۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ میں بھی جوشیلا ہوں۔ شکار کرتا ہوں۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔

بوڑھے یاغنم کا شک میرے اعصاب پر سوار ہوتا جا رہا تھا۔

"سنو — بوڑھے میاں آخر تم ہو کون؟ اور یہاں کیا کر رہے ہو؟ تم ایک اجنبی ہو۔ یہی بات ہے نا؟"

"تم ٹھیک کہتے ہو برخوردار! میں یہاں کا رہنے والا نہیں ہوں۔ میں ایک کیمیا گر ہوں۔ بہت مشہور کیمیا گر۔ عام طور پر

ہر کام پر بغاوت رکھتا ہوں۔

وہ چپ ہو گیا اور پھر اس گمبھیرتا کے ساتھ چائے پینے لگا کہ میں اضطراب سا محسوس کرنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ میں نے بڑے دکھتی ہوئی رگ پر انگلی رکھ دی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ چائے اور شہد اس کے محسوسات کو فوراً مسحور کر دیں۔ چائے ختم کرنے کے بعد وہ اُٹھا اور چولہے کے گرد گھومنے لگا۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے۔ اس کی ایک ٹانگ دوسری ٹانگ سے ٹکرا جاتی۔ اس نے آگ کے گرد تین چکر لگائے اور پھر پاؤں ٹیک کر بھدی آواز میں بولا ــ

"کیوں کیا ہوتا بوڑھے دادا ــ"

"کچھ بھی نہیں ــ بور ہو رہا ہوں اور ٹانگیں کھول رہا ہوں ــ جب میں بہت دیر تک بیٹھا رہتا ہوں تو یہ ناچنا چاہتی ہیں۔ چائے بہت اچھی تھی۔ پائپ پینا مجھے زیادہ اچھا لگتا ہے ــ اچھا میں اب چلتا ہوں۔ کہیں سے تمباکو لاؤں۔"

"ٹھہرو ــ کیا تم رات یہیں گزارنا چاہتے ہو؟ شاید ٹیم کل یہاں پہنچ جائے۔" "کل وہ آ بھی سکتی ہے اور نہیں بھی ــ شاید کل بارش ہو۔ شاید برف پڑنے لگے۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ انتظار کروں۔"

"وہ ہرن تو مجھے دکھا دو ــ شاید ہم اسے خرید لیں ــ ہم تمہیں کہاں ڈھونڈیں گے؟"

"مجھے ڈھونڈنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں خود ہی چلا آؤں گا ــ میں اس سارے جنگل سے اس طرح واقف ہوں جس طرح اس جھونپڑی کو۔ میری فکر نہ کرو۔ میں اپنی گھوڑی یہیں چھوڑے جا رہا ہوں ــ" اس نے تیزی کے ساتھ اپنے پیالے تھیلے میں رکھے، کندھے پر بندوق لٹکائی اور رات کے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

مجھے اس کے چلے جانے پر افسوس ہوا۔ عجیب آدمی تھا۔

میں نے کھانے کے برتن صاف کیے۔ بالٹی کو دھویا اور جھونپڑی کے اندر جا کر اپنے صوفے پر لیٹ رہا۔ جب میری آنکھ کھلی تو جھونپڑی کے شگاف میں نیلے آسمان پر صبح جھلملا رہی تھی ــ میں نے دفعتاً ایک آواز سنی ــ

"برخوردار ــ بہت دیر تک سوتے رہتے ہو۔ سورج ابھی افق پر کود پڑے گا۔ یہ کیا ہے؟" بابا جھونپڑی کے وسط میں کھڑا تھا اور جغرافیہ کے نقشوں کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

"یہ اس ضلع کے نقشے ہیں ــ تم اتنی جلدی کیوں اٹھ گئے ــ" وہ نقشوں کو دیکھنے میں محو تھا اور اس نے میری بات کا جواب نہ دیا ــ اس نے ایک نقشہ اٹھایا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ وہ کوئی سوال کرنا چاہتا تھا لیکن ارادہ بدل دیا۔

"کتنا نفیس ہے۔ میں مانتا ہوں کہ تم اپنے کام میں ماہر ہو ــ" میں نے کپڑے تبدیل کیے اور پھر اس سے پوچھا۔
"ہاں تو بوڑھے میاں چائے پیو گے؟ یا دلیہ کھاؤ گے؟"

اس نے جلدی سے کہا۔

"ایک منٹ ٹھہرو برخوردار ــ دلیہ بھی کھائیں گے۔ مجھے تم سے ایک اور سوال پوچھنا ہے۔ کیا تم پارٹی کے ممبر ہو؟"

"میں ایک کومسومول ہوں ــ" میں نے حیرت سے جواب دیا ــ "کیوں؟"

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔ کومسومول بھی اچھے ہوتے ہیں۔"

"آخر بات کیا ہے۔ کوئی بھید ہو تو بتاؤ ــ" میرے منہ سے یہ جملہ نکل گیا۔ میں اب بے صبر ہو چکا تھا ــ "کچھ بتاؤ گے بھی ــ"

"تمہیں اتنی جلدی کیوں ہے؟ جلدی میں کام بگڑ جایا کرتا ہے۔ کپڑے پہن چکے ــ بہت خوب ــ اب تم میرے ساتھ چلو"

۱۔ کیمونسٹ لیگ کا ممبر۔

"لیکن کہاں —"

"ابھی تک سوال پوچھ رہے ہو — تمہیں اب تو اس بات کی فکر نہیں ہونی چاہیئے۔ میں نے حکم دیدیا ہے۔ ایک خوبصورت خاتون ابھی یہاں آئے گی اور وہ اس سارے سامان کی دیکھ بھال کرے گی۔ اور دوپہر تک ہم واپس آجائیں گے"

اُس نے میری بے اعتباری اور بے یقینی کو بھانپ لیا ہوگا اس لئے بولا۔

"تمہیں مجھ پر کوئی شک ہے برخوردار؟ تو پھر مجھے یہ کہنے دو کہ تم مجھے مطلق نہیں سمجھتے — یہ میرا کوئی اپنا کام نہیں۔ تمہارا بھی نہیں۔ یہ سرکاری کام ہے۔ حکومت کا۔ سمجھے؟"

میں کچھ نہیں سمجھا تھا۔ "ہم وقت ضائع کر رہے ہیں"، یاضم بولا۔ "میں راستے میں تمہیں سب کچھ بتادوں گا"

"اور وہ آگئی۔ وہ مسکراتی ہوئی۔ ہماری چوکیدارنی۔ وہ بچوں کو اس جھونپڑی سے دور رکھے گی"

یہ وہی بڑھیا تھی جس سے میں مل چکا تھا۔ اُس کے پتلے ہونٹوں میں پائپ دبا ہوا تھا۔ یاضم نے کچھ تمباکو اپنی ہتھیلی پر رکھ کر پھانکا، اور وہ بڑھیا چٹائی پر بیٹھ گئی اور جب معمولی غنودگی کا عالم اس پر طاری ہوگیا۔

"آؤ چلیں —"

"سنو بوڑھے میاں۔ کیا مناسب نہیں کہ تم مجھے بتادو کہ ہم کہاں جارہے ہیں۔ اور کس لئے جارہے ہیں"

"میں سب کچھ حقائق سے ثابت کرنا چاہتا ہوں۔ اور جاتے ہوئے میں تمہیں کیا دکھاؤں گا۔ میں تمہیں وہاں لے چلا ہوں جہاں میں کام کر رہا ہوں۔ تم چلتے چلو ——— اور نکتہ چینی چھوڑ دو۔ نہیں تو میں اپنی چیزیں اٹھاؤں گا اور یہاں سے چل دوں گا۔ سمجھے؟"

"اچھا چلو ———" میں نے کہا اور جھونپڑی سے پہلے نکلا۔

پہاڑیوں کے سلسلے پر سورج ابھی نمودار نہیں ہوا تھا۔ دھند جو رات کو پڑی تھی ابھی تک طوفان کی طرح چھائی ہوئی تھی۔ بھورے رنگ کا دریا۔ کے کنارے بھی جھنک بڑھے تھے۔ صرف پاس کے درخت صاف دکھائی دے رہے تھے۔ جب میں جھاڑیوں کے قریب سے گزرا تو میری ٹانگ جلی ہوئی لکڑی میں پھنس گئی — راکھ اُڑ کر فوراً زمین پر دوبارہ جم گئی۔ خنکی اور نمی زیادہ تھی۔ یاضم کی گھوڑی گھاس چر رہی تھی —

ہم جھونپڑی سے نکل کر بل کھاتی ہوئی راہ گزر پر ہولئے — دریا کے ساتھ ساتھ۔ دفعتاً ہم نے دور سے ایک چیخ سنی — "ہو — ہو —" "ہو — ہو —" یہ کوئل بول رہی تھی۔ کوئل جس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ صبح سویرے اُٹھتی ہے۔ صبح کو نمودار ہوئے دیر ہوچکی تھی — دھند کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی صبح ہی ہو۔

میرے اوپر کے جوتے سیاہ دکھائی دے رہے تھے۔ جھاڑیوں میں سے گرتے ہوئے شبنم کے قطرے میرے کندھوں اور میری پیٹھ کو بھگو چکے تھے۔ جب ہم جھاڑیوں کی ایک قطار سے گزر کر آگے بڑھے تو ہم نے دھند کو اُٹھتے ہوئے دیکھا۔ آسمان بتدریج نیلا اور صاف ہوتا جارہا تھا۔ سورج کی زرد روشنی خاردار میدان سے ٹکرانے لگی تھی۔ اور سبز شاخوں کو چمکاتی چلی جارہی تھی ٹنڈ منڈ درختوں کا جھنڈ جگمگا اُٹھا تھا۔

ہمارا راستہ دریا کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ دریا ہمیں نظر نہیں آرہا تھا لیکن ہم دریا کی قربت کو محسوس ضرور کر رہے تھے کیونکہ وہاں کی زمین ہمارے قدموں تلے دھنستی چلی جارہی تھی۔ اور پھر دریا کی سطح کبھی کبھی جھاڑیوں میں سے چمک اٹھتی تھی۔ گھورتی ہوئی آنکھ کی طرح۔

اور پھر ایک ٹیلے کے پیچھے غائب ہو گیا۔ وہ ہاتھ میں پھاوڑا لئے ہوئے نمودار ہوا۔ کدال ایک طرف رکھتے ہوئے اس نے اپنی پتلون کی پچھلی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کچھ ڈھونڈنے لگا۔ وہ اپنی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہا۔ اس کی جیب کی درزوں سے کوئی چیز جھلک رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس جیب میں وہ اپنا پائپ رکھتا ہے۔ تانبے کے خول میں — میرا خیال تھا کہ وہ سگرٹ سلگا کر میرے اشتیاق میں اور اضافہ کرنا چاہتا تھا لیکن میں غلطی پر تھا۔ پائپ کی بجائے اس نے جیب میں سے ایک چھوٹی سی تھیلی نکالی یہ تھیلی کاغذ کے لفافے میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس نے اس پڑیا کا ایک کونہ کھولا۔ اور اپنی کھردری ہتھیلی پر زرد رنگ کے کوئی ایک درجن کے قریب دانے بکھیر دیئے — یہ سونا تھا۔

"اتنا سونا صرف ایک مرتبہ چھان پھٹک کا نتیجہ ہے — برخوردار!" اس نے فخر کے ساتھ کہا۔

"یہاں سے" میں نے سرگوشی میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ کہاں ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے —" بوڑھے نے دبی ہوئی ہنسی کے ساتھ کہا — "پرسوں میں نے آخری معائنہ کیا تھا اس جگہ کا۔ میں نے ندی کی نچلی سمت میں دیکھ بھال کی تھی۔ اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ اوپر کی جانب تلاش جاری رکھوں۔ مجھے یقین ہونا چاہئے اس سے پہلے میں یہ تمہیں دے دوں۔"

"کیا اب وہ؟"

"یہ سونا۔ اور کیا" اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ "یہاں سونے کا انبار لگا دیا ہے۔ یہ سب میری دریافت ہے۔"

"کب —"

"کوئی ایک مہینہ ہوتا ہے میں یہاں شکار کی غرض سے آیا تھا۔ اور اس سے پہلے درندے کی تلاش میں چل کھڑا ہوا تھا اور اسے پالیا۔"

"کیا تم کافی کھدائی کرتے رہے ہو — ؟"

"صرف دو تین مرتبہ — اور پھر میں اس سے دور بھاگا۔ اسے پاکر میں کثرت سے شراب پینے لگا۔ اس لئے بھاگ گیا۔ اور شکار کو اپنا مشغلہ بنا لیا۔ میں واپس نہ آتا اگر ہمیشہ کے لئے یہاں سے نہ جانا ہوتا۔"

"جا رہے ہو۔ لیکن کہاں؟"

اس نے جواب میں اپنی تھیلی ہلائی۔

"کہیں بھی نہیں۔ پہلے تم اسے تو دیکھ لو۔ میں یہ سونا تمہیں دے رہا ہوں۔ دانوں کی طرف دیکھو۔ ننھی ننھی پتیاں ہیں۔ اور سب کی سب گیلی۔ ان دانوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا ذخیرہ دور نہیں۔ یہیں کہیں ہوگا۔ بات یہ ہے کہ یہ جو پتھریلی ہیں یہ جو پتھریلی پہاڑیاں ہیں انہی میں یہ چیز پائی جاتی ہے۔ لیکن اسے ڈھونڈ نکالنا تمہارا کام ہے۔ اور تمہارے سردار کا۔ میرا کام تو صرف اتنا ہے کہ یہ چیز تمہارے حوالے کر دوں۔ اور پھر تم اپنے سردار کے سپرد کر دیا۔ اور وہ اپنے سے کسی بڑے کو دے دے گا۔ اور اسی طرح یہ سرمایہ حکومت کے پاس چلا جائے گا۔ تم بولتے کیوں نہیں؟ یہ میں تمہیں صحیح مقام پر نہیں لایا! میرا تو خیال ہے کہ میں تمہیں منزل پر لے آیا ہوں۔"

جب وہ بول رہا تھا تو ساتھ ہی ساتھ آنکھیں بھی ملتا جاتا تھا۔ اور ان دانوں کو اپنی تمباکو سے لتھڑی ہوئی انگلیوں سے الٹتا جا رہا تھا۔

"اتنی جلدی بھی کیا ہے؟" میں نے کہا۔ "سردار ایک دو دن میں یہاں پہنچ جائے گا تم اسے سب کچھ بتا سکتے ہو۔ اور ہماری مدد کر سکتے ہو۔ تم ہمارے ساتھ رہنا۔"

"نہیں۔ برخوردار مجھ جانا ہے مگر سونا مجھے نرن تو میں کبھی کا پالا گیا ہوتا۔ میں اسے تحفتاً کر دینا چاہتا تھا۔ مجھے پتہ ہے کہ تم بھی تھکے ہوئے ہو۔ اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ تمہارے ساتھ چلوں۔"

اب مجھ پر یہ راز کھلا کہ بوڑھے نے کو مسوپل اور فصلوں کے بارے میں مجھ سے کیوں پوچھا تھا۔ وہ مجھے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ جو ہرن کو نمک سے پکڑنے کی کہانی اس نے سنائی تھی وہ جھوٹی تھی۔ وہ تو مجھ سے شناسائی پیدا کرنا چاہتا تھا۔

میں نے اسے باز دیسے کرتے ہوئے کہا " تم نے بوڑھے والا بہت بڑا کام انجام دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے بتاؤ۔ آؤ ذرا بے تکلفی سے کام لیں۔ تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ اور تم کہاں رہتے ہو۔ ایسا کون واقعہ ہوا ہے کہ تم یہ پر مجبور ہوئے۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ جب تم کسی کو تحفہ دینا شروع کرو تو تمہیں دوسرے بھی جانا پڑتا ہے۔ یہی مطلب ہے تمہارا؟"

اس نے دبی ہوئی ہنسی کے ساتھ کہا " برخوردار بات یہ ہے کہ جتنے بھی کنبے ہماری بستی میں ہیں وہ سب کے سب نہایت اچھے مزدور ہیں۔ لیکن میں ان سب میں سے ہوشیار ہوں۔ میں اپنے بیٹے سے ڈر پڑا ہوں جو کو لکھوز کا صدر ہے وہ مجھ پر بھی حکومت کرنا چاہتا ہے۔ میں اس سے کوئی بات کرنے کو کہتا ہوں تو وہ انکار کر دیتا ہے۔ میں نے بہت برداشت کیا ہے لیکن اب تو پانی سر پر سے گزر گیا ہوا ہے۔ کوئی پیشہ ایسا نہیں ہے جسے میں نہ جانتا ہوں۔ میں پروں والے کوٹ بنا لیتا ہوں۔ شکار کر سکتا ہوں ...."

"ہاں تو یہ ہے ہماری زندگی۔"

"کیا تمہیں گھر چھوڑے ہوئے کافی عرصہ ہو چکا ہے؟"

"چار مہینے ہو چلے ہیں۔ میں بڑا ضدی ہوں لیکن میرا بیٹا مجھ سے بھی زیادہ ضدی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ میں خود واپس آجاؤں گا۔ اور اس کی نظروں میں گر جاؤں گا لیکن میں ابھی تک اپنا سر اونچا کئے ہوئے ہوں۔ کولکھوز کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا پھر مجھے کہیں سے پتہ چلا کہ اسے حد سے پیسے بنانے کا آرڈر ملا ہے۔ اور یہ پیسے ایک مہینے کے اندر اندر تیار ہو جانے چاہئیں۔ مجھے تشویش ہونے لگی کہ کیا ہو گا اگر وہ ایسا نہ کر سکے۔ کیا ہو گا۔ اگر کولکھوز کو بعد میں بدنامی آئے۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے اپنے جذبہ فخر کو ایک طرف رکھا اور واپس جانے کا تہیہ کر لیا۔" یاضم نے سرد آہ بھری اور سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"لیکن اس سونے نے مجھے روکے رکھا۔ پھر بھی میرا خیال درست نکلا۔ تم انفرادی طور پر کام کئے جانے کے بارے میں کچھ سن رہا ہے برخوردار ــــ یعنی ہر کسان اجتماعی کھیتوں پر کام کرنے والا کسان اپنے حصے کی اراضی کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اگر وہ اپنے کام میں گڑبڑ کرتا ہے۔ اچھی فصل نہیں اگاتا تو اسے لوگوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ وہ بچارا چھپ بھی تو نہیں سکتا۔ تم ہم سب جو کہ نہیں رہال کر کام کرنے سے بہتر کوئی طاقت نہیں۔ میں اب واپس جا کر اپنے بیٹے کی اکٹھی فصل کو جھٹک کر رکھ دوں گا۔ میرا تو خیال ہے کہ اب اسے ہوش آ گئی ہو گی۔" یاضم نے وضاحت تک بھول چوڑا اٹھ " اچھا تو اب باتوں کو ختم کریں۔ کیونکہ یہاں باتیں کرنے نہیں آئے۔ تو یہ تھیلی لے لو۔ یہ میں تمہیں دے رہا ہوں۔ ہم اس کا اچھی طرح معائنہ کریں گے۔ آخر یہ کام بھی تو حکومت کا ہے۔"

ہم ہری کے ساتھ ساتھ کرتی تین قدم اور نیچے کی طرف اتر گئے۔ اور میں نے راستے میں ایک تازہ کھدا ہوا گڑھا دیکھا۔ اس گڑھے کی دیواروں میں سے پتھر اور درختوں کی جڑیں باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ اور اس کے اندر ریت کی ایک موٹی تہ تھی۔

"یہ پھاوڑا لو۔ تم خود اس کا معائنہ کرو۔"

میں گڑھے میں کود پڑا۔ اور پھاوڑا بھر کے مٹی باہر پھینک دی۔ اور پھر اس گڑھے کے کنارے پر جا کر بیٹھ کر یاضم کی

(بقیہ صفحہ ۴۱۲)

[illegible]

# غزل

گھروں میں راہوں میں کھیتوں میں خوں اچھال دیا
کہاں سے لائے تھے اور کس ڈگر پہ ڈال دیا

ہر ایک سمت وہی تیرگی، وہی کہرا ———
وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم نے وطن اجال دیا

نئے وطن نے انہیں اور کچھ دیا ہو گا
ہمیں تو سلسلۂ صبر ماہ و سال دیا

مشقتیں شب و روز اور فاقے صبح و مسا
متاعِ محنتِ آزاد نے بھی کال دیا

حسین ماضی پہ مت جاؤ، ارتقا نے سدا
عروج دے کے ہر اک دور کو زوال دیا

حیات اس کی ہے نام اس کا، قدر اس کی ہے
کہ جس نے وقت کے سانچوں میں خود کو ڈال دیا

نظر کل ان کو مرا حکم ماننا ہو گا
جنہوں نے آج مری التجا کو ٹال دیا

عزیز اختر

# غزل

لٹا کر مرے دردِ دل کا خزانہ
نویدِ سکوں دے رہا ہے زمانہ

سلامت ہیں جیب و گریباں و دامن
ابھی خام ہے عاشقی میں زمانہ

نہ ہو جائیں گمراہ جذبِ طلب کے
سنا دل کی دھڑکن کا کوئی فسانہ

ہوئے سرد جذباتِ آتش نشینی
یہ کس لے میں گانے لگا ہے زمانہ

مجھے موج و طوفانِ دریا کا کیا ڈر
بھنور کے سفینے پہ ہوں میں روانہ

نکالا ہے میں نے سمندر کی تہ سے
وہ موتی کہ جس کا نہیں اور دانہ

شمیمہ منصور قریشی

# غزل

چمن چمن پہ چھا گئیں جوان سرسراہٹیں
فضا میں پھیلتی گئیں حسین جگمگاہٹیں

وہ دن بھی تھے کہ زندگی سرور ہی سرور تھی
یہ دن بھی ہیں کہ بجھ گئیں لبوں کی مسکراہٹیں

شکستِ سازِ غم مہیبِ دور کی نقیب ہے
بہیں گی اشک بن کے سوزِ شب کی گنگناہٹیں

دل و نگاہ کو فریب دے کے جا رہے ہیں وہ
مچل رہی ہیں ہر قدم لطیف جھنجھناہٹیں

یہ صبح و شام کا حسین امتزاج دیکھ کر
شباب بن کے چھا رہی ہیں دل پہ گنگناہٹیں

مجید علوی

# غزل

غمِ جاناں کو ابھی اور ابھر جانا تھا
زہر بن کے مری رگ رگ میں اتر جانا تھا

آج تو اُن کی نگاہوں میں بھی تھا لطف و کرم
آج تو گردشِ دوراں کو ٹھہر جانا تھا

کس نے کھایا نہیں مکارِ فسوں گر کا فریب
ہم نے بھی اپنے ہی رہزن کو خضر جانا تھا

وعدہ ملنے ہی ہمیں نقصِ کتاں ہونا تھا
وعدہ دیتے ہی نہیں صاف مکر جانا تھا

اُن کا آنا بھی تھا ہنگامۂ محشر کی مثال
اُن کا جانا بھی قیامت کا گذر جانا تھا

ابنِ سعید

# ویران کشیدگاہیں

## تمثیل کے افراد:-

شریفہ ——————————
بلقیس ——————————
میہدیل ——————————
اسد ——————————
خالدہ ——————————
اور ایک بہرا ——————————

زمانہ حال۔ گو شریفہ، بلقیس، میہدیل، اسد اور خالدہ ایسے افراد ہیں جو کسی بھی زمانے میں پیدا ہو سکتے ہیں

(میں اس تمثیل کے عنوان کے لئے اشرف کے اس مصرعے کا ممنون ہوں کہ
——— تری کی ویران کشیدگاہوں کے راستے میں ——— لیکن اس تمثیل کے پلاٹ اور کردار محض تخیلی ہیں اور کسی اصلی مسودہ یا واقعہ سے مماثلت محض اتفاقی ہے۔)

**منظر:-** پردہ اٹھتا ہے۔ تو ایک چھوٹے سے خوشنما ہوٹل کا وسیع برآمدہ نظر آتا ہے۔ برآمدے کی چھت اونچی ہے اور جس کے دونوں طرف اونچے اونچے ستون ہیں۔ ستونوں پر پھولوں کی بیلیں چڑھی ہوئی ہیں۔ بعض بیلیں اوپر چھت تک چلی گئی ہیں۔ برآمدے کے ایک طرف یعنی سٹیج کے پچھلے حصے میں ایک دلکش وادی ہے۔ جو نظر نہیں آ رہی۔ لیکن اس کا ذکر بار بار مختلف افراد کرتے ہیں۔ وادی کے چاروں طرف پہاڑوں پر اگے ہوئے اونچے اونچے دیودار اور چیڑ کے درختوں کی چوٹیاں بھی نظر آ رہی ہیں۔ ان سے بھی اوپر گہرا نیلا آسمان ہے۔ جس میں سفید جھاگ جیسے بادلوں کے ٹکڑے تیر رہے ہیں۔ کبھی کبھی ایک آدھ پہاڑی پرندہ بھی پر پھڑپھڑاتا نظر آ جاتا ہے۔ غرضیکہ فضا پوری طرح کوہستانی ہے۔ اس فضا میں سکون اور خاموشی ہے۔

اگر کوئی ہوٹل یا سٹیج کی پچھلی طرف کھڑا ہو تو نیچے پھیلی ہوئی وادی کو دیکھ سکتا ہے۔ اس ہوٹل کی شہرت ایک حد تک اس خوشنما برآمدے ہی سے نظر آنے والی اسی لینڈ سکیپ پر مبنی ہے۔ اور بیکار رئیسوں، ناکام محبت کرنے والوں اور بوڑھے قسم کے شاعروں، افسانہ نگاروں اور آرٹسٹوں میں یہ لینڈ سکیپ بہت مقبول ہے۔

برآمدے میں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے چھوٹی چھوٹی بید کی میزیں بچھی ہیں۔ جن پر خوشنما رنگوں کی پیالیاں۔ گلاس وغیرہ بے ترتیبی سے پڑے ہیں۔ میزوں کے گرد بید کی کرسیاں ہیں۔ جن پر رنگ برنگ کے کشن رکھے ہوئے ہیں۔ پردہ اٹھنے پر تمام میزیں خالی نظر آتی ہیں۔ برآمدے میں بھی بالکل خاموشی ہے۔ کبھی کبھی دور کہیں پرندوں کے چہکنے کی آواز سنائی دے جاتی ہے۔ صبح کی نرم نرم دھوپ کی ترچھی ترچھی کرنیں برآمدے میں ایسے داخل ہو رہی ہیں جیسے کسی نازک چلمن میں سے چھن چھن کر آ رہی ہوں۔

پردہ اٹھنے کے چند لمحوں بعد شریفہ ہلکے ہلکے قدم اٹھاتی ہوئی داخل ہوتی ہے۔ عمر کوئی چوبیس پچیس برس۔ خوش شکل چہرے سے ذرا جذباتی طبیعت کی معلوم ہوتی ہے

نگاہیں ایسے بے رنگ رہی ہیں جیسے وہ خالی الذہن ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں کوئی انگریزی رسالہ ہے اور دوسرے ہاتھ میں تاشوں کے دو پیکٹ ہیں۔ اس کے ہاتھ کی لمبی لمبی خوبصورت انگلیوں نے تاش کے پیکٹوں کو مضبوطی سے دبا رکھا ہے جیسے ان کو کسی قیمت پر بھی کھو دینا نہ چاہتی ہو۔ وہ ہلکے ہلکے قدم اٹھاتی ہوئی بائیں ہاتھ کے دروازے سے داخل ہوتی ہے۔ اور سٹیج کی پچھلی طرف جاتی ہے۔ اس سے ذرا پیچھے ہوٹل کا ایک بیرا داخل ہوتا ہے۔ شریفہ بیرے کی جانب پیچھے مڑ کے دیکھتی ہے۔ اور اس کی استفہامیہ نگاہوں کے جواب میں گرم گرم کافی کا آرڈر دے کر ایک ستون سے لگ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ تاکہ باہر پھیلی ہوئی لینڈ سکیپ کو دیکھ سکے۔ پھر آہستہ آہستہ بولتی ہے۔ جیسے خود اپنے سے مزے لے لے کر کہہ رہی ہو)

شریفہ:- یہ وادی کتنی پیاری ہے! ــــ یہ لینڈ سکیپ کتنی خوبصورت ہے! ــــ شاعری کی طرح پُرسکون! ــــ (ذرا رک کے) ــــ شاید ایک انسان کو اپنی زندگی میں بہت کم چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے ــــ مجھ کو ــــ شریفہ کو صرف یہ ہوٹل درکار ہے، اس کا یہ خوشنما برآمدہ درکار ہے۔ اور اس سے باہر پھیلی ہوئی یہ پُرسکون وادی! اور پھر میں اپنی تمام زندگی گرم گرم کریم پڑی ہوئی کافی پیتے ہیں بسر کر سکتی ہوں۔ مجھے کسی اور چیز کی خواہش نہیں ہے! ــــ (پھر چونک کر چاروں طرف دیکھتی ہے۔ گویا اطمینان کر رہی ہو کہ کسی نے اس کو یہ سب کچھ کہتے تو نہیں سُنا۔ بیرا خاموشی سے آتا ہے۔ اور ایک میز پر کافی کے برتن رکھ کر چلا جاتا ہے ــــ شریفہ اپنی اُسی مُردہ چال سے میز کے پاس آ کر ایک کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔ اس کا ایک رُخ دیکھنے والوں کی طرف ہے، ساتھ وہ اپنی گردن کو ذرا سا گھما کے پچھلی طرف لینڈ سکیپ کو بھی دیکھ سکتی ہے وہ انگریزی رسالہ ایک اور کرسی پر رکھ دیتی ہے۔ اور تاش کا ایک پیکٹ کھول کے پتوں کو بے خیالی میں آہستہ آہستہ پھینٹنے لگتی ہے پھر پتوں کو "پیشنس" کے لئے چن دیتی ہے۔ اور پھر اسی دھیمے لہجے بولتی ہے)

شریفہ:- میں اس وادی کو دیکھ سکتی ہوں، اس کے درختوں میں سے آتی ہوئی معطر ہوا کے جھونکوں کو اپنے گالوں پہ محسوس کر سکتی ہوں اور "پیشنس" کھیل سکتی ہوں اور کافی پی سکتی ہوں! ــــ پھر مجھے اپنی زندگی میں کیا چاہیئے! ــــ اور اسلم کو وہم تھا کہ اس کے بغیر میں مر جاؤں گی! ــــ گویا عورت محض ایک اقتصادی مسئلہ ہی تو ہے۔ کریڈٹ بڑھ جائے تو وہ مسئلہ سلجھ جاتا ہے، اور گھٹ جائے تو مسئلہ الجھ جاتا ہے۔ اور عورت ہوا نکلے ہوئے غبارے کی مانند بے جان پڑ جاتی ہے! ــــ (ذرا وقفے کے بعد کافی کا ایک گھونٹ لے کر) اب مجھے اس وادی کو دیکھنے رہنے کی فرصت ہے تاش کھیلنے رہنے کی فرصت ہے۔ بلکہ اگر میں چاہوں تو آپ شاعری بھی کر سکتی ہوں! ــــ

شریفہ پھر اپنے کھیل میں مشغول ہو جاتی ہے۔ وہ یہ کھیل بھی آہستہ آہستہ سُستی کے ساتھ کھیل رہی ہے۔ بلقیس تیز تیز قدموں سے داخل ہوتی ہے۔ یہ چھوٹے قد کی ذرا فربہ عورت ہے آنکھوں میں ایک طرح کی چمک ہے۔ لباس کے رنگ گہرے اور شوخ ہیں۔ بال فیشن ایبل طریقے پر کٹے ہوئے اس کے دونوں شانوں پر بکھرے ہوئے ہیں، ہونٹوں پر گہرے رنگ کی لپ سٹک ہے۔

بلقیس:- اوہ، ہلو! مسز اسلم! ــــ بلکہ سابق مسز اسلم، آپ اکیلی پیشنس کھیل رہی ہیں؟ ــــ (اور آکر شریفہ کے ساتھ میز پر بیٹھ جاتی ہے، بلقیس ہمیشہ ذرا تیزی کے ساتھ گھبرا کے باتیں کرتی ہے) ــــ مگر میں تو سمجھتی ہوں کہ آپ کو پیشنس نہیں کھیلنی چاہیئے۔ اس سے تو خواہ مخواہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ اپنی انفرادی زندگی سے اکتا گئی ہیں۔ یہ کھیل انسان اسی وقت کھیلتا ہے جب کسی شخص کا یا کسی بات کا انتظار کر رہا ہو! ــــ اور ظاہر ہے ایک بار قانونی علیحدگی اختیار کرنے کے بعد آپ کو اسلم کا بالکل انتظار نہیں کرنا چاہیئے!

شریفہ:- اسلم کا انتظار کون کم بخت کر رہا ہے۔ میں تو اب اپنے میں داخلی طور پر گہری دلچسپی محسوس کرتی ہوں۔

بلقیس:- میں تو ویسے ہی آپ کو متنبہ کرنا چاہتی تھی۔ اگر آپ یہ کھیل کھیلتی رہیں تو خواہ مخواہ دیکھنے والوں کو یہ محسوس ہو گا کہ آپ اپنے ہی سے اکتا گئی ہیں، اور کسی بات کا انتظار کر رہی ہیں، اور یوں بعض دفعہ کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ جاتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی نوجوان آپ کو یوں پیشنس کھیلتے دیکھ لے تو فوراً اپنا الو سیدھا کرنے کی غرض سمجھ بیٹھے گا۔ کہ آپ کے انتظار کی گھڑیوں کو ختم کر دے، اور پھر وہ ایسی چالیں چلے گا کہ آپ اپنے آپ کو تاشوں کے بجائے اس

خوبصورتی میں دلچسپی لیتے ہوئے باتیں کی ہوں ایسی صورت میں کوئی مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔ لہذا آئیے میرے ساتھ ہو کر کھیلئے —— اور اب آپ کو مسز اسلم کہنا آپ کی توہین سمجھتی ہوں۔ اب جبکہ آپ اسلم سے جو کوئی بھی وہ صاحب ہیں قانونی علیحدگی اختیار کر چکی ہیں تو صرف آپ کو آپ کے نام؟ ——— اب ——— آپ کے نام شریفہ سے مخاطب کیا کروں گی، تو آؤ شریفہ، شیر آؤ ہم دونوں پول کھیلیں۔ تم نے سنا ہوگا کہ اچھے پول کھیلنے والوں کے چہروں سے کسی جذبے کا اظہار نہیں ہونا چاہیئے۔ اور ہم کو بھی چاہیئے کہ ہم اپنے جذبات کا خواہ مخواہ اظہار نہ کریں کہ لوگ کیوں جانیں کہ ہم لوگوں کے اس شادی کی مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بعد کیا جذبات ہوتے ہیں!

شریفہ:۔ (چونک کر) اوہ — آپ بھی!

بلقیس:۔ ہاں مجھ کو مبارک باد دو، میں بھی! —— مجھ کو ابھی ابھی اپنے وکیل کا تار ملا ہے کہ اب میں آزاد ہوں —— اس بیوقوف نے مہر کا پورا روپیہ بھی میرے نام بنک میں داخل کرا دیا ہے۔ بلکہ وکیل نے لکھا ہے کہ انہوں نے طلاق نامے پر دستخط کرتے وقت جوشیلے لہجے میں اس بات کا بھی اعلان کیا۔ کہ ان کی مجھ سے بے پناہ محبت کا سب سے بڑا ثبوت یہی ہے۔ کہ وہ بغیر میرے تقاضہ کئے مہر کی پوری رقم میرے حوالے کر دیں گے —— تو شریفہ ڈارلنگ، میں آزاد ہوں تمہاری طرح —— اور زندگی کس قدر وسیع ہے۔ آؤ پول کھیلیں۔

(شریفہ کا منہ حیرت سے کھل جاتا ہے اور وہ صرف تعجب سے صرف اوہ! کہہ پاتی ہے۔ مگر پھر فوراً اپنے پر قابو پا لیتی ہے۔ اور ایسا ظاہر کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ جیسے وہ بھی بلقیس کی طرح اس وسیع زندگی کی قائل ہے۔ اور اس کے معاملے میں ایک بے پناہ دلچسپی محسوس کرنے لگتی ہے)

شریفہ:۔ اوہ کمال ہے! آپ نے مسز —— !

بلقیس:۔ اب مسز وسز کچھ نہیں —— میں صرف بلقیس ہوں۔

شریفہ:۔ —— تو بلقیس، تم نے مجھ کو بالکل بتایا بھی نہ تھا کہ تم بھی یہاں اس وجہ سے آئی ہوئی ہو۔ اب مجھ کو تم سے مل کر کس قدر خوشی ہو رہی ہے۔

بلقیس:۔ ہاں دراصل میں اس خبر کو تمہارے لئے ایک دلچسپ انوکھا پن بنانا چاہتی تھی۔ میں تمہارا قصہ تم سے سن چکی تھی۔ اور دل ہی دل میں فخر محسوس کرتی تھی۔ کہ میں بھی تم کو اسی قدر دلچسپ قصے سنا سکوں گی۔ مجھ کو بھی تم سے بے حد یگانگت محسوس ہوتی ہے۔ جیسے ہم دونوں برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں اور پھر عرصے کے لئے ایک دوسرے سے جدا رہے ہوں! —— آؤ پول کھیلیں۔

(بلقیس پول کے پتے بانٹنے لگتی ہے ساتھ ساتھ بولتی بھی جاتی ہے)

بلقیس:۔ مجھ کو تو ہمیشہ سے یہ پتہ تھا کہ محمود میرے لئے قطعی ناموزوں ہے۔ اس میں کوئی تخیل ہی نہیں ہے اور میری ہمیشہ سے یہ خواہش تھی کہ میں اپنے تخیل سے اس تمام زندگی کو ایک زبردست کامیابی اور فتح بنا ڈالوں اور زندگی کو ایک طوفانی قوت سے اپنے قابو میں کر لوں —— اور وہ بیوقوف تو صرف ایمانداری کے ساتھ سڑکوں کی انجینئری ہی کر سکتا ہے۔ سڑکوں کی تعمیر اور تخریب کے لئے سیدھے پلان بنایا کرتا ہے۔ میری تمام تخیل ضائع ہوتی ہے۔ میں تو زندگی کو ایک زبردست قوت کا نام سمجھتی ہوں اور یہ قوت صرف تخیل کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے!

(شریفہ ایک خاموش سنجیدگی کے ساتھ بلقیس کی باتیں سن رہی ہے۔ جیسے وہ کسی بہت گہرے راز سے واقف ہو رہی ہو)

محمود اس قوت کی موجودگی تک سے بے خبر تھا! —— مجھ کو اپنی زندگی سیمنٹ کی ایک سڑک کی طرح سپاٹ اور بے کیف معلوم ہو رہی ہے اور مجھ کو اس بات کا بھی بہت ڈر تھا۔ کہ اسی سپاٹ اور بے کیف سڑک کے اختتام پر میری زندگی بھی ختم ہو جائے گی —— مگر اب —— اب تو میں فرصت کے ساتھ اپنی زندگی کے بارے میں پلان بنا سکتی ہوں۔ میں اپنے تمام پلان یکجا کرنے کی غرض سے ہی یہاں اس خوشنما علاقے میں آئی ہوں۔

شریفہ :- ہاں واقعی یہ علاقہ بہت خوشنما ہے۔ (وہ اب بھی مدہم لہجے میں بول رہی ہے جیسے کسی [illegible] بات کو [illegible] اپنے آپ سے کہہ رہی ہو) اس وادی کا منظر بہت حسین ہے میرا خیال ہے میں تو اپنی تمام زندگی اس کو دیکھتے دیکھتے [illegible] بلکہ بعض دفعہ میں سوچتی ہوں کہ میں اس لینڈ سکیپ کو دیکھتے دیکھتے شاعری بھی کر سکتی ہوں یا اگر شعر نہیں کہہ سکوں تو کم از کم [illegible] خیالات ضرور میرے دماغ میں چکر لگتے رہتے ہیں۔ براؤننگ اور شیلی کی نظمیں میرے دماغ میں گونجتی رہتی ہیں ——— اور مجھ کو یہ احساس بہت انوکھا معلوم ہوتا ہے ——— بلقیس تم کو یقین نہ آئے گا۔ اب سے پہلے صرف ایک بار میں نے اس احساس کو اپنے میں موجود پایا ہے۔ اور وہ اس وقت تھا جبکہ اسلم نے پہلی بار مجھ سے شادی کی خواہش کی

بلقیس :- (گہرے تعجب سے)۔ اچھا! ———

شریفہ :- ہاں یہ احساس مجھ کو آج تک اچھی طرح یاد ہے۔ عجیب، انوکھا، نامعلوم، ناقابل بیان احساس۔ اور مجھ کو وہم ہوا تھا۔ کہ اس کے دل میں بھی یہ احساس موجود ہے ——— اور میں نے اس سے شادی کر لی تھی۔

بلقیس :- اور یہی تمہاری زندگی کی سب سے بڑی غلطی ثابت ہوئی! دراصل میرا خیال ہے کہ ان مردوں کو عجیب عجیب ترکیبیں آتی ہیں۔ ان میں غالباً ایک ناؤ حس ہوتی ہے جس سے وہ اپنی مخالف جنس کے افراد کے بعض خیالوں کو بخوبی سمجھ لیتے ہیں اور ان کو یقین [illegible] ہیں کہ ان کے دلوں میں بھی بالکل یہی خیالات موجود ہیں ——— ان کی یہ زائد حس بہت خطرناک ہوتی ہے۔ اسی لئے تمہارا یہ احساس بھی بہت خطرناک ہے تم کو جلد سے جلد ان شاعرانہ احساسات کو اپنے سے دور ہٹا دینا چاہیئے ——— میرا خیال ہے شریفہ تم ان کو دور کرنے کے لئے کوئی ایسا شغل اختیار کر سکتی ہو۔ جو تمہارے دماغ کو یوں بھٹکنے نہ دے۔

شریفہ :- مثلاً؟

بلقیس :- مثلاً نٹنگ شروع کر سکتی ہو!

شریفہ :- نٹنگ! کبھی نہیں! ——— نٹنگ سے تو میرے دماغ میں اور بھی عجیب عجیب خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً مجھ کو یہ محسوس ہوتا ہے۔ کہ میں جو کچھ بھی بن رہی ہوں وہ اپنے لئے نہیں بلکہ کسی اور کے لئے ہے! ——— اور مجھ کو اپنی بیکار محنت پر کچھ افسوس سا ہونے لگتا ہے پھر بعض دفعہ مجھ کو یہ احساس بھی بری طرح گھیر لیتا ہے کہ نٹنگ کبھی مکمل نہیں ہو سکتی ہے جیسے جو لوگ نٹنگ کرتے ہیں وہ چیز مکمل نہیں کرتے ہیں ——— اور یہ بھی مجھ کو کافی پریشان کرنے والا احساس معلوم ہوتا ہے!

بلقیس :- ہاں پھر تو تم کو نٹنگ بھی نہیں کرنی چاہیئے! ——— کبھی تم خواہ مخواہ کسی ایسے شخص کی تلاش شروع کر دو۔ جس کے لئے تم اپنی نٹنگ ختم کر سکو یوں تو تم غالباً ایک بار پھر عجیب مشکل میں پھنس جاؤ گی ——— خیر یہ ہم کیا فضول خیالی باتیں کر رہے ہیں۔ اور میں نے بھی یہ اپنی گھبراہٹ میں یہ پتے اُلٹے سیدھے ملا دیئے ہیں۔ لاؤ پھر سے بانٹیں اور ٹھیک طریقے پر کھیلیں!

(شریفہ پتے جمع کر کے بلقیس کو دے دیتی ہے اور وہ پھر سے پھینٹ کر بانٹ دیتی ہے اور دونوں کھیل شروع کر دیتی ہیں ——— تھوڑی دیر تک کھیل خاموشی سے جاری رہتا ہے۔ شریفہ کے چہرے سے ایسا لگتا ہے جیسے وہ رفتہ رفتہ اکتاتی جا رہی ہے لیکن بلقیس کھیل میں ایک زبردست دلچسپی محسوس کر رہی ہے ——— آخر شریفہ تھکے ہوئے انداز میں کہتی ہے)

شریفہ :- سچ سچ بتاؤ۔ بلقیس تمہارا اس وقت یہ جی نہیں چاہتا کہ ہم دونوں کے سامنے ایک ایک پارٹنر بھی بیٹھا ہو؟

بلقیس :- ہاں اگر ہم کو تاشوں کے لئے کوئی پارٹنر مل سکتی تو اچھا ہوتا لیکن ہم کو یہ بات نہ بھولنی چاہیئے کہ ہم نے شادی کے ڈھکوسلے سے آزادی صرف اس لئے حاصل کی ہے کہ اپنی اپنی انفرادی زندگیاں بسر کر سکیں۔ اور بغیر پارٹنر کے تاش کھیلنا بھی اس انفرادی زندگی کا ایک جزو ہے [illegible]

ایک لڑکی کو تمام محسوس ہونی چاہیئے۔ حتیٰ کہ ایک وقت میں ہم کو یا ٹریکیل سے بالکل نفرت سی ہو جانی چاہیئے۔

اس وقت میوریل داخل ہوتی ہے وہ کوئی چوبیس برس کی عیسائی لڑکی ہے۔ سادہ مگر دلکش ساڑھی پہنے ہوئے ہے۔ بال جوڑے کی وضع میں گندھے ہوئے ہیں۔ جوڑے میں پھولوں کا ایک گچھا لگا ہوا ہے جو اس کی ساڑھی کے رنگ سے میچ کر رہا ہے۔ رنگت سانولی ہے مگر ناک نقشہ سڈول اور دلکش۔ اس کے ایک ہاتھ میں ایک بیگ ہے جس میں مختلف سائز کے کاغذ اور نوٹ بکیں ٹھنسی ہوئی ہیں اور دوسرے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا کیش بکس ہے)

میوریل :۔ ہیلو لیڈیز، ہمارا تعارف نہیں ہوا ہے لیکن پھر بھی ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتی ہیں کیونکہ ہم نے اکثر دور ہی دور سے ایک دوسرے کے کپڑوں کو ناقدانہ نگاہ سے دیکھا ہے اور عورتوں کی یہ دلفریب عادت ہی ان کو ایک دوسرے کا واقف بنا دیتی ہے۔

(میوریل اپنے طنز کو واضح کرنے کے لئے خود ہی ہنس دیتی ہے۔ بلقیس اور شریفہ بھی کھسیانی ہو کر اس کی ہنسی میں شریک ہو جاتی ہیں۔ میوریل اپنا بیگ اور کیش بکس ان کی میز پر رکھ دیتی ہے اور ان کے تاش کے پتے ایک بار پھر گڈ مڈ ہو جاتے ہیں)

لیڈیز ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ یہاں پر عورتوں کی طرف سے ایک لاجواب قسم کا فینسی ڈریس کیا جائے (شریفہ اور بلقیس اس کے اس انکشاف پر ذرا چونک اٹھتی ہیں) فینسی ڈریس پارٹیاں ہمیشہ بہت دلچسپ ثابت ہوتی ہیں۔ ہر عورت ان میں بہتر دلچسپ طریقے پر اپنی شخصیت کو چھپا بھی سکتی ہے اور ابھار بھی سکتی ہے۔ اس طرح اس کی انفرادیت ایک نئے زاویئے سے ظاہر ہوتی ہے۔ (انفرادیت کے لفظ پر بلقیس اور شریفہ پھر چونکتی ہیں اور ایک دوسرے کو دیکھتی ہیں) پھر یہ ہے کہ جو چندہ ہم اس فینسی ڈریس پارٹی سے اکٹھا کریں گے وہ کسی محتاج خانے پر صرف کر سکتے ہیں (اور ان دونوں کو فاتحانہ انداز سے دیکھتی ہے۔ جیسے اپنی اس تجویز کی داد طلب کر رہی ہو)

مثلاً ہم چندے کا کچھ حصہ بین الاقوامی بچوں کے فنڈ میں دے سکتے ہیں۔ وہ فنڈ بین الاقوامی ہے کیونکہ بچے بین الاقوامی نہیں! (اپنے لطیفے پر خود مسکراتی ہے) گو میرا اپنا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ اگر فنڈوں کے بجائے بچے بین الاقوامی ہوتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ ایک تو فنڈوں میں زبردستی کی چندہ دینے والوں کے پیسے بچ جاتے۔ اور دوسرے بین الاقوامی بچے بین الاقوامی مسئلوں کو حل کرنے میں بہت مدد دے سکتے۔

(تینوں ساتھ مل کر ہنسنے لگتی ہیں اور میوریل فاتحانہ انداز میں ایک کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

بلقیس :۔ کب ہے یہ فینسی ڈریس؟

میوریل :۔ پرسوں سہ پہر کو، قریباً تمام انتظام تو مکمل ہو چکا ہے۔ مگر پھر بھی آپ دونوں اس کے بندوبست میں میری مدد کریں گی؟

بلقیس :۔ ہاں کیوں نہیں ضرور! (شریفہ صرف اثبات میں سر ہلا دیتی ہے) ضرور میں تو ابھی جا کے کوئی عمدہ سا فینسی ڈریس سوچتی ہوں۔ میرا اپنا خیال تو یہ ہے کہ میں شیکسپیئر کی کوئی ہیروئن بننا پسند کروں گی۔ کیوں کہ شریفہ؟

شریفہ :۔ (چونک کر جیسے کچھ سوچ رہی تھی اور اب بلقیس نے اس کے خیالات کو گڈ مڈ کر دیا ہے) کونسی ہیروئن؟

بلقیس :۔ یہی تو راز ہے۔ ہیروئن کے انتخاب ہی سے تو میری شخصیت ظاہر ہو گی اور اس کا پورا رعب بھی آپ لوگوں پر پڑے گا۔ اور شریفہ تم بھی اپنے ہلکے بھورے بالوں سے فائدہ اٹھا سکتی ہو۔ کسی انگریز مصور کی ہیروئن بن سکتی ہو۔ آخر بال کس شخصیت کے لئے موزوں رہیں گے؟

(میوریل اور شریفہ دونوں ایک ساتھ اس کے بالوں کا جائزہ لیتی ہیں۔ اور فوراً بھانپ لیتی ہیں۔ کہ اس نے شریفہ کے بالوں کا تذکرہ ہی اپنے بالوں کی طرف متوجہ کرنے کی غرض سے کیا تھا۔ میوریل جان بوجھ کر خاموش رہتی ہے۔ کیونکہ وہ بے دریغ بلقیس کے احساس تفاخر کو تسکین نہیں پہنچانا چاہتی تھی اور اس پر شریفہ اپنا فرض سمجھتی ہے کہ وہ اس کے بالوں کی تعریف میں کچھ کہے۔ لیکن ساتھ ہی اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کہے)

شریفہ :۔ ارے — ام — ہاں واقعی تمہارے بال بہت خوبصورت ہیں۔ میں نے تو اب تک بالکل غور ہی نہ کیا تھا۔

میوریل:۔ تو اگر آپ دونوں اپنے کھیل سے تھوڑا سا وقت مجھے دے سکیں تو ہم تینوں بیٹھ کر اس فینسی ڈریس پارٹی کا انتظام کریں۔ اور ہر ایک اپنے اپنے ذمے تھوڑا تھوڑا سا کام لے لے۔ کیونکہ کام اسوا بھی کافی پڑا ہے۔

شریفہ:۔ ضرور۔

میوریل:۔ سب سے پہلے تو آپ دونوں ایک ایک ٹکٹ اس پارٹی کا خرید لیجئے۔ ٹکٹ تین روپے کا ہے۔ چونکہ ہم چندہ کا ایک حصہ محتاج خانے پر صرف کر رہے ہیں۔ اس لئے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ہماری پارٹی کو تفریحی ٹیکس سے خارج کر دیا ہے۔ (ٹکٹوں کی ایک کاپی کھول کے، دو ٹکٹ پھاڑتی ہے۔ جو بلقیس اور شریفہ خاموشی سے اس کے ہاتھ سے لے لیتی ہیں۔ اور اپنے اپنے بٹوؤں سے روپے نکال کے دے دیتی ہیں۔ میوریل روپے کیش بکس میں ڈال دیتی ہے) ہم نے ٹکٹ کی قیمت تو تین روپے رکھی ہے۔ لیکن چونکہ یہاں آمدنی اور تمام انتظام پر بھی کافی خرچ ہوگا۔ اس لئے ہم آمدنی کا پانچ فیصدی حصہ ان بین الاقوامی فنڈ میں دیں گے۔ (شریفہ پانچ فیصد حصہ پر ذرا چونکتی ہے لیکن پھر فوراً اپنی حیرت کو چھپا لیتی ہے) پارٹی یہاں اس ہوٹل کے بال روم میں ہی ہوگی۔ آپ بال روم کو سجانے میں میری مدد کیجئے گا!

(پھر میوریل ادھر اُدھر دیکھتی ہے جیسے کوئی راز کی بات کہنے والی ہو)

میوریل:۔ دراصل میں یہاں بالکل اکیلی ہوں۔ اسی لئے آپ سے مدد کی درخواست کر رہی ہوں۔

(بلقیس اور شریفہ ایک بار پھر ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نگاہوں سے ——— ہیں اور ایک ساتھ لیتی ہیں "اکیلی!" جیسے وہ دونوں ایک ساتھ سوچ رہی ہوں کہ کہیں ہماری طرح میوریل بھی ———؟)

میوریل:۔ جی ہاں بالکل اکیلی اور آزاد ہوں ابھی چند روز پہلے میں اس آزادی کی تلاش میں تھی نہ معلوم لوگ طلاق کو اس قدر ڈراؤنی چیز کیوں سمجھتے ہیں میرا اپنا خیال تو یہ ہے کہ طلاق لینے کے بعد ہی ایک عورت کی انفرادیت پورے عروج پر آتی ہے (شریفہ اور بلقیس کی حیرت اور بھی بڑھ جاتی ہے کیونکہ ان کو محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میوریل ان کی ہی باتیں دوہرا رہی ہے) شادی نہ کرنے کی صورت میں لڑکی میں ایک طرح کی جھجک رہتی ہے جو اس کی شخصیت کی نشوونما میں حائل ہوتی ہے اس طرح پر شادی ایک حیاتیاتی ضرورت سمجھی جا سکتی ہے۔ لیکن شادی کے بعد اگر کوئی صورت مانع علیحدگی کی ہو سکے۔ تو عورت گویا اپنے کو پا لیتی ہے اور پھر محض اپنی زندگی گزارتی ہے پھر میرا اپنا خیال تو یہ ہے۔ کہ مردوں میں تخیل زیادہ ہوتی ہے۔ اور عملی قوت کم۔ اور وہ عورتوں کے صحیح ساتھی بننے سے قاصر رہتے ہیں۔ (اب بلقیس ——— اس کی باتوں میں بہت گہری دلچسپی محسوس کرنے لگتی ہے کیونکہ وہ مردوں کے بارے میں ایک نیا اور اس کے اپنے نظریے سے مختلف نظریہ پیش کر رہی ہے) اپنا تمام وقت اپنے بالکل کی سی بے ہنگم اور بوجھل تخیل میں کھویا رہتا تھا۔ کبھی کبھی اپنی سوئی سوئی بیوقوف آنکھوں سے میرے چہرے کو دیکھنے لگتا تھا۔ جیسے وہ کچھ کھو بیٹھا ہو ——— بے حد بیوقوف مگر شاید بے حد سویٹ ——— مگر آخر زندگی میری کی ایک ڈلی پر تو نہیں گزاری جا سکتی! میرا اس بیوقوف سے زندگی سے اکتا گئی تھی اور میں نے سوچا کہ مجھ کو اپنی تمام عملی صلاحیتیں اس میری کی ڈلی پر ضائع نہ کرنی چاہئیں بلکہ ان کو باہر کی عملی زندگی پر صرف کرنا چاہیئے! ——— (میوریل، بلقیس اور شریفہ کو ایسے دیکھتی ہے جیسے اندازہ لگا رہی ہو کہ اس کی باتوں کا ان پر کیا اثر ہوا ——— (تھوڑے سے توقف کے بعد) مجھے امید ہے کہ آپ میری ان باتوں کو بہت قابل اعتراض نہیں سمجھ رہی ہیں؟

(بلقیس اور شریفہ ایک ساتھ چونک کر دیکھتی ہیں)

شریفہ:۔ مگر مجھ کو یہ تمام باتیں ناقابل یقین معلوم ہو رہی ہیں۔

میوریل:۔ ناقابل یقین؟ ——— کیوں؟

بلقیس:۔ (قہقہہ لگا کر) کیونکہ بتقریباً یہی کچھ ہم دونوں کے ساتھ پیش آیا ہے (شریفہ کچھ جھینپ رہی ہے اور اپنی جھینپ کو چھپانے کے لئے

تاش کے پتوں کو اٹھا کر پھینٹنے لگتی ہے!)

میوریل:- واقعی! ـــ اوہ کتنا لاجواب اتفاق ہے۔ بالکل ناقابلِ یقین مگر انتہائی شاندار اتفاق! ـــ تو اب آپ دونوں کو بھی اس برآمدے کی فضا ہم تینوں کی زندگیوں کا ایک گہرا عنصر معلوم ہوتی ہے؟ ـ عفت شریفہ معصومیت کے ساتھ اثبات میں سر ہلا دیتی ہے اور میوریل اٹھ کر سٹیج کے پچھلے حصے میں جا کر کھڑی ہو جاتی ہے اور نیچے وادی پر ایک نگاہ ڈالتی ہے) واقعی اب زندگی میں کچھ اور تمنا کرنا بے سود ہے ہمارے پاس یہ برآمدہ ہے یہ خوبصورت شاعرانہ وادی اور اس کے چیڑ اور دیودار کے درخت اور یہ دلکش دھوپ ہے اور ہم تینوں کی زندگیوں کا یہ زبردست اتفاق ہے جس نے ہم کو یہاں اس برآمدے میں لا کر اکٹھا کر دیا ہے۔ اب ہم اپنی پوری صلاحیتوں کو صرف اپنے پر صرف کر سکتے ہیں بغیر کسی اور کو کچھ دیئے! ـــ اب ہم فینسی ڈریس پارٹی کر سکتے ہیں اور اس کو تین خوش قسمت مطلقہ عورتوں کی شاندار پیش کش کہہ سکتے ہیں۔ اس کا چندہ کسی محتاج خانے کو دے سکتے ہیں۔ اب کوئی بھی اپنی سوئی ہوئی انگلیاں خواہ مخواہ ہمارے چہروں پر گاڑنے کا حق دار نہ ہوگا ـ اور ہاں ہم تاش کھیل سکتے ہیں (میز کے پاس آ کر بیٹھ جاتی ہے اور شریفہ سے جو تاش کے پتے پھینٹنے لگتی ہے) آیئے ہم کٹ تھروٹ کھیلیں۔ تین خوش قسمت مطلقہ عورتوں کے لئے کٹ تھروٹ ہی سب سے زیادہ دلچسپ کھیل ثابت ہو سکتا ہے جیسے یہ کھیل ایجاد ہی ہمارے لئے ہوا تھا۔ (پھر پتے بانٹنے لگتی ہے ساتھ ہی کوئی انگریزی دھن بھی زیرِ لب گنگنا رہی ہے۔ جیسے خود سے بہت مطمئن ہے! ـ کھیل کچھ دیر تک دلچسپی کے ساتھ جاری رہتا ہے۔ تینوں کھیل میں کافی منہمک ہیں، اور اپنے چاروں طرف سے کچھ بیگانہ سی ہو گئی ہیں ـــ اسی خاموشی میں اسد داخل ہوتا ہے۔

(اسد نوجوان ہے شکل کا بھی اچھا ہے کپڑے کافی قیمتی پہنے ہوئے ہے۔ اس کی ٹائی خاص طور پر بہت بھڑکیلی معلوم ہو رہی ہے اس کے ہلکے ہلکے گھونگر والے بال اس کے ماتھے اور کنپٹیوں پر بے پروائی سے پڑے ہوئے ہیں جس سے اس کے چہرے کی جاذبیت اور واضح ہو جاتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں بھی ایک طرح کی چمک ہے۔ جو غالباً اس کے کردار کی شوخی اور ذہانت کا پتہ دیتی ہے ـ اندر آنے کے بعد وہ پہلے تو ایک نظر ان تینوں پر ڈالتا ہے۔ مگر پھر ان کو اپنے کھیل میں منہمک دیکھ کر دبے پاؤں برآمدے کی پچھلی طرف چلا جاتا ہے۔ اور نیچے پھیلی ہوئی وادی پر ایک نظر ڈالتا ہے۔ لیکن اسی اثناء میں اس کے قدموں کی چاپ سے تینوں چونک پڑتی ہیں اور پہلے تو نظر بھر کے اسد کو دیکھتی ہیں۔ اور پھر اس کو نظرانداز کر کے اپنے کھیل میں مصروف ہو جانا چاہتی ہیں کہ اسد بول اٹھتا ہے:۔

اسد:- معاف کیجئے گا، میں آپ لوگوں کے کھیل میں مخل تو نہیں ہو رہا؟ (تینوں ایک ساتھ سر ہلا دیتی ہیں گویا کہہ رہی ہوں ہرگز نہیں۔ اسد اب ان کی میز کے قریب آ جاتا ہے) آپ کو اس فینسی ڈریس پارٹی کے بارے میں کچھ معلوم ہے جو یہاں پرسوں سہ پہر کو ہونے والی ہے؟ (تینوں کے چہروں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن شریفہ فوراً اس کو ضبط کر کے اپنے چہرے کو سنجیدہ بنا لیتی ہے)

میوریل:- جی ہاں آپ کو کیا معلوم کرنا ہے؟

اسد:- تب تو مجھ کو آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ دراصل معاف کیجئے گا۔ مجھ کو تو ایسی چیزوں میں کوئی خاص دلچسپی نہیں میں تو سمجھتا ہوں کہ فینسی ڈریس وغیرہ ایک قسم کا فرار ہے۔ اور اس فرار کی ضرورت محض جذباتی دباؤ کی موجودگی سے پیدا ہوتی ہے! اور میں کبھی جذباتی دباؤ کا شکار نہیں بنتا ہوں! (تینوں ذرا جھنجھلا کر اسد کو دیکھنے لگتی ہیں) مگر خیر یہ تو اپنا اپنا نظریہ ہے۔ عورتوں کو اکثر فینسی ڈریس پارٹیوں میں بہت دلچسپی محسوس ہوتی ہے چنانچہ میری بیوی خالدہ کو بھی اس کے بارے میں بہت گہری دلچسپی محسوس ہو رہی ہے۔ جب سے انہوں نے اس کے بارے میں سنا ہے وہ کافی بدحواس ہوتی جا رہی ہیں۔ اور میرے پیچھے پڑ گئی ہیں کہ میں اس کے بارے میں تمام معلومات بہم پہنچاؤں۔ میرا خیال ہے کہ خالدہ کو آپ لوگوں سے ملا دوں گا۔ وہ یقیناً آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔

بلقیس :۔ خیر اس کو اس قدر یقینی ہونا بالکل ٹھیک نہیں ہے۔ مگر میری وہ ہم سے اس کی تفصیل حاصل کر سکتی ہیں۔

اسد :۔ (میز کے قریب بیٹھتے ہوئے) آپ لوگ کٹ تھروٹ کھیل رہی تھیں! شاید اس لئے کہ آپ کو جو غالباً ٹرمپ نہیں مل رہا تھا؟ (وہ تینوں اور بھی زیادہ جھنجھلا اٹھتی ہیں، اور شریفہ تو ایسا منہ بناتی ہے جیسے وہ اس سے گہری نفرت محسوس کر رہی ہو اور بلقیس جو شاید سب سے زیادہ جھنجھلا رہی ہے سوچتی ہے اس کو کچھ کہنا چاہیئے)

بلقیس :۔ خیر محض اس لئے تو نہیں، ویسے بھی یہ بہت دلچسپ کھیل ہے۔

اسد :۔ خیر تو آپ لوگوں کے اس فینسی ڈریس پارٹی کے سلسلے میں کیا ارادے ہیں! میں آپ کو بتاؤں کہ اس میں میں بھی آپ کی مدد کر سکتا ہوں مثلاً میں پارٹی کے لئے بڑے بڑے PLACARDS بہت اچھے بنا سکتا ہوں۔ مجھ کو ایسے PLACARDS بنانے میں بہت مہارت حاصل ہے بلکہ شادی سے پہلے میرا یہی مشغلہ تھا۔ اور اب خالدہ میرا مشغلہ بن گئی ہے۔ بعض دفعہ اب بھی میں یہ سوچتا ہوں کہ (PLACARDS) بنانا شادی سے زیادہ دلچسپ مشغلہ ہے مثلاً PLACARDS کو ایک بالکل مضحکہ خیز چیز بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن برخلاف اس کے اگر کوئی بیوی کو مضحکہ خیز چیز سمجھنے لگے تو کافی مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔ پھر بھی آپ کی اس پارٹی کے لئے تو میں ——— یہ بنا ہی سکتا ہوں۔

میمو ریل :۔ بہت بہت شکریہ! ——— مگر ———

اسد :۔ (بات کاٹ کر) شکریہ وکریہ کچھ نہیں۔ مثلاً یہ دیکھیئے۔ (یہ کہہ کر میموریل کی ایک نوٹ بک میں سے کاغذ پھاڑ تا ہے۔ اور جیب سے قلم نکال کر اس پر ایک اشتہار کا ڈیزائن بنانے لگتا ہے) یوں ایک نیم دائرے میں آپ گرینڈ وینیز فینسی ڈریس پارٹی لکھ سکتی ہیں۔ گرینڈ وینیز فینسی ڈریس پارٹی! ——— اور یہاں اس کے نیچے ذرا چھوٹے حرفوں میں تاریخ وقت وغیرہ آ سکتا ہے۔ اور یہاں پر سلہوٹ میں ایک عورت کی فینسی ڈریس میں تصویر آ سکتی ہے۔ سلہوٹ اس لئے کہ سلہوٹ میں تصویر بنانی سب سے آسان ہوتی ہے۔ اور پھر اس کے بھی نیچے آپ لکھ سکتی ہیں۔ چندے کا ایک حصہ کسی محتاج خانے میں دیا جائے گا۔ اس طرح لکھنے سے آپ لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کر لیں گی۔ اور پھر یہاں سب سے نیچے آپ چھوٹے چھوٹے حرفوں میں لکھ سکتی ہیں ——— فلاں فلاں اور فلاں کی شاندار پیش کش ——— (اس آخری فقرے پر تینوں بری طرح چونک پڑتی ہیں اور جھلا اٹھتی ہیں، جیسے ان کے دلوں میں چور ہو۔ پھر میموریل سب سے پہلے اپنے جذبات پر قابو پالینے میں کامیاب ہو جاتی ہے)

میموریل :۔ اوہ، بہت بہت شکریہ۔ لیکن ———

اسد :۔ پھر آپ نے بیکار شکریہ ادا کرنا شروع کر دیا۔ میں نے آپ سے کہا! کہ اس طرح کے اشتہاروں کے ڈیزائن بنانا میرا خاص محبوب مشغلہ ہے۔ اور مجھے خوشی ہے کہ اس پارٹی کے بہانے خالدہ ذرا معروف رہے گی اور میں اطمینان کے ساتھ اپنے اس پرانے مشغلے میں دلچسپی لے سکوں گا ——— ٹھیریے میں خالدہ کو بلا کے لاتا ہوں (اور اٹھ کے تیزی سے باہر چلا جاتا ہے اور اپنے ساتھ وہ کاغذ بھی لے جاتا ہے جس پر وہ ڈیزائن بنا رہا تھا۔ تینوں خاموشی کے ساتھ اس کو باہر جاتے ہوئے دیکھتی ہیں۔ پھر ایک گہرا سانس لے کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتی ہیں جیسے ایک دوسرے سے پوچھ رہی ہوں "یہ کس قسم کا آدمی ہے؟" ان کا کھیل گڑبڑ ہو چکا ہے۔ بلقیس اور میموریل تاش کی گڈی سمیٹنے میں مصروف ہو جاتی ہیں اور شریفہ ذرا گردن کو گھما کر کھوئی کھوئی نظروں سے باہر دیکھنے لگتی ہے)

بلقیس :۔ کچھ عجیب سا آدمی ہے خواہ مخواہ ہمارے بیچ میں کود پڑا۔

شریفہ :۔ مگر تم نے ہمت کر کے اس کو ہٹا کیوں نہ دیا؟

بلقیس :۔ (جو شریفہ کی اس بات پر بالکل ہی تلملا اٹھی ہے) میں کیا کرتی! اس نے ہم کو موقعہ ہی کب دیا کچھ کہنے کا اور معاف کرنا سیر آپ تو ...

ہے کہ تم خاصی دلچسپی کے ساتھ اس کی ٹائی کو دیکھ رہی تھیں!

شریفہ:- میں تم سے اپنے دل کی بات کہہ رہی ہوں۔

میموریل:- بغیر اس فضول بحث سے کوئی فائدہ نہیں۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ کوئی مرد اور وہ بھی ایک شادی شدہ مرد ہمارے انتظامات میں دخل دے بلکہ میں تو یہ بھی نہیں چاہتی کہ ہم تینوں کے علاوہ کوئی اس فینسی ڈریس میں کچھ کام کرے۔ کیونکہ ہم تینوں کو ایک زبردست اتفاق نے یہاں یک جا کیا ہے۔ اور ہم تینوں ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔

شریفہ:- (طنز سے) تو پھر آپ نے اس سے کہا کیوں نہیں کہ یہ فینسی ڈریس پارٹی تین مظلوم عورتوں کی شاندار پیش کش ہے اور وہ اس کے لئے اشتہار کے ڈیزائن بنانے کی تکلیف نہ کرتے!

(شریفہ اٹھ کر برآمدے کے پچھلے حصے میں چلی جاتی ہے جیسے وہ بلقیس اور میموریل کے پاس اب بیٹھنا نہیں چاہتی ہے وہ ایک ستون سے لگ کر باہر دیکھنے لگتی ہے میموریل اور بلقیس دونوں خاموش بیٹھی رہتی ہیں جیسے کسی جذبے کو دبانے کی کوشش کر رہی ہوں لیکن ساتھ ہی یہ بھی جانتی ہوں کہ یہ جذبہ ابھر کے رہے گا! — کچھ دیر تک سٹیج پر گہری خاموشی رہتی ہے۔ پھر ایک دم سے خالدہ اور اسد اندر داخل ہو کر اس خاموشی کو توڑ دیتے ہیں)

اسد:- ہیلو! — یہ ہیں خالدہ!

(خالدہ ذرا دبلی کم عمر سی لڑکی ہے۔ شکل میں کافی جاذبیت ہے اور تمام وقت ایک خفیف سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیلتی رہتی ہے کپڑے سادہ مگر دلکش ہیں۔ میموریل اور بلقیس اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے اس کو سر سے پیر تک دیکھتی ہیں اور شریفہ اپنی جگہ کھڑے کھڑے گردن موڑ کر اس کا جائزہ لینے کی کوشش کرتی ہے۔ پھر تینوں باری باری غیر متعلق طریقے پر اپنا تعارف کراتی ہیں۔

میموریل:- میں میموریل ہوں!

بلقیس:- ——— اور میں بلقیس۔

شریفہ:- میرا نام شریفہ ہے۔ (خالدہ ہر نام پر تھوڑا سا ٹھٹکتی ہے جیسے اس کی منتظر ہو کہ اس کو نام کے آگے کچھ اور بھی بتایا جائے گا۔ پھر کچھ مایوس سی ہو کر تینوں کی طرف باری باری مسکراتی ہے اور ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ جاتی ہے)

خالدہ:- اُف۔ یہ کتنی خوشنما جگہ ہے مجھے تو بالکل اس سے محبت ہو گئی ہے۔ (برآمدے کے پچھلی طرف نگاہ ڈالتی ہے جیسے باہر کی فضا کو جی بھر کے دیکھنا چاہتی ہو) اور یہ اسد آج تک یہاں نہیں آئے تھے۔ میں نے کئی بار ان سے کہا بھی تھا اور اب اس وقت بھی میں نے ان کو زبردستی بھیجا تھا۔ کہ یہاں سے لینڈ سکیپ ضرور دیکھ کے آئیں۔ اور انہوں نے یہاں آکر لینڈ سکیپ میں دلچسپی لینے کے بجائے آپ لوگوں سے فینسی ڈریس کی تفصیلات حاصل کرنی شروع کر دیں۔ خیر! دراصل فینسی ڈریس پارٹیوں میں مجھ کو بھی بہت دلچسپی ہے۔

میموریل:- اچھا!

خالدہ:- اور اسی لئے میں آپ کی اس پارٹی کے انتظام وغیرہ میں آپ کا ساتھ دینا چاہتی ہوں۔

(میموریل بلقیس کی طرف دیکھتی ہے جیسے یہ چاہتی ہو کہ خالدہ کو کوئی مناسب جواب دے دے۔ پھر وہ دونوں شریفہ کی طرف دیکھتی ہیں جو ابھی تک سٹیج کے پچھلے حصے میں ایک ستون سے لگی کھڑی ہے۔ شریفہ صرف ایک لمحے کے لئے ان دونوں کی طرف دیکھتی ہے پھر فوراً گردن موڑ کر باہر کی لینڈ سکیپ کو دیکھنے لگتی ہے جیسے فینسی ڈریس کے ذکر سے کافی اکتا چکی ہو)

میموریل:- دراصل ہم لوگ یہاں کچھ کرنا چاہتے تھے ———

خالدہ:- ہاں خالی بیٹھے بیٹھے آپ اکتا گئی ہوں گی — آپ سب یہاں اکیلی ہیں!

(میوریل اور بلقیس اس سوال کو نظر انداز کرنا چاہتی ہیں)

میوریل :۔ ویسے بھی اگر کوئی مشغلہ ہو تو اچھا رہتا ہے۔ پھر ہم اس پارٹی کے چندے کا کچھ حصہ ایک محتاج خانے میں دینا چاہتی ہیں۔ پارٹی یہاں ہوٹل کے بال روم میں ہی ہوگی۔

(یہ سب باتوں میں مشغول سی ہیں کہ شریف دبے پاؤں باہر چلی جاتی ہے وہ جاتے جاتے بھی ان لوگوں سے گریزاں سی نگاہ ڈالتی جا رہی تھی جیسے ایکا ایکی اس کے دل میں بلقیس اور میوریل کے لئے نفرت سی پیدا ہو گئی ہے، اور وہ ان کا ساتھ زیادہ دیر تک نہیں دینا چاہتی ہے۔ اس کے باہر جاتے وقت بلقیس اور میوریل ذرا حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھتی ہیں جیسے اس کی غیر موجودگی کو محسوس کر رہی ہوں۔ مگر پھر باتوں میں مشغول ہو جاتی ہیں)

خالدہ :۔ میں سوچتی ہوں کہ اس پارٹی کے انتظام میں آپ کا پوری طرح ہاتھ بٹاؤں۔ مثلاً میں آپ کے لئے بال روم سجا سکتی ہوں۔ مجھ کو پارٹیوں کے لئے کمروں کو سجانے کی بہت مہارت ہے۔ اور شوق بھی مجھ کو یہ ہمیشہ ایک بہت دلچسپ مشغلہ معلوم ہوتا ہے واقعہ تو یہ ہے کہ مجھ کو شادی کے وقت بھی سب سے زیادہ دلچسپی اسی مشغلے میں محسوس ہو رہی تھی (وہ کو اپنی مخصوص مسکراہٹ سے اسد کو دیکھتی ہے جو جواباً مسکرا دیتا ہے اور پھر اٹھ کر سٹیج کی پچھلی طرف اس ستون کے پاس جا کے کھڑا ہو جاتا ہے جہاں پہلے شریف کھڑی تھی) میں جانتی تھی شادی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ مجھ کو برابر اس بات کا موقع ملتا رہے گا۔ کہ میں کسی کمرے کو اپنی مرضی کے مطابق سجا سکوں! (میوریل اور بلقیس اس کی باتوں سے رفتہ رفتہ اکتا رہی ہیں لیکن اس کی بات کاٹنے کی ہمت بھی نہیں رکھتی ہیں) اور پھر اسد بھی اس پارٹی میں مدد کر سکیں گے۔ یہ پارٹیوں کے لئے اشتہار بہت دلچسپ بنا سکتے ہیں۔

میوریل :۔ (اکتاہٹ سے) ہاں ہمیں معلوم ہے!

خالدہ :۔ معلوم ہے! — کیسے! — اوہ اب میں سمجھی وہ خود آپ کو پہلے ہی بتا چکے ہیں (قہقہہ لگاتی ہے۔ لیکن بلقیس اور میوریل جواباً صرف اخلاق کے طور پر تھوڑا سا مسکرا دیتی ہیں) تب تو بہت اچھا ہے۔ اسد اس نئی دلچسپی کے لئے بہت شاندار سا اشتہار ڈیزائن کرتا، یہ تینوں بچاریاں اس کے لئے بہت محنت کر رہی ہیں ——— واقعی مجھ کو آپ سب سے خواہ مخواہ بہت گہری ہمدردی محسوس ہوتی ہے آپ لوگ یہاں اکیلی بیٹھی بیٹھی اس قدر معصومانہ طور پر اس پارٹی کا تمام انتظام کر رہی ہیں۔ آپ تینوں نہ معلوم کیوں مجھ کو کتنی تنہا اور اکیلی معلوم ہوتی ہیں جس کو آپ پر رحم سا محسوس ہو رہا ہے۔ گویا آپ ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی بے حد تنہا ہوں۔ دراصل مجھ کو آپ جیسے لوگوں پر جو اتنے سوشل کاموں کو اپنے ذمے لے لیتے ہیں اور یوں سوسائٹی کو دلچسپ بنا دیتے ہیں، بہت رحم آتا ہے۔ آپ دوسروں کی اغیوں کی خاطر اپنے آپ کو بھول جاتی ہیں! (میوریل اور بلقیس اپنی اپنی جگہ تلملا اٹھتی ہیں۔ لیکن پھر بھی احتجاج کرنے کی ہمت اپنے میں نہیں پاتیں، اور خاموشی کے ساتھ خالدہ کی آواز سنے جاتی ہیں)۔ اسد! واقعی تم ان کے لئے بہت پیارا اشتہار بنانا۔ مثلاً: اس پر لکھ سکتے ہو، تین قابل ہمدردی اکیلی عورتوں کی شاندار پیشکش! (وہ بہت زور سے قہقہہ لگاتی ہے اور ساتھ ہی بلقیس اور میوریل کو دیکھتی ہے گویا اس کی منتظر ہو کہ وہ بھی اس کے قہقہے میں شریک ہوں گی۔ لیکن وہ دونوں پتھر کی طرح خاموش اور ساکت ہیں۔ جیسے اپنی اپنی جگہ سن ہو کر رہ گئی ہوں۔ ان کے چہروں کا رنگ بھی تقریباً اڑ چکا ہے۔ حالانکہ چند لمحوں کے بعد اپنے اکیلے پن سے گھبرا کر میوریل جھٹ سے اٹھ جاتی ہے اور اپنی جیب سے سگریٹ نکال کر اس کی میز پر سے اٹھا جاتی ہے اور جا کر اسد کے پاس کھڑی ہو جاتی ہے۔ اور اسد کا ایک بازو نرمی سے پکڑ لیتی ہے۔ اس کے یوں بازو تھامنے پر اپنی جگہ پر بالکل بجلی کی طرح جاتی ہے لیکن پھر کچھ سوچ کر وہ خاموش سا ہو جاتا ہے)

میوریل :۔ (بغیر ہلکم اپنے کو اس قدر اکیلا بھی نہیں محسوس کرتے ہیں! ——— (دھیمی ہنسی کے ساتھ رک رک کر بولتی ہے) بلکہ ——— بلکہ میں تو یہ کہوں گی کہ ہم یوں اکیلے رہنا پسند کرتے ہیں، اپنی مرضی سے ہم لوگوں نے یہ زندگی اختیار کی ہے ——— (اسد ... )

محسوس کر سکتے ہیں۔ اپنی شخصیت کو کم میں ملا سکتے ہیں ــــ

الدرہ:۔ (ساحب اس کی بات کاٹ دیتی ہے کیونکہ ایکا ایکی وہ اپنے کو ان قابلِ رحم عورتوں سے زیادہ باہر کی لینڈ سکیپ میں دلچسپی لیتے ہوئے پاتی ہے) واقعی میرے خدا یہ منظر کس قدر حسین ہے! ــ میرا خیال ہے اسد کہ ہم دونوں تمام عمر اس حسین لینڈ سکیپ کو یوں ایک دوسرے کے برابر کھڑے ہوئے دیکھتے رہ سکتے ہیں۔ اپنی زندگیاں گزار سکتے ہیں ہم چاہیں تو شاعری بھی کر سکتے ہیں یا پھر فینسی ڈریس پارٹیوں میں شرکت کر سکتے ہیں ــــ اور یوں اپنی زندگیوں میں ایک حسن پیدا کر سکتے ہیں ــــ اور ــــ

اسد:۔ (طنزاً) ــــ اور اپنا اور اوروں کا وقت ضائع کر سکتے ہیں۔ اس دُنیا کے لئے بالکل ناکارہ شہری ثابت ہو سکتے ہیں۔ خیالی قسم کی چیزوں میں پناہ تلاش کر سکتے ہیں! ــــ اور اس بات سے بیگانہ رہ سکتے ہیں کہ دُنیا میں اس لینڈ سکیپ کے علاوہ بھی اور بہت کچھ ہے بہت کچھ! ــــ جو خوبصورت بھی ہے بدصورت بھی ــــ دلچسپ بھی ہے غیر دلچسپ بھی، اور اس سب کچھ میں اپنی زندگی گزارو دنیا کامیابی ہے۔ اس سے بھاگنا ناکامی! ــــ چلو اندر چلیں یہاں دھوپ تیز ہو گئی ہے۔ اندر چل کے اطمینان سے لائبریری میں بیٹھیں گے اور فینسی ڈریس کے اشتہار کے لئے عمدہ سا ڈیزائن سوچیں گے! ــــ خدا حافظ لیڈیز! ــــ چیریو!

(دونوں چلے جاتے ہیں، جاتے جاتے بھی خالدہ تقریباً اسد کے بازو پر لٹکی ہوئی ہے۔ اور گنگناتی ہوئی باہر جاتی ہے۔ اب بلقیس اور میویل اکیلی بیٹھی رہ جاتی ہیں۔ وہ دونوں ابھی بھی اپنی جگہوں پر بالکل ساکت بیٹھی ہیں۔ جیسے خالدہ اور اسد کی باتوں نے ان کے دماغوں کو واقعی سُن کر کے رکھ دیا ہو۔ چند لمحوں کے بعد وہ دونوں گویا آہستہ آہستہ ہوش میں آنے لگتی ہیں، مگر ان کے چہروں کی شائستگی اور تبسم غائب ہو چکے ہیں۔)

بلقیس:۔ یہ دونوں کس قدر قابلِ ملامت ہیں ــــ نہ جانے اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں۔

میویل:۔ وہ عورت اپنے کو بہت قابلِ فخر سمجھتی ہے۔ کیونکہ وہ اپنے مرد کے ساتھ رہتی ہیں ــــ کس قدر تنگ اور نیچ خیال کے لوگ ہیں یہ

(اس کے چہرے پر نفرت، غصہ اور افسوس کے ملے جلے جذبات ہیں یہی جذبات بلقیس کے چہرے سے بھی ظاہر ہو رہے ہیں)

میرا تو جی چاہتا تھا کہ ان دونوں کو انتہائی بدتمیزی کے جواب دوں۔ (طنز سے) ہم قابلِ رحم اکیلی عورتوں کی پیش کش ــــ اس کو یہ خیال ــ نہ جانے وہ اپنے میاں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے دوسروں پر اپنی فوقیت کیوں محسوس کرتی ہے۔

بلقیس:۔ (جس کی آواز اب بالکل بھرا گئی ہے جیسے اس کے سینے میں جذبات اُبل رہے ہیں۔ مگر وہ ان کو پورا اظہار کرنے سے معذور ہے (وہ اپنی کرسی سے کھڑی ہو جاتی ہے اور آہستہ آہستہ ٹہلنے لگتی ہے) لوگ بے وجہ ــــ اس قدر اندھے کیوں ہو جاتے ہیں ــــ وہ اپنی ناک سے آگے دیکھنے سے قاصر کیوں رہتے ہیں! ــــ وہ دُنیا بھر کی آبادی کو محض اپنے نقطۂ نگاہ کے محدود دائرے میں سے کیوں دیکھتے ہیں! ــــ

میویل:۔ پیاری بلقیس! محض اس لئے کہ دُنیا کی تمام آبادی انتہائی خود غرض ہے صرف اپنا ہی نقطۂ نگاہ دیکھ سکتی ہے اتنی تخیل نہیں رکھتی۔ کہ یہ سوچ سکے کہ اس کے علاوہ بھی اور بہت سے ان گنت نقطہ ہائے نگاہ ہیں ــــ بیوقوف! خود غرض ــــ

(ایک بیرا داخل ہوتا ہے جو ہاتھ میں ایک کاغذ لئے ہوئے ہے)

بیرا:۔ یہ مسز اسلم بیگم صاحب نے دیا تھا جاتے جاتے وہ کہہ گئی تھیں کہ یہ پرچہ آپ دونوں میں سے کسی کو دے دیا جائے۔

میویل:۔ جاتے جاتے۔ کیا مطلب؟ (گھبرا کے پرچہ اس کے ہاتھ سے لے لیتی ہے۔ بیرا پرچہ دے کے چلا جاتا ہے۔ بلقیس پہلے ایک دفعہ پورا پرچہ خود پڑھتی ہے پھر اس کو زور زور سے پڑھتی ہے پھر دانتوں سے اپنے ہونٹ بھی کاٹتی جاتی ہے)

بلقیس (روتے ہوئے) — تم دونوں مجھے معاف کرو۔ کیونکہ میں فیضی اور ... پارٹی میں شریک نہ ہو سکوں گی۔ اس کی وجہ ... کوئی ...
بلکہ میں اب تم لوگوں کا ساتھ نہیں دے سکتی ہوں — کیونکہ میں واپس جا رہی ہوں۔ مجھ کو اپنے سے نفرت محسوس ہو رہی ہے اور معاف کرنا
مجھ کو تم لوگوں کے خیر مخلصانہ رویے سے بھی بہت نفرت ہو چکی ہے۔ تم لوگ دل میں کچھ سوچتے ہو اور کچھ کہتی ہو ... مجھ کو ... کچھ
کہتی ہو۔ میں نے صاف محسوس کیا تھا کہ خالد سے باتیں کرتے ہوئے تمہاری نگاہوں میں ایک طرح کی جلن تھی۔ محض اس لئے کہ وہ اس جنگل میں اپنے
میاں کے ساتھ ہے۔ اپنے رنگ کے ساتھ اور تم سب ایک ہیں! ہم لوگوں کو در اصل نہ کسی انفرادیت کی تلاش ہے نہ خواہش نہ کسی شخصیت کی تلاش ہے
اور نہ کسی شاعرانہ تصور کی — اور صرف اسی لئے میں واپس جا رہی ہوں اور سچے دل سے یہ ابتدا ہر کرتی ہوں کہ تم دونوں بھی واپس چلی جاؤ گی! — (بلقیس
کے جذبات اب ناقابل برداشت حد تک پک چکے ہیں وہ یہ چھینک رہی تھی ہے۔ ایک کرسی پر بیٹھ جاتی ہے اپنے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں چھپا لیتی ہے۔
——— میوریل بھی چند لمحوں کے لئے خاموش رہتی ہے جیسے شریفہ کے اس عجیب و غریب غیر متوقع فیصلے نے اس کو ایک بار پھر سوچ کر ... دیکھنا ... چاہتی
ہے کہ اپنے جذبات پر قابو رکھے لیکن بلقیس کو بھی اس الجھن سے نکال لے۔ اس لئے وہ ہمت کر کے بولتی ہے۔ بہ ... آواز صاف ہے مگر وہ ... ک رک کر بول رہی ہے)
میوریل۔ اری بیوقوف لڑکی! — بدقسمت شریفہ — اس کو پتہ نہیں کہ اس کو نہ گئی کس چیز کی تلاش اور خواہش اور ضرورت ہے — خیر اس کی قسمت! (اٹھ کر ... کے پچھلے
حصے میں چلی جاتی ہے اور ایک ستون سے لگ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اس کی پیٹھ بلقیس کی طرف ہے۔ سورج کی کرنیں اب تیز ہو چکی ہیں وہ اس کو گھیرے ہوئے
ہیں وہ تھوڑے وقفے کے بعد آہستہ سے اونچے لہجے میں بولتی ہے جیسے بلقیس کو مخاطب کر رہی ہو) اس کو یہ توفیق ہے ... بد قسمتی سے ہمیں کیا واسطہ! ہم کو تو اب یہ
بھی یہ لینڈ سکیپ، یہ وادی، یہ چیڑ اور دیودار کے درختوں کی قطاریں، یہ کوہستانی پرندے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی بنا پر تو ہم شاعری کر سکتے ہیں
ان میں سکون تلاش کر سکتے ہیں — ان کے سہارے جی سکتے ہیں۔ کیوں بلقیس؟
بلقیس۔ (جوابا اپنے چہرے کو چھپائے بیٹھی ہے۔ جیسے پیچھے ... رک رک کے کہتی ہے) ہاں — کیوں نہیں!!

(— اور پردہ گر جاتا ہے)

(بقیہ صفحہ ۸۴)

تنقیدی نگاہوں کی چھلنی میں ریت کو چھاننے لگا۔ حتیٰ کہ نیچے کالی مٹی رہ گئی۔ اور اس کالی مٹی میں سونے کے دانے چمک رہے
تھے۔ چپٹے اور نکیلے — یہ دانے بہتے ہوئے کسی نزدیکی ذخیرے سے چلے آئے تھے۔
"بوڑھے دادا۔ تم نے ٹھکانے پر ہاتھ مارا ہے۔"
"نہیں نہیں۔ ذہانت دھوکا بھی ہو جاتا ہے۔" یاضم نے بڑی متانت سے کہا — "یقین کے ساتھ تم اس وقت کہہ سکتے ہو۔
جب کانی کھدائی کر چکو — لیکن برخوردار میری کچھ ہدایات بھی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم کامیاب ہو جاؤ تو ساری تفصیلات لکھ کر مجھے
بھجوا دو۔ سُن رہے ہو کہ نہیں۔ میں تمہیں اپنا پتہ دے جاتا ہوں۔ مجھے صحیح طریقے سے اطلاع دینا۔ خانے پر مہر لگا کر میں لوگوں
کو بتانا چاہتا ہوں کہ بوڑھا یاضم ان جنگلوں میں بیکار نہیں بھٹکتا پھرا۔ کیا تم ڈرگوں کے پاس مہر ہے؟ اچھا تو ہے۔ اب آؤ ذرا
اور نیچے چلیں۔ میں یہ جگہ بھی دیکھ بھال چکا ہوں۔ جب تم واپس جاؤ تو نقشے پر ان مقامات کا نام بھی لکھ دینا۔ اور میں نظر ثانی کر دوں گا۔
تمہیں ابھی نوٹ کیوں نہیں کر لیتے۔ یہ زیادہ اچھی بات ہو گی۔ یہ حکومت کا کام ہے اور بہت اہم۔ اور تم ابھی جوان ہو۔ یہ ممکن ہے
شاید تم بھول جاؤ۔ اچھا اچھا میں مذاق کر رہا تھا۔ نہیں کہو میں نے خود بخود تمہیں اپنا وارث نہیں چنا تھا۔"
اور اس طرح میں بوڑھے دادا یاضم کا وارث بن گیا۔ اور جیسا کہ بعد کے معائنہ نے ثابت کیا میں ایک دولت مند وارث تھا۔
میں نے اپنے کام کے نتائج سے حسب وعدہ بوڑھے یاضم کو کو مکھنو میں آگاہ کر دیا۔ ہم نے باقاعدگی کے ساتھ اسے سربمہر خط
بھیج دیا۔

# دنیا کا معرکہ آرا تاریخی شاہکار

تاریخ عالم کی خونچکاں داستانیں۔ اردو ادب میں بلحاظ موضوع اور تحقیق و تفتیش بے مثال تصنیف از سید

## تاریخ انقلاباتِ عالم

ابو سعید بزمی ایم۔ اے۔ اُردو ہی نہیں۔ دنیا کی تمام زبانوں میں یہ اپنے موضوع کے اعتبار پہلی کتاب ہے۔ جو تاریخ انقلابات عالم کے نام سے شائع کی گئی ہے۔ فاضل مصنف نے دس سال کی طویل محنت اور عرق ریزی سے کام لیکر ثابت کر دیا ہے کہ تاریخ سیاست اور معیشت پر ایک مستقل انسائیکلو پیڈیا ہے۔ جس کا مطالعہ ہر اہل علم کے لئے ناگزیر ہے۔ خصوصاً اخبار نویسوں، طالب علموں اور سیاست سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بے حد معلومات افزا کتاب ہے۔ اور طرفہ یہ کہ مصنف کا نقطۂ نظر پارٹی پالیٹکس سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتا اور اس درجہ غیر جانبدارانہ ہے کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہوگی۔ سائز ۱۸×۲۲/۸ کاغذ دبیز۔ طباعت و کتابت دیدہ زیب۔ قیمت جلد اوّل دس روپے۔

## کشکول

مصنفہ رئیس احمد جعفری۔ مصنف کی علمی و ادبی زندگی کا نچوڑ، عربی زبان کے ادب، تاریخ اور حکایات و محاضرات کا بے مثل انتخاب اور براہ راست ترجمہ۔ ہندوستان کے اُستادانِ سخنور، میر، ذوق، ناظم وغیرہ کے کلام کا بہترین اور بے مثل انتخاب، ادبی اور تنقیدی مقالات، مصر کے مشہور اور زندہ جاوید ادیب لطفی منفلوطی کے افسانوں کا ترجمہ، سیر و سیاحت، کلکتہ کے مٹیا برج کی سیر، غرض مختلف عنوانات پر سیر حاصل اور پُر مغز مقالات کا گلدستہ ابھی ابھی شائع ہوا ہے اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے اُردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ قیمت مجلد پانچ روپے (ﮯ)

## سٹینڈرڈ اُردو ڈکشنری

جدید طرز کی جامع و مکمل اُردو لغت۔ مرتبہ آغا محمد باقر ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ مصنف نے کئی سال کی لگاتار محنت کوشش اور مشاہیر اہل الرائے، منتخب اہل قلم اور افسران محکمہ تعلیم کے مشورے سے اس کو مجلّا اُردو خوانندہ حضرات کے لئے مستند ترین بنا دیا ہے۔ عربی، فارسی، انگریزی اور ہندی کے جملہ مروجہ الفاظ اور علوم و فنون، تہذیب و تمدن، تجارت و سیاست کے وہ تمام الفاظ و اصطلاحات بھی جو اُردو زبان میں استعمال ہوتی ہیں اور دیگر اُردو لغت میں نہیں ملتیں۔ طلبہ، اساتذہ اور ادبا کی جملہ ضروریات کے پیش نظر ضروری اعراب کے ساتھ درج کی گئی ہیں۔ موجودہ اُردو لغاتوں میں بہترین کامل اور جدید طرز کی لغت بڑے سائز ۱۰ × ½ ۷۰۰ صفحات کی ضخامت۔ کاغذ، طباعت، اور جلد خوبصورت۔ اور مضبوط۔ دیدہ زیب گرد پوش اور قیمت صرف بارہ روپے۔

---

جدید اُردو شاعری پروفیسر عبدالقادر سروری ۔ ۔ ۔

کمال اتاترک ۔ بطلِ آزادی مرحوم جناب تکبر صاحب ۔ ۔ ۔

ماڈرن اُردو ڈکشنری۔ مرتبہ صاحبزادہ ابو نعیم عبدالحکیم خاں

نشتر جالندھری مجلّا قیمت ۔ ۔ ۔ صبح بہار اختر شیرانی

قیمت ۔ ۔ ۔ اختر ستان قیمت ۔ ۔ ۔

لیلیٰ آوارہ ۔ ۔ ۔ نیلوفر حسن عزیز جاوید قیمت ۔ ۔ ۔

قیمت ۔ ۔ ۔ ساز فطرت ۔ ۔ ۔ صبر و ضبط

قیمت دو روپے چار آنے

معاشیات قومی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ۔ ۔ ۔

دیس سے باہر۔ آغا محمد اشرف ایم۔ اے ۔ ۔ ۔

لندن سے آداب عرض۔ آغا محمد اشرف ۔ ۔ ۔

اتفاقات۔ مرزا محمد اصل نجم لکھنوی مجلد ۔ ۔ ۔

شیشہ و سنگ ۔ ۔ ۔

دبستان خلیقی دہلوی ۔ ۔ ۔

وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ مرتبہ اختر شیرانی ۔ ۔ ۔

حضر کعبہ دل ۔ ۔ ۔

قرآنی اخلاق مرتبہ پروفیسر عبدالصمد صارم مرحوم ۔ ۔ ۔

اُردو زبان اور ہند از ناظم سوہاروی ۔ ۔ ۔

تاریخ انقلاب روس مصنفہ چودھری شیر جنگ ۔ ۔ ۔

کارل مارکس اور اس کی تعلیمات ۔ ۔ ۔

دل و نادل مصنفہ رئیس احمد جعفری ۔ ۔ ۔

ادراقِ پارینہ از چودھری شیر جنگ ۔ ۔ ۔

گورکی کے افسانے۔ سعادت حسن منٹو ۔ ۔ ۔

دو قرآن۔ مصنفہ ڈاکٹر غلام جیلانی برق ۔ ۔ ۔

انجام حیات مصنفہ سید آل رسول قلبی ۔ ۔ ۔

## کتاب منزل

[illegible] بازار لاہور

(دارت الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام چودھری برکت علی پرنٹر پبلشر چھپ کر شائع ہوا)

Regd. No. L 3521



کیا سرعلمہ پریس - لاہور